ماھنامہ

نقوش

ہندوستانی نمبر

www.taemeernews.com

نمائندہ دکنِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

ہندوستانی مزاح نمبر (نثر)

جون ۱۹۸۵ء ○ جلد ۱۸ ○ شمارہ خصوصی

مدیر: ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمالؔ ○ مہمان مدیر: یوسف ناظم

مجلسِ مشاورت:
بھارت چند کھنہ ○ محمد منظور احمد
سریندر لوتھر ○ عنایت اللہ
مجتبیٰ حسین ○ مسیح انجم

مجلسِ ادارت

سرورق
سعادت علی خاں

جنرل منیجر
سمیع جلیل

کتابت: محمد عبدالرؤف ○ مسرور انور

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان۔ حیدرآباد ۲
بائنڈنگ: حفیظیہ بک بائنڈنگ ورکس، چھتہ بازار، حیدرآباد ۲

قیمت ۵۰ روپے

۳۱۔ مجردگاہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱ فون: آفس: 33776
رہائش: 521064

www.taemeernews.com

اپنے چمن میں کیا کیا ہے پیارے!

(فہرست)

○ تصاویر : ۵ تا ۱۲

○ کھل جا سم سم

عارضی اداریہ : مہمان مدیر ۱۳

اداریہ : مدیر ۳۸۱

○ کسوٹی (تنقید، جائزہ)

ہندوستان میں اُردو طنز و مزاح : پروفیسر محمد حسن ۱۵

اُردو طنز نگاری اور ظرافت کے پندرہ بیس سال : ڈاکٹر ظ۔ انصاری ۱۸

اُردو ظرافت نگاری : یوسف ناظم ۳۳

اُڑیا نثر میں طنز و مزاح : شیام سندر مشرا / اسماعیل آذر ۹۷

انگریزی کا دیسی مزاح : ڈاکٹر سید حامد حسین ۱۰۴

بنگالی میں مزاح : ہمانیش گوسوامی / ڈاکٹر یوسف کمال ۱۱۰

پنجابی نثری ادب اور طنز و مزاح : ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی / راز سنتوکھ سری ۱۱۶

تلگو مزاح (نثر) : این۔ وی گوپال سوامی / ایس ناگیشور راؤ ۱۲۳

ترجمہ : ڈاکٹر یوسف کمال

تلگو کے نثری ادب میں مزاح : ڈاکٹر کے۔ بھکتا وتسل راؤ ۱۲۷

ٹامل میں طنز و مزاح : عزیز تمنائی ۱۳۰

سندھی نثر میں مزاح کی روایت : کرت بابانی / یوسف ناظم ۱۳۵

کشمیری کے نثری ادب میں طنز و مزاح : بشیر عارف ۱۴۲

کنڑ کا مزاح : حمید الماس ۱۴۶

گجراتی نثر میں طنز و مزاح : ڈاکٹر سکینہ جوشی ۱۵۲

مراٹھی ادب میں طنز و مزاح : اعجاز مدنی ۱۶۳

ملیالم ادب میں طنز و مزاح : پروفیسر آیپا پانیکر / یوسف ناظم ۱۷۲

میتھلی ادب میں طنز و مزاح : ڈاکٹر اعجاز علی ارشد ۱۷۵

ہندی نثر میں طنز نگاری : دیے ویش ٹھاکر / خالد اگاسکر ۱۸۲

طنز کی شوکر کوٹنڈ گولی : رق لال شاہین / صبیحہ فرزانہ ۱۸۹

www.taemeernews.com

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جُدا جُدا

(تخلیقات/ترجم)

ہندی : جھڑتا نیم بڑھتا تھیم : شرد جوشی ۱۹۲
شکایت مجھے بھی ہے : رتی لال شاہین / صبیحہ فرزانہ ۱۹۶
ملیالم : مہاراجہ اور مینڈک : آئیا پانیکر / یوسف ناظم ۱۹۹
مراٹھی : میں ٹیلی فون کرتا ہوں : گنگا دھر گاڈگل / خالد اُگاسکر ۲۰۱
گجراتی : اگر شانتی لال مل جائے : دنود بھٹ / ڈاکٹر سکنیہ جوہری ۲۰۶
بلاعنوان : لگن بہاری لال مہتہ / مناظر عاشق ہرگانوی ۲۱۰
کنڑا : ڈاروِن کا فلسفہ : بیچی / حمید الماس ۲۱۵
کشمیری : بسی بس میں سوار ہونا : ڈاکٹر محمد زماں خاں آزردہ / منصور احمد منصور ۲۱۸
راجستھانی : ضرورت ہے مصنفوں کی : پورن سرما / مناظر عاشق ہرگانوی ۲۲۲
ٹامل : بلیوں کی ہڑتال : کل کی / عزیز تمنائی ۲۲۴
تلگو : بے تکی حرکتیں، حماقتیں : راوی کونڈل راؤ / مسیح انجم ۲۲۸
پنجابی : اعزاز دانشور کا : ڈاکٹر گورنام سنگھ تیر / راز سنتوکھ سری ۲۳۳
بنگالی : آ بیل مجھے مار : نارائن گنگوپادھیائے / مناظر عاشق ہرگانوی ۲۳۶
اڑیا : غیر ضروری مہمان : نتورانند / اسمٰعیل آذر ۲۴۰

اُردو (انتخاب و بقلم خود سوانح)

کہتے ہیں تجھ کو "اہلِ نظر" غائب نہ کیا

سوال نامہ، چند تاثرات اور انٹرویو

خودنوشت

احمد جمال پاشاہ ۲۴۶ — کپور: ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ۲۴۸
برق آشیانوی " ۲۵۳ — اعضائے رئیسہ اور سر ۲۵۳
بھارت چند کھنہ " ۲۵۷ — ضرورت ہے ایک صدر کی ۲۵۹
پرویز یداللہ مہدی " ۲۶۶ — کہانی پر بیٹھنا ۲۶۷
رشید قریشی " ۲۷۳ — آئینہ، بڑھاپا اور کبریٰ بیگم ۲۷۴
شفیقہ فرحت " ۲۷۹ — تعزیت ہماری ۲۸۰
فکر تونسوی " ۲۸۶ — بیویوں کی ٹریڈ یونین ۲۸۸
مجتبیٰ حسین " ۲۹۳ — تقہ ڈاڑھ کے درد کا ۲۹۴
مسیح انجم " ۳۰۰ — دسترخوان کے شیر و شعر ۳۰۵
نریندر لوتھر " ۳۰۹ — حیدرآباد کا تعزیہ ۳۱۲
وجاہت علی سندیلوی " ۳۱۸ — برکت ایک چھینک کی ۳۲۲
یوسف ناظم " ۳۲۸ — باقر مہدی (خاکہ) ۳۲۹

سوال نامہ ۳۳۴
جواب نامہ (تاثرات)
پروفیسر محمد حسن ۳۳۵
پروفیسر گوپی چند نارنگ ۳۳۵
پروفیسر قمر رئیس ۳۳۶
پروفیسر نثار احمد فاروقی ۳۳۸
شمس الرحمٰن فاروقی ۳۳۹
باقر مہدی ۳۴۰
ڈاکٹر وحید اختر ۳۴۵
رشید حسن خاں ۳۵۱
شمیم حنفی ۳۵۳
عتیق حنفی ۳۵۴
ابن فرید ۳۵۵
ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید ۳۵۷
ڈاکٹر مظفر حنفی ۳۵۸
مناظر عاشق ہرگانوی ۳۵۸

بات چیت : کلیم الدین احمد اور ڈاکٹر عبدالمغنی سے — ڈاکٹر اعجاز علی ارشد ۳۶۱
اُردو طنز و مزاح : منتخب کتابیات ؟ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری ۳۶۷

ماہنامہ شگوفہ
سالانہ زرِ خریداری ۳۵ روپے ؛ عرب ممالک سے ۱۲۰ روپے
امریکہ و برطانیہ سے ۱۵۰ روپے

www.taemeernews.com

ہندوستانی مزاح نمبر ـــــ قلمی معاونین

یوسف ناظم مہمان مدیر

ڈاکٹر محمد حسن

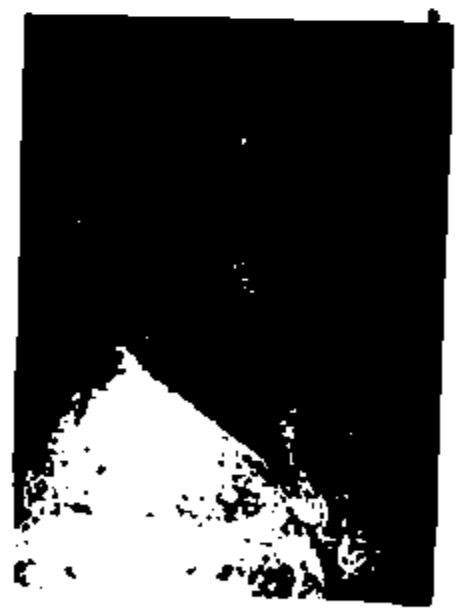

ڈاکٹر ظ۔ انصاری

www.taemeernews.com

فکر تونسوی

بھارت چند کھنہ

مجتبیٰ حسین

نریندر لوتھر

www.taemeernews.com

احمد جمال پاشا

وجاہت علی سندیلوی

رشید قریشی

برق آشیانوی

www.taemeernews.com

پرویز یداللہ مہدی

مسیح انجم

ڈاکٹر حامد حسین

اسمٰعیل آذر

www.taemeernews.com

ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر

رازسنتوکھ سری

فتورامند

آیپا پانیکر

www.taemeernews.com

شیام سندر مشرا

ڈاکٹر مکتا جوھری

ڈاکٹر درویش ٹھاکر

ڈاکٹر بھکتا وتسل راؤ

www.taemeernews.com

حمید الماس

کرت باباني

اعجاز علی ارشد

خالد اگا سکر

www.taemeernews.com

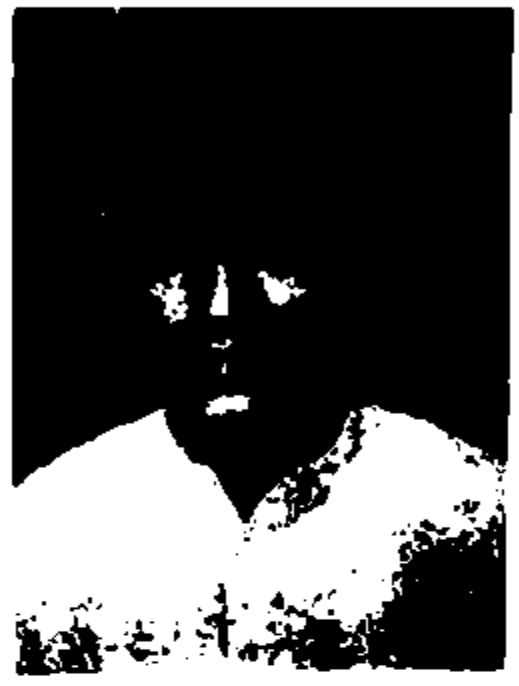

محمد زمان آزردہ

شفیقہ فرحت

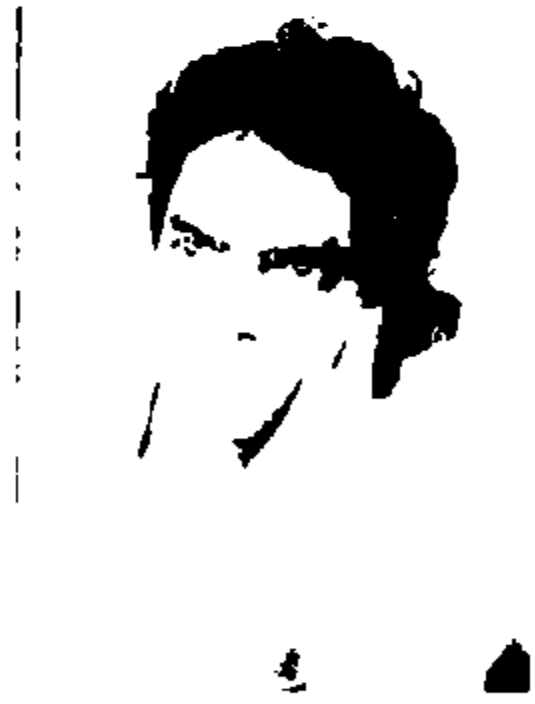

رتی لال شاہین

محمد ضیاء الدین انصاری

www.taemeernews.com

عارضی اداریہ

مہمان مدیر کو اصولاً چند دنوں یا چند مہینوں کا مہمان ہونا چاہیئے لیکن یہ تو اتفاق ہے کہ میں لگاتار پچھلے تین سال سے مہمان مدیر ہوں۔۔ اس خصوصی نمبر کی اشاعت میں (حسب معمول) تاخیر ہوگئی (تھوڑی سی کوشش اور کی جاتی تو مزید تاخیر ہوسکتی تھی) میں نے دیانت داری سے کام کرنا چاہا اور اپنی استعداد اور بساط کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس پرچے کا کینوس بھی مختصر بنایا یعنی خود کو صرف دورِ حاضر کے نثری مزاحیہ ادب کے دائرے میں رکھا لیکن اس محدود حد بندی کے باوجود مضامین حاصل کرنے میں خاصی دشواری ہوئی۔ ہندوستانی زبانوں کے ظریفانہ ادب پر خاطر خواہ کام نہیں ہوا ہے۔ ساہتیہ اکادمی کی طرف سے حال حال میں مختلف زبانوں کی تواریخ ادب شائع ہوئی ہیں اور کہنا چاہیئے کہ ساہتیہ اکادمی نے ایک اہم اور قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے لیکن کسی بھی زبان کی تاریخ ادب میں ظریفانہ ادب سے متعلق کوئی علیٰحدہ باب موجود نہیں ہے۔ سرسری ذکر ضرور ہے۔ ایسے ادیب اور نقاد جو ہندوستان میں بولی جانے والی دو یا تین زبانوں پر عبور رکھتے ہوں، خوش قسمتی سے کافی تعداد میں موجود ہیں لیکن بدقسمتی سے ظرافت اُن کا موضوع نہیں رہا ہے۔ اس لیے کسی بھی ذمہ دار نقاد نے یہ بات پسند نہیں کی کہ اس موضوع پر سرسری قسم کا مضمون لکھ دیا جائے۔ مقالہ نگار حضرات کو کافی چھان بین کرنی پڑی اور اس تاخیر بلکہ تعویق کے باوجود کچھ مقالے وصول نہیں ہو سکے۔ کبھی کبھی میں نے یہ بھی سوچا کہ مدیر "شگوفہ" مصطفیٰ کمال نے مہمان مدیر کے انتخاب میں

www.taemeernews.com

غلطی کی۔ کسی بہتر شخص کا انتخاب ہوتا تو ہندوستان کی سبھی زبانوں کا احاطہ ہو جاتا۔ خیر۔ کسی نے کیا اچھا مصرع کہا ہے ع کارے دنیا کسے تمام نہ کرد۔

جملہ (۱۵) زبانوں کے مزاحیہ ادب کا جائزہ اور (۱۳) کے منتخب مضامین کے تراجم کے ساتھ یہ خصوصی شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ جی لگا کر پڑھیئے۔ کسی بھی رسالے کا مدیر سمینار یا سمپوزیم کا صدر نہیں ہوتا کہ آخر میں تیصراتی کلمات پیش کرے۔ اس لیے تقابلی مطالعہ کی زحمت قارئین ہی کو کرنی ہوگی۔ یوں بھی ہم نے مختلف زبانوں کے نثری مزاحیہ ادب کا کوئی ٹورنمنٹ نہیں منعقد کیا ہے یہ تو صرف خیر سگالی کی ایک تقریب ہے اس تقریب میں کوئی زیادہ قابلِ توجہ نظر آرہا ہے یہ دیکھنے والوں کے اپنے اپنے صوابدید کا معاملہ ہے۔

یوں تو اس شمارے کے سبھی باب آپ کی توجہ کے مستحق ہیں لیکن اردو کے مزاحیہ نثری ادب کے بارے میں جن خیالات کا اظہار ہمارے ناقدین نے کیا ہے وہ اس لحاظ سے آپ کے خصوصی مطالعے کے مستحق ہیں کہ ایک تو یہ رائیں مختلف مکاتیبِ خیال کے اہلِ نظر حضرات نے دی ہیں اور دوسرے یہ کہ یہ متوازی بھی ہیں اور متضاد بھی، متوازن تو خیر ہیں ہی۔ میرا مرتب کیا ہوا سوال نامہ بہت زیادہ برانگیختہ کرنے والا (PROVOKING) سوال نامہ تو نہیں تھا (کسی اسسٹنٹ کا ارادہ تھا بھی نہیں) تاہم کچھ سوالات تھے جنھیں متنازعہ فیہ کہا جاسکتا ہے۔ چند احباب نے اس سوال نامے کا جواب دینے سے احتراز کیا اور کہا یہ کہ ان کا جواب نہ دینا ہی مہمان مدیر کے حق میں بہتر ہے۔ اس باب میں (۱۴) ناقدین کی رائیں اور دو انٹرویو شامل ہیں۔ اعجاز علی ارشد نے کلیم الدین احمد (مرحوم) کے انٹرویو کے لیے بڑی تگ و دو کی۔ اب جب کہ کلیم الدین احمد ہم میں موجود نہیں ہیں اس انٹرویو کی نوعیت ایک تبرک کی ہے۔

مدیر "شگوفہ" مصطفیٰ کمال جو پچھلے (۱۸) سال سے نہایت پابندی کے ساتھ شگوفہ اور شگوفہ کے خاص شمارے، سالنامے اور سووینیر شائع کرنے کے عادی رہے ہیں۔ اس شمارے کی اشاعت کے سلسلے میں چوک گئے اور ان کی اس دیر حاضری میں میرا بڑا حصہ رہا ہے اس لیے اگر انہیں معتوب ٹھیرانا ہی ہے تو مجھے بھی یاد رکھیئے گا۔

رہا "شرکائے محفل" کے شکریہ کی رسم تو کم سے کم اردو کی موجودہ لغات میں تو مجھے وہ الفاظ نہیں ملے جن کا سہارا لے کر میں اپنے کرم فرماؤں کے کرم ہائے بے پایاں کا ذکر کرسکتا۔ اس لیے یہ فرض بھی مستقل مدیر ہی کو ادا کرنا چاہیئے۔

یوسف ناظم
(مہمان مدیر)

www.taemeernews.com

پروفیسر محمد حسن

ہندوستان میں اُردو طنز و مزاح

ہنسنے ہنسانے کا فن شریف ہندوستان میں عموماً اور ہندوستان کے اردو ادب میں خصوصاً مائل بہ زوال ہے۔ جو ہنسے وہ بہت صاحب بصیرت ہوگا نہ نرا احمق اور ہمارے آپ سے دور کا انسان دونوں سے دامن بچاتا ہے جو باتیں ہنسنے ہنسانے کی ہیں وہ اب ماتم کا سبب اور گریہ وزاری کا باعث بن گئی ہیں یا بنتی جاتی ہیں۔ مزاح نگار کو ہر قدم پر جوکر بن جانے کا خطرہ لاحق ہے ایک ایسے معاشرے میں جو لاسمتی کا شکار ہو یہ کچھ بے جا بھی نہیں۔ آدمی ہنسنے والا جانور ہے مگر ہنستا صرف اسی وقت ہے جب معمولات کا کوئی تصور رکھتا ہو قدم جب معمولات سے ہٹا ہوا دیکھتا ہے تو مسکراہٹ اور اس کے بعد قہقہہ پیدا ہوتا ہے جب جادۂ اعتدال سے گریز زیادہ ہو تو طنز کی کٹیلی ہنسی اُبھرتی ہے گویا معاشرہ اپنے گنہ گاروں کو استہزا کی سزا دیتا ہے یہ معمولات اقدار کی محتاج ہیں اور اقدار، تمدن کی کسی قدر گوارا سطح کی طلب گار ہوتی ہیں۔

ہندوستان میں ۱۹۴۷ء سے اب تک اردو کے ساتھ جو کچھ گزری ہے اس کے بعد اردو ادب میں طنز و مزاح کا برقرار رہ جانا تو معجزہ ہوتا۔ رشید احمد صدیقی اپنے آخری دور میں مزاح نگار سے زیادہ سماجی مصلح ہو گئے تھے کسی نے شکایت کی تو انھوں نے جواب میں اشاری کہا "جب تاش کی بازی میں سبھی بادشاہ، بیگم، غلام کٹ جائیں تو پھر جوکر ہی کو کھیل کھیلنا ہوتا ہے" بات پتے کی ہے اور اس میں ہندوستان کے اردو ادب سے طنز و مزاح کے غائب ہو جانے کی بنیادی وجہ مضمر ہے۔

پاکستان میں اردو طنز و مزاح پر شباب آیا ہوا ہے۔ اعلیٰ ترین مزاح نگاروں کا جھرمٹ ہے جو مدتوں جگمگاتا رہے گا اور کیسے کیسے مزاح نگار — مشتاق احمد یوسفی۔ ابن انشا، کرنل محمد خان، شفیق الرحمٰن، ضمیر جعفری۔ فالدا اختر۔ ان میں سے ہر نام اعلیٰ ادب کی ضمانت ہے کچھ اس میں شائبہ خوبیٔ تقدیر بھی ہے مارشل لا کے فیوض و برکات کو بھی اس میں دخل ہے جو کسک کو درد اور چوٹ کو ضرب شدید بنا کر جراحتوں کے چمن کھلا دیتا ہے مگر ان مزاح نگاروں کے ہاں فکر کی جو سطح، اسلوب کا جو رچاؤ اور فن کی جو آسودگی ہے وہ کلاسیکی جہات کی ہے اور ان پر عظمت کی پرچھائیاں صاف دکھائی دیتی ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی ان میں بھی سب سے ممتاز ہیں اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو نثر نے اپنا برنارڈ شا اور عہد جدید نے اپنا غالب پالیا ہے۔

یہ مانا کہ یہ افتخار ہمارے لیے کم نہیں کہ اردو میں طنز و مزاح کا گلزار کھلا ہوا ہے ہمارے دل سے ذرا دور ہی سہی، مگر اس کو کیا کیجیے کہ خود ہندوستان میں اردو طنز و مزاح کی روایت تیزی سے زوال پذیر ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کی رہ پٹنہ تک جا پہنچی ہے مگر طنز و مزاح کو فروغ نہیں ہوا خود حیدرآباد میں بھی زندہ دلوں کے مجمعے خاصے ویران سے لگنے لگے۔ شگوفہ حیدرآباد کا سب سے جاندار حلقہ کرنل محمد خاں کے اقتباسات سے حیات ہونے لگا کہ اگلے کے اجالے کی حیثیت رکھتے تھے۔

ایسا نہیں کہ اپنی خاکستر چنگاریوں سے خالی ہو۔ اپنی کتاب "طنزیات و مضحکات" کا اختتام رشید احمد صدیقی نے

www.taemeernews.com

حلیم بیگ چغتائی، فرحت اللہ بیگ، در شوکت تھانوی پر کیا ان میں خود رشید صاحب کا نام بھی شامل کیجئے کہ شاید ان سب سے بڑا نام ہے پھر ابوالکلام آزاد کی نکاہیہ تحریریں جو غبار خاطر میں جھلک اٹھیں خاصے کی چیز ہیں اور اعلیٰ ادب کی نشانی ہیں ۱۹۴۷ء کے بعد بھی صورت حال خراب نہیں ہوئی۔ کنہیالال کپور، فرقت کاکوروی، سلمیٰ صدیقی، دلاور فگار، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، فکر تونسوی، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کی نکاہیہ تحریریں سامنے آتی رہیں اور یہ خیال قائم رہا کہ طنز و مزاح کی دنیا میں سب خیریت ہے۔ ذرا دور دوں میں احمد جمال پاشا تھے لطایف و ظرایف کا گلزار کھلا رہتا تھا شاعروں میں راجہ مہدی علی خاں تھے جن کی ہر نظم گویا قہقہوں کا طوفان ہمرکاب لاتی تھی اور بھی بہت سے نام تھے بھارت چندکھنہ، نریندر لوتھر اور خواجہ عبدالغفور۔

مگر دیکھتے دیکھتے یہ سارا مجمع جیسے بکھر گیا۔ ۱۹۸۳ء میں جو صورت حال ہے وہ خاصی دل شکن ہے ایسا لگتا ہے کہ اردو میں تعقیل کا قحط پڑ گیا ہے دل مرجھا گئے ہیں موضوعات محدود ہو گئے ہیں ہنسی کھوکھلی اور مصنوعی ہو کر رہ گئی ہے اور آزمودہ کار اور تجربے والے مزاح نگار بھی گویا تھکن کا شکار ہوئے جا رہے ہیں یہ صحیح ہے کہ ابھی تک پرانے مزاح نگاروں کی صف میں فکر تونسوی، دلاور فگار، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، خواجہ عبدالغفور، بھارت چندکھنہ، نریندر لوتھر اپنی آبرو بنائے ہوئے ہیں مگر ان میں سے بھی اکثر خود کو دہرا رہے ہیں۔ مجتبیٰ حسین نے سفرناموں کی راہ نکالی ہے یوسف ناظم نے خاکے لکھنے شروع کئے ہیں اور خواجہ عبدالغفور اب مزاح نگار سے زیادہ عالمی مزاح کے تنقید نگار یا مورخ ہو چلے ہیں اور اس نئے منصب کو بڑی کامیابی سے نباہ رہے ہیں ان کے بعد والی نسل میں جو چند نام ابھرے تھے وہ سب تتر بتر ہو گئے ارشد علی خاں حیدرآباد سے ابھرے جدیدیت کی ادبی تحریک پر ان کے طنزیہ مضامین میں تازگی اور شگفتگی نظر آئی ہے مگر پھر وہ ایک دم غروب ہو گئے۔

دہلی میں م۔ احمد رسالوں سے بے نیاز اپنے مختصر لطایف کا صحیفہ شایع کرتے رہتے ہیں ان لطیفوں کی کاٹ بڑے سوکے کی ہوتی ہے اور سماجی معاملات کے مختلف پہلوؤں پر ان کا طنز بے پناہ مگر 'تین دیوانے' سے لے کر ان کے تازہ کتابچے 'آدمی کی پول کھل گئی' تک ان کے ہاں یکسانیت نظر آنے لگتی ہے 'تین دیوانے' میں انہوں نے تین کردار ایجاد کئے۔ ایک مسلمان، ایک ہندو اور ایک سکھ۔ تینوں قوم پرست اور سیکولر ہیں ملک و ملت کی فلاح عزیز رکھتے ہیں اور اپنے ملک کو دنیا میں ترقی کرتے دیکھنا چاہتے ہیں مگر جب اپنی قوم کے کرتوت دیکھتے ہیں تو تیز ابی ردعمل سے بھی نہیں ہچکچاتے اردو زبان کے بارے میں جو بے انصافی ہوئی اس پر م۔ احمد کا ایک جملہ والا تبصرہ بلاغت کی معراج ہے "قوم نے ہندیان میں اپنی زبان کاٹ لی" اسی لیے جب ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ کے موقع پر پاکستانی جاسوس کے نام پر ہر داڑھی والے مرد اور ہر برقعے والی عورت کی پکڑ دھکڑ ہونے لگی تو م۔ احمد نے ایک حکیم جی کا کردار ایجاد کیا جو اپنے کسی ہندو مریض کی خیریت نہ ملنے پر بے چین ہو کر اپنے دلی سے دہلی چلے آتے ہیں اور چاندنی چوک میں فرقہ پرستوں کے ہاتھوں پاکستانی جاسوس سمجھ کر گھیر لیے جاتے ہیں۔ مجمع انھیں گھیرے کھڑا ہے کوئی اول فول بک رہا ہے کوئی گالی گفتاری اور حکیم صاحب ان سب کے چہروں سے ان کے امراض کی تشخیص کرنے میں مصروف ہیں۔

شفیقہ فرحت نے بھوپال سے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شایع کیا ان میں خوش دلی کی لہر اور مجلسی ترنگ کا جذبہ تو ہے مگر بس اس سے آگے قدم بڑھانے کی انھوں نے ہمت نہیں کی ہے۔ مگر ایک خاتون کی نظر سے انہوں نے زندگی کو مصروفیات اور انسانی تعلقات کی نرخ ناک اور مضحکہ انگیز بھول بھلیوں کی شکل میں دیکھا اور برتا ہے:

آگے بڑھنے سے پہلے آیئے ایک جھلک طنز و مزاح کے موضوعات پر بھی ڈال لی جائے، یہ موضوعات زیادہ تر متوسط طبقے کے گھر اور دفتر سے متعلق ہیں۔ مرد اور عورت کے تعلقات زن و شو کی بک بک جھک جھک، دوستوں کی بوالعجبیاں، مشاغل کی ستم ظریفی ۔۔۔ یہی سب کچھ ہمارے طنز و مزاح کے موضوعات ہیں: مجھے ایسا لگتا ہے کہ کم سے کم آج کا مزاح نگار تن آسانی کی بنا پر صرف اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھنا پسند کرتا ہے اس سے ہٹ کر ذرا بھی ادھر اُدھر نظر ڈالنے کو غیر ضروری زحمت قرار دیتا ہے اور پھر اگر کسی قدر دور سا فتادہ موضوعات پر محنت اور ریاضت کر کے معلومات حاصل کرنا اور فکر و نظر کا سامان فراہم کرنا تو بالکل ہی بیکار سی بات

www.taemeernews.com

سمجھتا ہے اس کی اپنی معلومات کی جو دسترس ہے وہ ان کو بھی یہاں سمیٹ اور سمیٹ کر محض چند چلتے ہوئے فقروں کی روشنی تک محدود کر لیتا ہے پھر اس تساہل سے کوئی نکلا اور کسی تازہ تجربے سے دوچار ہوا تو ابن انشا، مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خاں کے دیو قامت سائے اسے اچک لیتے ہیں اور بجارا کا اپنا اسلوب مارا جاتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے سفرنامۂ جاپان کا یہی حال ہوا۔ یوسف ناظم نے ادیبوں کے دستخطوں کو موضوع بنایا اور پھر پانچ بجارے ہیں اور دو شاعری کے پانچ مشہور آفاق کرداروں کو اپنایا اور دونوں ہی میں کامیابی حاصل کی مگر جزوی۔

جن مزاح نگاروں نے حال میں اپنے مزاحیہ مضامین کے مجموعے شائع کئے ان میں رشید قریشی، مسیح انجم، پروفیسر اسد اللہ مہدی، ڈاکٹر حبیب ضیاء، رحمن اکولوی، رؤف خوشتر شامل ہیں مزاح کی ایک اور شکل انشائیوں کے ذریعے سامنے آئی جن کو بعض نقادوں نے مزاح کو انشائیہ کی پہچان قرار دیا۔ ڈاکٹر محمد حسنین۔ ڈاکٹر کمال الدین کے انشائیوں کے مجموعے بہار سے شائع ہوئے ہیں وجاہت علی سندیلوی کا قفس تماشائی، ان دونوں کے درمیان ہے رقص تماشائی میں افسانہ، انشائیہ اور مزاحیہ تینوں کا سنگم ہے اور اس امتزاج سے انھوں نے سنجیدہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی ہے وجاہت علی سندیلوی خواہ مخواہ ہنسانے کی کوشش نہیں کرتے البتہ مضحکہ پیدا کرنے والے سوالیہ نشان لگاتے گزر جاتے ہیں۔

مزاح کی دو اور اقسام روزناموں کے مزاحیہ کالموں اور مشاعروں کے مزاحیہ کلام کے ذریعہ سامنے آئی ہیں مگر توسنوی کے پیاز کے چھلکے بہت مشہور ہوئے اور ان چھلکوں کی زد میں انھوں نے حالات حاضرہ کے مختلف کوائف کو لپیٹ لیا اس سے ان کے ہاں تنوع تو بڑھ گیا مگر آورد کا عنصر بھی بڑھ گیا۔ سہالوی کا مزاحیہ کالم قومی آواز میں برابر شائع ہوتا ہے مگر ان کے مزاح میں انحطاط بہت واضح ہے مرزا کا کردار جو اب سارے طنز و مزاح میں دبا کی طرح عام ہو گیا ہے پطرس کے مضمون "مرحوم کی یاد میں" سے شروع ہوا تھا اور مشتاق یوسفی سے ہوتا ہوا مجتبیٰ اور سہالوی تک پہنچا ہے مگر بقول غالب: "اب میں دم کیا ہے" تخلص بھوپالی کا کالم ان کی وفات کے بعد کوئی دوسرا ممتاز مزاح نگار نہ لکھ سکا۔

مشاعروں کے مزاحیہ کلام میں وآہی کے واقعاتی مزاح کے بعد ظل سیوہاری، آفتاب لکھنوی، ساغر خیامی وغیرہ کے نام نمایاں ہوئے ہیں مگر وقتی مقبولیت کے باوجود ان کی شاعری میں دلاور فگار تک کی سطح بھی پیدا نہیں ہو سکی۔

الغرض میرے نزدیک تو ہندوستان کے طنز و مزاح پر ان دنوں بڑا برا وقت پڑا ہے لوگ ہنسنا بھولتے جا رہے ہیں اور معاشرہ دن رات ایسی دلدل کی طرف بڑھتا جاتا ہے جہاں اقدار کے ستون یا تو پارہ پارہ ہو چکے ہیں یا سرے سے موجود ہی نہیں ہیں ایسے میں کشادہ دلی کی جگہ نفسا نفسی، خوش دلی کی جگہ خود غرضی اور ہنسنے کی جگہ کھسیانے لے لیتی ہے شاید اس تہقہے کے زوال کی ایک وجہ یہ بھی ہو: لیکن اسباب قیاس کرتے رہنے سے تسلی کی صورت پیدا نہیں ہوتی خاص طور پر اردو ادب میں جو غالب کے خطوط اور رشید احمد صدیقی کی تیکھی تحریروں سے مالا مال ہے اس قسم کی تہی دامنی کا ظہور المیہ سے کم نہیں: بلکہ پڑوس میں تہقہوں کے چمن کھلے ہوئے ہیں ہم داغ دل کے شمار میں مصروف ہیں پتہ نہیں داغ دل لبوں پر ہنسی بن کر کب جگمگائے گا؟! □□

اس دور میں سب مٹ جائیں گے، ہاں، باقی وہ رہ جائے گا
جو قائم اپنی راہ پہ ہے اور یکتا اپنی ہٹ کا ہے
اے شیخ و برہمن، سنتے ہو، کیا اہل بصیرت کہتے ہیں
گردوں نے کتنی بلندی سے ان قوموں کو دے پٹکا ہے

اقبال

یا باہم پیار کے جلسے تھے، دستور محبت قائم تھا
یا بحث میں اردو ہندی ہے، یا قربانی یا جھٹکا ہے

www.taemeernews.com

ظ۔ انصاری

اُردو طنز نگاری اور ظرافت کے پندرہ بیس سال

جنھیں سمجھ لی ہے، وہ یہ بھی ضرور سمجھتے ہوں گے کہ طنز اور مزاح کے تخم الگ الگ کسی طرح کی مٹی میں نہیں پنپتے ہیں۔ اگرچہ ایک ہی کھیت میں دونوں کی بوائی نکائی دیکھی گئی ہے، مگر ایک کی فصل ربیع میں اور دوسرے کی خریف میں بگنتے ہیں۔ موسم کے ساتھ ان کی فصل پیداوار میں بھی فرق پڑتا ہے، اتنا فرق پڑتا ہے بعض اوقات کہ تخم کی تاثیر بدل جاتی ہے۔ بویا مزاح، نکلا طنز (مثلاً کرنل محمد خاں کی تحریر، جس کا حوالہ آگے آئے گا) یا بویا طنز نکلے ایٹم کے ڈونڈے اگر گھر د۔۔۔ مثلاً مرحوم عبدالماجد دریابادی کی طنزیہ حاشیہ آرائی، وہ تبصرے جو موصوف مولانا تہذیب حاضر کے ہر ایک مظہر پر "سچی باتیں" کے عنوان سے مستقلاً تحریر فرمایا کرتے تھے۔

مطلب کہنے کا یہ کہ پہلے کھیت کی مٹی جانچ لو، سونگھ لو؛ اس میں طبع رواں کی نمی خوب گہری ہے یا نہیں؛ ذی رُوح کی ٹہنی کا فاسفورس بڑھا ہوا ہے یا نہیں ـــــ اگر نہیں تو طنز کا تخم نہیں اُگنے والا۔

عام تندرستی کے لیے، چاہے وہ آدمی کی ہو، یا ادب کی، پھیپھڑوں کی، توانائی اور اس کا اظہار بھی لازم ہے؛ یہ اظہار ہلکے پھلکے، خوش باشی کے، چھیڑ خانی کے، پھبتی کے جملوں سے بھی ہو جاتا ہے؛ ہوتا ہی رہتا ہے۔ اخباروں، رسالوں کے فکاہیہ کالم اسی مد میں آتے ہیں۔ قومی، نسلی، علاقائی لطیفے بھی یہی کام کرتے ہیں۔ مثلاً شمالی ہندوستان میں "سردار جی" کے تعلق سے، یورپ میں "یہودیوں" کے، انگلستان میں آئرش، اور اسکاچ لوگوں، فرانس میں روسیوں کے تعلق سے بظاہر بے ضرر لطیفے درآمد برآمد ہوتے رہتے ہیں۔

مذاق مذاق میں کوئی ایک ٹائپ۔ ایک رنگ، ایک چلن یا نپے تلے برتاؤ اور عقیدوں کا آدمی پورے سسٹم یا سماج کا یا اس کے کسی گوشے کا نمائندہ بن کر اُبھرتا ہے تو وہ مزاحیہ کردار، وہ معجونِ مرکب، طنز کا ٹھپہ بن جاتا ہے، عقیدوں اور قدروں کے اس پورے مجموعے (SUM TOTAL OF VALUES) کے لیے۔ بڑی تبدیلیوں کے زمانے میں ادبی تصانیف ـــ اور اسٹیج ڈراموں کے راستے ایسے ٹھپے ہمیشہ عام ہوئے ہیں اور ذہنی ارتقا کے سفر میں کام آئے ہیں۔ ہماری زبان میں اس کی مثال سرشار کا خوجی، نذیر احمد کا ظاہر دار بیگ، امتیاز علی کے چچا چھکن اور شرکت تھانوی کے قاضی جی سے ملتی ہے۔ یہ وہ عمل ہے کہ

www.taemeernews.com

شوخ مزاحیہ تحریر، مصنف کی نیت اور صلاحیت سے مل بھگت کر کے گہری اُتر جاتی ہے اور طنزیہ تراش خراش کے ساتھ کسی کسی مقصد کی ترجمانی کا حق ادا کرتی ہے۔ پھولوں کی چھڑی کا نشتر بن جانا بھی ہے، مثلاً ظریف لکھنوی کے شعر اور رشید احمد صدیقی کے مضامین۔ اور اس کے برعکس بھی ہوتا ہے کہ امتیازات اور ترجیحات کے خانے ذہن میں تو بنے ہوئے ہیں، نیت بھی ہے کسی پہلو کو اُبھارنے یا گرانے کی، لیکن پھولوں کی چھڑی رکھی تو پھلجھڑی اُٹھالی۔ زبان پر جتنی قدرت ہے، اس سے زیادہ طبیعت میں چُہل ہے، اور جتنی چُہل ہے اُس سے زیادہ خود کو بے طرف رکھنے کی تمنا۔ اس کی مثالیں بہت ملیں گی، خود ہماری آنکھوں دیکھے لوگوں میں راجہ مہدی علی خاں اور یوسف ناظم کے نام زبان پر آتے ہیں کہ حملہ بھی کرنا چاہیں تو چھیڑ خانی سے آگے نہیں جاتے۔

پس، لازم نہیں کہ مزاح نگاری اور طنز نگاری ایک تخلیقکار میں یا کسی قلم کاری کے پھل میں جمع ہو جائے۔ مزاح محض ظرافت بھی ہوتا ہے۔ بڑے بڑوں نے مُنھ کا مزہ بدلنے کے لیے ظریفانہ نظم و نثر کے ٹکڑے پارچے چھوڑے ہیں۔ جن سے بگڑ بیٹھے اُن کی ہجویں لکھی ہیں؛ جن سے بے تکلفی رہی اُن پر پھبتیاں کسی ہیں اور یوں ظرافت اور خوشباشی کے انار چھوٹتے رہے ہیں (مانسون کے آجکل یہ ادبی آتشبازی ہمارے ہاں سیل پڑی ہے!)

ہاں، مزاح نگاری یا ظرافت ایک پردہ بھی ہوتا ہے؛ گہرے، شدید تاثر کو جھوجھل اور جھلاہٹ کر، کراہ کو تیکھے ترچھے تیروں سے بچاکر، گوارا بناکر آپوں اور پرایوں تک پہنچانے کی خاطر۔ جتنی اس تاثر کی شدت ہوگی اتنا ہی گہرا وار پڑے گا، پھر مزاح یا ظرافت کے باریک ریشمی پردے سے طنز کا نشتر نکل آئے گا۔ اکبر الہ آبادی کی شاعری اور کرشن چندر کی نیم افسانوی تحریروں کا (مثلاً گدھے کی سرگذشت یا "خر گزشت" کا) جوہر یہی ہے کہ بظاہر جتنی شوخ ہیں، ان کا طنز اتنا ہی نشتری ہے۔ راجندر سنگھ بیدی، اپنے کرداروں کی پیکر تراشی میں طنز اتنا تہ در تہ رکھتے ہیں کہ ان کی شوخی پُر لطف ہونے کے باوجود تہ نشین ہو جاتی ہے۔ نشتر کو موٹے غلاف میں رکھو تو دھار کو صدمہ پہنچے۔

(۲) غور طلب ہے ہماری زبان کی یہ صفت کہ اُس کا ادب کتنا کم عمر، اور اس میں بھی بہت سا وقت رونے بسورنے میں نکل گیا (غزل ہو یا مثنوی، مرثیہ ہو یا داستان، زیادہ تر اَلمیہ ہے) ..... تاہم جس مزاح نہایت نازک، جملوں کی کاٹ بے حد تیز، دھار شفاف، نوک پلک لطیف اور ہلکے سے اشارے میں بات کی سطح بلند و پست کر دینے کی صلاحیت غیر معمولی۔ چہرے کی شگفتگی اور آستین کی چُنٹ سنبھالے ہوئے، چٹکیاں بھرنے کی ادا اسے آتی ہے اور یہ صفت اتفاقی یا بے سبب نہیں؛ اس میں تین تین تہذیبی دھاروں (ہند آریائی، عرب، ترک) کا اپنی تلمیحوں، تاریخوں اور ترکیبوں میں سے رستے رہنا، ان کے آداب اور عادات کا رس ٹپکتے رہنا، انتہائی انتشار کی طول طویل مدت سے گذر کر پوری ایک صدی غیر ملکی زبان کی صحبت میں کاٹ لینا اس غیر معمولی صلاحیت کا بنیادی سبب ہے۔ شاعری ہی کر لیجئے، اُردو ادب کا ہادی حصّہ ہے، شاعر خطابیہ ہو یا حماسیہ، رومانی ہو یا انقلابی، غنائیہ ہو یا رثائی، بیانیہ ہو یا فکری، ہماری دانست میں تو ایک بھی قابلِ ذکر شاعر اُردو کا ایسا نہیں، جس کے ہاں شکر خندے سے زیادہ زہر خند نہ پایا جاتا ہو۔ بعضے تو زہر خند کے وقت ہی نیاز چکتے ہیں۔ مثلاً ساحر لدھیانوی اور کیفی اعظمی؛ اس ضمن میں یہ نام یوں آئے کہ طنز یہ اور مزاحیہ ادب کے ذکر میں ان کی طرف دھیان تک نہیں جاتا۔ حالانکہ اُن کی شاعری کا غنائی حصّہ بھی اس صفت میں ممتاز ہے۔

ہر ترقی یافتہ زبان میں ہوتا ہے اور ہماری ترقی پذیر زبان کو یوں کہ باہر کی بکھری ستھری تہذیبوں اور ادبوں کا ورثہ بھی چھن چھنا کر ملتا رہا، پھر علاقائی مزاجوں اور مزاحوں کی آمیزش، برائے نام سہی، مگر چلتی رہی، تو اس زبان میں شاعری کی چھان پھٹک کے اثر سے الگ الگ آوازوں کے، لہجوں کے پیشکش بھی برابر بنتے رہے۔ مردانہ کھڑی آوازیں، نسوانی دھیمی دلنواز آوازیں، یہ تو خیر رزم اور بزم کی آماجوں کا، لہجوں کا، انتخاب الفاظ کا کھلا فرق! اس کے علاوہ کلاسیکی اور فکری کیفیت کے منظم سے، مدھم سُروں کے سانچے، ایک دو لفظوں کے جوڑ کو

www.taemeernews.com

ادھر سے اُدھر کیا اور زبان کا ذائقہ بدلا۔ شفیق الرحمٰن اور عمیر جعفری کے اس عمل سے ہ پیروڈی ورنہ پھبتی کا انداز ہے، مزاح کا زیرلب تبسم کا لطف لیتے رہے ہیں اور سید محمد جعفری اس سے طنز کا، افراد، اداروں اور زندگی کے اوچھے کھابڑ نقشوں (مظاہر) پر نوکیلے طنز کا عمل جو ہمیں سید محمد جعفری کی شاعری میں نظر آتا ہے، اس کا رشتہ براہ راست اکبر اور اقبال کے طنزیہ کلام سے جا ملتا ہے؛ فرق یہ کہ وہ بزرگوار تہذیب مغرب کے جارحانہ اقدام سے برگشتگی یا برہمی کا اظہار کرتے تھے، اُن کے ہاں یہ دلشکن تھا مزاحیہ کھٹک اور طنزیہ کھنکار کے ساتھ؛ وہی رنگ ذرا ہلکا اور نسبتہً پھیکا فرقت کاکوروی کی طنزیہ تحریروں میں ملتا ہے۔ سید محمد جعفری شاعری میں اس سلسلے کی اہم کڑی ہیں جو قومی تحریک آزادی بلکہ صاف کہیے تو کانگرس کے دو ٹوک حامی منشی سجاد حسین (آف اودھ پنچ) اور بمبوق کی نثر میں اور ظریف لکھنوی کی شاعری میں پہلے سے چلا آتا تھا۔

محض اتفاق نہیں ہے (دوسرے بہت سے ادبی مظاہر کی طرح یہاں بھی سیاسی سماجی اسباب اور تاریخی جواز آسانی سے تلاش کیے جا سکتے ہیں) کہ بیسویں صدی کی دوسری تیسری دہائی ہماری زبان میں مزاح کے بجائے طنز کی فصل کو زیادہ فراواں پاتی ہے۔ اخباری ذوق اور سیاسی شوق کے اوّلین اُبال کے ساتھ، معاشی تنگی اور خوش باشی کے کشمکش میں ہر پہلو سے کڑوے، کسیلے طنز کا زبان و قلم تک آنا اور قبولِ عام پانا قدرتی بات تھی۔ پھر سیاسی نظریوں، پارٹیوں، گروہوں اور طبقوں کی صف بندی کا ماحول، عظیم بیگ چغتائی ایک ڈرامائی صورتحال پیدا کر کے اس کے مضحکہ خیز پہلوؤں پر ٹھٹھا مارنے والے فنکار تھے۔ فرحت اللہ بیگ نے ایکشن کو بہ نسبت ری ایکشن سے سروکار رکھا۔ دلّی کی ٹھیٹھ بولی کے ادبی امکانات کو وہ اپنے بیان سے روشن کرتے اور اسی میں شگفتہ چھیڑ چھاڑ کی چاشنی بلا دیتے ہیں۔

تقریباً انہی دو دہائیوں میں "تین بیگ" اُردو کے دیوان خانے میں کھلے ہیں؛ دو نثر میں، ایک شاعری میں۔ (تیسرے کا نام عظمت اللہ بیگ) تینوں میں قوتِ ایجاد کی کارفرمائی نظر آتی ہے ــــ مگر الگ الگ سطحوں پر۔ فرحت اللہ بیگ کو ہم نہ پوری طرح مزاح کے خانے میں ڈال سکتے ہیں، نہ طنز کے سپرد کر سکتے ہیں۔ طبیعت کی شگفتگی اور نظر کی اُداسی نے ان کے ہاں دھوپ چھاؤں کا منظر رکھا ہے۔ ماضی اور اس کی تدریں عزیز ہیں، سُہانی ہیں مگر آنی جانی ہیں، وہ نہ بجھتے ہیں نہ کراہتے ہیں۔ بیان کرتے اور مسکراتے جاتے ہیں۔ عظیم بیگ کے بے محابا اور متعدی قہقہے کے سامنے فرحت اللہ بیگ ایک شگفتہ مگر دردمند مسکراہٹ لیے ٹہل رہے ہیں۔ انھوں نے شور تو بہت نہیں مچایا، اپنا رنگ البتہ خوب پھیلایا اور بعد کی پیڑھی جیسے کئی نکاہیہ کالم نگار اور طنزیہ انشائیے لکھنے والے ان کے رنگ سے فیضیاب ہوئے ہیں۔

روزناموں اور ہفتہ واروں کی چہل پہل بڑھی اور اُردو صحافت کا مرکز لاہور کی طرف سرکا تو اہلِ پنجاب کی کھاڑی زندہ دلی کا تیز رنگ بھی اس پر چڑھا۔ لکھنؤ کی تیکھے ناک نقشے والی نفاست پسند ضلع جگت اور پھبتی، شرمیلی سی نشتر زنی جو سودا و انشا سے سرشار اور ہندی افادی تک، بلکہ شبلی اور ولایت علی بمبوق تک چھنتی ہوئی پہنچی تھی، وہ دہلوی اسکول کے حسنِ نظامی اور نذیر مورتی تک تو چلی گئی، گوارا اور پُرلطف رہی، لیکن پنجاب کے مزاح نگاروں نے مزاح میں گڑ گھولا، طنز میں تشبیہ مرچ کا آچار جھونکا تو ذائقے ہی بدلنے لگے۔ یہ ظفر علی خاں اور سیلا رام وفا، بہاشہ کرشن، شورش کاشمیری اور چراغ حسن حسرت کی طنز نگاری کا دور ہے جو لمبی دہائیوں پر چھایا رہا۔ بہتیرے نو وارد اسی رو میں بہہ گئے۔

ظفر علی خاں اور ان کے حلقۂ معاصرین و تلامذہ اُردو کے طنزیہ ادب میں صحافت کے پُرجوش دخل کی ہی نمایندگی نہیں کرتے بلکہ ادب آداب کے پابند دیوان خانوں کی دل لگی کو عوامی، فطری اور پُرشور ملاقاتی شادابی عطا کرتے ہیں۔ صحافت اور ادب کی سرحد پر نوکیلے جوتے کو محفل میں لپیٹ کر نہیں، لٹھ میں ٹانگ کر، نچا کر حریف پر پھینکنا سکھاتے ہیں۔ جب ہم اس سلسلے کی اگلی نسل کو ستین اور لیے دیے، کم آواز پستول سے جانماری کرتے دیکھتے ہیں تو یہی صحافت کے میدانِ کارزار سے سوندھی مہک، حالاکہ تمغہ پہنچتا ہے چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، وقار انبالوی، امتیاز علی تاج اور کنہیا لال کپور کی تحریروں کے لُب و لہجہ میں۔

www.taemeernews.com

جس طرح ظفر علی خاں ایک دَور، ایک حلقے، ایک خاص فضا کے بے مثال اور قدآور نمائندے تھے؛ اسی طرح رشید احمد صدیقی اور احمد شاہ بخاری (پطرس) دو معمار ہیں کہ ایک کا رُخ مشرق کی طرف، دوسرے کا مغرب کی جانب۔ ہم نشین کے چٹکی بھرتے وقت دونوں کے چہرے کے اعصاب پُرسکون رہتے ہیں، خود مسکراتے تک نہیں، کسمساتے تک نہیں۔

پطرس اُردو کے ظریفانہ ادب میں واحد شخصیت ہیں جنھوں نے ٹائپ کیرکٹروں اور تصویروں پر طنز کی نیت سے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین لکھے اور انگریزی ادب کی مہذب شوخی کو اُردو سے روشناس کیا۔ وہ مغرب کی طرف سے اُٹھے ہوئے ابر کا ایک ٹکڑا تھے کہ برستے گزر گئے۔ بُوندیں سب کو ملیں، پانی کسی کو نہیں۔ اتنے بڑے عالم اور مردِ دانا مرف چند شوخ مضامین پر قناعت کر کے اتنا بڑا نام کمانے والے وہ تنہا اہلِ قلم ہیں۔ ان کی شخصیت بڑی نہ ہوتی تو اپنے تھوڑے سے کام پر اتنا بڑا نام نہ پاتے۔ (اس صفت میں ان کے معاصر عبدالرحمٰن بجنوری کی دوسری ایسی ہی مثال ہے) اور کچھ کم حیرت انگیز نہیں یہ حقیقت کہ پطرس کی مزاح نگاری کا آغاز ہی انجام ثابت ہونے کے باوجود ایک ایسی پگڈنڈی کے نشان چھوڑ گیا، جس پر پہلے شفیق الرحمٰن نے، پھر مشتاق احمد یوسفی نے قدم بڑھایا۔ ایک نے مزاحیہ شگوفے چھوڑنے کے لیے، دوسرے نے تیکھے ترچھے کٹیلے طنز پر مزاح کا پردہ تاننے کے لیے۔

بھلا ہوا کہ تقسیم ہند کے ہولناک زلزلے کے دوران اور اس کے فوراً بعد کے دس بارہ سال اُتھل پتھل کی ہولناکی میں ہمارے ادب کے پاس اسٹک شوئی کی خاطر تھوڑا بہت اثاثہ موجود تھا۔ شوکت تھانوی پہلے سے لکھ رہے تھے۔ ریڈیو اور اخبار کے ذریعے نئی سیاسی سرحدوں کے آر پار اور بھی پھلے پھولے، ابراہیم جلیس شروع سے ہی ہوئے تھے، کنہیالال کپور کی شوخی، پیلے بھدے ایندھن کا سا دھواں دیتی رہی۔ کرشن چندر نے آہ اور کراہ کی آگ میں تپا کر اپنے افسانوں کے طنزیہ ٹکڑے اور طنزیہ مضامین کے افسانوی کردار اتنی تعداد اور تسلسل میں دیے کہ اگر اُن کا سکہ پہلے کی طرح آگے بھی چلتا رہتا تو اُردو مختصر افسانے کا مفہوم ہی ہو جاتا نیم افسانوی طنزیہ انشائیے، ماضی قریب میں اُردو کے طنزیہ ادب کو کرشن چندر سے زیادہ کسی نے متاثر نہیں کیا، حالاں کہ وہ اعلیٰ پائے کے افسانہ نگار شمار ہوتے ہیں۔

تقسیم ہند کے لہولہان منظر میں افسانے کو اگر کسی نے ہولناک قاتل طنز کی بھٹی میں بھجایا اور زہر مہرہ بنایا تو وہ سعادت حسن منٹو ہیں۔ افسانوں سے قطع نظر منٹو کے "سیاہ حاشیے" اور اسی طرح کے نثر پارے بھی خالص طنزیہ ادب کے شہ پارے ہیں۔

شاعروں میں دونوں ظریفوں (اول لکھنوی، دوم جبل پوری) کے ساتھ اور ان کے بعد احمق پھپھوندوی، مجید لاہوری اور سید مہدی علی خاں تو تھے ہی طنزیہ مزاح نگار، جنھوں نے اپنے سیاسی شعور کی دھار کبھی مرنے نہیں دی، لیکن وہ جو سنجیدہ شاعری کرنے اور اپنا طرزِ آپ نکالنے کے جوکھم میں عمر بھر پڑے تھے، ان میں جوشؔ ملیح آبادی اور شادؔ عارفی بھی ۱۹۴۷ء کے بعد زہرناک طنز نگاری کے کام کے رہ گئے۔ طنزیہ ادب کی کوئی تاریخ جوشؔ اور شادؔ عارفی کے نام اور کام کا جائزہ لیے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ جوشؔ نے طنز کو جو طنطنہ عطا کیا وہ شاعری سے نثر میں بھی اُتر آیا۔ یہ دونوں تقریباً ہم عصر ہیں اور عام معنی میں نظریاتی ہم سفر ہیں، لیکن آپ دیکھیں، لہجے میں، وسعتِ نظر اور شخصیت کے پھیلاؤ میں دونوں کے درمیان وہی فرق ہے جو دریائے کوسی اور گنگا میں ہے۔ ڈمرو نچا نچا کر تانڈو کا طوفانی رقص کرنے والے شیو جی کی جٹاؤں سے جو ہمالیائی دھاریں چلی تھیں وہی بل کر پاٹ دار گنگا بنی ہیں۔

خیر، ان باتوں کے جتانے کا یہ محل نہیں۔ (شفیق الرحمٰن اس جملے کو لکھتے تو یوں لکھتے: "..... کا یہ محل نہیں؟ یا یہ کہ..... کا یہ مکان نہیں؟") نظروں کی آلٹ پھیر ہے اور محاوروں اور مقولوں میں شرارتی ردّ و بدل سے شفیق الرحمٰن کے مزاحیہ مضامین درمیانی طبقے کے بنتے کھیلتے لڑکوں لڑکیوں کی "پک نک یا" "جوال کی ریل" بن جاتے ہیں۔ ایک وقت آیا تھا، ایسا بُرا وقت آ کے گیا ہے جب —

www.taemeernews.com

نوجوانوں کو ہی نہیں، بلکہ سنجیدہ سے سنجیدہ شہیدوں کو ادب کے بیلے میں جوانی کی اس ریل کی ضرورت تھی۔ طبیعت ہلکی ہو جاتی تھی انیس پڑھ کر ایک سیر چشم اور شکم سیر، خوش باش اور خوش اوقات، دل پھینک اور دل نواز گریجویٹ کا تصور بندھتا ہے ان کے مضامین پڑھتے وقت۔ اے حمید اور خالد اختر بھی شروع شروع میں شفیق الرحمن کی اس عام مقبولیت کی چھاؤں میں آ گئے تھے۔ مگر پانچویں، دہائی گزرتے گزرتے صنفِ ادب کی اس وادی میں دُور کا ایک شجرِ سایہ دار رہ گیا اور بس!

اُردو اخبارات کے فکاہیہ کالموں پر یا تو ماضی کے سالک (بٹالوی) کا، یا پھر شفیق الرحمن کا سایہ دیر تک ٹھیرا رہا۔

مطلع صاف ہونے لگا تو ۶۰۔ ۱۹۵۵ء کے دوران طبع زاد لکھنے والے کئی ایسے شوخ قلم جگمگائے جنھوں نے نثر اور نظم میں خود اپنے مالا مال تجربوں اور پختہ مشقِ سخن کا جلوہ دکھایا۔ تعارفی سطروں کے بعد فی الوقت ہمارا موضوع وہی ہیں۔

(۲)

اُنھیں میں اگر سینیر جونیر کی درجہ بندی نہ کی جائے ـــــ تو فکر تونسوی، مشتاق احمد یوسفی، انتظار حسین، ابن انشا، راؤ دلاور فگار اپنے جُداگانہ اوصاف کے ساتھ سب سے نمایاں اور کارگر ہیں۔ (دھیان رہے کہ کارگر ہونا، کاری گر ہونے سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا شاعر ہونا شاعری گر ہونے سے) نمایاں اور کارگر ہونا تو ایک طرف، میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ کوئی بیس برس سے نثر و نظم میں اس صنف پر یہی پانچ مسخرے راج کرتے رہے ہیں، باقی جتنے ہیں وہ انہی کے درمیان یا تو جھولا جھول رہے ہیں، یا اپنی شناخت قائم کرنے کی کوشش میں ایک خلا کو پُر کر رہے ہیں۔ خلا پُر کرنا بھی فطرت کا تقاضہ پورا کرنا ہی ہے۔

یہ نہیں کہ ہم کرنل محمد خاں، کیپٹن ضمیر جعفری، خالد اختر، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا اور رضا نقوی واہی کی اہمیت سے بے خبر ہوں۔ جس زبان کے ادب میں ظریفانہ شگفتہ کاری، خواہ مخواہ کی بھاری بھرکم علمی سنجیدگی سے مرعوب اور معذرت طلب رہی ہو، جہاں سید انشا کے علمی ادبی کارناموں کو اُن کے ٹھٹھوں کے سبب کم تولا گیا ہو، وہاں ظریفانہ طنز، اور مزاحیہ نکتہ سنجی پر ثابت قدم رہنا کوئی ہلکا کام نہیں۔

ابن انشا اپنی وضع کے ایک عاشق آدمی تھے۔ اُن کی شاعری میں عشق کی گھلاوٹ اور تپش نہیں تو کچھ بھی نہیں ـــــ ادب میں جگہ بھی اسی خصوصیت کے ساتھ پائی۔ اگر انھوں نے اخباری کالم، سفرنامے اور انشائیے نہ لکھے ہوتے، تب بھی شاعر کی حیثیت میں اپنا قد نکال چکے تھے۔

یہی معاملہ انتظار حسین کا ہے۔ جُہل ان کی طبیعت میں بھی ہے، کلاسیکی ادب کے قدیم و جدید سرمائے پر ان کی نظر ابن انشا سے بھی زیادہ وسیع ہے اور زبان پر قابو ایسا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ افسانوی ادب میں اپنے کارناموں سے جو حیثیت انہوں نے بنائی تھی اسے بھی کالمی طنز نگاری کے خطروں میں ڈال دیا اور اس صنف کی آبرو رکھنے میں شریک ہوئے۔ زبان کو زمین سے لگے لگے چلانے اور اُسے ایک شوخ ذہن دینے میں ابن انشا، انتظار حسین، دلاور فگار اور رئیس امروہوی نے بُرے وقتوں میں بڑا کام کیا ہے۔ (طنز نگار کا جوہر بُرے وقتوں میں ہی چمکتا بھی ہے)

اگر اردو ادب کے ظریفانہ، مزاحیہ اور طنزیہ ادب کو اَدوار میں تقسیم کیا جائے تو سو بات کی ایک بات ہم یہ کہیں گے کہ ادھر کے پندرہ بیس سال کا جو دَور ہے، اس کی بہترین نمائندگی مشتاق احمد یوسفی نے کی ہے۔ انھوں نے رشید احمد صدیقی + پطرس + شفیق الرحمن کے الگ الگ رنگ ملا کر اپنے کینوس پر بکھیرے اور ان پر اپنا رنگ حاوی رکھا۔ ان کا کونسا رنگ حاوی ہے؟ ـــ لفظوں اور ترکیبوں کی کتر بیونت اور تحریف سے ہٹ کر، کلاسیکی ٹکڑوں کی اشاریت بدل بدل کر جو وہ انگریزی اور فرانسیسی ـــ WIT (بذلہ سنجی) کا ایلیمنٹس (ست) بنا دیتے ہیں، وہ انھیں اگلے پچھلے سبھی "ہم صنفوں" سے نمایاں کرتا ہے۔

ویسے تو اُن کے تین مجموعے آ چکے ہیں (ہماری نظر سے صرف ایک "زرگزشت" گزرا) تاہم ایک آدھ نمونہ ان کے رنگِ خاص کو

www.taemeernews.com

سمجھنے میں مفید ہوگا :

"تُو نے پی ہی نہیں" ـــــــ عنوان سے وہ ایک انشائیے میں لکھتے ہیں :

..... سُنا ہے کہ چائے کے بڑے خوبصورت باغ ہوتے ہیں، یہ بات یوں بھی سچ معلوم ہوتی ہے کہ چائے اگر کھیتوں میں پیدا ہوتی تو ایشیائی ممالک میں اتنی افراط سے نہ ملتی بلکہ غلّہ کی طرح غیر ممالک سے درآمد کی جاتی۔ میری معلوماتِ عامہ محدود ہیں۔ مگر قیاس یہی کہتا ہے کہ کافی بھی زمین ہی سے اُگتی ہوگی کیوں کہ اس کا شمار ان نعمتوں میں نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آسمان سے براہِ راست نازل کرتا ہے۔ تاہم میری چشمِ تخیل کو کسی طرح باور نہیں آتا کہ کافی باغوں کی پیداوار ہوسکتی ہے اور اگر کسی ملک کے باغوں میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے تو اللہ جانے وہاں کے جنگلوں میں کیا اُگتا ہوگا! ایسے اربابِ ذوق کی کمی نہیں جنھیں کافی اس وجہ سے عزیز ہے کہ یہ ہمارے مُلک میں پیدا نہیں ہوتی۔ مجھ سے پوچھئے تو مجھے اپنا ملک اس لیے اور بھی عزیز ہے کہ یہاں کافی پیدا نہیں ہوتی۔

..... یہاں مجھے کافی سے اپنی بیزاری کا مخلصانہ اظہار مقصود ہے۔ لیکن اگر کسی صاحب کو یہ سطور شراب کا اشتہار معلوم ہوں تو اسے زبان و بیان کا عجز تصور فرمائیں۔ کافی کے طرفدار اکثر یہ کہتے ہیں کہ یہ بے نشے کی پیالی ہے۔ بالفرض محال، یہ گذارش احوالِ واقعی یا دعویٰ درست ہے تو مجھے ان سے دِلی ہمدردی ہے۔ مگر اتنے دامنوں میں آخر وہ کیا چاہتے ہیں؟.....

..... کافی پی پی کر سماج کو کوسنے والے ایک انٹلکچوئل نے مجھے بتایا کہ کافی سے دل کا کنول کھِل جاتا ہے اور آدمی چہکنے لگتا ہے۔ میں اس رائے سے سولہ آنے متفق ہوں۔ کوئی معقول آدمی یہ سیال پی کر اپنا منھ بند نہیں رکھ سکتا۔ ان کا یہ دعویٰ بھی غلط معلوم نہیں ہوتا کہ کافی پینے سے بدن میں چستی آتی ہے۔ جبھی تو لوگ دَوڑ دَوڑ کر کافی ہاؤس جاتے ہیں اور گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے ہیں....."

"چارپائی اور کلچر" ـــــــ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو :

..... رہا یہ سوال کہ ایک چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گذارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا نہیں دیکھا..... ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ تنگ سے تنگ چارپائی پر بھی لوگ ایک دوسرے کی طرف پاؤں کیے آ یا کی شکل میں سوتے رہتے ہیں۔ چنچل ناری کا چیتے جیسا اچیت بدن ہو یا کسی عمر رسیدہ کی کمان ایسی خمیدہ کمر، یہ اپنے آپ کو ہر قالب کے مطابق ڈھال لیتی ہے اور نہ صرف یہ کہ اس میں بڑی وسعت ہے بلکہ اتنی لچک بھی ہے کہ آپ جس آسن چاہیں بیٹھ جائیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ بیٹھنے اور لیٹنے کی درمیانی صورتیں ہمارے ہاں صدیوں سے رائج ہیں ان کے لیے یہ خاص طور سے موزوں ہے۔

چارپائی کی سب سے خطرناک قسم وہ ہے جس کے نیچے کھچے اور ٹوٹے بانوں میں اللہ کے برگزیدہ بندے محض اپنی قوتِ ایمانی کے زور سے اٹکے رہتے ہیں۔ اس قسم کے جھلنگے کو بچے بطور جھولا اور بڑے بوڑھے ـــ آلۂ تزکیۂ نفس کی طرح استعمال کرتے ہیں....."

اُن کے ساتھ دلاور فگار کا نام ذہن میں آتا ہے کہ ان جیسا طنز نگار شاعر برصغیر میں موجود نہیں اور حق یہ ہے کہ اکبر الہ آبادی ظریف لکھنوی اور احمق پھپھوندوی والی لائن کے سب سے سینیر گارڈ آج وہی ہیں۔ یوں ہماری آنکھوں دیکھتے ـــ

www.taemeernews.com

روزمرہ کے واقعات اور مسائل پر شوکت تھانوی، رئیس امروہوی، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی، ظفر علی خاں، سالک، چراغ حسن حسرت، فرقت کاکوروی، شاہد صدیقی، سبھی نے طبع آزمائی کی ہے۔ مگر وقتی بیگار یا سیاست اخبار نے ان سبھوں سے تانیہ پیائی بھی کرا کے چھوڑی۔ ایک تھے سید محمد جعفری، کہ اگر اسی کام کے ہو رہتے تو اردو شاعری میں یہ صنف کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہوتی، اور ایک ہیں دلاور فگار کہ ابر اگر برسے گھنٹہ بھر تو ان کی قدرت کلام کی چھت برستی ہے گھنٹوں اور پہروں، وہی ہیں جنھیں چھت بچوڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

ادب کے بازار میں بھی تھوک کی آڑھت خوردہ فروشی کے بیوپار سے جُدا ہوتی ہے۔ فی الحال ہم ایک ایسے آڑھتی کے سامنے ادب سے کھڑے ہیں جس کے آگے پیچھے بھیڑ بھڑکا ہے اور جو نہ کسی معزز ہستی یا ادارے کا ادب کرتا ہے نہ کسی سے اپنا ادب کرا تا ہے۔ یہ ہے فکر تونسوی جو تیس برس سے، روزانہ گڑ کی بھیلیوں میں مرچوں کی دھانس بھر بھر کر، کالم کے کالم، مضمون کے مضمون، خاکے، چہرے لہو لہان کر رہا ہے اور اس کا گودام کبھی خالی نہیں دیکھا گیا۔

فلک پیما کے مضامین اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں میں سالک اور حیات اللہ انصاری اور چراغ حسن حسرت کے روزانہ کالموں میں پھر بھی محتاط لب و لہجہ اور چبھتا ہوا تلخابہ ہوا کرتا تھا۔ فکر اوّل تو چلتے نہیں'۔۔۔۔

"اوروں کے جہاں سینک سماوے' چتو کے وہاں موسل"

بگھارنی چاہتے ہیں، پھر مبالغہ کرنے میں طنز کو نشتر کے بجائے ڈانگ بنا لیتے ہیں؛ سماجی شعور اگر پٹا ہوا لفظ نہ ہوتا تو ہم اسی سے کام لیتے۔ تاہم یوں کہا جائے کہ اردگرد کی دنیا کے بارے میں اُن کا گہرا کمٹیلا شعور نظریاتی کتابوں میں درج احوال سے اتنا نہیں آیا جتنا خود اپنی کھال سے۔ یہ کھال (فالج کے حملے کے بعد) آدھے بدن کی کھال پر رہے فکر تونسوی (یا بقول کرشن چندر، فکر طنزوی) جو پورے زخمی طنز نگار کروں کا توں سنبھالے ہوئے سانس لے رہی ہے۔ اس کے سارے مسامات شہری نچلے درمیانی طبقے کے داخل ہو رہے ہیں۔

فکر تونسوی نے حالات کے دباؤ اور طبیعت کی اُفتاد "ہر چہ باداباد" سب فکاہیہ کالموں اور مزاحیہ مضمون کو اپنی پناہ گاہ بنایا تھا۔۔۔۔

یہی آخر کو ٹھیرا فن ہمارا

اور وہ پناہ گاہ ہی ان کی جولاں گاہ بن گئی۔۔۔ یہاں تک کہ ان کے وجود پر چھا گئی۔ زندگی بھر کی ٹھوکریں، عزتیں، محبتیں، نفرتیں ان کی تحریروں میں دو نالی بندوق کے چھرّے بن بن کر نکلتی ہیں۔ دو نالی اس لیے کہ ایک نالی میں درد بھرا ہے، دوسری میں بارود۔

میں نے کچھ پہلے ان کی ایک تصنیف "فکرنامہ" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا،

"..... وہ مسکراتا نہیں، قہقہہ لگاتا ہے، بے فکری کا قہقہہ نہیں، بے دردی کا؛ ..... ہنسانے کی کوشش اور رُلانے کی نیت سے ایسا سُخن بناتا ہے کہ پہلی نظر میں کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شخص مذاق کر رہا ہے مذاق اُڑا رہا ہے یا مذاق مذاق میں گالی دینا چاہتا ہے ....."

یہ جملے فکر کے سوانحی اور معاصر کے حق میں یا اس کے خلاف نہیں جا سکتے۔ فکر کے معاصرین میں کرشن چندر نے جن جن کو متاثر کیا، مثلاً راجندر یادو، ابن انشا اور خود کرشن چندر۔۔۔ وہ اسی سمت کے طنز نگار تھے۔ مگر طنز نگاری کو انھوں نے اپنا پورا قلمی وجود سونپا نہیں تھا، فکر نے یہی کیا۔ مضمون نگاری، شاعری، ادارت سب کچھ اور سب کی طرح ساگری اسی ایک ہنومان جی کے مندر میں ارپن کر دی۔ یہاں تک کہ وہ خود اس مندر کے تنہا پروہت بن بیٹھے۔

پاکستان بننے کے بعد کرنل فیض احمد فیض اور میجر چراغ حسن حسرت نے وردی اُتار کر لیٹی تو یکے بعد دیگرے تین اور تسلم کار،

www.taemeernews.com

فوجی وردیاں ڈانٹے ہوئے میدانِ ظرافت میں اُتر آئے۔ شفیق الرحمٰن (جو بعد میں کرنل ہوئے، میجر ضمیر جعفری اور کیپٹن محمد خاں۔ محمد خاں کو تو یہ فنِ سخن ایسا راس آیا کہ وہ "لفٹینی" سے کرنل ہو گئے اور نام ہی سے پڑ گیا کرنل محمد۔ جب جرنیل سنگھ ہوتے ہیں تو کرنل محمد بھی یہی) ان تینوں کے سامنے علی الترتیب پطرس کی خوش باش، خوش مذاق کردار نگاری اور لطیف جملہ بازی کے نمونے بطور مثال رکھے ہوئے تھے کیونکہ ابتدا تینوں کی وہیں سے ہوئی۔ آگے چل کر عمر اور طبیعتوں کے فرق کے ساتھ لکھت بدلتی گئی۔ شفیق الرحمٰن نے جو اسٹائل شروع میں بنا لیا تھا، وہ خاصا آلودہ ہونے کے باوجود وہیں برقرار ہے۔ ضمیر جعفری نے غیر معمولی آثار کے باوجود قلم سے بھی کم آمیزی اختیار کی، رہے کرنل محمد خاں۔ ان کی سیدھی سچی ظرافت میں طنز اتنا ہی خوشگوار یا گوارا ہوتا ہے جتنا دودھ میں پانی (ہم تو آٹے میں نمک کا محاورہ اس لیے نہیں باندھا کہ کرنل محمد بھی یوں نہ باندھتے) "بجنگ آمد" جو کرنل صاحب کا پہلا بیان مسلسل ہے، ۱۹۶۸ء میں چھپا تھا، تب سے اب تک کئی بار یہاں وہاں چھپ چکا ہے۔

محمد خاں کا سکنڈ لفٹنٹ بننا، چین کے محاذ جنگ پر جانا، میجر کے عہدہ تک ترقی کرنا، وطن واپس آنا اور طرح طرح کے کڑوے، کسیلے، کھٹ مٹھے تجربوں سے گزر کر قلم اُٹھانا، اُردو کے ظریفانہ ادب کا بالکل اچھوتا تجربہ ہے۔ سخت گیر فوجی ماحول اور جنگی مُہم کا ماجرا وہ اپنے رچے ہوئے ادبی مطالعہ اور ذوق میں رنگ کر یوں بے تکلفی سے سُناتے ہیں گویا جنگ پر نہیں، پنجاب کی کسی قصباتی برات میں ہو کر آئے ہیں۔ اسی کے گاڑھے لطیفے اور رسیلے ہنگامے چھان چھان کر چاندنی میں سُکھا رہے ہیں۔ یہاں ایک طول طویل مثال کے بغیر چارہ نہیں:

"... پُل سے پار ہوئے تو ایک نئی دنیا میں داخل ہو گئے۔ حدِ نگاہ تک ایک وسیع سبزہ زار پھیلا ہوا تھا۔ معاً ہماری نگاہ ایک پک ٹک کرتی ہوئی ٹولی پر پڑی۔ انھوں نے ہمارا "کانوائے" دیکھا تو ہماری طرف لپکیں۔ ایک نہیں، دو نہیں، پوری سات دوشیزائیں! خدا جانے اِن بنات النعش کے جی میں کیا آئی کہ دن دھاڑے عُریاں ہو گئیں یعنی تقریباً عُریاں۔ پیراکی کا لباس پہنے ہوئے تھیں، ابھی بھیگی بھیگی دریا سے نکلی تھیں۔ ہم نے انھیں ایک نظر دیکھا اور پھر۔ اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی..... ہمارا کارواں تو کیا، گردشِ شام و سحر رُک گئی۔ ساتوں کی سات سرو قد، آہو چشم اور مرمریں بدن۔ اس قدر دلرُبا جیسے غالب کی غزل، اِسے دیکھو تو زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے، اُسے دیکھو تو سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے۔ اور وہ جو ذرا ہٹ کر مسکرا رہی تھی؛ چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے۔ اور ہم کہ مُدت ہوئی تھی یار کو مہماں کیے ہوئے، جگر لخت لخت سے دعوتِ مژگاں کرتے آگے بڑھے۔

بعد میں سُنا کہ ہمارے سالارِ کارواں بھی اس حُسن کی یلغار کے آگے تھوڑی دیر کے لیے سالار سے انسان بن گئے اور جیپ روک کر انھیں ہیلو کہا اور چلے تو ایک مُدت تک پیچھے تاکا کیے۔ جب مقامی لوگوں سے پوچھا کہ یہ ایک سے بڑھ کر ایک نو بہارِ نازکرن ہے تو معلوم ہوا کہ دخترانِ یہود ہیں اور یہ کہ ہم دریائے اُردن عبور کر کے فلسطین میں داخل ہو چکے ہیں....." ص: ۱۱۶

جس رنگ سے کرنل صاحب نے تصویر کھینچی، اس رنگ کی پیالی میں غالب کی پوری غزل گھولی گئی ہے وہ بھی اس شوخی سے کہ ہمیں کوشش و کاوش کا گمان نہیں گزرتا مگر مظاہر اور مناظر کی تہ میں کیسی سنگین حقیقتیں پوشیدہ ہوئی ہیں، اس سے مصنف محمد خاں نہ نظر چراتے ہیں، نہ وعظ سُناتے ہیں،

دوسرا دن بھی حیفہ کی سیر میں گزرا۔ حیفہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر واقع ہے لہٰذا وہ اپنے رُخِ زیبا کا کوئی گوشہ چھپا نہیں سکتا اور نہ چھپانا چاہتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس کا حُسن بندِ نقاب کھولے قوسِ قزح کی طرح سامنے کھڑا ہے۔ ڈھلان خدا نے بنائی ہے، مکان انسان نے اور دونوں نے مل کر ایک دلکش شاہکار پیدا

www.taemeernews.com

کر دیا ہے۔ ایک فلسفی ساتھی سے بات کی تو بولا:

"..... حیفہ پر ہی کیا منحصر ہے۔ ہر شاہکار فطرت سے تعاون کرنے پر ہی وجود میں آتا ہے ..... حیفہ سے نکلے تو ساحل کے ساتھ ساتھ جنوب کو بڑھے۔ پہلے تیس چالیس میل یہودیوں کے باغیچوں کے تھے جن کے شاداب مالٹے آب و رنگ میں ان یہودی دوشیزاؤں کو شرماتے تھے جو ہاتھ ہلا ہلا کر بے شرماتے ہمیں الوداع کہہ رہی تھیں۔ پاس ہی یہودی کاشتکار مشینوں سے صحرا کو گلزار بنا رہے تھے اور ہم فیصلہ نہ کر پاتے تھے کہ بگولوں میں گھرا یہ بیابان تھا اندر قطار ـــــ پھر دفعتہً باغیچوں کا سلسلہ ختم ہوا اور کیا دیکھتے ہیں کہ مختلف قطعات زمین میں اونٹوں اور گدھوں کے ناہموار تعاون سے ہل چلایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہ عرب کاشتکار ہیں۔ کھیتوں کے قریب سے گذرے تو عرب بچے بھاگے بھاگے آئے اور ہماری طرف ہاتھ بڑھا کر "سگارہ رفیق" کی صدا لگانے لگے۔ صدا کا ترجمہ کرایا تو معلوم ہوا کہ سگریٹ کی بھیک مانگ رہے ہیں۔ ہم مسافروں کو پہلے تو دشت دیکھ کے گھبرا آیا اور پھر سوچا کہ ہمارے عرب بھائیوں کا کیا بنے گا، اور بنا یہ کہ چند ہی سال بعد فلسطین جغرافیے سے نکل کر تاریخ میں چلا گیا اور اس کی جگہ اسرائیل نے لے لی اور ہمارے عرب بھائی پناہ گزینوں کے کیمپوں میں منتقل ہو گئے"۔۔۔[۱۱۵]

یہاں مزاح اور ظرافت کا رنگ چوکھا، خوشگوار اور طنز ہمدردانہ ہے۔ طنز کا نشانہ اکثر یا تو خود مصنف ہے، یا اس کے احباب یا وہ جن سے وہ کوئی ذہنی قرابت رکھتا ہے۔ درد کا شائبہ اگر ہے بھی تو ایسے کہ پڑھنے والا سوچے، مصنف کی نیت یہ نہیں تھی، وہ تو روداد لکھ گیا، یہ نکتہ، یہ نشتر خود میں نے اپنی ذہانت سے نکالا ہے۔

اگر اسے لطیفۂ غیبی نہ مانیے تو اُدھر کے تین فوجی افسروں کے پے در پے اقدام کے بعد (جنھوں نے دَردی سے نقاب کا کام لیا اور یوں نقاب پوش مزاح نگاری اور طنز نگاری کا بگل دیا) ہماری طرف تین عدد حنفی بھی اس خاردار میدان میں سینے کے بل سرکتے دیکھے جا رہے ہیں۔ ہماری مُراد عمیق حنفی، مظفر حنفی اور شمیم حنفی سے ہے۔ تینوں شاعر، تینوں نثر نگار، نہایت ذی علم، صاحب نظر، صاحب دل اور تقریباً ہم عصر اور ہمسر ـــــ مگر شاید خود بھی دعویدار نہ ہوں کہ وہ آپ سے آپ طنزیہ مصرعوں اور جملوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ عمیق حنفی اپنے انشائیوں اور جرائی تحریروں میں ترش روئی کے باوجود شدید قسم کا طنز کرتے ہیں۔ مظفر حنفی نے شروع میں شاذ عارفی کی انگلی کیا تھامی کہ خود ان کی انگلی میں ایکزیما ہو گیا۔ غزل کی زمین میں قافیوں کے نگینے دَر و بَست میں، ترکیبوں کے انتخاب میں، اظہار کی اشاریت میں، حریفوں کو پنجہ دکھانے میں، کہیں نہ کہیں اُس اُنگلی کو ضرور کھُجا لیتے ہیں ـــــ اور یوں ان کی غزل نے اپنی کھُلی شناخت کا ایک اشارہ اور نکال لیا ہے۔ شمیم حنفی کی اولین تحریروں سے اور ذہنی بلوغ کی دوسری علامتوں سے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ طنز نگاری کا رُخ کریں گے، لیکن ان کے طنز میں شاعرانہ دردمندی اور دلچسپی کشمکش ہے جیسی تضادوں کی ماری دنیا میں ایک عمر گزار چکنے کے بعد کسی رہرو راہ محبت کی رگوں میں اُتر آتی ہے۔

ہم اپنے موضوعِ سخن سے، ویسے ہی، کونسا انصاف کر سکے ہیں کہ ان تین حنفیوں کا ذکر درمیان میں آجانے سے توازن بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ دراصل ہم لوگ عادی ہو گئے ہیں کہ جب تک کوئی اہلِ قلم خود کو کسی مقررہ خانے میں رکھ کر اپنے مُرتبان کا لیبل نہ پڑھوا دے، ہم آزادانہ اس کے مافیہ کی اصل قدر و قیمت نہیں آنکتے۔ عمیق، مظفر اور شمیم تینوں اپنی نثری اور شعری کاوشوں میں گہرے اور باریک طنز نگار ہیں۔ مظفر بَرملا، عمیق بے اختیار اور شمیم بالارادہ۔ اور ان کا ذکر یہاں یاد دہانی یا نشاندہی کے طور پر آنا چاہیئے تھا۔

(۴)

اب ہم ٹھیک آج کے اُن قلم کاروں کے رُوبرو ہیں، جن کی درج گزٹ عمریں کچھ بھی ہوں، مزاحیہ و دیگر طنزیہ ادبیات کے

www.taemeernews.com

رجسٹر میں ان کا اندراج ۱۹۶۰ء کے بعد ہی ہوا ہے۔ ان میں علی الترتیب یوسف ناظم، رضا نقوی واہی، احمد جمال پاشا، بھارت چند کھنہ، نریندر لوتھر، سلمیٰ صدیقی، ماچس لکھنوی، شفیقہ فرحت، ہلال اور استاد رام پوری، اور سدید مشفق خواجہ اور مجتبیٰ حسین کے نام آتے ہیں اور ناموں کی یہ فہرست ناتمام ہو تو ہو، ناقص نہیں ہے۔ اس فہرست میں سب سے اہم پہلے اور آخری نام کے درمیان رہبر اور رہزن کا رشتہ بھی ہے اور حیدرآبادی زندہ دلی کا بھی۔

یوسف ناظم تقسیم کے پہلے سے لکھ رہے ہیں، لیکن وہ شاعری میں بھی ذہیل رہے۔ بہت دیر سے اُن پر کھلا کہ دراصل وہ مزاح نگار پیدا ہوئے تھے۔ مشاعروں سے دست بردار ہوئے بغیر ہی انھوں نے اپنے نیم مزاحیہ نیم طنزیہ انشائیوں سے خود کو استاد منوالیا۔ نثر اور نظم دونوں میں شاہد صدیقی جیسے بے ساختہ بذلہ سنج اور نکتہ آفریں مزاح نگار کے بعد وہی خاک حیدرآباد کے دادِ نمائندہ ہوتے کہ اتنے میں مجتبیٰ حسین اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس (مرحوم) کے نقشِ قدم پر آگے بڑھے اور کیف و کم میں اُن سے آگے بڑھ گئے۔ ہم نے مختلف تبصروں میں یوسف ناظم کے چٹکیاں بھر کر دیکھا کہ ان کا دہنا ہاتھ جس سے وہ اعلا درجے کا طنز لکھ سکتے تھے، سو رہا ہے یا اس میں بیداری کے آثار ہیں۔ ابھی ہم سوچ میں تھے کہ انہوں نے اپنے مضامین کا ساتواں مجموعہ "ذکرِ خیر" کے عنوان سے چھپوا دیا۔ خیر سے یہاں یہ ذکر انہی سترہ قلم کاروں کا ہے جو مصنف سے روٹھ جانے کی سکت نہیں رکھتے یا روٹھیں تو منائے جا سکتے ہیں (یہ خاکسار ان میں سے ایک ہے) لے دے کے ایک خاکہ یوسف ناظم کے قلم سے ان کے زود رنج معاصر باقر مہدی کا نکلا تھا جہاں ذکرِ خیر اور ذکر شر گڈمڈ ہو گیا تھا وہ انھوں نے چپکے سے سرکا دیا۔

اب وہ مضامین کے علاوہ کالم نگاری پر بھی کمر بستہ ہوئے ہیں اور "اتوار یہ" کے عنوان سے ہر ہفتے ایک ایسا کالم کھینچ دیتے ہیں جس پر پڑھنے والے سے لے کر چھاپنے اور چھپوانے والا تک پھسل جائے اور ان کے قلم پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ ہم نے کسی وقت انہی کے پچھلے مجموعہ "نقطہ" پر لکھا تھا:

"یوسف ناظم نہایت شستہ اور شائستہ مذاق کے آدمی ہیں۔ کوشش بھی کریں تو (باقر مہدی کے سوا) کسی کی دلآزاری نہیں کر سکتے۔ بلکہ مزاح میں اتنا ہی طنز ملاتے ہیں جتنا ہر ایک ذائقہ خوشی خوشی گوارا کر سکے۔ اگر خدانخواستہ گمان گزرے کہ ان کے دسترخوان پر مرچ مسالے کی تیزی سے کوئی معصوم مہمان بدگمان یا بدمزہ ہو جائے گا اور ان پر سماجی شعور بگھارنے کا الزام لگ جائے گا تو وہ اس پلیٹ کو ہی آہستہ سے اٹھا لیتے ہیں۔"

آخر یوسف ناظم نے اپنے ساتویں مجموعے میں ہمارے تبصرے کو ثابت کر دکھایا۔

آدمی کا ذریعہ معاش عمر بھر ایک سیدھی لکیر پر چلتا رہے تو اس کے قلم پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ یوسف ناظم سے پہلے کی دو جنوں شایں ہیں۔ لیبر ریلیشنز کے ذمہ دار عہدے پر رہتے رہتے وہ تحریر میں بھی لیبر ریلیشنز ملحوظ رکھتے ہیں۔ کسی تیکھے نوکیلے خیال یا دھار دار کو اتنا نہیں کھینچتے کہ کسی فریق کے چبھنے کا اندیشہ ہو۔

عجب معاملہ ہے کہ ادھر حیدرآباد سے نہ صرف ایک "شگوفہ" رسالہ اس صنف کا نکلتا چلا آ رہا ہے بلکہ آدھے درجن خوش مذاق مزاح نگار بھی پندرہ بیس سال کے اندر نمودار ہوئے اور بعض پوری طرح نمودار ہوتے ہوتے رہ گئے، مثلاً بھارت چندکھنہ (آئی۔ اے۔ ایس) کہ اگر مسلسل لکھتے رہتے تو افسری سے ریٹائر ہونے کے بعد اس سے بلند تر کرسی پر ظریفانہ ادب انھیں بٹھا لیتا۔ البتہ ان کے معاصر نریندر لوتھر جن کا عظیم جرمن مارٹن لوتھر سے قریب دور کا بھی کوئی رشتہ نظر نہیں آتا، مغربی ظریفانہ ادب کے زیرلب اندازِ بیان سے فیض یاب ہیں اور کبھی کبھی اپنے پڑھنے اور سننے والوں کو بھی فیض پہنچاتے رہتے ہیں۔ خدا انھیں جرمن اور افریقن لوتھروں کے انجام سے محفوظ رکھے۔

سلمیٰ صدیقی کو تین سمتوں سے طنز نگاری کی نعمت ملی تھی، بہترین ورثہ۔ بہترین صحبت۔ نہایت نازک حسِ مزاح — مگر وہ "چند کلیوں پر قناعت" کر گئیں اور "سکندر نامہ" کے بعد میدان خالی چھوڑ کر، استراحت کے لیے اپنے پائیں باغ میں چلی گئیں۔ البتہ شفیقہ فرحت، جنھوں نے محض شوقیہ ادھر توجہ کی تھی، آج بھی اپنے مقدمہ کی پیروی کر رہی ہیں: "لو آج ہم بھی . . . . . ان کے

www.taemeernews.com

مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "صاحب اولاد" ہونے کا اعلان کرتا ہے۔

واہی بھی محض حسن اتفاق سے طنزیہ شاعری کی طرف متوجہ ہوئے تھے، مگر آج دلاور فگار کی خالی جگہ وہی پُر کرنے میں مصروف ہیں اور ہیں بھی بڑے پُرگو۔ حال میں جیسی واہی اور خاص نمبر کی اشاعت نے انھیں ان کا حق دے دیا ہے۔ سید محمد جعفری اور دلاور فگار کے کمالات کے ہوتے، اگر طنزیہ شاعری نے واہی سے آگے قدم نہ بڑھایا تو افسوس رہے گا کہ تہذیب حاضر سے اُسے اپنا حصہ نہیں ملا۔

بیشتر مشاعروں اور کوی سمیلنوں کے مسخرے پن کو ضرورت تھی اور ایجاد کی اس ماں نے (نوٹ کیجئے کہ ہم گالی نہیں بکتے) اچھے بھلے مزاحیہ شاعروں کو پھکڑ پنے میں ڈال دیا ورنہ ماچس لکھنوی، تخلص بھوپالی، ناظر خیامی، سلیمان خطیب، بلال اور استاد رام پوری آفتاب لکھنوی، علاء الدین صابر، ناظم انصاری وغیرہم سلیقے کی طنزیہ شاعری پر قناعت کر سکتے تھے۔ رام پوریوں نے شاد عارفؔ سے ان کے جیتے جی جو سلوک روا رکھا تھا، وہ ان کے مرنے کے بعد طنزیہ رنگ کو رسوا کر کے اور بھی گرا دیا۔

رقتؔ کاکوروی نے سال ہا سال پہلے اساتذہ کی نثری اور شعری پیروڈی (تحریف) کو قبول عام بخشا تھا۔ غالبؔ کی نا قابل تقلید خطوط نگاری کے خطوط پر رقتؔ نے بھی جعلی خطوط لکھنے تھے۔ محفلوں میں سُنے گئے، پسند کیے گئے۔ یہ سلسلہ اور دنوں تک چلا۔ یہاں تک کہ الزبتھ ریڈ نے، جو اس میدان کے شہسوار نہیں، اسے پھر سے رواج دیا ہے۔ اس کی صدائے بازگشت بھی بلند ہو رہی ہے۔

احمد جمال پاشا نہایت سلیقے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ خالص مزاح نگاری سے طنز کی جانب تیزی سے بڑھے تھے۔ نظری جوہر تھا، سلامتی طبع تھی، تعلیم اور صحبت اعلا پائی۔ قدر شناس ملے، مگر وہ درجن بھر اچھے مزاحیہ (نیم طنزیہ) انشائیے دے کر جو مراقبے میں گئے، پھر نہ ملے۔

مشفق خواجہ بنیادی طور سے تحقیق و تنقید کے آدمی ہیں۔ بہت کم عمری سے اُنہوں نے تحقیقیوں میں نام پیدا کیا۔ دقتِ نظر کے ساتھ سلیقہ اور سلیقے کے ساتھ سجا ہوا ذوق شاذ و نادر ہی کسی ایک کے حصے میں آتا ہے، مشفق خواجہ کو دل و دماغ کی روشنی کے ساتھ انھیں کہنی بھی مضبوط ملی ہے۔ نتیجہ دیدہ ریزی، دماغ پاشی، اگلے پچھلے ادیبوں کی جامہ تلاشی۔

ایسے شخص کا نیم مزاحیہ ہفتہ وار کالم لکھنا اور کان پر قلم دھرے ("خامہ بگوش") نکلنا محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ اس کی بدولت وہ متحرک تصویر دل سے باخبر اور معاش سے بے فکر نصیر کر گئے ہوں گے۔ قلم سے روزی کمانے والوں کے لیے اور چارۂ کار بھی کیا ہے!

مجتبیٰ حسین اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ، سب سے شگفتہ اور بے تکلف لکھنے والے ہیں گیارہ بارہ برس کے دوران پانچ مجموعے ان کے مزاحیہ مضامین کے آ چکے ہیں (اور اگر زیر تحریر مضمون نے چھپنے میں دیر کی تو چھٹا مجموعہ بھی کاتب کی گرفت سے نکل چکا ہوگا) حیدرآباد سے پائے تخت دلی پہنچ کر ان کا رنگ زیادہ گہرا گمبھیر یا شوخ و شریر تو نہیں ہوا البتہ چمکا خوب! مثلاً ان کا چوتھا مجموعہ مضامین "آدمی نامہ" جس میں پندرہ آدمیوں کا نام لقاب درج ہے وہ بھی اس طور سے گویا طرحی مشاعروں کی ردیف وار غزلیں ترتیب دی گئی ہوں، کپور (لمبا آدمی)، ابراہیم جلیس (اپنا آدمی)، فکر (بھیڑ کا آدمی)، عمیق حنفی (قنوطی آدمی) وغیرہ پندرہ آدمیوں کو اسی طرح کے پندرہ لقاب سے نوازا گیا ہے۔ غزل گو استاد اپنی مشقِ سخن کی دھونس جمانے کے لیے جس طرح بنگلاخ زمینوں میں سلاست کلام کا جلوہ دکھایا کرتے تھے، یہ عطائے لقاب اسی طرح کی کاوش ہے۔ اب سے دور نقاد و تزیر آغا نے بھی شاعری کا جائزہ لینے میں کروٹوں کی شمالیں اسی طرح چنی تھیں: کی شمال . . . . کی شمال۔ وغیرہ نیا ڈزائن تھا چل گیا۔ پھر شاید موصوف پر اس سنگلاخ زمین کی سلاست کھلی تو وہ راستے پر آ گئے۔

سب سے بڑی خوبی مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری میں یہ ہے کہ وہ خاکہ کھینچتے ہیں، خاکہ اڑاتے نہیں۔ کسی سے دل میں بُغض

پیدا ہوئے وکیل تو شیطان نے کہا ؎ لو آج ہم بھی صاحب اولاد ہو گئے (اکبر)

www.taemeernews.com

نہیں پالتے۔ یہی خوبی ان کے دوسرے شگفتہ اور مزاحیہ مضامین میں خون کی روانی نارمل رکھتی ہے مگر اس خوبی میں تو ان کے شریک یوسف ناظم بھی شریک ہیں۔ پھر ان دونوں "ٹکیوں" میں وجہ امتیاز کیا رہی؟ ــــ تو وہ شے دونوں کے تقابلی مطالعے سے کھلے گی جو نمونے کے ایک ہی آدمی پر تقریباً ایک ہی زمانے میں لکھے گئے۔ وہ نمونے کا "پھڑکدار" آدمی ہے راجندر سنگھ بیدی کہ اگر پہلے کی طرح جما رہا ہوتا تو مالک محروسہ کو ایک بار پھر "محروسہ" کر کے دکھا دیتا۔

یوسف ناظم بیدی پر لکھتے ہیں،

"لڑکپن کے ہم ساز راجندر سنگھ بیدی آگے چل کر دوستوں کے دم ساز تو بنے لیکن زمانہ ساز نہ بن سکے۔ یہ فن انھیں نہیں آیا۔ وہ بس دوستوں پر جان اور محفلوں پر پان چھڑکتے رہے۔ جب وہ بے تحاشہ پان کھاتے تھے تو نہ رستم کی پروا کرتے تھے، نہ سکندر کی۔ ان کے اپنے کپڑے تو خیر ان کے اپنے ہی کپڑے تھے لیکن دوسروں کے کپڑوں سے بھی انہوں نے نفرت نہیں برتی۔ اُن کا مخاطب ہمیشہ لہولہان ہو جاتا تھا۔ کہتے تھے یہ خلوص کی نشانی ہے اور کیا یاد کرو گے کسی رئیس سے سابقہ پڑا تھا ایک مرتبہ بیمار ہوئے تو کھانا کسی نرسنگ ہوم میں رکھے گئے۔ جب بھی ان کے تیماردار اُن سے ملنے جاتے انھیں نرسنگ ہوم میں داخل ہو کر ان کے کمرے تک جانے کی کبھی زحمت نہیں اٹھانی پڑتی تھی۔ راجندر سنگھ بیدی نرسنگ ہوم کے قریب ہی کی ایک پان کی دوکان پر کھڑے مل جاتے۔ کئی پان ان کے منھ میں اور پانوں کا پلندہ ان کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس بات کو کئی سال ہو گئے۔ لیکن وہ دوکاندار اب بھی نرسنگ ہوم جا کر کسی نہ کسی ملازم سے مزور پوچھ آتا ہے: بھائی صاحب وہ سردار جی پھر بیمار نہیں ہوتے؟ میرا کاروبار مندا پڑا ہے۔ انھیں کسی طرح بلا لیجئے۔ (بیدی صاحب) کہتے تھے ان کی دوکان پر مجھے بار بار اس لیے جانا پڑتا ہے کہ نرسنگ ہوم میں کھانا ہی کتنا ملتا ہے۔ . . . . گوشت خوری ان کا محبوب مشغلہ رہا ہے اور مرغی کے شکار کو وہ سب سے بہتر شکار سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں شکار کے لیے بیابان کیوں جایا جائے، دسترخوان ہی کیوں نہ چنا جائے . . ."

اب مجتبیٰ حسین اور بیدی کا خاکہ ملاحظہ ہو:

. . . . انہوں نے فلاں توقع ایک پھڑکدار لطیفہ سنا دیا اور اپنے آنسوؤں کو یکلخت دیکھتے چھوڑ کر آتشبازی کے انار کی طرح اندگی کی شگفتگی میں پرواز کر گئے . . . . . بات دراصل یہ ہے کہ بیدی صاحب ہمیشہ جذبوں کی سرحد پر رہتے ہیں۔ اور سیکنڈوں میں سرحد کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر عبور کر لیتے ہیں۔ ان کی ذات "بھٹنے" کا وقت ہے۔ برسات کے موسم میں آپ نے کبھی یہ منظر دیکھا ہوگا کہ ایک طرف تو ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہے اور دوسری طرف آسمان پر دھلا دھلایا سورج چھما چھم چمک رہا ہے۔ اس منظر کو اپنے ذہن میں تازہ کر لیجئے تو سمجھئے کہ آپ اس منظر میں نہیں، بیدی صاحب کی شخصیت میں دور تک چلے گئے ہیں۔ ان کی ذات میں سورج اسی طرح چمکتا ہے اور اسی طرح ہلکی سی پھوار پڑ رہی ہوتی ہے۔ . . . . "

ادھر چند برسوں میں ایک نام اور بھی چمکا ہے مختلف گوشوں اور مزاح کوشوں کی محفلوں میں وہ ہے خواجہ عبدالغفور کا نام ان کے مضامین کے کئی مجموعے پے در پے برات کی دھوم دھام اور فیاضانہ ضیافتوں کے تام جھام کے ساتھ نکل چکے ہیں، اور ہماری بے خبری کو للکارتے ہوئے نکلے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب موصوف نے اردو (یعنی لشکر) کی حالتِ زار پہ ترس کھایا اور "شگوفہ زار" سے لے کر "گل افشاں" تک کئی "زار" کمک پر روانہ کیئے اردو تو خیر مصیبت سے زار و نزار نکل آئی البتہ مزاحیے اور طنزیے لکھنے کی نیت اور کوشش میں انہوں نے وہ کام کر ڈالا جو اوروں سے چھوٹ گیا تھا، یعنی طنز و مزاح پر تفصیلی روشنی ڈالی، اس کی قسمیں گنائیں، اس کی مثالیں فراہم کر دیں تاکہ یہ صنف سکّہ بند ہو جائے۔ سردار جعفری صاحب نے بھرے جلسے میں اعلان کیا کہ انہوں نے اس موضوع پر خواجہ صاحب کی تحریروں سے کافی روشنی پائی ہے۔ چنانچہ انہوں نے روشنی اور ہم نے عبرت حاصل کی۔

. . . . کہتے ہیں کہ مشیتِ ایزدی میں کسی کو دخل نہیں۔ بے حساب رزق پہنچانے والے نے خواجہ صاحب کو ہر طرح کی نعمت اور عزت سے

www.taemeernews.com

ڈالا تھا، بس ایک فائل کی کسر رہنے دی تھی۔ وہ فائل جس پر نادیدہ حکم "تخلیق ادب" لکھا ہوتا ہے سکریٹریٹ کی میز سے اُٹھتے اُٹھتے انہوں نے یہ کسر بھی نکال دی اور فائل منگا کر اس پر اپنا نوٹ ثبت کیا اب چاہے فائل کھولو، نہ کھولو۔ خواجہ صاحب کے دستخط اوپر ہی صاف پڑھے جاتے ہیں۔ کوئی ہمیں بتائے کہ مشیت ایزدی میں قلمکار کو کتنا دخل ہے۔

سیاسی اور سماجی موضوعات پر احتجاجی، پوش منداور دھار دار طنزیہ شاعری کو تو شاعروں کے مسخرے ور غلا کر لے گئے اب کئی برس سے دل میں دھک دھک ہو رہی ہے کہ کہیں ہمارے ہاں نیک طینت مزاح نگاری یا ظرافت ہی طنز نگاری پر سواری نہ کرے اور اسے یوسف ناظر ادہ مجتبیٰ حسین کے رتھ سے باندھ کر نہ چل دے۔ یہ خدشہ ابھی گیا نہیں ہے۔ البتہ کچھ نئے پکتے ہوئے چہرے نظر آنے لگے ہیں۔ مثلاً پرویز یداللہ مہدی، ساجد لکھنوی (صاحب بے سر و پا) ساجد رشید، شکیل اعجاز، معین اعجاز، فیاض انفوس، رحمٰن اکولوی، جن کی بغل میں بطور حلف نامہ ایک ایک تصنیف موجود ہے، آگے دنیا بہ اُمید قائم۔

کیسا تلخ و ترش زمانہ ہمیں نصیب ہوا اور وہ یوں جارہا ہے ہنستے ہنستے! منٹو کے طنزیے کے بعد جوگندر پال کے طنزیہ افسانچے کتنی دور تک لے جائیں گے بھلا! اخباری کالموں سے مزاح نگار ابھرا کرتے تھے اور اسٹیبلشمنٹ سے ذہنی مفاہمت کی بلند بانگ طاقتوں کا پانچواں کالم اسی کالموں سے سر اٹھایا کرتا تھا۔ ان سر پھروں نے ریڈیو، ٹی وی، فلم اور اب آئی پی کے پول میں سر چھپا لیا۔ راوی پار والے قلمکار اس جاندار روایت کے زندہ رکھنے میں ہلکان ہوئے جاتے ہیں، اور ہماری طرف معاملہ یہ ہے کہ سر سلادے، بھیجا کھادے۔ منٹو تو کیا، آج کسی ہری چند اختر اور راجہ مہدی علی خان تک کا پتہ نہیں ہے۔

⑤

الغرض دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ پچھلے دس پندرہ سال کے دوران مزاح اور طنز کا معیار مشتاق یوسفی اور دلاور فگار تک پہنچ کر ٹھیر گیا ہے۔ نثر اور نظم میں تا حال یہی دو نام ۱۹۷۰ء کے بعد تک کا معیار سنبھالے ہوئے ہیں۔

عام طور سے سمجھ لیا گیا ہے کہ جو کوئی مزاح لکھ سکتا ہے وہ گویا طنز و مزاح لکھتا ہے۔ یہ عامیانہ تصور اس حد تک تو درست ہے کہ جو شخص اعلا درجے کی بذلہ سنجی، نوک جھونک کی خصلت اور ظرافت اپنی طبیعت میں نہیں رکھتا، یا یوں کہئے کہ نہایت لطیف و کثیف مزاح جس کی فطرت میں نہیں وہ لفظوں کا کرتب دکھانے پر بھی طنز نگار نہیں ہو سکتا۔

طنز نگاری کے لیے حسِ مزاح کی تیزی لازم ہے۔ مگر اس کے برعکس درست نہیں۔ ہاتھ کی صفائی اور شعبدے دکھانے والوں کو بھی آرٹسٹ کہہ لیتے ہیں مگر آرٹسٹ کو شعبدہ باز نہیں کہا جاتا۔ پطرس کی مثال سامنے ہے کہ جب (پاکستان بننے کے چند سال بعد) وہاں آرٹس کی پہلی انجمن کراچی میں قائم کی گئی تو انہوں نے داد دی اور اپنے ملک میں پھیلی ہوئی کم نظر قدامت پرستی پر ایک شدید طنزیہ خط چھپوایا "دوست کے نام"۔ یہ وہی پطرس تھے جو ایک دوست کی یاد میں، پُر لطف مزاحیہ مضمون بیس برس پہلے لکھ چکے تھے۔

طنزیہ انشائیے محض بلیغ جملے اور چٹکتے ہوئے فقرے لکھ دینے سے نہیں بنتے۔ لکھنے والے کو خود بھی چٹکی تو بھرنا ہونا چاہیئے۔ باہر سے نہیں، اندر سے ضرور۔ ہمارے دیکھتے ظفر علی خاں نظم میں اور رشید احمد صدیقی نثر میں اول درجے کے طنز نگار تھے۔ اور وہ اس لیئے تھے کہ جن قدروں، عقیدوں، اداروں اور ارادوں کو اپنا آدرش بنائے ہوئے تھے، ان کی پسپائی یا رسوائی برداشت سے باہر ہو گئی۔ یہی کڑھن، یہی بیتابی اور کڑاہٹ ان کے بلیغ یا چٹکلے جملوں اور مصرعوں میں سمائی ہے۔ بیان کی قدرت اور لطیف اشاروں نے اسے کہیں میٹھی چھری بنا دیا ہے، کہیں چرانے کا گھونٹ۔

طنز کی اشاریت اور شدت سے قوموں اور تہذیبی گروہوں کی تہذیبی گہرائی اور رسائی بھی ناپی جا سکتی ہے۔ (آسکر وائلڈ اور برنارڈ شا آئرش تھے، پھر انگریزوں کے کردار پر اور ضاع و اطوار پر جاکٹ طنز لکھتے رہے یہاں تک کہ شا کے اقوال اور ملفوظات نے "شاویانہ" نام پایا انگریزی زبان کی محفلوں میں سوغات بن گئے۔ اس سے انگریزوں کے شاندار تہذیبی ورثے کا وقار

www.taemeernews.com

جھلکتا ہے۔ گالی کھا کے بے مزا نہ ہونا بلکہ مزیدار تواضع کرنا دو صدی سلطنت چلانے کے بعد آتا ہے۔

ہماری کم سواد زبان کو شاندار تہذیبی ورثہ ملا تھا، تقاضا اس کا بھی یہی تھا اور ماضی میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں (مثلاً واجد علی شاہ کے انتزاع سلطنت ۱۸۵۶ء پر امانت لکھنوی کا مشہور شعر) لیکن جوش کی "یادوں کی برات" پر حال میں جو لے دے ہوئی وہ اس گہرائی اور سمائی کو جھٹلاتی ہے۔

جو قلم کار خود اپنا مضحکہ خیز کارٹون نہ بنا سکے یا اپنے کارٹون سے لطف اندوز نہ ہو سکے قلم پکڑنا طنز نگاری کی شریعت میں اس پر حرام ہے۔ غالبؔ "حیوانِ ظریف" تو تھے ہی، طنز ان کی طبیعت میں بلا کا تھا۔ خود کو فرض کر کر کے کیسی کیسی سنائی ہیں کیا کیا اپنے کارٹون بنائے ہیں! تبھی تو ان کے خطوط سہل نگاری کے بجائے طنز نگاری کا بھی اولین نثری نمونہ اور سدا بہار نمونہ بن گئے ہیں۔

مزاح کو ادب کی ہلکی پھلکی صنف شمار کیا جاتا ہے، اس کی مانگ اور مقدار تو ہمیشہ برقرار رہتی ہے، معیار ایک سا نہیں رہتا معیار بنتا ہے لکھنے والے کے تہذیبی معیار اور قوتِ اظہار سے۔ یہ دونوں اوصاف کاہے سے بنتے ہیں (ہمیں اپنی آبرو عزیز ہے) ہم کچھ نہیں بتا سکتے۔

مزاحیہ چیزیں پڑھنے کے لیے معتدل ہوا، طبیعت کی شگفتگی، برجستگی اور ہونے سے چٹکی کاٹنے کا فن بظاہر کافی ہے لیکن یہ مال پانچ سات مضامین کے بعد تھڑ جاتا ہے۔ دیر تک چلانا ہو تو کلاسیکی ادب اور زبان کے پچھلے ذخیرے کا ورد کرتے رہنا اور موجود سرمائے کو ٹھنگاتے اُلٹتے پلٹتے رہنا لازم ہے۔ پان کرا اپنی رگوں میں سُرخی رنگ جنار رکھتے ہیں، اور گھوڑے کے سیروں چنے چاب جاتے ہیں، اگر بار بار پھیرتے نہ رہیے تو یہ تھیلے پر، وہ نشان پر گل جاتے ہیں۔ مزاح نگار دانش مند ہوگا تو اسے یہ اشارہ کافی رہے گا۔ ورنہ ادب کی صاف ستھری بساط پر "چرکینی" کرے گا۔ (۱۹ ویں صدی کے نامور ہزل نگار "چرکین" کی طرف اشارہ ہے)۔

طنز نگاری میں بہت باریک کپڑے کا چھنا ہوا مزاح بہت مقدار میں پڑتا ہے۔ اس کی چاشنی پہلے سے تیار رہتی ہے۔ پھر ایک سادہ سی مشین ہوتی ہے قرع انبیق یا قرانبیق نام کی، جسے قرم بیق بولتے ہیں (یونانی میں اسے صرف انبیق کہتے تھے) اور اس کے طرح طرح کی جڑی بوٹیاں پڑتی ہیں، شیشے کی کرچیں بھی ڈال دیتے ہیں، نیچے آگ جلتی ہے، رات رات بھر جلتی رہتی ہے اور ٹونٹی سے ایک ایک بوند عرق ٹپکتا رہتا ہے۔ فنکار کے وجود کی قرم بیق سے قلم کی ٹونٹی میں ہو کر جتنا عرق نکل آئے مزاح کی چاشنی اس میں گھول کر جو شے بطور تصنیف پیش کی جائے، وہ طنزیہ ادب ہے۔ اسے سنجیدہ ادب کے برابر بلکہ بعض موقعوں پر اس سے زیادہ مہنگا تولتے ہیں۔ جب ہوا کا دباؤ سنسر کا موسم، قومی یا معاشی مانگوں کا بازار بگڑا ہوا ہو تو اس شے کی مانگ اور قیمت بڑھ جاتی ہے۔ مثال کے لیے آج کل کے پاکستان کا ادبی ریٹ کارڈ دیکھا جا سکتا ہے۔

مسلّمات سے بگڑ بیٹھنے، ڈسپلن کی شدت پر چیخنے اور اپنی برہمی کو دوسروں کی برہمی سے ہم آہنگ کر دینے کے لیے چھیڑ چھاڑ کا لہجہ اختیار کرنا ہمیشہ سے طنزیہ ادب کا امتیاز رہا ہے۔ یہ "مزاح المومنین" قسم کی چیز نہیں (جیسی مثلاً ڈاکٹر عابد حسین کے "مضامینِ عابد" اور "بزم بے تکلف" میں ملتی ہے ... ایک خوش ذوق عالم کی خوش وقتی)۔

سیاسی ڈھانچے پر مذہبی تعبیرداروں کی گرفت آزاد منش بندوں کو بھلا کب گوارا ہوتی۔ انہوں نے اپنی اور آزادہ رو معاصرین کی تلملاہٹ کو چند علامتوں میں سمویا اور ان علامتوں کو بانس پر چڑھا دیا (آج کل احتجاجی جلوس والے پتلا بنا کر سر بازار جلاتے ہیں) زاہد، ناصح، واعظ، محتسب، مفتی، قاضی، فقیہ شہر، امیر شہر، لائے بکتی وغیرہ اسی طرح کی علامتیں ہیں جن سے بظاہر کھلواڑ کرنے کے بہانے اپنے اپنے وقت کے عظیم شاعروں نے طنز کے نشتر چلائے ہیں اور آزادی پسند حلقوں اور طبقوں کی ترجمانی کی ہے۔ بعد میں یہ نشتر بن گیا ـــــ آج تک (مفہوم بدل بدل کر) وہ فیشن چل رہا ہے۔ یوں، غزل کی شاعری میں بھی طنزیہ کلام کا چلن رہا۔ اور غزل بے ضرر سی شے نہیں رہ گئی۔ سب سے زیادہ رسیلے فارسی شاعر حافظ نے رسیلی صنف میں تلخی ایام خوب

www.taemeernews.com

گھونی ہے۔

یہ تبھی ممکن تھا کہ طنز نگار اہل قلم کسی خیال، کسی نسبتہً آزاد نظریے، کسی نہ کسی روشن خیالی کی لہر، کسی فکری بغاوت کے دل سے حامی ہوں، اور کسی نکسالی طور طریقے کے دل سے مخالف ہوں اور اس مخالفت کو مصلحتِ وقت کے حوالے نہ کیا ہو۔ ناگواری تپ کر غصہ بنے تو اظہار کے جتنے سانچے ڈھالتی ہے ان میں طنزیہ تحریر ایک بڑا جاندار سانچہ ہے۔ کلاسیکی ادب کے وسیع مطالعے، مظاہر کے تقابلی مشاہدے کے ساتھ ساتھ روح کا درد اور غصہ مسکراتے چہرے کے لبوں پر آئے تب کہیں طنز اور مزاح یکجان ہوتے ہیں۔ اور یہ نعمت اردو کو شروع سے نصیب رہی ہے ــــ مگر اب؟ ہاں! اور اب؟

سوچنے کی بات ہے کہ اردو نے قومی آزادی کے بعد پچھلے دس پندرہ سال سے اس صنف میں اپنا حق ادا نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا؟ اور کیا تو اس میں کس شے کی کمی ہے؟ اِن ولومنٹ (INVOLVEMENT) کی یا کمٹ منٹ (COMMITMENT) کی یا پیرپنٹ کی؟؟!!

شُوورلڈ گروپ کی جانب سے

ماہِ صیام کا نایاب تحفہ

ہماری دُعا ہے کہ رب العالمین اپنے حبیبؐ کے صدقے میں سارے مُسلمانوں کے روزے قبول فرمائے اور ایسی ہزاروں خوشیاں اپنی رحمت سے نصیب کرے۔ آمین

قدم قدم پر آپ کا ساتھ دیں
شُوورلڈ کے شوز، چپلس، سینڈلس اور سلیم شاہی

آج بھی اور کل بھی، ہر وقت خدمت کے لیے تیار

شُوورلڈ
شُوورلڈ سرکل
پتھر گٹی، حیدرآباد
فون: 44852

شُوورلڈ انڈسٹریز کمپنی
ناپلی اسٹیشن روڈ، حیدرآباد

نیو شُوورلڈ
عابد روڈ
حیدرآباد
فون: 550337

www.taemeernews.com

یوسف ناظم

اردو ظرافت نگاری

پیش لفظ

ٹھیک چالیس سال پرانی بات ہے

۴۴۔ ۱۹۴۳ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے ایم۔ اے کے امتحان کے لئے اردو صحافت اور اردو ظرافت میں سے کسی ایک موضوع پر مقالہ لکھنے کی اجازت مانگی تھی۔ بڑی ردوقدح کے بعد اردو ظرافت نگاری پر مجھے کام کرنے کی اجازت ملی۔ اس موضوع پر اُس وقت تک صرف رشید احمد صدیقی کی طنزیات و مضحکات شائع ہوئی تھی۔ ڈاکٹر سید سجاد مرحوم صدر شعبہ اردو میرے گائیڈ تھے اور عبدالقیوم خاں باقی مرحوم کا انہیں دنوں شعبہ اُردو میں لکچرر کی حیثیت سے تقرر ہوا تھا اور یوں کہنا چاہیئے کہ میرا مقالہ اصل میں انہیں کی نگرانی میں لکھا گیا تھا۔ اور اب کہیں جاکر توفیق ہوئی کہ میں ان بکھرے اوراق کو ازسرِنو ترتیب دوں۔ شگوفے کے اِس خاص نمبر کے لئے اس مقالے کو ترتیب دیتے وقت شاعری کا باب حذف کر دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ اس لحاظ سے بھی نامکمل ہے کہ اِس میں موجودہ دور کے لکھنے والوں کا ذکر نہیں ہے۔

نثر کا باب کنھیالال کپور پر ختم ہوتا ہے۔ کنھیالال کپور اُس وقت کے سب سے کمسن لکھنے والے تھے۔ مشتاق احمد یوسفی، ابن انشا اور کرنل محمد خاں کی تحریریں ۱۹۴۳ تک منظرِ عام پر نہیں آئی تھیں اس لئے ان کا بھی ذکر اس مقالے میں شامل نہیں ہے۔ مجتبیٰ حسین اور فرقت کاکوروی نے غالباً اُسی وقت لکھنا شروع کیا تھا۔

۴۰ سال کی اس مدت میں ظرافت نگاروں کی فہرست خاصی طویل ہوگئی ہے اور جن لوگوں نے اس صدی کے چوتھے دہے میں لکھنا شروع کیا تھا وہ خود اب پرانے کہے جانے لگے ہیں۔ عہدِ حاضر کی ظرافت نگاری ایک علیحدہ اور مستقل باب کی متقاضی ہے اور یقیناً کوئی بہتر مضمون نگار اس موضوع سے انصاف کر سکے گا۔

اس مقالے کے شائع کئے جانے کی وجہ یہ بھی ہے کہ غیر منقسم ہندوستان کی ایک ریاست کی ایسی یونیورسٹی کی دین ہے جس کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور اردو اُس وقت زندہ زبان تھی۔

www.taemeernews.com

باب اوّل ــــ اصول اور نفسیات

تمہید :۔ ظرافت نگاری ادب کی ایک اہم شق ہے۔ اسے ادب کی صنف ہونے کا درجہ تو حاصل نہیں ہے لیکن اس طرز نگارش کی ایک خصوصی نوعیت ہے اور یہ اصناف ادب میں شامل کئے جانے کی توجیہ پر ہے کیوں کہ اس کی ادبی اور سماجی اہمیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مختلف زبانوں کے ادب کے سرسری مطالعہ سے جس کے اسے زیادہ سے زیادہ مواقع حاصل ہیں، اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ کسی زبان میں افسانہ ناپید ہے تو کسی میں ڈراما نہ ہونے کے برابر ہے کسی زبان میں ناول نہیں ہے تو کوئی زبان خود نوشت سوانح عمریوں یا سفرناموں سے محروم ہے لیکن ہر ملک اور ہر زبان کے ادب میں ظرافت کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہے اور صحافت میں تو یہ بہرحال پائی جاتی ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ خندہ، مزاح اور طنز انسانی نفسیات کے اہم ترین جز ہیں اور جب یہ جذبات، اصول اخلاق کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تو اپنی ترقی یافتہ شکل میں افراد اور اقوام کی زندگی کے سفر میں مشعل راہ ثابت ہوتے ہیں۔

کسی ملک کے ادبی ظرافت کا مطالعہ کرنا درحقیقت اس ملک کے معاشرتی، تہذیبی اور سیاسی حالات کا مطالعہ کرنا ہے۔ ظریفانہ ادب قوموں کے رجحانات اور ان کی طرز فکر، مظہر ہوتا ہے۔ یہی بات ادب کی دیگر اصناف کے بارے میں بھی کہی جاسکتی ہے لیکن ظریفانہ ادب خاص طور پر سماج اور اقوام کے مزاج اور رویہ کی نشان دہی کرتا ہے سوسائٹی کے معائب اور افراد کی کوتاہیوں کو بے نقاب کرنے کے اور بھی کئی وسیلے ہیں لیکن ظریفانہ ادب اس کا سب سے بہتر اور خوبصورت ذریعہ ہے۔ ادبی ظرافت میں بظاہر تفریح کا عنصر کارفرما ہوتا ہے لیکن اس کی تہہ داری تفریح سے زیادہ تنقید کا پہلو رکھتی ہے۔ حیات انسانی سے اس کا بہت قریبی تعلق ہوتا ہے اور یہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ سماج اور افراد جتنے مہذب ہوں گے ادبی ظرافت بھی اتنی ہی شائستہ ہوگی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظرافت نگاروں کی فکر انگیز اور موثر تحریریں سماجی معاشرے کے نقائص کو دور کرنے اور افراد کے خیالات کو سنوارنے کا کام انجام دیں۔ اسپین کے شہرہ آفاق ظرافت نگار سروانٹے (CERVANTE) فرانس کا نوبل پرائز حاصل کرنے والا نثر نگار اناطول فرانس اور انگلستان کے طنز و مزاح نگار ادیبا شکسپیئر، پوپ، سوئفٹ اور ایڈیسن کی تحریریں اس کی واضح مثالیں ہیں اور معاشرے کی خرابیوں پر نشتر زنی کی ہے۔ ادبی ظرافت اپنی تہہ داریوں کی بنا پر درحقیقت ملکی مسائل اور تمدن کے حسن و قبح پر روشنی ڈالتی ہے۔

مزاح حیات انسانی کے الم انگیز لمحات کے تاثر کو زائل یا کم کرنے کے ساتھ ساتھ انسانی ذہن کو جودت اور تیزی عطا کرتا ہے۔ محفل میں انبساط اور مسرت کی فضاء مزاح ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ افراد کو ان کی کمزوریوں اور مضحکہ خیز عادتوں سے آگاہ کرنے کا کام بھی مزاح کے ذریعہ ہی انجام پاتا ہے۔ ظرافت ادب اور صحافت کے پیمانوں میں ڈھل کر گرتوں کو تھام لینے بلکہ کوشش میں لانے کا گُر ہے۔ صحافت جو ہماری روزمرہ زندگی کا ایک لازمی جز ہے

www.taemeernews.com

ظرافت کے پس پردہ ملک کے مسائل اور انتظامیہ کی ناکامیوں پر طنز اور نکتہ چینی کرتی ہے۔ ظرافت، تنقید کی خوبصورت ترین طرز ادا ہے۔ ظرافت کی ہمہ گیری سے انکار ممکن نہیں اسی لئے ہندوستان میں غالب، شبلی اور عبدالماجد دریابادی جیسے سنجیدگی پسند ادیبوں نے بھی ظرافت کا دامن تھاما ہے۔ ظرافت کا تعلق خندہ سے ہے جو ہر انسان کے تحت الشعور میں موجود رہتا ہے۔

ظرافت کی اس نفسیاتی اور ادبی اہمیت کی تحقیق کے لئے مغربی مفکرین نے ظرافت کے اصول پر بڑی اعلیٰ قسم کی بحثیں کی ہیں اور اس کی اقسام اور خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ میریڈتھ نے ظرافت کو حیات انسانی کی بہبود کے لئے بہت ضروری قرار دیا ہے اور اس امر کو بھی واضح کیا ہے کہ ظرافت کے لئے کس قسم کی سوسائٹی کی ضرورت ہے اور ظرافت کن حالات میں قوم اور معاشرے کے لئے فائدہ مند ثابت ہوسکتی ہے۔

ظرافت کے سرچشمۂ اول یعنی خندہ اور اس کی نفسیاتی تحقیق پر اسپنسر (SPENCER)، ولیم ہیزلٹ WILLIAM HAZLETT، جیمس سلے (JAMES SULLEY)، فرائڈ FREUD، برگساں، BURGSON، میکس ایسٹ مین (MAX EAST MAN) اور میک ڈگل (MC DOUGAL) جیسے مفکرین نے اپنی عمر عزیز کا بڑا حصہ صرف کیا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے اس کی ماہیت پر غور و فکر ہوا لیکن سترھویں صدی عیسوی سے اس پر اصولی تحقیقات کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے ہابس (HOBBES) نے اس ضمن میں اپنے نظریات پیش کئے۔ اس کے بعد سے آج تک اس پر تحقیقات ہورہی ہیں پھر بھی "خندہ" انسان کی ہنسی اور ان کے تحت الشعور سرچشموں پر مکمل روشنی پڑ چکی ہے اس لئے نئے نئے نظریئے ہمیشہ سامنے آتے رہے ہیں۔ جیسے جیسے زمانہ اور اس کی تہذیب پیچیدہ ہوتی گئی خندہ اور ظرافت بھی نئے اور پیچیدہ راستے اختیار کرتی گئی۔ اگلے صفحات میں کوشش یہ کی گئی ہے کہ ان مفکرین کے نظریوں کا کما حقہ جائزہ لیا جائے۔

ادبی ظرافت صرف ہنسی اور دماغی تفریح کے لئے نہیں ہے بلکہ خیالات کے تزکیے اور تنقیح کے لئے بھی ہے۔ ظریفانہ ادب کی حیثیت شراب دو آتشہ کی سی ہوتی ہے یعنی ایک طرح سے تو وہ تفنن طبع کا باعث ہے، ہنساتا ہے دل کو فرحت بخشتا ہے تو دوسری حیثیت میں یہی یار شاطر معلم اور رہبر بھی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آج برنارڈ شا کی ظریفانہ اور طنزیہ تمثیلیں قوم کی تابندہ ترین فکریات کی ترجمانی نہیں کرتی ہیں۔ کیا ایڈیسن نے اپنی طنز و ظرافت سے سترھویں صدی عیسوی میں انگلستان کی سوسائٹی کا رُخ نہیں بدل دیا۔ کیا سرونٹے اور اناطول فرانس کے مشہور و معروف کردار ڈان کوئکسوٹ (DON QUIXOT) جنرل ڈی ڈی GENNAL DEU اور فال اسٹاف، معاشرے کے مخصوص اور مضحک افراد کی عکاسی نہیں کرتے!

یہ ادعا غلط نہیں ہوسکتا کہ ظرافت ادب کی اہم ترین شاخ ہے اور اس کے عمل میں عالمگیر وسعت ہے۔ اس پس منظر میں اردو ادب کی ظرافت کے معیار، اسلوب اور اثر کی جانچ کی جانی چاہیئے۔

www.taemeernews.com

اُردو کا ظریفانہ ادب مجموعی حیثیت سے تہی دامن اور منزل نارسیدہ ہے۔ متقدمین نے ظرافت کا منتہائے مقصد خوش طبعی کا اظہار دل و دماغ کی تفریح اور جلب شہرت جانا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے اکثر و بیشتر شعراء نے ظرافت کو سب و شتم اور یاوہ گوئی کا ذریعہ بنایا۔

ہجو کے نام پر اپنے مخالف کی تضحیک و تذلیل میں ظرافت کو نچلے درجے کی چیز بنا دیا۔ کہنے کو اردو کے ظریف شاعروں کی تعداد دو سو سے بھی زیادہ ہے لیکن اولی ظرافت کے معیار کو برقرار رکھنے والے شاعر معدودے چند ہی ہیں۔

اُردو میں ظریفانہ شاعری نے حقیقی معنوں میں اُس وقت جنم لیا جب مغلیہ حکومت کا آفتاب ڈھل چکا تھا اور ہندوستانی قوم حالات کی نامساعدت کا شکار ہو رہی تھی۔ بادشاہ اور عمائدین سلطنت کا مذاق بگڑ چکا تھا۔ افراد کے خیالات پراگندہ تھے۔ ایسے ماحول میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ظرافت پنپ کیسے سکتی ہے۔ اس کے معیار اور شائستگی کا سوال تو بعد میں پیدا ہوتا ہے۔

ان حالات میں اردو شاعری میں ظرافت کا آغاز عرش دکھ دَد کے بہلانے اور برائے نام حکومت کرنے والے بادشاہوں کا دل خوش کرنے یا مٹتی ہوئی تہذیب پر منہ بنانے کے جذبات سے ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسے عہد کی شاعری کی حیثیت مجموعی کس معیار کی ہو سکتی ہے۔ سودا۔ انشا۔ مصحفی۔ رنگین اور جان صاحب اس عہد کے ظریف شاعر تو ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ظرافت کے پس پردہ ان کے کیا جذبات کام کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کا غیر جانبدارانہ اور اصولی تجزیہ ہمیں اس نتیجہ پر پہنچاتا ہے کہ جہاں ان کے کلام میں عمدہ ظرافت کے نمونے ملتے ہیں وہیں شخصی خصومت اور ذاتی عناد کے جذبے نے ان کی شاعری میں نامناسب اجزاء بھی پیدا کر دیئے ہیں۔ رنگین اور جان صاحب نے ہجویں نہیں لکھیں لیکن ان کے کلام میں جگہ جگہ عریانی اور فواحش کا رنگ جھلک آیا ہے۔

اُردو کی نثری ظرافت کا آغاز رقعات غالب سے ہوتا ہے۔ غالب، سجاد حسین اور سرشار کی ظرافت نگاری کو ژانر کے نقطہ نظر کے تحت بے مقصد ظرافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ مولوی محفوظ علی (جو قدیم لکھنے والوں میں سے ہیں) کی ظرافت نگاری میں مقصد کی جھلک نظر آتی ہے۔ ورنہ عام طور پر اس عہد کی نثری ظرافت، بے ضرر ہونے کی خوبی کے علاوہ دوسری خوبیوں سے محروم ہے۔

اردو ظرافت نگاری کا تفصیلی جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ اصولی ظرافت اور فنز و مزاح کے علمی اور نفسیاتی پہلوؤں پر نظر ڈالی جائے۔

ظرافت کا سرچشمہ اول یعنی خندہ اس کی ماہیت اور نفسیات

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مشہور مصنف ولیم ہیزلٹ نے خندہ کی ماہیت پر اولی نقطہ نظر سے اعلیٰ تحقیقی مضامین لکھے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

www.taemeernews.com

" صرف آدمی ہی وہ حیوان ہے جو ہنستا اور رلاتا ہے کیونکہ اس میں یہ فرق کرنے کی صلاحیت موجود ہے کہ خارج میں کیا موجود ہے اور کیا موجود ہونا چاہیئے تھا۔ ہم اس وقت روتے ہیں جب کوئی رکاوٹ ہماری خواہشات کی تکمیل میں مزاحم ہوتی ہے اور اس وقت ہنستے ہیں جب ہماری معمولی معمولی توقعات پوری نہیں ہوتیں اور ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ ہم حقیقی اور واقعی مصائب میں بیدردانہ اشک بہاتے ہیں اور غیر دانشمندانہ حرکات پر اس لئے ہنستے ہیں کہ ہمیں ان سے ہمدردی نہیں ہوتی۔ ہم ایسی باتوں پر تحقیر آمیز ہنسی ہنستے ہیں جو ہمارے یقین سے بالاتر ہوتی ہیں اور ایسی چیزوں پر بے ساختہ ہنس دیتے ہیں جو عقل سے بہت دور ہوتی ہیں۔

ادبی ظرافت پر بحث کرنے کے لئے خندہ کی ماہیت کا جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اسے ہی مزاح کا سرچشمہ اول مانا گیا ہے۔ بقول حالی مزاح جو جذبۂ خندہ کی ایک قسم ہے انسان کی جبلی خاصیت ہے جو کہ کم و بیش تمام افراد میں پائی جاتی ہے۔ اسپنسر، ڈارون اور فرائڈ کا بھی نظریہ یہی ہے کہ خندہ انسان کا ایک فطری حس ہے۔ مغرب میں "خندہ" پر اہم تحقیقات کا آغاز سترھویں صدی سے ہوا اور اس کے پہلے محقق ٹامس ہابس، THOMAS HOBBSS نے یہ نتیجہ اخذ کیا۔

" میں آخر میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ جذبۂ خندہ فوری شان فتحمندی کے سوا کچھ نہیں جو ہمارے اندر کسی قسم کی فوقیت کے فوری تصور یا دوسروں کی کمزوریوں کے تقابل سے پیدا ہوتی ہے"

اٹھارویں صدی کے محققین میں جنھوں نے خندہ کی جسمانی تشریح اور نفسیاتی عمل پر روشنی ڈالی، ڈاکٹر بیٹی، چیسٹر فیلڈ شافٹسبری، لارڈ کیمس مشہور ہیں اور ان کی تحقیقات اور نظریوں نے بعد میں آنے والے محققین کے لئے راستہ ہموار کیا۔ بیسویں صدی کے اہم محققین کے خیالات مندرجہ ذیل سطروں میں پیش کیے گئے ہیں :۔

خندہ کے مختلف نظریئے اور ان کی تشریح

بیسویں صدی کے محققین میں جیمس سلے، فرائڈ، برگساں، میک ڈوگل اور ایسٹ مین کی تحقیقات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان تحقیقات کی وجہ سے خندہ سے متعلق مختلف نظریوں کو قبولیت کا سند حاصل ہوئی۔

۱۔ جیمس سلے[1]:

خندہ سے بحث کرتے ہوئے اس نے دو اہم باتیں بیان کی ہیں۔ ایک تو خندہ کے اسباب اور دوسرے ان کی افادیت اور استعمال۔ اپنے نظریئے کے پہلے جزو پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ خندہ کا پہلا سبب ندرت NOVELTY قرار دیتا ہے ۲۔ اخلاقی کمزوریاں اور ۳۔ جسمانی کمزوریاں۔ دوسروں کی ان کمزوریوں پر ہم ہنستے ہیں۔ اخلاقی و اقدار

---

[1] AN ESSAY ON LANGHTA ENJOYMENT OF LONGHTA

www.taemeernews.com

کے مروجہ اور مسلّمہ اقدار سے ہٹ کر کسی شخص کی کوئی حرکت یا عادت اخلاقی کمزوری شمار ہوتی ہے اور اس کے ذکر پر ہنسی آتی ہے، کسی شخص کی جسمانی کمزوری یا نقص پر ہنسنا عام ہے خاص طور پر بچوں اور نوجوانوں میں۔ ۴۔ فقرہ مابلے اور قانون کی شکست و ریخت بھی ہنسی کا موجب ہوتی ہے۔ کوئی بچہ بڑوں کی سی باتیں کرنے لگے۔ داڑھی منہ لگالے، ان کا لباس، جوتا یا ٹوپی پہن لے آنکھوں پر چشمہ چڑھالے۔ یہ سب باتیں ہنسی کی موجب ہوتی ہیں۔ ۵۔ چھوٹی چھوٹی ناکامیاں، (DISAPPOINTMENTS) بھی ہلکی ہنسی کا باعث ہوتے ہیں۔ سوگز کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جانے والے پر ہم دل کھول کر ہنستے ہیں۔ ۶۔ غیر شائستگی اور موہومیت۔ کسی محفل میں اگر کوئی شخص کوئی نازیبا حرکت کر بیٹھے یا گفتگو کے دوران مطلب خبط کر دے تو خندہ ضروری ہے۔ ۷۔ سوانگ ۸۔ علم اور مہارت کی کمی۔ پڑھے لکھے لوگ بالعموم ان پڑھ لوگوں پر ہنستے ہیں اور وہ لوگ جو اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں، مبتدیوں پر ہنستے ہیں۔ ۹۔ ملّے، لفظی کھیل اور تفریحی ذہانت ۱۰۔ تکلیفات حیات سے استخلاص۔ خندہ کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم معمولی آلام سے نجات حاصل کرسکیں۔ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں جو عام ہیں اور ہر شخص کو پہنچا کرتی ہیں ان کا بہترین تریاق خندہ ہی ہو سکتا ہے۔ چلتے چلتے ٹھوکر لگ جائے یا سر دروازے سے ٹکرا جائے تو اسے ہنس کر ہی ٹال دینا چاہیئے۔ ۱۱۔ ذہنی عدم دلچسپی کا عمل۔ ۱۲۔ عجوبیت اور حیرت۔ ایسی باتوں پر جو دیکھنے میں عجیب و غریب معلوم ہوں انسان اُن پر فطری طور پر ہنستا ہے ۱۳۔ غیر متوقعہ اور اچانک واقعات۔ چلتے چلتے کوئی بزرگ گر پڑیں یا راستے میں کسی کے سر سے ٹوپی اڑ جائے۔ چھتری اُلٹ جائے تو خندہ ضروری ہو جاتا ہے۔

جیمس سلے آگے چل کر جس اہم نکتہ کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ ذہنی خندہ کے ساتھ ساتھ ذہنی خندہ ہے وہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ ذہنی خندہ دل و دماغ کی تفریح ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جو ادبی ظرافت کی اساس ہے۔

فرائڈ[1]:۔ خندہ کی نفسیات اور ماہیت سے متعلق فرائڈ کا مشہور نظریہ (EMOTIONAL ENERGY) ہے یعنی نفسی توانائیوں کی حفاظت اور کفایت۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ اسپنسر کا خیال تھا کہ خندہ انسانی جسم کی فالتو توانائیوں کا مظہر ہے لیکن فرائڈ اس نظریئے کا حامی ہے کہ خندہ کا جذبہ انسان کے تحت الشعور میں موجود رہتا ہے اور وہ انسان کی نا مدتوانائیوں کی پیداوار نہیں بلکہ نفسی توانائیوں کے خاص موقعہ و محل کی مناسبت کے ساتھ استعمال کئے جانے کا نام ہے۔ اس کا یہ نظریہ سائنٹفک الفاظ میں اس مفہوم کو ادا کرتا ہے کہ "اختصار ہی شوخی اور ظرافت کی جان ہے۔ اس نظریہ کی وضاحت کے لئے جن واقعات کو پیش کیا گیا ہے ان کو مختلف حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے ایک جس پر وہ زور دیتا ہے وہ خندہ کے جذبے کو الفاظ کا جامہ پہنانا اور ان میں تغیّر و تبدل کر کے جذبات کو ٹھوس بنانے کا عمل ہے اس کے کئی طریقے ہیں مثلاً ذو معنی الفاظ کا استعمال جیسے کہ استعارات، رعایت لفظی صنعت ایہام اور تلمیحات کے ذریعے خندہ پیدا کرنے کی کوشش۔ بہرحال فرائڈ کے یہ سب کچھ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اختصار اور کفایت سے کام لیکر

---

[1] WIT WITH ITS RELATIONS TO THE UNCONCIOUS BY FREUD

www.taemeernews.com

شوخی اور ذہانت کو عالمگیر بنایا جائے۔ اس کے علاوہ فرائڈ کے نزدیک فیملات کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ اس نے لکھا ہے "فیملات میں جو مفہوم و معنی ہوتے ہیں وہ اسے ظرافت میں تبدیل کر دیتے ہیں"۔ تیسری چیز جس پر وہ زور دیتا ہے ظرافت ہے اس کی اس نے دو قسمیں بیان کی ہیں جن پر آگے چل کر اظہار خیال کیا جائے گا۔

برگسان[1] :- برگسان خندہ کے بنیادی اسباب دس قرار دیتا ہے۔

۱۔ خندہ تصحیح کرتا ہے۔ ہم بسا اوقات کسی پر صرف اس لئے ہنستے ہیں کہ اسے علم اور احساس ہو جائے کہ اس کی حرکتیں دوسروں کی ہنسی کا باعث ہوتی ہیں۔ یہ ہنسی اس شخص کی اصلاح کے لئے ہوتی ہے۔ برگسان نے اس نظریے پر اپنی کتاب "نفسیات خندہ" میں تفصیل سے بحث کی ہے۔

۲۔ خندہ میکانیت کے خلاف ردِ عمل ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی نشست و برخاست یا خورد و نوش کے معاملے میں بہت زیادہ میکانی واقع ہوا ہو اور مشین کی مانند مقررہ طریقے پر چلتا ہو یعنی اس کی حرکتوں میں کوئی لچک یا بے ساختگی نہ ہو تو اس کی میکانیت یقیناً مضحکہ انگیز ثابت ہوگی۔

۳۔ غائب دماغی، یہ کیفیت چند لوگوں کے ساتھ مخصوص نہ سہی لیکن ہر شخص پر کبھی نہ کبھی وقتی طور پر طاری ہو ہی جاتی ہے۔ آدمی کیلا چھیلتا ہے۔ چھلکا ہاتھ میں رکھ لیتا ہے اور کیلا پھینک دیتا ہے۔

۴۔ چوتھا اہم سبب عیب اور پستی ہے۔ خواہ وہ جسمانی ہو یا دماغی لیکن اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ دوسرا انسان اس کی نقل کر سکے ورنہ خندہ، رحم و ترحم کے جذبے میں تبدیل ہو جائے گا۔ برگسان کا یہ نظریہ بڑی دقت نظر اور سوچ بچار کا نتیجہ ہے۔ یعنی یہ کہ اگر ہم کسی لنگڑے شخص یا شرابی کی نقل اتاریں تو یہ دوسروں کی ہنسی کا باعث ہوگا لیکن اگر یہی لنگڑا پن ایسا ہو جس کی نقل کرنا دشوار ہو تو اس صورت میں ہمارا خندہ رحم کی صورت اختیار کرے گا اور ہم اس شخص سے ہمدردی کریں گے نہ کہ اس کا مذاق اڑائیں گے۔

۵۔ ذہنی لچک کا فقدان یا بے اختیار کسی ضابطہ، قاعدے، قانون کی بات بے موقع زبان سے نکل جائے۔ اس نظریے کو واضح کرنے کے لئے ایک لطیفہ یا دلانا مناسب ہوگا۔ ایک شخص میدانِ جنگ میں گولی کا نشانہ بنا اور مارا گیا۔ گولی اس کی پیشانی میں لگی تھی۔ اس کے ایک دوست نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا، اچھا ہوا گولی آنکھ میں نہیں لگی۔ ورنہ آنکھ ضائع ہو جاتی۔ بینائی کی اہمیت کا خیال اسکے ذہن میں کچھ اس طرح موجود تھا کہ دوست کی موت کا خیال اسکے ذہن سے نکل گیا۔ اس شخص کی بات بظاہر ہنسی کا باعث ہو سکتی ہے۔

۶۔ جسمانی اخلاقی اور روحانی اقدار کا ایک دوسرے پر غالب آنا۔ بنے ہوئے مشائخین اور زاہدوں کا مضحکہ بالعموم تلبیس کے ذریعہ اڑایا جاتا ہے یعنی یہ کہ اگر کسی شیخ کی اخلاقی اور روحانی کیفیت بیان کرنی ہو تو اس کی تصویر بناتے وقت اس کی داڑھی بہت زیادہ لمبی بنادی جاتی ہے۔ اس کے سر پر بڑا عمامہ رکھ دیا جاتا ہے۔ یا کسی عاشق کو تصویر میں اس قدر دبلا اور کمزور دکھایا جائے کہ اس کی پسلیاں تک دکھائی دینے لگیں یا کسی اخبار نویس کو کتابوں کے ڈھیر میں اس طرح دفن کر دیا

---

[1] LAUGHTER HENRY BERGSON

www.taemeernews.com

جائے کہ فقط اس کا سر اور چہرہ نظر آ سکے۔ مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے نمائشی رکھ رکھاؤ اور غلو کو ظاہر کیا جائے شاعر کہتا ہے

شیخ اللہ رے تیری عیاری کس تو حیہ سے پڑھ رہا ہے نماز

یہ اظہار بیان خندہ کا موجب ہے خواہ واقعہ ہو یا نہ ہو۔

۷۔ جسمانی پریشانی۔ جیسے کسی بے ہنگم آدمی کی پریشانی۔ سوتے میں خراٹے لینا۔ یا کسی کا بہت زیادہ گردن ہلا ہلا کر بات کرنا۔ بار بار ابرو چڑھانا۔ منہ بنانا۔ یہ سب ہنسی کا باعث ہوتے ہیں۔

۸۔ غیر ذی روح اشیاء کو زندہ بنا دینا۔ ہنسی پیدا کرتا ہے۔

۹۔ الفاظ اور معنی کی تکرار اور اٹ پھیر سے بھی خندہ پیدا ہوتا ہے جیسے بچہ ماں کو نصیحت کرنے لگے یا باتوں باتوں میں کوئی غلط لفظ منہ سے نکل جائے۔

۱۰۔ تکلیف کے اثرات کو زائل کرنا۔ خندہ کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ چھوٹی چھوٹی تکالیف کے اثر کو زائل کیا جا سکے۔ راستے میں چلتے چلتے ہم گر پڑیں اور خفیف سی چوٹ آجائے تو ہم خود ہنس دیتے ہیں۔ گویہ ہنسی خفت آمیز ہوتی ہے لیکن تکلیف کے احساس کو مٹا دیتی ہے۔

میک ڈوگل:۔ میک ڈوگل نے خندہ پر نئے انداز سے بحث کی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ خندہ تبسم کی ترقی یافتہ شکل نہیں ہے بلکہ انسان کا وہ فطری جذبہ ہے جو اس کے تحت الشعور میں موجود رہتا ہے اور مختلف وجوہات کی بناء پر حرکت میں آتا ہے۔ تبسم سے خندہ کا کوئی تعلق نہیں۔ دوسرا اصول اُس نے یہ بتایا ہے کہ جب غیر جانبدارانہ ہمدردی نہیں پیدا ہو سکتی تو خندہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب انسان کسی دوسرے پر ہنستا ہے تو اس لحظہ نظر کے ساتھ ہنستا ہے کہ وہ راست طریقے پر اس سے ہمدردی نہیں کرنا چاہتا۔ اس کی غلطی اور کمزوری کی نشاندہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنے تاسف یا ہمدردی کو غیر جانبدارانہ طریقے پر صرف ہنسی کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ اس سے زیادہ گہری بات یہ ہے کہ انسان کی ہنسی کے پیچھے خود اس کا درد ناکامی اور تاسف پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسروں کی ناکامی دیکھ کر اسے اپنی ناکامی یاد آتی ہے لیکن اس پر رنجیدہ ہونے کی بجائے وہ اسے ہنس کر ٹال دیتا ہے۔

ایسٹ مین:۔ ایسٹ مین نے خندہ کی ماہیت پر اگرچہ کوئی تفصیلی بحث نہیں کی ہے لیکن یہ نکتہ اسی نے بتایا ہے کہ خندہ متعدی ہوتا ہے۔ جب ہم دوسروں کو ہنستا دیکھتے ہیں تو ہمیں بھی خواہ مخواہ ہنسی آجاتی ہے۔ ہنسی متعدی ہے اس شہرۂ آفاق نظریے کا خالق ایسٹ مین ہی ہے۔

خندہ انسان کی جبلی خاصیت ہے۔ اس کی نفسیاتی تشریح کے بعد خندہ پر اصولی بحث کا دوسرا قدم یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ فطرت انسانی کا یہ ترجیحات ناآشنا جذبہ کس طرح ان نیت سے ہم کنار ہوتا ہے۔

ظرافت کا آغاز: خندہ کے جذبۂ فطری کی کئی قسمیں ہیں اور یہ مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ فتح، حقارت

www.taemeernews.com

برتری، تفرع، مضحکہ خود پسندی، تکریم و تعظیم وغیرہ۔ یہ سارے جذبے اور احساسات خندہ کے پس پردہ کارفرما ہوتے ہیں۔ ان جذبات کو نوعیت کے اعتبار سے ۳ قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱. احساس فتح اور جذبۂ حقارت
۲. مسرّت اور تفریح
۳. ہمدردی اور مضحکہ

لیکن یہ جذبے ظرافت کا رنگ اس وقت اختیار کرتے ہیں جب انسانیت کے بنیادی عناصر سے ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ ظرافت کا لباس انھیں اسی وقت ملتا ہے جب یہ جذبے انسانی صفات سے متصف ہوکر جلوہ آرا ہوتے ہیں پہلے پہل خندہ کا اظہار تشدد، بھولے پن، بے مروتی اور احساس برتری پر مبنی تھا یعنی انسان کی ہبلنی انتقام کے جذبے کی تسکین کے لئے بھی انسانی صفات جب تک شائستگی کے پیمانوں میں نہیں ڈھلی تھیں جاہل انسان کی ہبلنی خنجر بکف ہوتی تھی لیکن جیسے جیسے انسان مہذب ہوتا گیا اور اس جذبے پر تہذیب و تمدن کے اثرات مترتب ہوتے گئے خندہ سے آہستہ آہستہ تنفر کا جذبہ کم ہوتا گیا اور اس پر ہمدردی، انسان دوستی اور جذبۂ ترحم کا رنگ غالب آتا گیا۔

خندہ کی انسانیت آموزی (HUMAN IZATION) کی بحث کے آغاز میں دو متضاد نظریوں کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ یہ نظریے ہابس اور میک ڈوگل کے ہیں۔ ہابس خندہ کی قدیم ترین صورت سے بحث کرتا ہے میک ڈوگل خندہ کی ترقی یافتہ شکل کو پیش کرتا ہے۔ ہابس پوچھتا ہے ظرافت کیا ہے؟ اور موخرالذکر پوچھتا ہے ظرافت کیا کرتی ہے؟ ہابس کا خیال ہے کہ ظرافت سے ہمدردی کا عنصر خارج ہے۔ میک ڈوگل کہتا ہے ظرافت ہمدردی کی پیداوار ہے۔ ان نظریوں کے تضاد کی سب سے بڑی وجہ سوسائٹی کا فرق ہے۔ جوں جوں تہذیب و معاشرت ترقی کرتی گئی ظرافت کا رنگ نکھرتا گیا۔ اور خندہ جب چلا پا چکا تو تہذیب کا اثاثہ بن گیا۔ موجودہ شکل میں خندہ، ظرافت کے روپ میں انسان کے ذوق، شائستہ خیالات اور جذبہ ہمدردی کا آئینہ ہے۔ سسٹلی اسمتھ نے اس ارتقائی کیفیت کو یوں بیان کیا ہے۔

"تہذیب، جسمانی خندہ کو خندۂ ذہنی کا روپ دے دیتی ہے اور مزاح خیال کو جودت بخشنے والا خندہ ہے"۔

اس پس منظر میں یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جذبۂ خندہ کی انسانیت آموزی نے انسان کو ظریف بنایا اب دیکھنا یہ ہے کہ ظرافت کس طرح ادبی رنگ اختیار کرتی ہے۔

ظرافت اور مزاح کی تشریح

ظرافت اور مزاح میں فرق:۔ اردو میں 'طنز و مزاح' ایک ترکیب بن گئی ہے اور یہ مجموعۂ الفاظ عام طور پر ظرافت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ظرافت اپنے وسیع معنوں میں ہیومر، وٹ اور سٹائر HUMOUR, WIT & SATIRE ان تینوں ادبی خصوصیات کا آئینہ ہے لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ ان تینوں کی الگ الگ نوعیت اور

www.taemeernews.com

حیثیت ہے اور خاص طور پر ظرافت (WIT) اور مزاح (HUMOUR) کے فرق کی وضاحت کے لئے عالمانہ بحثیں ہوئی ہیں. چند مفکرین کے نظریوں کی روشنی میں اس فرق کو ذیل کی سطور میں واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے.

جیمس سلے ان دونوں کے فرق کو اس طرح واضح کرتا ہے کہ "مزاح ایک جذباتی (EMOTIONAL) حالت ہے اور ظرافت ذہانت کی ایک خاص وضعداری اور انداز ہے. جارج ایلیٹ کا خیال ہے کہ مزاح ظرافت سے پہلے پیدا ہوا اور مزاح میں نا تحانہ ہنسی کا عنصر بھی شامل ہے اور جذبۂ ہمدردی بھی جو زندگی اور فطرت کی ہم آہنگی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے ظرافت سے متعلق اس کا نظریہ یہ ہے کہ اس میں درشتی اور تظلم ہے. مزاح موقعہ محل اور خصوصیات سے پیدا ہوتا ہے اور ظرافت طعن و طنز کی تلوار ہے اور اپنی فطرت میں خندہ رکھتی ہے. اس کا خیال ہے کہ ظرافت مختصر تیز اور نوری ہوتی ہے.

برگساں کی رائے ہے کہ مزاح میں اصولی طنز ہے. برگساں کی یہ رائے ذرا پیچیدہ ہے لیکن ظرافت اور مزاح کے فرق کو ولیم ہیزلٹ نے وضاحت سے ظاہر کیا ہے. وہ کہتا ہے خندہ کی دو قسمیں ہیں. ایک مزاح اور دوسری ظرافت. مزاح کی تعریف وہ یوں کرتا ہے "مزاح کسی مضحک شئے کو اس کے اصلی رنگ میں اور صحیح قد و خال کے ساتھ پیش کرتا ہے اور ظرافت اس شئے کا کسی دوسری چیز سے مقابلہ کرنے اور دونوں میں امتیاز کرنے کا طریقہ اظہار ہے. مزاح انسان کے اس جذبۂ فطری کا ارتقا ہے جسے خندہ کہتے ہیں اور ظرافت تخیل اور آرٹ کی پیداوار ہے.

مولانا حالی نے مزاح کی تعریف میں زیادہ وضاحت سے کام لیا ہے. وہ کہتے ہیں "مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لئے کیا جائے ایک ٹھنڈی ہوا کا جھونکا، ایک سہانی خوشبو کی لپیٹ ہے. جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں. ایسا مزاح نہ صرف حکما، بلکہ انبیا نے بھی کیا ہے. اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لئے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں. اس سے جودت اور ذہن کو تیزی ہوتی ہے.

گزشتہ تین صدیوں میں مزاح اور ظرافت سے متعلق نظریات بدلتے رہے ہیں. انگلستان میں خاص طور پر جہاں مزاح اور ظرافت پر بیسیوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں، ان دونوں کے فرق کو بحث کا مرکز بنایا گیا ہے. ظرافت پہلے بھی جودت ذہنی، چہل، برجستہ گوئی کی خصوصیات کی حامل سمجھی جاتی تھی. اسے خطرناک بھی مانا جاتا تھا اور عالمانہ طریقہ اظہار بھی. اور آج بھی اس کی ان صفات اور خصوصیات پر دو رائیں نہیں ہیں. ظرافت ایک ایسا ہتھیار ہے جو خوب و زشت، اچھے اور برے دونوں کاموں میں استعمال ہو سکتا ہے. اس سے چاہے آپ آپریشن کر لیجئے چاہے قتل عمد کا الزام اپنے سر لے لیجئے. ظرافت ذہین اور سمجھدار طبقے کے کام کی چیز ہے. ظرافت سے متعلق یہ نظریہ بھی رہا ہے کہ چونکہ اس میں صرف ذہانت کا عنصر ہوتا ہے اس لئے یہ ہمدردی، محبت، مروت اور نیکی کے جذبات سے محروم ہے اور اس کے ثبوت میں لکھنے والوں کے ایسے کردار پیش کئے گئے جن کی زبان سے ظرافت نگاروں نے پُر مذاق لیکن غیر ذمہ دارانہ اور دل دکھانے والی باتیں کہلوائیں. اس لئے ہیوریعنی مزاح کو نسبتاً نظری سمجھا گیا اور کہا گیا کہ ظرافت کا خمیر مزاح سے نہیں اٹھتا ہے تو وہ تکلیف دہ اور دل شکنی

لہ مقالات حالی حصہ اول

www.taemeernews.com

کا باعث ہے۔ اکثر صورتوں میں ظرافت کی قیمت برسوں کی دوستی ہوتی ہے۔ ایک ظریفانہ جملہ، دیرینہ تعلقات کے لئے قاتل ثابت ہوسکتا ہے جب کہ مزاح اس عیب سے مبرا ہے۔ مزاح کو عطیۂ خداوندی بھی کہا گیا ہے۔ اس کا تعلق مزاج سے ہوتا ہے۔ خوش مزاجی اور بذلہ سنجی طبعی اور فطری ہے جب کہ ظرافت ترشے ہوئے ہیرے کی طرح کی چیز ہے۔ اس پتھر کو جتنا خوبصورت تراشا جائے گا اور دیکھنے سننے میں قابل قبول بنایا جائے گا اس کی مانگ بڑھے گی۔ ظرافت کے لئے ذہانت، علم، استعداد یہ سب چیزیں ضروری ہیں۔ مزاح خندہ کی بہت زیادہ لطیف Sublime صورت ہے جس میں شاعرانہ رجحانات اور تفریح طبع کے عناصر کارفرما ہوتے ہیں اس کا تعلق نفسیات انسانی سے ہوتا ہے اور اس کی تہہ میں وہ جذبۂ مسرت پنہاں ہوتا ہے جو کبھی کبھار لبوں پر صرف ہلکے تبسم کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ظرافت خندہ کی دوسری نوع ہے جو ہماری نفسیات سے زیادہ ہمارے تخیل سے تعلق رکھتی ہے۔ اسے ذہن انسانی کے عمل (Reaction) کا پرتو سمجھنا چاہیئے۔ مزاح پیداوار ہے جذبہ کی اور ظرافت پرتو ہے شعور اور ادراک کا۔

مزاح کا منشا تبسم زیر لبی ہے لیکن ظرافت اپنی ماہیت اور اثر کے لحاظ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ مزاح میں شگفتگی ہے اور ظرافت میں شگفتگی اور شوخی دونوں۔ مزاح خوش طبعی اور خوش مزاجی کا نام ہے جب کہ ظرافت میں لطف اور شادکامی کے عناصر ہیں۔

اٹھارویں صدی عیسوی میں البتہ ہیومر سے متعلق جو نظریات پیش کئے گئے ان کی رو سے مزاح عیوب سے پاک نہیں تھا اسے غیر ذمہ دارانہ، وحشی طرز ادا، غیر مربوط اور شائستگی کے خلاف سمجھا گیا اور اس کی وجہ یہ تھی آپرا، فلم، سرکس اور اس قسم کے دوسرے ناٹک تماشوں میں مزاح کے نام سے جو مسخرہ پن، لوگوں کی ہنسی کے لئے پیش کیا گیا اس نے مزاح کی صحیح قدر و قیمت گھٹا دی۔ یہ کچھ اس قسم کا مزاح تھا جس میں ظرافت بھی نہیں تھی کیونکہ اس میں نہ تو کوئی بلند نظری تھی نہ علمیت۔ نہ گہرا طنز تھا نہ ذہنی جودت کی کوئی بات۔

مزاح اور ظرافت سے متعلق مختلف ادوار میں نظریات بدلتے رہے اور اس بناء پر انگریزی ادب کے شہرہ آفاق مزاحیہ کرداروں مثلاً فال اسٹاف اور ڈان کوئکسوٹ سے متعلق بھی لوگوں کے خیالات تبدیل ہوتے رہے۔ سروانٹیز اور شیکسپیئر کے تخلیق کئے ہوئے یہ کردار ہمیشہ توجہ کا مرکز رہے۔ فال اسٹاف کو عاشق مزاج بلکہ دل پھینک رومیو اور پیٹو مسخرہ سمجھا گیا اور ڈان کوئکسو کو نیم پاگل مانا گیا لیکن اٹھارویں صدی کے آخر میں مزاح اور ظرافت کے ان نئے نظریات کی روشنی میں فال اسٹاف کو ایک لپندیدہ اور بے مزہ آوارہ گرد شخص کی حیثیت حاصل ہوئی اور ڈان کوئکسو کو شاہ خرچ انسان دوست کے روپ میں دیکھا گیا۔ اس کی مضحک، مہمل اور غیر معقول باتوں پر ہنسے سب لیکن ان کی ہنسی ہمدردی اور محبت کے جذبے سے عاری نہیں تھی۔

ان تفصیلات اور وضاحتوں کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا مناسب ہوگا مزاح سے متعلق صحیح نظریہ یہ ہے کہ اس سے ہمدردی کا جذبہ خارج نہیں ہے اور مزاح سے اگر ہونٹوں پر ہنسی آتی ہے تو آنکھوں میں آنسو بھی جھلک سکتے ہیں۔

www.taemeernews.com

مزاح اور ظرافت پر تحقیقی کام کرنے کے معاملہ میں یہ بات بھی دلچسپی کی ہے کہ اس کام پر انگلستان کے محققین کی اجارہ داری تھی لیکن انیسویں صدی میں اس اجارہ داری کے خلاف جرمن محققین نے آواز اُٹھائی اور انگلستانی نظریات کے متضاد نظریئے پیش کئے۔ ان جرمن نلاسفروں میں جین پال رچٹر (JEAN PAUL RICHTER) کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ جین پال کے متعلق کہا جاتا ہے کہ بذاتِ خود برطانوی مزاح نگاروں سے متاثر تھا لیکن بعد میں خود اس کے اپنے خیالات نے برطانوی مزاح نگاروں کو متاثر کیا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مزاح، کامک کی ایک جمالیاتی شکل ہے۔ اُس نے مزاح نگار کو مزاح نگار کے بدن سے الگ نہیں مانا اور کہا کہ وہ خود بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ مزاح کے ہمہ گیر ہونے کی خاصیت کی بناء پر مزاح کسی شخص واحد کو نادان نہیں ٹھہرا سکتا بلکہ صحیح مزاح یہ ہے کہ پوری دُنیا کو نادان مانا جائے جس میں مزاح کی تخلیق کرنے والا شخص بھی شامل ہے۔ جین پال اس خیال کو بھی پیش کرتا ہے کہ احساسِ برتری میں بھی درد کی کسک موجود ہے۔

آج مزاح فن کی اعلیٰ ترین شکل ہے جو صرف نفیس ہی نہیں شائستگی اور مروت کی دولت سے بھی مالا مال ہے۔ آج ایک بذلہ سنج اور ظریف شخص وہی ہے جو فرحت و انبساط اور ہنسی کی فضاء پیدا کرنے کی صناعانہ مہارت اور صلاحیت رکھتا ہو۔ مزاح اب کو وسیع معنوں میں استعمال ہونے لگا ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مزاح کے بنیادی معنی بدل گئے ہیں۔ درخت وہی ہے صرف کونپلیں نئی پھوٹی ہیں۔[1]

ظرافت کی تفصیل اور خصوصیات :۔ آئندہ سطروں میں ظرافت کی تفصیلی خصوصیات پر بحث مقصود ہے کیونکہ یہی اس مقالہ کا اصل موضوع ہے۔

ظرافت کو ہماری سوسائٹی میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اسے انسان کی اعلیٰ دماغی اور عمدہ تخیل کی پیداوار سمجھا جاتا ہے۔ ظرافت کا انسان کے وجود سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ازمنۂ قدیم کی سوسائٹی پر بھی ظرافت کسی نہ کسی رنگ اور طور سے سایہ فگن رہی ہے۔ جیسا کہ رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب طنزیات و مضحکات میں لکھا ہے اہلِ یونان کی ابتدائی زندگی میں بھی ظرافت کا عنصر موجود رہا ہے۔ الفلاحت اور الخمر کے دو دیوتا تھے جن کے نام پر نذریں چڑھائی جاتی تھیں اور عیش و نشاط کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ ان محفلوں میں ظرافت اور مزاح کی پھلجھڑیاں چھوٹا کرتیں اور ہنسی کے فوارے اُڑتے تھے۔ اس لئے یہ سمجھنا چاہیئے کہ ظرافت کسی خاص عہد کی پیداوار نہیں بلکہ یہ پانی کا ایک چشمہ ہے جو زمانۂ قدیم سے بہتا چلا آرہا ہے۔

اصل ظرافت کیا ہے :۔ ایڈیسن کہتا ہے "ظرافت کا خدا اپنے کندھے پر کمان ترکش رکھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کئی تیر ہوتے ہیں۔ اس کی نظروں میں بلا کی تیزی ہوتی ہے۔ دیکھتے ہی وہ خوف و محبت دونوں پیدا کرتا ہے"۔

ڈارون کا نظریہ ہے "مضحکہ خیز خیال سے تخیل کو گدگدی ہوتی ہے اور بہت زیادہ ہنسی آنسو لاتی ہے"۔ ڈارون کے

[1] مندرجہ بالا سطور میں جن نظریات اور خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اُن کا ماخذ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ہے۔

www.taemeernews.com

اس خیال پر یہ مصرع صادق آیا ہے۔

زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں

ظرافت اصل میں خیال اور اظہار کا وہ سانچہ ہے جس میں ذہنی عمل آزاد اور رواں ہوجاتا ہے۔ چونکہ ظرافت ہماری فہم و ادراک کا عمل ہے اس لئے ذہنی پختگی اس کی اساس ہے۔ سمجھ بوجھ کو اس میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ بات میں سے بات اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب تخیل پوری طرح کام کر رہا ہو۔ ظرافت حیات انسانی کے خوشگوار لمحات کی روح رواں ہے۔ واشنگٹن ارونگ لکھتا ہے "ایسی ظرافت جس میں الفاظ کم اور مسرت بخش ہنسی کا عنصر زیادہ ہو زندگی کے صحیح لطف کا آئینہ ہے۔"

معاشرے میں ظرافت بجائے خود اور اس کی اہمیت اس لئے برقرار ہے کہ اس کے ذریعہ انسان خود اپنی اور اپنے ہم جنسوں کی غلطیوں کو خوش کن مگر پُراثر انداز میں پیش کر سکتا ہے۔ مذاق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ باہمی محبتوں کی دھوپ ہے۔ گفتگو کی ایک ہلکی سی نشانہ بازی ایک خوشگوار موسم بہار اور ایک مسرت بخش فضا کا احساس ہے۔

ہابس (HOBBES) کی رائے میں ظرافت ایک ہرن ہے جو ہمیشہ چھلانگ بھرتی ہے اور یکسانیت رکھنے والی چیزوں پر دوڑتی ہے۔ اس سے خوشگوار تصویریں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی نظر میں حسن پیدا ہوتا ہے۔ وہ دل کو تسکین پہنچاتی اور خیال کو لذت بخشتی ہے۔

لاک لکھتا ہے "ظرافت حافظے کی فوری قوت کا ایک جزو ہے" جب کہ پوپ کا خیال ہے صحیح ظرافت ایک فطری صلاحیت ہے۔

یوں تو سبھی فنون لطیفہ کے لئے خداداد صلاحیتیں ضروری ہیں لیکن ظرافت کے لئے خواہ وہ ادبی ہو یا مجلسی برائے تفریح ہو یا تزکیہ اخلاق کے لئے خداداد صلاحیتوں کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ کمزور شعر، بے ربط تقریر، بے مزا گفتگو یہ سب چیزیں سہی جا سکتی ہیں لیکن بے تکی ظرافت پوری محفل کو مکدر کر دیتی ہے۔ شوخی طبع اور شگفتگی مزاج انسانی طبیعت کے جوہر ہیں اور انہی کی زمین سے ظرافت کی شراب کشید کی جا سکتی ہے۔

ظرافت کی تعریف متعین کرنے میں ہیزلیٹ نے تفصیل اور وضاحت سے کام لیا ہے۔ ہیزلیٹ ظرافت کے گرد ایک حصار باندھ دیتا ہے۔ اس نے ظرافت کی حدیں مقرر کی ہیں۔ پیشہ ور ظریف اس کے نزدیک بے معنی ہیں۔ وہ کہتا ہے مسلسل ظرافت دل کو سخت بنا دیتی ہے۔ پیشہ ورانہ ظرافت اچھی صحبت اور اچھے آداب کو نقصان پہنچاتی ہے۔ وہ تو کہتا ہے کہ لطائف و ظرائف بھی جن کا مقصد تصحیح ہونا چاہیئے، اور جن سے سبق ملنا چاہیئے، کثرت استعمال اور پیشہ ورانہ استحصال کی بنا پر اپنا اثر کھو دیتے ہیں۔ اپنے اس نظریئے کی تائید میں ہیزلیٹ لکھتا ہے "ظرافت گفتگو میں نمک کی طرح ہونی چاہیئے نہ کہ غذا کی طرح۔"

فرائڈ کی تحقیق اور اس کا تجزیہ یہ ہے کہ ظرافت کو ہمیشہ عقلیت تنقیدی فیصلے اور دماغی قوت کے خلاف جنگ

www.taemeernews.com

کرنی پڑتی ہے۔ اگر بہت زیادہ عقلی گفتگو کی جائے اور یہ کہنے کی ضرورت پڑے۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

تو یہ ایک انحراف ہوا۔ ہماری کسی بات پر شدید تنقید کی جارہی ہو اور نقاد نکتہ چین بن کر ہمارے اعمال کا جائزہ لے رہا ہو۔ دلائل و براہین کی ضربیں پڑ رہی ہوں تو ایسے موقع پر ظرافت کے سوا اور کوئی چیز کام نہیں آسکتی۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے ؎

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا

دباؤ سے بچنے کے لئے بھی ہم ظرافت کی پناہ چاہتے ہیں (کچھ لوگ ظرافت سے پناہ مانگتے ہیں) داغ کا شعر ہے۔

لطف مئے تجھ سے کیا کہوں زاہد
ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

فرائڈ، ظرافت کو الفاظ کا کھیل (WORD PLAY) بھی کہتا ہے اور مہملات کا تماشا بھی اور کہتا ہے جس ظرافت نام ہے اس فعل کا جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ ظرافت سے پیدا ہونے والی لذت کو کس طرح شعور کی مدد سے کسی دباؤ سے محفوظ رکھا جائے۔

وہ ظرافت کو بے مقصد اور با مقصد اقسام کی ظرافت میں تقسیم کرتا ہے۔ بے مقصد ظرافت سے اس کی مراد وہ ظرافت ہے جو صرف تفریحِ طبع کا باعث ہو اور با مقصد جس میں تصحیح اور اصلاح کی خواہش مضمر ہو۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اپنے دشمن کو چڑیا بنانے اور اس کا مضحکہ اُڑانے سے دیکھنے اور سُننے والے کو ہنسی آتی ہے۔ اس ہنسی کو ہم اپنے دشمن کی شکست سمجھتے ہیں اور دوسروں کو ہنسا کر اپنی فتح کی داد چاہتے ہیں۔ ہجو گو شاعروں کا کلام زیادہ تر اسی بنیاد پر قائم ہے۔

لپ۔ لاک اور برک ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہیں۔ وہ ظرافت اور فیصلے میں فرق کرتے ہیں۔ برک کہتا ہے صحیح فیصلہ اور ظرافت دو مختلف چیزیں ہیں۔ اس نظریے کی تفصیل یہ ہوگی کہ ہم مذاق مذاق میں کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو ظریفانہ نقطۂ نظر سے تو بہت زیادہ دلچسپ اور قہقہہ انگیز ہوتی ہے لیکن ہمارا حقیقی فیصلہ اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے کسی شخص سے متعلق رائے قائم کرنے میں اگر ہم ظرافت سے کام لیں تو ہماری رائے فیصلے سے زیادہ مزاح سے متاثر ہوگی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جب یہ دونوں صلاحیتیں یکجا ہو جائیں تو ظرافت مکمل ہو جاتی ہے۔ جیسے کسی عالم شخص سے یہ کہنا کہ آپ تو ارسطو کے والد ہیں، زیادتی ہے لیکن یہ کہنا کہ آپ کی موجودگی میں تو ہم اپنے کو تحانیہ مدرسے کا طالب علم سمجھتے ہیں ظرافت بھی ہے اور صحیح فیصلہ بھی۔

ظرافت فطرت انسانی پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے صحیح اور صالح ظرافت افراد کے خیالات کو پاکیزگی اور نفاست

www.taemeernews.com

بخشتی ہے۔ طبیعت انسانی کو شگفتہ کر دینا اس کا ایک معمولی عمل ہے اور جب وہ ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے تو افراد کے خیالات کو اپنے سانچے میں ڈھالتی ہوئی قوموں کے رجحانات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ معاشرے کے عمومی مسائل سے الجھتی اور انھیں پاک و صاف کرتی ہے۔ معاشرت کے طریقوں، رسوم و رواج اور روایتی بندشوں کے مراحل سے آگے نکل کر سیاسی و ملکی معاملات کو زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے ایسی ظرافت درحقیقت تہذیب اور شائستگی کی دین ہوتی ہے اور یہی اعلیٰ اور معیاری ظرافت کہلاتی ہے۔ اس کے لئے صدیوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔

محمد حسین آزاد نے ظرافت کی تین خوبیاں بتائی ہیں۔ خوش طبعی، خندہ جبینی، اور حسنِ گفتگو۔

کولرج نے ظرافت کے اصول و آداب پر بحث کرتے ہوئے کہا ہے کہ ظرافت اور ہمدردی ساتھ ساتھ چلتے ہیں اس لئے سچی ظرافت وہی ہے جس میں دل شکنی کا پہلو نہ ہو۔

خیال خاطر احباب چاہیئے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

ظرافت جہاں انسانی تعلقات کے لئے مقراض ہے وہیں یہ انسانی تعلقات میں خوشگواری اور استواری بھی پیدا کرتی ہے۔ یہ صلاحیت بھی اس میں موجود ہے۔ اکبر الہ آبادی کہتے ہیں۔ ؎

بگڑے ہوئے من گئے ہنسی میں
حکمت ہے کچھ ایسی دل لگی میں

ظرافت کی تعمیر میں تین چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ شوخی، ذہانت اور مبالغہ۔ یہ تینوں اجزائے ترکیبی ظرافت کو سنوارتے ہیں۔ شوخیٔ طبع ظرافت کے میدان میں نت نئے گل کھلاتی ہے۔ کہیں تقریر کرتے ہوئے ڈیوک آف بکنگھم نے کہا تھا۔

"قوانین کچھ عورتیں تو ہیں نہیں کہ ضعیف ہوتے ہی بیکار ہو جائیں" یا اکبر الہ آبادی کا یہ شعر کہ

اس کی بیٹی نے اٹھا رکھی ہے دنیا سر پہ ؛ خیریت گزری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا۔ شوخیٔ طبع کی عمدہ مثال ہے۔

۲۔ ذہانت انسان کے جذبۂ پسندیدگی یا نفرت پر اپنا اثر ڈالتی ہے۔ بلند چیز کو پست اور پست کو بلند بنا دیتی ہے۔

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

۳۔ ظرافت کا رنگ مبالغہ سے نکھرتا ہے۔ اس کی مثالیں ہمیں سودا کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں مثلاً ایک گھوڑے کی تعریف وہ یوں کرتے ہیں ؎

لیکن مجھے دے دیئے تواریخ یاد ہے۔
شیطان اس پہ نکلا تھا جب سے سوار

www.taemeernews.com

اگلے صفحات میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ظرافت کس طرح ادبی لباس پہنتی ہے اور اس کا کیا عمل ہوتا ہے۔

ادبی ظرافت :۔ ادبی ظرافت کا سب سے بڑا عمل خندہ کے فطری جذبہ کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنا ہے تاکہ ان الفاظ سے دوسروں کے ذہن میں ہنسی کا موقعہ محل پیدا ہو اور سننے اور پڑھنے والوں میں وہی جذبے منتقل ہو جائیں جو لکھنے یا کہنے والوں کے دل میں ہوں۔

تہذیب اور معاشرے کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ظرافت نہ صرف انسانی اصول اخلاق کی ہمرنگ ہوتی گئی بلکہ اس میں فنی اور ادبی حسن بھی اپنی رعنائی دکھانے لگا۔ علم کی روشنی نے ظرافت کے محاسن کو اُجاگر کیا اور جب یہ "ادب" کے دائرے میں داخل ہوئی تو صرف ہنسی اور تفریح کا باعث نہیں رہی بلکہ اس کا عمل کسی خاص نصب العین کا پابند ہو گیا۔

خصوصیات اور اہمیت : ادبی ظرافت ایک آرٹ ہے اور اس کی خصوصیات میں مندرجہ ذیل امور کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

شگفتگی مزاج اور شوخیٔ طبع : جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے ان کا تعلق درحقیقت طبائع سے ہے۔ انھیں خداداد صلاحیتیں کہنا چاہیئے۔ انسانی طبیعت کی اندرونیت کو اس میں بڑا دخل ہے۔

شائستگی اور نفاست، شائستگی اور نفاست کے بغیر ظرافت ادبی ظرافت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ تہذیب سے ہٹی ہوئی ظریفانہ بات۔ ادبی ظرافت کی شان کے منافی ہے۔ ادبی ظرافت پھکڑپن یا دریدہ دہنی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

مشاہدے اور ادراک کی تیزی، باریک بینی اور نکتہ سنجی کی صفات یا خوبیاں مشاہدے اور ادراک کی محتاج ہیں۔ ادبی ظرافت کے لئے صرف وسیع مطالعہ ہی نہیں، گہرا مشاہدہ بھی ضروری ہے بلکہ مناظر قدرت اور اردگرد کے ماحول اور حالات کا مشاہدہ مطالعہ سے زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے۔

احساس تنفر کی کمی اور خوشگوار طرز ادا : ادبی ظرافت کسی سے تنفر یا کسی کی تحقیر کے جذبے اور خواہش سے مجرد ہو جاتی ہے۔ اسے احساس تنفر سے بری ہونا چاہیئے۔ اگر جذبۂ تنفر ہو بھی تو ابتذال اور عریانیت کے عیوب سے پاک ہو۔ خوشگوار طرز ادا، جذبۂ تنفر کو بھی قابل قبول بنا سکتی ہے۔ ادبی ظرافت میں لذت اور مسرت کے عناصر نہ ہوں تو یہ طبیعت پر گراں گزرتی ہے۔

مسائل حیات کے ساتھ لطف انگیز وابستگی : اسے ہم بامقصد ظرافت کا نام دے سکتے ہیں۔ ایسی ادبی ظرافت جو ہماری روزمرہ زندگی کے مسائل پر روشنی ڈالے۔ بہت زیادہ کامیاب ظرافت کہی جا سکتی ہے۔

الفاظ، اسلوب اور اثر، ان تینوں امور کا ادبی ظرافت میں خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے محمد حسین آزاد ظرافت میں الفاظ اور اسلوب پر زیادہ زور دیتے ہیں اور حالی اثر پر۔ زبان کی چاشنی، اسلوب کی دلاویزی، الفاظ کی نشست، ان سب کا خوشگوار امتزاج بے اثر نہیں ہو سکتا۔ ظرافت نگار اگر اپنی طرز نگارش سے پہچانا جاتا ہے تو یہ اس کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

www.taemeernews.com

ادبی ظرافت ایک قسم کا تیز اور موثر مطالعۂ حیات ہے یعنی چیزوں کے سمجھنے اور سمجھانے کا خوشگوار طریقہ ہے مولیر کا ڈرامہ نکاح بالجبر اس کی عمدہ مثال ہے۔ جس طرح کسی مسئلے پر بحث کی جاسکتی ہے اسی طرح ظریفانہ انداز میں بھی یہ بحث بخوبی اور زیادہ موثر طریقہ پر کی جاسکتی ہے۔ نکاح بالجبر کے نتائج و عواقب پر مولیر نے اپنے ڈرامے میں ظریفانہ انداز کو برقرار رکھتے ہوئے بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے اور وہی بات کہی ہے جو ایک خطیب یا مصلح کہہ سکتا ہے۔

شیکسپیئر کے ڈراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے جان ڈرنک واٹر لکھتا ہے

"یہ ڈرامے نہ صرف تاریخ کے اہم واقعات بیان کرتے ہیں بلکہ عوام کی زندگی اور ان کے ذہنی رجحانات کی بھی عکاسی کرتے ہیں اور ان تاثرات کا مرکز خیال فال اسٹاف کا کردار ہے"

شیکسپیئر کا یہ کردار مضحکہ خیز ہی نہیں بلکہ انسانی فطرت کے اکثر عیوب اور محاسن کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ سروانٹیز کا مشہور و معروف کردار ڈان کوئکسوٹ (جس کا ذکر پچھلے صفحات میں آچکا ہے) بادِ بدا ایک فرضی اور قیاسی کردار ہونے کے حقائق کو پیش کرتا ہے۔

کولریج نے سروانٹیز کے انداز تحریر پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سروانٹیز میں صحت زیادہ ہے اور شیکسپیئر میں تاثرات (REFLECTIONS)

سوئفٹ کی کتاب "GULLIVERS TRAVELS" انتہائی مضحکہ خیز ہونے کے باوجود ایک سنجیدہ کتاب ہے۔ وہ بھی یہی بتانا چاہتا ہے کہ عقل اور شعور کے بغیر انسان کو اس کا حقیقی شرف حاصل نہیں ہوسکتا۔

اناطول فرانس نے جو کردار پیش کئے ہیں ان میں جنرل ڈی بی آج بھی جیتا جاگتا کردار ہے۔ یہ برٹش دانشوروں کی سیاست کسی تھیٹر کے مسخرے کی سی ہے۔ نہ صرف اس کا حلیہ مضحکہ خیز ہے بلکہ حرکتیں بھی حماقت آمیز ہیں۔ اناطول فرانس [illegible] کو پیش کرنے صرف ہنسانے کا سامان ہی نہیں پہنچاتا بلکہ اس امر کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ ہمیں کن باتوں سے [illegible]

اسی طرح الف لیلہ کے بعض مناظر حیات بھی ادبی ظرافت کا عنصر رکھتے ہیں۔ مسافروں، سیاحوں، تاجروں کی زندگی کے پست شعبوں سے تعلق رکھنے والے افسانوں کا اچھوتا اثر، جنوں، طلسموں اور توہمات سے دوچار ہونا پُر لطف چیز ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد کا کردار مرزا ظاہر دار بیگ بھی اسی قبیل کا ایک کردار ہے۔ یہ کردار ہماری ہنسی کا تو خیر جب ہوتا ہی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ایک نصیحت آمیز اور عبرت انگیز کردار بھی ہے۔ غربت میں شان امارت بنائے کی خواہش کیا رنگ لاتی ہے اسے نذیر احمد نے خوبی سے ظاہر کیا ہے۔

ان مثالوں سے یہی وضاحت مقصود ہے کہ ادبی ظرافت مسائلِ حیات کے ساتھ لطف انگیز دلچسپی رکھتی ہے اور اس کی ایک مستقل حیثیت ہے۔ یوں تو سبھی اصناف ادب کا زندگی سے تعلق ہوتا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ افسانہ، ناول نویس، تمثیل نگار اور نظم گو شاعر ان کے ادبی کارنامے جدید ترین فکریات کو بحسن و خوبی نہ پیش کرسکیں لیکن معیاری

www.taemeernews.com

اور اعلیٰ ظریفانہ ادب اپنے زمانے کی تبدیلیوں، ہیجان اور سرد و گرم کا عکاس اور نقیب ہوتا ہے۔ جعفر زٹل جیسے ہزل گو شاعر کے کلام میں بھی اکثر مقامات پر غور و فکر کے نکات ملتے ہیں بلکہ اسے تو اپنی ظرافت کی قیمت جان دے کر چکانی پڑی۔ سودا کا قصیدہ شہر آشوب اور نظیر اکبرآبادی کی بیشتر نظمیں واقعیت کا پہلو رکھتی ہیں۔ ظرافت نگاروں کے ہاں اگر مبالغہ ہوتا بھی ہے تو اس میں لطیف طنز کا پہلو چھپا رہتا ہے۔ ادبی ظرافت کی حیثیت ایک مصلح (Reformer) کی سی ہے ایسا مصلح جس کے انداز بیان میں خشونت اور درشتی نہیں حلاوت اور دوستداری ہوتی ہے۔

ادبی ظرافت ایک اصولِ تنقید بھی ہے۔ مزاح نگاری کے میدان میں طنز نگاری سب سے زیادہ موثر اور کارگر طرز نگارش سمجھی گئی ہے۔ طنز میں تنقید کا انداز نمایاں رہتا ہے۔ ادبی ظرافت شدید احساس اور عمیق مشاہدے کی پیداوار ہے۔ یہ کہنا کہ

کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

طنز بھی ہے اور تنقید بھی ہے۔

روم میں جوونل اور ہورس کی تحریروں نے صرف تہذیب و تمدن ہی کو نہیں، مذہبیات کو اپنا ہدف بنایا ہے اور ان پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ انگلستان میں چاسر، پوپ، ڈرائڈن، سوئفٹ اور ایڈیسن کی طنزیہ تحریریں اور شیکسپیئر کی مزاح نگاری برطانیہ کی سوسائٹی اور انگریزوں کے کردار پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اناطول فرانس کا یہ مقولہ کہ "دولت سب سے بڑی نیکی ہے" اس کی طنزیہ تنقید کا مختصر ترین اور عمدہ نمونہ ہے۔ اناطول فرانس اس نظریئے کا حامی رہا ہے کہ کسی انسان کو متعارف کرانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اس کے معائب بیان کئے جائیں۔

ہندوستان میں نظیر اکبرآبادی اور اکبر الہ آبادی نے اپنے اپنے عہد میں اپنی طرز معاشرت رسوم و رواج، فیشن پرستی عدم مساوات کو بڑا تنقید اور دوسرے سماجی مسائل پر تنقیدیں کی ہیں۔ ان تمام ادیبوں اور شاعروں کی ادبی کاوشیں اپنی افادیت اور اثر انگیزی کی بناء پر مقبول عام رہی ہیں۔ اسی لئے دانشوروں کی رائے ہے کہ کسی کو راہ راست پر لانے کے لئے ہنسی اور طنز سزا سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں سزا کیوں دیتے ہو۔ ہنستے کیوں نہیں؟

ادبی ظرافت قدر دوام رکھتی ہے اور ہمہ گیر بھی ہے یہ بجائے خود ایک زندہ تاریخ اور تنقید ہے اس میں نصیحت تلقین تدریس اور عظمت و پند کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ظرافت ان سب کا ایک موثر واسطہ ہے اس کے ہمہ گیر ہونے کی خوبی کی بناء ہی پر حالی، شبلی اور اقبال جیسے مرنج و مرنجان اور سنجیدگی پسند ادیبوں اور شاعروں نے اس طرز نگارش کو اختیار کیا۔ انگلستان میں ایڈیسن جیسے سنجیدہ طبیعت کے ادیب نے ادبی ظرافت کے ذریعہ شہرت دوام حاصل کی مولانا محمد علی کامریڈ میں اپنے طنزیہ مضامین چھپایا کرتے تھے۔ ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں اور عبدالماجد دریابادی نے بھی ظرافت کا دامن نہیں چھوڑا۔

www.taemeernews.com

ادبی ظرافت کی قسمیں

۱. مجرد ظرافت ۲. طنز اور ۳. ہجو

مجرد ظرافت : اسے ظرافت برائے ظرافت کا نام دینا مناسب ہوگا۔ فرائڈ نے اسے بے مقصد ظرافت کہا ہے ایسی ظرافت کا مقصد صرف تفریح طبع ہے۔ لطیفہ گوئی بھی اس کی ایک شاخ ہے۔ ایسی ظرافت جو صرف دل خوش کن ہو اور ہنسنے ہنسانے کے لئے استعمال کی جائے فرحت بخش ہونے کے علاوہ اور کوئی مفید نتیجہ پیدا نہیں کرسکتی۔ انشاء کی ظرافت اس کی اچھی مثال ہے۔ پطرس کے مضامین میں بھی مجرد ظرافت ہے۔ ایسی ظرافت نہ تو کسی کا ملال دکھاتی ہے اور نہ کوئی تکدر پیدا کرتی ہے۔ حالی نے ایسے ہی مزاح کو ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اور سہانی خوشبو کی لپیٹ کہا ہے۔ مجرد ظرافت بھی زندگی کے لئے مزہ ہی ہے۔ ہمیشہ ہر وقت، ہر گھڑی غور و فکر میں مبتلا رہنا بھی وبالِ جان ہے۔

طنز : برگساں نے طنز (۱۹۰۷ء) کو خطیبانہ طعن و تعریض کا نام دیا ہے لیکن مجرد طنز سارا موضوع بحث نہیں ہے۔ ہمیں صرف ایسے طنز سے بحث مقصود ہے جس میں ظرافت کا عنصر غالب ہو۔ اسے سطائر (SATIRE) کہہ لیجئے۔ طنز، ظرافت کی سب سے زیادہ موثر شکل ہے۔

ہجو : ہجو و ہجا کا مفہوم بجائے خود اتنا برا نہیں جتنا کہ سمجھا جاتا ہے۔ ہجو بدنصیبی سے ایک بدنام طرز نگارش ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عام طور پر جو ہجویں کہی گئی ہیں شخصی خصوصیت اور ذاتی عناد ان کی بنیاد رہی ہے۔ ان میں تضحیک اور تذلیل کا پہلو نمایاں ہوگیا ہے۔ فارسی ظرافت نگاری کا اثر ہمارے اردو پر پڑا چاہیئے تھا اور ہوا بھی یہی۔ لیکن خود فارسی میں ہجو گوئی کا معیار پست رہا ہے۔ اسی لئے شبلی نے شعر العجم میں اس صنف کی بڑی مذمت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں بہتر تو یہی تھا کہ یہ بے ہودہ صنف سرے سے اڑا دی جاتی۔ لیکن ہجو شعراء کا ایک بڑا آلۂ کار تھا جس سے ان کی معاش کا تعلق تھا۔ اس لئے وہ اس سے دستبردار نہیں ہوسکتے تھے۔

افلاطون بھی ہجو و ہجا کا مخالف رہا ہے۔ وہ بھی اس خیال کا حامی ہے کہ ظرافت میں تضحیک کا پہلو نمایاں ہو جائے تو اسے انسان کے جذبۂ تنفر کی پیداوار سمجھنا چاہیئے۔

ہجو غیر ذمہ دارانہ تنقید ہوتی ہے بلکہ اس میں تنقیص کا رنگ غالب رہتا ہے ادبی ظرافت میں انسانیت آموزی کی جو خصوصیت موجود ہونی چاہیئے ہجو میں وہ پائی نہیں جاتی اس لئے ان لوگوں کی نظروں میں جو ایک اخلاقی نظریہ رکھتے ہیں ہجو سبک اور تقریباً بے مایہ چیز ہے۔ لیکن یہ نکتہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کوئی صنف ادب بجائے خود کمتر درجے کی نہیں ہوتی یہ تو اپنے سرمائے سے پہچانی جاتی ہے۔ ہجو ملیح بھی بہرحال ہجو ہی ہے لیکن قابل قبول۔

ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ مسابقت کا جذبہ جو کبھی کبھی شخصی خصومت اختیار کر لیتا ہے اعلیٰ ادب کی تخلیق کا باعث بنتا ہے۔

ظرافت کے مناسب اجزاء : ایک زمانے تک لوگ اس بات پر اصرار کرتے رہے کہ ظرافت کو تضحیک اور تحقیر کے لئے استعمال

www.taemeernews.com

کیا جاتا رہا اور نظریاتی طور پر بھی یہی سمجھا گیا کہ ایسی تضحیک جس میں ہمدردی کا جذبہ نہ ہو ظرافت ہے لیکن اب یہ خیال بالکل مختلف ہے۔ طعن تشنیع۔ لعنت ملامت۔ سب دستم ظرافت کے اجزاء نہیں اس کے معائب ہیں۔

حالی نے لکھا ہے" برخلاف اس کے جب وہ (مزاح) اس حد سے بڑھنے لگتا ہے تو دلآزار ہونا شروع ہوتا ہے اور آخر کو اس سے بجائے محبت کے دشمنی اور بجائے خوشی کے غم پیدا ہوتا ہے۔ وہ اخلاق کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے گھن کپڑے کو یا کیڑی لوہے کو۔"

تلخی بھی طنز و ظرافت کو ناپسندیدہ بنا دیتی ہے۔ طنز کی ہلکی سی چوٹ کافی ہے۔ اس میں شدت پیدا کرنا خوشی مزاجی اور شگفتگی طبع کے منافی ہے۔ جعفر زٹلی کی ہزلیات میں اسی تلخی (BITTERNESS) نے غضب ڈھایا اسی لئے باوجود کمال ظرافت کے انہیں ادب میں کوئی مستقل حیثیت حاصل نہ ہو سکی۔

ادبی نقطۂ نظر سے عریانی اور فحش گوئی ظرافت کی سب سے زیادہ ناپسندیدہ لغو اور غیر مہذب صورت سمجھی جا سکتی ہے۔ دیہات تو عریانیت میں اچھائی کا پہلو تلاش کر لیا جاتا ہے اور اسی بنا پر غالباً عبدالباری آسی نے چرکین کو استاد مزاحیہ کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں چرکین کو اپنے فن میں کمال حاصل تھا لیکن اخلاقی نقطۂ نظر سے اس کی شاعری بہت پست اور سوقیانہ ہے فن کی تعریف تو اسی وقت کی جا سکتی ہے جب اس کا استعمال بھی صحیح ہو ورنہ ویسے تو نقل شکنی بھی فن ہے۔

مشرقی سوسائٹی میں یوں بھی عریانیت اور فواحش کا رواج نہیں ہے۔ ادب آرٹ اور ظرافت کا اخلاقی پہلو ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیئے۔

ظرافت کا جمالیاتی پہلو :۔ جمالیات کا اصل موضوع کسی شئے کے حسن یا لذات پر غور کرنا ہے۔ جمالیات کے نقطۂ نگاہ سے اگر کسی چیز پر غور کیا جائے تو اس کی ظاہری شکل و صورت اور خیالات کو نظر انداز کر کے اس کی ذات میں جو خوبی اور حسن پوشیدہ ہے اس پر غور کرنا ہوگا۔

ظرافت پر جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے غور کرنے کا آغاز اس تصور سے ہوتا ہے کہ جملہ قسم کے خندہ کی ایک بنیادی وجہ ہوتی ہے۔ کسی شئے میں خواہ عدم تناسب یا بے آہنگی ہی کیوں نہ ہو اگر اس کا اثر خوشگوار ہے اور نتیجہ میں ہم کچھ حاصل کر سکتے ہیں یا اس کی وجہ سے ہمیں کچھ استخلاص یا سکون ملتا ہے تو یہ اس کی جمالیاتی کیفیت ہوگی۔

جہاں تک ظرافت کی جمالیات کا تعلق ہے اس میں بڑی پیچیدگی اور تضاد ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ظرافت سے متعلق جمالیاتی اور فلسفیانہ نظریئے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اخلاق کا تقاضا کچھ اور ہے اور ظرافت کی روح کچھ اور کہتی ہے۔ ظرافت سے نجات کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک قسم کا کیف و سرور پیدا کرتی ہے جس میں تفکر بھی شامل ہے۔ یہی تفکر جمالیات کا اہم موضوع ہے جس کی ایک صورت نجات، طمانیت اور سکون ہے لیکن یہ سکون سکوت یا بے ہوشی نہیں بلکہ یہ تفکر آمیز سکون ہوتا ہے۔ ظرافت میں یہ حسن ذرا دیر سے پیدا ہوتا ہے اس لئے بعض لوگ ظرافت کو حسن سے عاری سمجھتے ہیں۔ لیکن جب ہم اس کی عملیت کو نظر انداز کر کے اس کی اندرونیت یا تہہ داری پر غور کرتے ہیں

www.taemeernews.com

تو اس کا حسن بے نقاب ہو جاتا ہے یعنی ظرافت اُس وقت حسن بنتی ہے جب وہ کسی معیّنہ نصب العین کی تکمیل پر تصنع سے دور ہو اور آپ اپنا لطف پیدا کرے اس مرحلے پر ظرافت آرزوئے ناتمام کے نعم البدل کی صورت اختیار کرتی ہے جس انسان کی آرزو ناتمام رہتی ہے وہ ہمدردی اور نفرت کے ملے جُلے جذبے سے اس ناکامی کی کوفت اور تکلیف کو کم کرتا اور تسکین حاصل کرتا ہے۔ لذت اور مسرت ایک جمالیاتی تسکین کا نام ہے اور اسے مزاح اور ظرافت کی وساطت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ احساس برتری اور احساس تفنّنی ظرافت کی پیدا کی ہوئی مسرتوں کا نام ہے اخلاقی نقطۂ نظر سے ان احساسات کا اظہار ظرافت کے ذریعہ شائستگی اور تہذیب کے منافی ہو سکتا ہے لیکن ظرافت کا جمالیاتی حسن اسی میں پوشیدہ ہے۔

ادبی ظرافت کی جمالیات :- ظرافت کا جذبہ الفاظ کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے اور الفاظ ظرافت کا آئینہ ہیں۔ الفاظ میں اتنی قوت، تیزی، شوخی، اثر اور بانکپن ہوتا ہے کہ انسان کی ساری نفسیات اور کردار کا کچھ ان میں سما جاتا ہے۔ ادبی ظرافت جب اشعار کا لباس پہنتی ہے تو وہ نغمہ، ترنم اور توازن کے اثر سے دو آتشہ بن جاتی ہے۔ اس سے ہمیں دُہری لذت حاصل ہوتی ہے۔

نثر میں ظرافت کا حسن قدرے مدہم پڑ جاتا ہے۔ نثر میں چونکہ طوالت ہوتی ہے اس لئے ظرافت کا جمالیاتی رنگ نظم کے مقابلے میں ذرا کم ہوتا ہے۔

ادبی ظرافت کا جمالیاتی پہلو جب پس منظر میں ہوتا ہے تو ہمیں اس کی عملیت ناگوار گزرتی ہے اور یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ ظرافت کی روح جسم کی مصنوعی ساخت سے بے آہنگ ہے۔ ظرافت کا تعلق چونکہ انسانی نفسیات سے ہے اس لئے یہ فطری ہے لیکن اس کا جسم یعنی سانچہ ہمارا اپنا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ اگر ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو ظرافت کا جمالیاتی حسن خود بخود نکھر جاتا ہے۔ اگر طریقۂ اظہار خام اور طرز ادا ناقص ہے تو ادبی حسن اور ظرافت کی روح اس عیب کی نذر ہو جاتی ہے۔ اس لئے ظریف شاعر کا قادر الکلام ہونا اور ظرافت نگار کا انشا پرداز ہونا ضروری ہے۔

مختلف اصناف ادب میں ظرافت کی اہمیت :-

۱۔ شاعری۔ شاعری ادب کی جان ہے۔ ورڈزورتھ تو کہتا ہے "شاعری سارے علم کی جان اور ان کا لطیف ترین جوہر ہے"۔ ادب کی اس صنف میں ظرافت کا رنگ خوب کھلتا ہے۔ شاعرانہ نکات، شاعرانہ تخیل، شاعرانہ فکر، نکتہ سنجی اور مبالغے کی خصوصیت ادبی ظرافت کو حسن و لطافت کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ چونکہ شاعری ادب کی سب سے زیادہ موثر اور لطیف صنف قرار دی جاتی ہے اس لئے اس میں ظرافت کے بھی ہزار رنگ اور رُخ ہیں۔ علم طور پر سبھی ملکوں کے ادب میں اور خاص طور پر اُردو شاعری میں ظرافت، شعر و شاعری کی ابتدا ہی سے موجود ہے۔ انگریزی کے پہلے شاعر چاسر کے کلام میں ظرافت اور طنز کا عنصر موجود ہے۔ انوری اور فردوسی نے طنزیات اور ہجویات بھی لکھیں اگر فردوسی کا شاہ نامہ شہرت رکھتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ محمود غزنوی کی ہجو بھی اتنی ہی مشہور ہے۔ اُردو شاعری کے

www.taemeernews.com

قدیم ترین دور میں ظرافت کے نمونے ملتے ہیں۔ اس لئے یہ کہنا مناسب ہوگا کہ ادبی ظرافت کو شاعروں نے پہلے اپنایا۔

ظریفانہ شاعری کے لئے کس ماحول کی ضرورت ہے:۔

میریڈتھ کے نزدیک ظریف شاعر کے لئے ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہے جس میں افراد کے خیالات شائستہ اور تہذیب یافتہ ہوں اور ان کا اثر سوسائٹی قبول کرے۔ سوسائٹی میں جب بے حسی اور افیونیت در آتی ہے تو اس اضافی نشیب و فراز کی بناء پر افراد ٹکلی اور سماجی مسائل کو دھندلا دھندلا دیکھتے ہیں وہ ان مسائل کی ماہیت سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ظریف شاعر، فائدہ پہنچانے کی بجائے نقصان رساں ثابت ہوسکتا ہے کیوں کہ افراد ہنستے ہیں بہت زیادہ ہنستے ہیں لیکن عمل سے معذور رہتے ہیں۔ ایسا ہی ماحول اس وقت بھی ہوتا ہے جب قوم ہذیانی کیفیت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اعتدال سے گزر جانا ہذیانی کیفیت ہے، قوم میں ایسے جذبات پیدا ہو جائیں جو اس کو دانش و بینش سے دور اور نتائج و عواقب سے بے پرواہ کر دیں تو اس ماحول میں ظریف شاعر کی حیثیت اس ڈاکٹر کی ہو جاتی ہے جس کی مریض سنتا نہیں ہے اور ڈاکٹر کا سارا علم، ساری قابلیت دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

۲۔ افسانے اور ناول

افسانہ نگار، زندگی کے واقعات اور حقائق کو افسانوی انداز میں پیش کرتا اور ظرافت کے امتزاج سے انہیں دو آتشہ بناتا ہے مگر شاعری افسانے کے مقابلے زیادہ موثر اور اثر انگیز ہوتی ہے لیکن اپنی باریکیوں، اشاروں اور استعاروں کی وجہ سے افسانے کی گرفت بڑی مضبوط ہے۔ ناول نویس اپنے مشاہدے کو ادب کے روپ میں ظاہر کرتا ہے اس کی ادبی کاوشوں کا مرکز خیال افسانہ نگار سے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ افسانہ اور ناول دونوں میں حقائق سے قریب ہونے کے باوجود قصہ کہانی کی چاشنی ہے۔ ان دونوں میں کردار نگاری کی گنجائش ہے ان میں کرداروں کے ذریعہ زندگی کی حماقتوں مضحکہ خیز حالات اور دلچسپ واقعات کو فن کارانہ انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اردو میں ظریفانہ ناولوں کی کمی ہے۔ افسانے البتہ بہت لکھے گئے۔

۳۔ مضمون نگاری: یہ ادبی ظرافت کی ایک موہوم مشکل لیکن مقبول عام اسلوب نگارش ہے۔ موہوم اس لئے کہ اس کے کوئی بندھے ٹکے اصول نہیں ہیں، مزاحیہ مضمون مختصر بھی ہوسکتا ہے، طویل بھی ہو سکتا ہے اور نامکمل بھی مشکل اس لئے کہ اس میں کوئی پلاٹ نہیں ہوتا۔ مرکز خیال بھی یوں سمجھ لیجئے نہیں ہوتا۔ مضمون کی مثال بالکل پانی سی ہے۔ موسلا دھار بارش کی طرح ہے تو نقصان دہ ہے صرف چند قطروں کی شکل میں ہے تو ناکافی ہے۔ مضمون نگاری میں عموماً زبان کے چٹخارے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن بنیاد اس کی ظرافت ہونی چاہیئے۔

۴۔ تمثیل: تمثیل نگاری کو دوسرے اسالیب نگارش پر اس لئے ترجیح دی جاسکتی ہے کہ ڈرامے کے ذریعے، زندگی کے واقعات اسٹیج پر دکھائے جاسکتے ہیں۔ جو کیفیت افسانے اور ناول کی اثر انگیزی میں ہے وہی تمثیل میں ہے۔ اس میں کردار کی زندگی پلاٹ کی کشمکش اور الجھاؤ کو ادبی ظرافت کے ذریعہ زیادہ موثر اور دلچسپ بنایا جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

ڈرامے کی دو بڑی قسمیں ہیں طربیہ اور حزنیہ اور ظرافت کا عنصر دونوں میں پایا جاتا ہے۔ طربیہ میں تو ظرافت کا ہونا ضروری ہے ہی لیکن حزنیہ میں بھی اس کا استعمال درد الم اور رنج و غم کے اثرات کو کم کرنے کے لئے کیا جاتا ہے خواہ وہ ناٹک ہو یا فلم اس میں ایک نہ ایک کردار ضرور ایسا ہوتا ہے جو ہنسی کا باعث ہوتا ہے۔ کردار نہ ہو تو کم سے کم کہیں نہ کہیں کوئی ایسی سچویشن ہونی چاہیئے جو ذہن کو حزنیئے کے الم انگیز اثرات سے وقتی طور پر آزاد کر سکے۔

طربیہ تمثیلوں میں ظرافت کے امکانات زیادہ ہیں۔ ابسن کا ڈرامہ "حشرات الارض" اس کی عمدہ مثال ہے۔ برنارڈ شاہ کے اکثر و بیشتر ڈراموں میں بھی ظرافت کا رنگ نکھرا ہوا ہے۔ اردو میں قدیم اول کے ڈراموں کی تلاش و جستجو میں حیران پریشان ہونا پڑتا ہے۔

۵۔ صحافت : اخبار ہماری روزمرہ زندگی کا ایک جزو لازم ہے۔ صحافت نے انسانی زندگی میں ایک ضرورت کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ یہ قوم و ملک اور زمانے کے تابندہ ترین افکار کی ترجمانی کرتی ہے۔ سیاست اور معاشرت یہ دو ایسے انسانی ادارے ہیں جو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنے رہتے ہیں۔ صحیفہ نگاروں کو سیاسی، معاشرتی اور تمدنی حالات پر تبصرہ و تنقید کرنے کے بہتر مواقع حاصل ہوتے ہیں بلکہ تنقید ان کی ذمہ داری ہوتی ہے لیکن چونکہ سیاست میں اقتدار اعلیٰ سے سابقہ ہوتا ہے اس لئے راست تنقید اور بلا واسطہ نکتہ چینی کی بجائے طنز و ظرافت سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ موثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اخبارات کے مزاحیہ کالم کا رواج اسی لئے شروع ہوا۔ ادبی ظرافت صحافت کا ایک جزو بن گئی اور پنچ کی ظرافت کی بنیاد پڑی۔

پنچ : پنچ کی ظرافت کو مختصراً یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ ایک لفظی کارٹون ہے۔ جس طرح تصویری کارٹونوں میں کسی شخصیت یا کسی واقعے کے خدوخال مضحکہ خیز شکل میں پیش کئے جاتے ہیں اسی طرح لفظی کارٹونوں میں بھی ہجو طنز اور تنقید سب کچھ موجود ہوتی ہے لیکن شوخی اور تیزی، اختصار اور جامعیت کے ساتھ۔

جس طرح پنچ کے کارٹون دنیا بھر میں سند کا درجہ رکھتے ہیں اسی طرح لفظی کارٹون اپنی زبان، طرز ادا اور شوخیٔ خیال کے اعتبار سے حسن و ادب کا ایک نمونہ ہیں۔

باب دوم

اُردو ظریفانہ نثر

اردو نثر کے ابتدائی دور میں ہم ظرافت نگاری کا عنصر تلاش کرتے ہیں تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادبی ظرافت تہذیب اور ادب کی شوخی یا شگفتہ اور ——

www.taemeernews.com

سائنٹفک دور کی پیداوار ہوتی ہے قدیم اُردو نثر میں لطائف ہیں جو قصہ کہانیوں کی صورت میں ہیں یا وہ ظرافت ہے جو الف لیلیٰ کی طرح داستانی اور افسانوی صورت رکھتی ہے مثلاً داستان امیر حمزہ۔ عمر عیار۔ اور طلسم ہوشربا میں دیگر نفیانہ کردار یا بے وقوفی اور حماقت کے وہ تلمیحی نام جنھیں ہم شیخ چلی وغیرہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی اور تہذیب سے راست تعلق رکھنے والی ظرافت پر بحث کا آغاز مرزا غالب کے رقعات سے کیا جانا مناسب ہے

مولانا حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ مرزا ۱۸۵۰ء تک ہمیشہ فارسی میں خط و کتابت کرتے تھے مگر سنہ مذکور میں جب کہ وہ تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور کئے گئے اور ہرکارے ہر نیوز لکھنے میں محو ہوگئے۔ اس وقت بضرورت ان کو اردو میں خط و کتابت کرنی پڑی ہوگی۔ وہ فارسی نثر میں اور اکثر فارسی خطوط جن میں قوت متخیلہ اور شاعری کا عنصر نظم سے بھی کسی قدر غالب معلوم ہوتا ہے۔ نہایت کاوش سے لکھتے تھے۔ پس جب ان کی ہمت مہر نیمروزی ترتیب دانشا میں مصروف تھی ضرور ہے کہ اس وقت ان کو فارسی زبان میں خط و کتابت کرنی اور وہ بھی اپنی طرز خاص میں شاق معلوم ہوتی ہوگی۔ اس لئے قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے غالباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے اردو زبان میں خط لکھنے شروع کئے"۔[1]

غلام رسول مہر لکھتے ہیں "میرا خیال یہی ہے کہ ۱۸۵۰ء سے قبل اردو خط و کتابت شروع کر چکے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں چونکہ اردو نثر کو اہل علم زیادہ پایہ نہیں دیتے تھے۔ اس لئے وہ خط محفوظ نہ رہ سکے لیکن جیسے جیسے اردو کا رواج بڑھتا گیا اور فارسی کا رواج کم ہوتا گیا۔ غالب کی خط و کتابت فارسی کے بجائے اردو میں زیادہ ہوتی گئی"۔[2]

لیکن چونکہ ہمیں ۱۸۵۰ء سے قبل کے خطوط ملتے نہیں ہیں اور مولوی غلام رسول مہر نے قطعیت کے ساتھ اس خیال کا اظہار نہیں کیا ہے اس لئے حالی کے بیان کو زیادہ قرین قیاس سمجھنا چاہیئے۔ اور اردو نثر میں مزاح نگاری کے آغاز کی تاریخ کو تعین ۱۸۵۰ء ہونا چاہیئے۔

غالب: غالب کے ذکر میں صرف رقعات غالب سے بحث کرنا اور اپنے اصل موضوع کی طرف آنے سے قبل مختصراً ان کی ادبی اہمیت کو واضح کر دینا کافی ہے۔

برجستگی اور بے تکلفی، روانی اور سلاست رقعات غالب کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ غالب کے موقلم سے جو لفظ بھی ٹپکا اپنی تصویر بن گیا ہے۔ خط لکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے جیسے گفتگو کر رہے ہیں خود غالب نے اپنے خطوط کے متعلق یوں اظہار خیال کیا ہے۔ خط بنام خواجہ غلام غوث خاں بہادر

"پیر و مرشد! اہل متنع اس نظم و نثر کو کہتے ہیں کہ دیکھنے میں آسان نظر آئے اور اس کا جواب نہ ہو سکے۔
بایں ہمہ سہل متنع کا کمال حسن کلام ہے اور بلاغت کی نہایت ہے متنع درحقیقت ممتنع النظیر ہے۔ شیخ سعدیؒ

---

[1] یادگار غالب۔ صفحہ ۱۸۴۔ [2] غالب مصنفہ غلام رسول مہر صفحہ ۳۰۰۔

www.taemeernews.com

کے بیشتر فقرے اس صفت پر مشتمل ہیں۔ اور رشید وغیرہ اس شیوہ کی رعایت منظور رکھتے ہیں خود سالی ہوتی ہے سخن فہم اگر غور کرے گا تو فقیر کی نظم و نثر میں سہل ممتنع پائے گا۔[1]

غالب کی جودت خیال اور شیرینیٔ بیان نے ان خطوط میں ادبی طرائف کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ قدرت نے انہیں ظریف الطبیعت عطا کی تھی اس لئے لطیفے اور چٹکلے ان خطوط کا جزو خاص بن گئے ہیں۔ ان خطوط میں قہقہہ بردوش مزاح اور ظرافت نہیں بلکہ تبسم زیر لبی پیدا کرنے والی حلاوت ہے۔

ان کی خط و کتابت ان کے لئے ایک تفریحی مشغلہ کے مماثل تھی خود بھی لطف اٹھاتے اور دوسروں کے لئے بھی سامان انبساط مہیا کرتے۔ ان کے خطوط کا یہ مزاحیہ اور طربیہ انداز اردو ادب میں "تحفہ دوام" (PERMANENT VALUE) رکھتا ہے۔

مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں۔

"کیوں صاحب کیا یہ آئین جاری ہوا ہے کہ سکندر آباد کے رہنے والے دلی کے خاک نشینوں کو خط نہ لکھیں بھلا اگر یہ حکم ہوا ہوتا تو یہاں بھی تو اشتہار ہوجاتا کہ زنہار کوئی خط سکندر آباد کو یہاں کی ڈاک میں نہ جاوے"[2] اس کے بعد ایک خط میں یوں گہرافشاں ہوتے ہیں۔

کیوں صاحب روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی اور اگر اس طرح نہیں ملتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو، میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں یعنی جس کا خط آیا میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ جب تو اطراف و جانب سے دو چار خط آرہتے ہوں بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو، دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے۔ ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو میری دلگی ہوجاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے یہ کیا سبب دس دس بارہ بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا یعنی تم نہیں نے خط لکھو۔ نہ لکھنے کی وجہ لکھو۔ آدھ آنے میں نمل نہ کرو ایسا ہی ہے تو بیرنگ لکھو"[3]

ان خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ غالب کی خط و کتابت ان کی تفریح طبع کا باعث تھی اور جب خط لکھنے کی یہی وجہ ٹھیری تو ظاہر ہے کہ ان میں مزاح کی مٹھاس اور چاشنی کا ہونا ضروری ہے۔

غالب نے میر مہدی مجروح کے خط میں مراسلت کی اس روش کا مضحکہ اڑایا ہے۔ جس میں بڑے بڑے القاب و آداب اور خیریت گوئی و عافیت جوئی کے طویل جملے ہوا کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

اب اور کیا لکھوں تم میرے ہم عمر نہیں جو سلام لکھوں میں فقیر نہیں جو دعا لکھوں۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ لفافہ کو کریدا کرو مسودہ کو بار بار دیکھا کرو۔ پاؤ گے کیا۔ کیوں سچ کہو اگلوں کے خطوط کی تحریر کی بھی طرز تھی۔ ہائے کیا اچھا شیوہ ہے! جب تک یوں نہ لکھو وہ خط ہی نہیں ہے چاہ بے آب ہے۔ ابر بے باراں ہے۔ نخل بے میوہ ہے خانہ بے چراغ ہے۔ چراغ بے نور ہے۔ ہم جانتے ہیں تم زندہ ہو تم جانتے ہو کہ

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۴۰ [2] اردوئے معلی صفحہ ۵۴ [3] اردوئے معلی صفحہ ۸۱

www.taemeernews.com

ہم زندہ ہیں۔ امر ضروری کو لکھ دیا زوائد کو اور وقت پر موقوف رکھا اور اگر تمہاری خوشنودی اسی طرح کی نگارش پر۔ تو بھائی ساڑھے تین سطریں ویسی بھی میں نے لکھ دیں۔ کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ مقبول نہ ہوگی"۔ [1]

نواب امیر الدین احمد خاں رئیس لوہارو نے اپنے بچپن میں غالب کو ایک خط لکھا۔ جس میں مرزا صاحب کو دادا صاحب لکھا تھا۔ جواب ملاحظہ ہو۔

"میاں تمہارے دادا تو نواب امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو صرف تمہارا دلدادہ ہوں"

بنام نواب نور الدولہ بہادر

پیر و مرشد! بارہ بجے تھے۔ میں ننگا اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نے آکر خط دیا۔ میں نے کھولا۔ پڑھا چھلے کو انگرکھا یا کرتا گلے میں نہ تھا اگر ہوتا تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا۔ حضرت کا کیا جاتا میرا نقصان ہوتا"۔

بنام نواب شہاب الدین احمد خاں بہادر

آج میرے پاس ٹکٹ ہے نہ دام۔ معاف رکھنا والسلام"۔

بنام نواب علاؤ الدین احمد خاں بہادر علائی۔

سنو صاحب! شعراء میں فردوسی اور فقرا میں حسن بصری اور عشاق میں مجنوں۔ یہ تین فن ہیں سر و فقر اور پیشوا ہیں شاعر کا کمال یہ ہے کہ فردوسی ہو جائے۔

فقیر کی انتہا یہ ہے کہ حسن بصری سے ٹکر کھائے۔ عاشق کی نمود یہ ہے کہ مجنوں کی ہم راہی نصیب ہو۔ لیلیٰ اس کے سامنے مری تھی۔ تمہاری محبوبہ تمہارے سامنے مری۔ بلکہ تم اس سے بھی بڑھ کر کہ لیلیٰ اپنے گھر میں اور تمہاری معشوقہ تمہارے گھر میں مری۔ بھئی! مغل بچے بھی غضب ہوتے ہیں۔ جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔

جس طرح شاعری میں کہا جاتا ہے۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب۔ اسی طرح کی بات غالب کی خطوط نگاری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

منشی سجاد حسین اور اودھ پنچ: اخبار اودھ پنچ لکھنؤ سے ۱۸۷۷ء سے ۱۹۱۲ء تک بڑی آن بان کے ساتھ نکلتا رہا اس کے لکھنے والوں میں پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ اکبر الہ آبادی، نواب سید محمد خاں آزاد ترہبون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق۔ مولوی عبد الغفور شہباز، مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ منشی احمد علی کسمنڈوی اور ابو الکلام مولانا امید امیٹھوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اور اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد تھے ان کا سنہ پیدائش ۱۸۵۶ء ہے اور وطن کاکوری ضلع لکھنؤ ہے ۱۸۷۳ء میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ کیننگ کالج لکھنؤ میں شریک ہوئے۔ لیکن تعلیم کا سلسلہ جلد ختم ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں منشی صاحب نے اودھ پنچ نکالنا شروع کیا جو ۱۹۱۲ء تک نکلتا رہا۔

منشی سجاد حسین کو اودھ پنچ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے ہندوستان میں اڈیسن کا درجہ حاصل تھا۔ اودھ پنچ نے طنزیہ

---

[1] اردوئے معلی۔ صفحہ ۱۸۶

www.taemeernews.com

ظرافت کے وسیلے سے اردو زبان اور ملک کی جو خدمات انجام دیں ان کا ذکر صحافت کے باب میں کیا جائے گا۔ یہاں صرف سجاد حسین کی ظرافت نگاری سے بحث مقصود ہے۔

منشی سجاد حسین کی طبیعت ہی میں مزاح اور ظرافت رچ گئی تھی۔ بذلہ سنجی اور شوخی کو ان کی فطرت کا جزو سمجھنا چاہیئے۔ ان کی زبان نہایت رواں اور صاف ہے۔ عبارت میں دلکشی ہے۔ استعارات و تشبیہات سے بھی کام لیتے ہیں۔ اصلاح کی خواہش تحریر کی اوٹ سے جھانکتی نظر آتی ہے۔ بعض جگہ بھرد ظرافت کے نمونے بھی ملتے ہیں لیکن چونکہ اصلاح ان کا مقصد رہا ہے اس لئے یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ منشی سجاد حسین کی ادبی خدمات اردو زبان اور بالخصوص ظریفانہ ادب میں بلند مقام رکھتی ہیں۔ ان کے دو ناول حاجی بغلول اور احمق الذی اردو میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ بالخصوص حاجی بغلول منشی صاحب کی ظرافت نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ حیات شیخ چلی بھی ان کی شوخی طبع اور ذہانت کی آئینہ دار ہے۔ شاعری کے میدان میں بھی انہوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لیا ہے۔ حاجی بغلول میں ان کے اکثر اشعار ملتے ہیں۔

حاجی بغلول کے متعلق رشید صاحب لکھتے ہیں "حاجی بغلول ایک طور پر ڈکنس (CHARLES DICKENS) کے پک وک ابرواڈ (PICKWICK ABROAD) کا نامکمل اور ایک حیثیت سے ناقص چربہ ہے۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حاجی بغلول اردو طنزیات اور ظرافت میں منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اور اب تک اس کا جواب اردو میں کہیں نظر نہیں آیا:" [1]

سجاد حسین کی ظرافت میں باوجود عربی اور فارسی الفاظ کی کثرت کے رنگینی پائی جاتی ہے۔ حاجی بغلول کے کردار میں اس رنگینی ظرافت نے ایک تنوع پیدا کر دیا ہے۔ انہیں ادنیٰ مطلب کا ڈھنگ آتا ہے۔

(حاجی بغلول کا ایک اقتباس درج ذیل ہے۔ بے ساختگی اور روانی ملاحظہ فرمائیے۔ حاجی صاحب اپنی معشوقہ کنڈے والی کو یاد کر کے اس کے تصور سے اپنے دل ہی میں باتیں کر رہے ہیں)

اے نیک بخت! افسوس تجھ کو خبر نہیں کہ کوئی حاجی جان دیتا ہے۔ یوں دم توڑتا ہے۔ آپ تو کھیتی باڑی میں جی بہلاتی ہوگی یا گھر کے چلی چولہے میں پڑی ہوگی (اے تو بہ معروف ہوگی) یا اپلیاں پیاری پیاری بناتی ہوگی۔ مگر یہاں سوکھ سوکھ کر عشق کی دھوپ میں ہم کنڈا ہوئے جاتے ہیں۔ ہائے افسوس کیا نام کہ حضور کی محبت میں کیسے کیسے مخمصے اٹھائے۔ لوگوں کا ادھر کے کھیت میں لیجانا گھوڑے پر سے گرنا عمل خوانی میں کڑی سہنا۔ مگر حاجی عاشق صادق ہے جو تسلیم و رضا کی سپر لگائے سب چوٹیں کھاتا ہے۔ ورنہ ورنہ کیا نام کہ مجال تھی کسی کی کہ انگلی تو دکھائے۔ مارے جوتیوں کے ستھراؤ کر دیا ہوتا۔ مگر نہیں عاشق کے ضابطہ کے خلاف یہ بات تھی۔ جنت گاؤں کو تم اپنے جلوہ سے رشک ارم بناؤ وہاں کا گدھا اور سور براق اور دنبہ ہے۔ اور آدمی تو ہماری آنکھ میں حور اور غلمان ہیں۔ دم بھر کو کوئی سسرال جاتا ہے۔ چوسنی کھیل جاتی ہے۔ بھلا ہے کوئی مرد آج اس میدان میں جو عشق بازی میں آپ کے

[1] ظریفات و مضحکات صفحہ ۱۰۰

www.taemeernews.com

حاجی کا مقابلہ کر سکے۔ ہائے میں آج کو کوا ہوتا کہ جہاں تم ہو تیں وہاں بیٹھ کے قاؤں قاؤں کی صدا سناتا۔ تم ہنکانے اُٹھتیں اور ہم تمہارے سر پر آ بیٹھتے۔ ہائے تمنا ہے کہ تمہارے گائے بھینس ہوئے اور کیا نام کہ تمہارے گلے میں رسی باندھ کر چرانے لیجاتیں۔ پیڑوں پر تمہارے نازک ہاتھ پھیرتے۔ تم دودھ دوہتی ہوتیں اور ہم تم کو چاٹتے ہوتے۔ کیا نام کہ اگر کہو تو بھی چلیں۔ اب تو ہم دنیا میں تمہارے عاشق مشہور ہو گئے۔ سب پر بھید کھل گیا۔

اس مختصر سی عبارت میں سجاد حسین نے ظرافت کی جو لہر دوڑادی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے کس قدر شوخ طبیعت پائی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ سجاد حسین کی عبارت میں ظرافت اکثر جگہ مسخرہ پن کی شکل بھی اختیار کر گئی ہے۔ لیکن اس عیب پر ان کے دوسرے محاسن پردہ ڈال دیتے ہیں۔ عبارت میں ایسی شگفتگی اور شوخی دوسرے لکھنے والوں کے پاس شکل ہی سے ملے گی۔

اودھ پنچ: اودھ پنچ ۱۸۷۷ء میں جاری ہوا۔ وقت اور زمانہ کے لحاظ سے اس کا اجرا امداد غیبی کے مرادف سمجھا جا سکتا ہے۔ اس میں جو مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ بالعموم تنقید اور مضحکہ کا پہلو لئے ہوئے ہوتے۔ ان مضامین کو کسی نے بہت زیادہ پسند کیا اور کسی نے کم۔ پنڈت برج نرائن چکبست نے اودھ پنچ کی ظرافت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"قوموں کے مذاق سلیم نے جو ظرافت کا اعلیٰ معیار قائم کیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے ہم اودھ پنچ کی ظرافت کو اعلیٰ درجہ کی ظرافت نہیں کہہ سکتے۔ لطیف ظرافت اور بدلہ سخی و تمسخر میں بہت فرق ہے۔ اگر لطیف و پاکیزہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہے تو اردو دیوان کے عاشق کو غالب کے خطوط پر نظر ڈالنا چاہیئے۔ اودھ پنچ کے ظریفوں کی شوخ و طرار طبیعت کا رنگ دوسرا ہے ان کے قلم سے پھبتیاں ایسی نکلتی ہیں۔ جیسے کمان سے تیر۔۔۔ جو مظلوم ان تیروں کا نشانہ بنتا ہے روتا ہے۔ اور دیکھنے والے اس کی بیکسی پر روتے ہیں۔ ان کے فقرے دل میں ہلکی سی چٹکی نہیں لیتے ہیں بلکہ نشتر کی طرح تیر جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا غالب کی زیر لب مسکراہٹ سے الگ ہے۔

رشید احمد صاحب اس کے جواب میں لکھتے ہیں۔

"اودھ پنچ کے علمبرداروں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ ایک تو ایسے کہ خود بھی قہقہہ لگاتے اور دوسروں کو بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے۔ اور دوسرے وہ افراد بھی تھے جو خود مسکراتے تک نہ تھے لیکن سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ جاتے تھے۔ اکبر اور آزاد کے ادبی کارنامے بھلائے نہیں جا سکتے۔ پنچ کا یہ دور بالکل قدرتی تھا۔ بانیم خفی خسوف و کسوف کی بنا پر مہر و ماہ کو کب تک روکا جا سکتا ہے۔"[1]

اس میں شک نہیں کہ مزاح اور ظرافت کی جو تعریفات پچھلے صفحات میں بیان کی گئی ہیں اور طعن و طنز میں جو خندہ جبینی اور آسودگی پائی جانی چاہیئے وہ پوری طرح اودھ پنچ میں موجود نہیں ہے۔ لیکن جیسا کہ رشید صاحب نے لکھا ہے پنچ کا یہ دور بالکل قدرتی تھا۔ ابتدائی کوششوں میں نقائص اور کوتاہیوں کا ہونا ضروری ہے۔ اس لئے مجموعی طور پر اودھ پنچ کو اردو زبان کا نمائندہ طنزیہ اخبار سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] طنزیات و مضحکات صفحہ ۸، ۷، ۹،

www.taemeernews.com

بالخصوص اکبر الہ آبادی۔ رتن ناتھ سرشار۔ نواب سید محمد خاں آزاد اور مولوی عبدالغفور شہباز کی ظرافت آپ اپنی نظیر ہے۔ اودھ پنچ منشی سجاد حسین کے آخر دم تک نکلتا رہا۔ ان کی وفات پر ۱۹۱۲ء میں اودھ پنچ روپوش ہوگیا۔

۱۹۱۶ء میں حکیم شیخ محمد ممتاز حسین صاحب سابق پروفیسر ایڈورڈ کرسچین کالج لکھنؤ نے اودھ پنچ کو دوبارہ زندہ کیا۔

اودھ پنچ کا یہ دور سابق اودھ پنچ سے بلحاظ مقاصد و خدمات زیادہ کامیاب سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں علمی و فلسفیانہ مضامین بھی چھپنے لگے ملک کی آزادی کی خواہش ظرافت کے لباس میں جلوہ گر ہوئی۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت کارٹون یعنی مضحک تصاویر کی اشاعت ہے۔ کارٹون کی اشاعت کا یہ خیال انگلستان کے مشہور اخبار پنچ کی مقبولیت نے پیدا کیا۔ مضحک تصاویر نے اودھ پنچ جدید کی مقبولیت کو بڑھا دی ہے۔ اور یہ ماننا پڑے گا کہ ہندوستانی جوہر خداداد رکھتے ہیں۔ اگر کسی سے اکتساب بھی کریں گے تو کمال کو پہنچ جائیں گے۔ اودھ پنچ کے بعض کارٹون اپنی ندرت اور جامعیت کے اعتبار سے یورپین صحائف کے بعض بہترین کارٹون سے ٹکر کھاتے ہیں۔[1]

رتن ناتھ سرشار (۱۸۴۶ء تا ۱۹۰۰ء)، ظرافت نگاری میں سرشار کی حیثیت کے تعین کے لئے مناسب ہوگا کہ سب سے پہلے عبدالباری آسی کے ان خیالات کا جائزہ لیا جائے جو انہوں نے تذکرہ خندہ گل میں سرشار سے متعلق ظاہر کئے ہیں۔

آسی صاحب لکھتے ہیں "رتن ناتھ سرشار جب ظرافت لکھتے ہیں۔ تو کچھ رسوم و رواج کے نقشے کھینچ کر کچھ حالات پیدا کرتے ہیں۔ کچھ اس فرقے کے حالات لکھتے ہیں اور ان میں محاورات کو داخل کرتے ہیں۔ کچھ استعارات لاتے ہیں کچھ ضرب الامثال سے بیت کلام میں مدد لیتے ہیں کچھ ہنسنے ہنسانے والے الفاظ استعمال کرتے کچھ کلام کو طول دیتے ہیں۔ کچھ مشاہیر کے تڑپانے والے اشعار موقع بموقع لکھتے ہیں۔ تب کہیں جا کر عبارت میں ایک لطافت پیدا ہوتی ہے۔ اس میں بھی ایک نقاد کی پہلی نظر نکتہ چین کو آوری کا عیب صاف اور کھلا ہوا نظر آتا ہے۔ اور دوسری نگاہ خوردبین طوالت کلام کی وجہ سے ہر داستان کو سعدان بن سنگور کی داستان خیال کرنے لگتی ہے۔ الفاظ کے قالب نقش و نگار سے مزین اور مرتب معلوم ہوتے ہیں۔ مگر وہ لعبت چین سے زیادہ نہیں ہوتے۔ نہ ان میں کوئی روح نہ جان۔ عام نظروں کو دھوکہ دینے میں البتہ مدد کرتے ہیں"۔[2] اس کے بعد آسی صاحب نے سرشار کا سجاد حسین سے مقابلہ کیا ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ آسی صاحب نے اس خیال کی بنیاد کن دلائل پر رکھی ہے۔ انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اور سرشار کی رنگین بیانی کو جس انداز میں متعارف کیا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی، جو گو اپنے مخالف کی اچھی سی اچھی بات کو پست ترین بنا کر پیش کرتا ہے۔ رتن ناتھ سرشار کی بہترین تصنیف فسانہ آزاد سمجھی جاتی ہے۔ صرف اس کتاب کو پیش نظر رکھا جائے تو آسی صاحب کے اس خیال کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے کہ سرشار میں آورد ہی آورد ہے۔ پنڈت برج نارائن درآ بجانی فسانہ آزاد کے متعلق لکھتے ہیں۔

---

[1] طنزیات و مضحکات صفحہ ۱۶۵ [2] تذکرۂ خندہ گل صفحہ ۲۵۹

www.taemeernews.com

قصہ کا پلاٹ تو بہت سادہ بلکہ حد درجہ بے مزہ ہے۔ مگر ڈھائی ہزار گنجان صفحے پڑھتے چلے جایئے ذرا بد مزہ نہیں ہوجئے گا بلکہ سطر سطر پر اشتیاق بڑھتا جائے گا۔ محض اس وجہ سے کہ عبارت آرائی غضب کی ہے۔ طرز ادا نہایت بے تکلف اور آسان تانہ اور نیچرل تمثیل اور واضح پھر اس کے ساتھ جا بجا پُر لطف ظرافت پھڑکتے ہوئے نقرے مزیدار شوخیاں ترکی بہ ترکی جواب۔ جماعت آمیز مضحک باتیں جن کو پڑھ کر ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔۔۔۔ یہ ہے اصل قصہ اور جہاں تک قصہ کے پلاٹ کا تعلق ہے اس سے بدتر اور بے مزہ شاید ہی کوئی قصہ انسانی دماغ سے نکلا ہوگا۔ مگر اس قصہ کو رتن ناتھ کی زبان سے سنئے تو معلوم ہو جائے کہ ہم ایک نگار خانہ جن میں چلے جا رہے ہیں۔ جس کی دلکش جیتی جاگتی تصویریں الفاظ کا جادو اور تخیل کی کثرت مناظر کی چونچالی ایسی ہے کہ جب اس آئینہ خانہ سے گزرتے ہیں تو کچھ یقین کچھ شک کرتے ہوئے ایک طلسم ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ اور یہ معلوم ہتا ہے کہ کس زبردست بازیگر نے اپنے کرتبی ڈنڈے سے یہ سامان ہمارے سامنے کھینچ دیا ہے[1]

سرشار کی تحریر کے متعلق یہ دو متضاد بیانات ہمارے پیش نظر ہیں۔ پنڈت بشن نارائن در آبخانی کی یہ تحریر ظاہر ہے کہ آسی صاحب کے تذکرہ خندۂ گل سے برسہابرس پہلے لکھی گئی۔ کاش کہ یہ تحریر ان کی نظر سے بھی گزر جاتی اور اگر ایسا ہوا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ آسی صاحب کا قلم کیوں کر اس قدر متضاد باتیں لکھ سکا۔ اس میں شک نہیں کہ سرشار کی عبارت میں تشبیہات و استعارات محاورات اور ضرب الامثال بکثرت ہیں۔ لیکن اس سے یہ صادق نہیں آتا کہ سرشار کی تحریر میں آمد نہیں ہے آورد کا نقص تو ان میں کہیں بھی نہیں پایا جاتا۔ اور رنگینی بیان کی اور عبارت آرائی اگر کوئی جرم ہے تو سرشار کی تحریر نے جنم لیا اس وقت سے اور اب اسی تو وقت کا تھا۔ عبارت آرائی اس وقت تحریر کی شان سمجھی جاتی تھی یہی اس کا حسن اور زیور تھا۔ غالب کی نثر میں اکثر جگہ تشبیہات و استعارات کا استعمال ہوا۔ ادیب ہوں یا شاعر سب نے اسی رنگ کی پیروی کی ہے۔ آسی صاحب اس بات کو جانتے ہوئے بھی کہ حالی اور آزاد سرسید اور اسمٰعیل میرٹھی نے جب ادب میں نئی راہیں ایجاد کیں تو ان کے خلاف کس قدر زہر اگلا گیا۔ آسی نے سرشار کی تحریر میں جو نقائص نکالے ہیں وہی اس عہد میں محاسن سمجھے جاتے تھے۔ آسی صاحب نے یہ بھی لکھ دیا ہے کہ سرشار کے الفاظ اگرچہ حسین ہوتے ہیں لیکن ان میں نہ کوئی روح ہوتی ہے نہ جان۔ اس میں شک نہیں کہ سرشار کی طوالت کلام اکثر جگہ گراں گزرتی ہے لیکن الفاظ بہرحال بولتے ہوئے ہیں۔ نقرے اور جملے ـــ لطف دیتے ہیں۔ اب رہی ظرافت تو سرشار کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان کی شوخی طبع "ہر رنگ میں بہار کا اثبات" پیدا کرتی ہے۔ وہ ہزاروں صفحات لکھ ڈالتے ہیں۔ لیکن کلام کی شوخی میں فرق نہیں آنے پاتا۔ افسانوی نقطۂ نظر سے ان کے پلاٹ بدمزہ اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں اور وہ اپنے قصوں میں اتنے کردار پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کا سنبھالنا ان کے لئے مشکل ہو جاتا ہے۔ ان عیوب کا ان کے افسانوں میں پایا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ غور فکر کے بالکل عادی نہ تھے۔ اور انہیں اپنے قلم پر قابو نہ تھا۔ لیکن جہاں تک ظرافت نگاری کا تعلق ہے سرشار کی عبارت زندہ دلی اور شوخی کا منبع ہے۔

خوجی۔ اے میاں وہ سانڈنی بلا کی دھاوا کرنے والی ہے۔ ریل کی دم میں باندھ دو۔ دیکھو چند دمی تک برابر چھم چھم کرتی چلی جاتی ہے یا نہیں۔ ہندوستان سے ملک میں ویسی ایک تو نظر آتی نہیں۔ کیا دم خم ہے بھئی میں دو ایک دفعہ سوار ہوا واللہ ہے یہ

---

[1] منقول از تاریخ ادب اردو۔ صفحہ ۱۱۲۔ حصہ نثر۔

www.taemeernews.com

معلوم ہوتا تھا کہ ہوا پر چلا جا رہا ہوں۔ وہ ٹھمک ٹھمک چال کراہو ہو، سواری اور اونٹ بگھی گھوڑا پالکی، ہاتھی سب اس کے مقابل میں گرد ہیں۔ اور سچ پوچھو تو میاں صف شکن سے اس کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔

میر صاحب۔ واہ خواجہ صاحب آپ بھی واللہ کیا بے تکی باتیں کرتے ہیں۔ کجا بے زبان جانور کجا ہمارے صف شکن سلمہ اللہ تعالیٰ باجی اور بھلے مانس کا مقابلہ کیا۔ ارے وہ اشرف الحیوانات ہے۔ ایسی ایسی ہزار سانڈنیاں اس کی ایک لات پر نثار ہونے لگے سانڈنی کے کھونے کا زیادہ رنج ہوا۔[1]

نواب سید محمد آزاد آئی۔ ایس۔ او: نواب سید محمد آزاد ۱۸۴۶ء میں بمقام ڈھاکہ پیدا ہوئے۔ مشرقی بنگال کے معزز اور دولت مند خاندان سے آپ کا تعلق تھا۔ بنگال کونسل میں دو مرتبہ ممبر منتخب ہوئے۔ اور امپریل سروس آرڈر کا نشان اعزازی آپ کو عطا ہوا۔

نواب سید محمد آزاد اودھ پنچ لکھنؤ کے سب سے بہتر لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ادبی ظرائف اور مزاحیہ شگوفے ان کے طعن و طنز کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کی طنز نگاری میں شدت اور تلخی نہیں بلکہ لطافت اور شگفتگی ہے۔ زبان صاف شستہ ہے تشبیہات و استعارات سے مطلقاً احتراز کیا ہے۔ ان کی عبارت باوجود سادگی کے اثر و تاثیر کی گھلاوٹ رکھتی ہے۔ ادائے مطالب پر ان کا قلم پوری طرح حاوی ہے۔ ان کی تحریر میں لطافت اور روانی ہے۔ اور ساتھ ساتھ عبارت میں زندگی اور زندہ دلی کی روح جلوہ گر ہے۔

اکبر الہ آبادی کی طرح انہوں نے اپنے انداز میں ہندوستانیوں کی مغرب پرستی اور شوق تقلید پر قلم اٹھایا ہے۔ مغرب اور مغربیت کے خلاف انہوں نے اپنی طنز نگاری کی صلاحیتوں کو پوری طرح استعمال کیا ہے۔ مغربی معاشرے پر ان کی نکتہ چینی کا انداز عمدہ اور لطیف ہے۔

نواب سید محمد آزاد نے ایک ڈکشنری بھی اپنے مخصوص رنگ میں لکھی ہے۔ ان کی یہ لغت ان کے عہد کے ملکی و معاشرتی حالات پر روشنی ڈالتی ہے۔ الفاظ کے معانی و مطالب بیان کرتے ہوئے انہوں نے ملک کی سیاست و معاشرت پر تنقید کی ہے۔

یہ مقولہ کہ مضحکہ سچائی کا امتحان ہوتا ہے۔ نواب سید محمد آزاد کی تحریر پر بڑی حد تک صادق آتا ہے۔ ان کا طعن و طنز تنقید کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اس میں بیداری کا عنصر کارفرما ہے۔ ان کی تحریر کی خوبیاں ظفر علی خاں کی طنز نگاری میں ملتی ہیں۔ لیکن ظفر علی خاں کے طنز میں ادبی لطائف و ظرائف کی کمی ہے۔ مصلح دونوں ہیں۔ ظفر علی خاں میں ظرافت نہیں صرف طنز ہے۔ نواب آزاد کی طنز نگاری کا مقصد پنہاں ہے۔ اور موخر الذکر کا مقصد آشکارا۔ آزاد زہر کو امرت کا روپ دینا چاہتے ہیں۔ لیکن ظفر علی خاں زہر کو زہر ہی کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

ڈکشنری کے ذریعہ طنز کا پہلو اختیار کرنا نواب آزاد کی ایجاد ہے اور اس انداز میں طنز کرنے کی پیروی ان کے بعد اکثر لکھنے والوں نے کی ہے خواجہ حسن نظامی نے بھی اس صنف میں لکھنا چاہا ہے۔ لیکن موجد کا حق امتیاز برقرار ہے۔ رشید صاحب نے

---

[1] فسانۂ آزاد، جلد چہارم۔

www.taemeernews.com

آزاد کے متعلق اپنی یہ رائے دی ہے۔

آزاد کی طنز و ظرافت میں جو چیز نہایت نمایاں اور بارزہ ہے وہ اُن کی خلق شگفتگی ہے۔ کینہ پروری اور زہرناکی کا عنصر کہیں نہیں ہے۔ آزاد نے ہندوستان کے سیاسی اور معاشرتی رجحانات پر نہایت جامع طریق سے اظہار خیال کیا ہے۔

ڈکشنری: پالیسی ــ گیدڑ بھبکی ہوائی بندوق کی آواز۔ کمزور کو دبانا۔ زبردست سے ڈرنا۔ ہمران پارلیمنٹ کا آپس کا ناز و نیاز۔ کسی کے چلتے ہوئے گھر سے ٹاپنا۔

سوئیزیشن ــ اپنے ہم وطنوں کو نیم وحشی جاننا۔ اپنے بزرگوں کو "اولڈ کوس" (پرانا ناز) کہنا۔ ہارمونیم کی گت پر برانڈی کی دھن میں پیروں سے تال دینا۔

کانشنس ــ ایک خاص قسم کا مادہ سنگ شانہ جو مدبروں کے دماغ کا جزو لاینفک ہے اور جس کو کسی ڈاکٹر نے آج تک پہچانا نہیں۔ ہر قسم کے معاہدے کا خاص ضرورتوں کے لئے توڑ دینا۔ ایمان کو حکمت عملی کی اسپرٹ سے تر رکھنا۔

تعلیم نسواں ــ عام جلسوں میں اپنی بہو بیٹیوں کو لے جانا۔ اپنی میم کا ناچنے کے جلسے میں ایک وقت کے لئے دوسرے کی میم سے تبادلہ کرنا۔

سلطان حیدر جوش: مولانا محمد علی کے اخبار "ہمدرد" کے لکھنے والوں میں سلطان حیدر جوش خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہمدرد میں ان کا قلمی نام "جان بل" تھا رشید صاحب کی رائے میں "سلطان حیدر جوش کے طنز میں فلسفیانہ ظرافت اور ظرافت میں فلسفیانہ طنز کا دلنشیں عنصر بہت نمایاں ہے اس قسم کی ظرافت اور طنز کی ابتداء اردو ادب میں کسی نہ کسی حد تک سلطان حیدر ہی کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ جوش غالباً پہلے لکھنے والے ہیں جنھوں نے اردو طنزیات و مضحکات میں مغربی آب و رنگ پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی تحریر میں اسپیکٹیٹر کی نشتریت بھی کہیں کہیں نظر آتی ہے گو اسپیکٹیٹر کی رعنائی خیال پاکیزگی بیان ژرف نگاہی، اختصار اور بے ساختگی کا فقدان ہوتا ہے"[1]

سلطان حیدر جوش اردو کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ انہیں کہنہ مشق انشاء پرداز سمجھنا چاہیے۔ اردو افسانہ نگاری میں انہوں نے اپنا ایک علیحدہ راستہ بنایا ہے۔ جوش میں "فلسفیانہ ظرافت" تو نہیں البتہ فلسفیانہ طنز ضرور موجود ہے۔ ظرافت کا عنصر ان کی تحریروں میں کم ہی ہے لیکن طنز پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ وہ الفاظ سے نہیں کھیلتے واقعات سے شغل کرتے ہیں۔ اور ان واقعات ہی میں ان کا طعن و طنز پرورش پاتا ہے۔ ان کی عبارت میں شوخی اور شگفتگی کا بھی فقدان ہے علمیت اور فلسفہ طرازی ان کی تحریر کی خصوصیات ہیں۔ اس میں وقت پسندی کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ طنز اور ظرافت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی طبیعت کو شگفتہ کر دے۔ اس خوبی سے ان کی تحریر عموماً خالی ہے۔ طنز نگاری میں البتہ انہیں کمال [illegible] ہمارا موضوع بحث نہیں ہے لیکن چونکہ جوش کی تحریروں میں کہیں کہیں ظرافت کی جھلکیاں بھی نظر آجاتی ہیں اس لئے ان کا تذکرہ ضروری سمجھا گیا ہے۔ وہ سماج کے عام نقائص پر شد و مد کے ساتھ نکتہ چینی کرتے ہیں۔

---

[1] طنزیات و مضحکات۔ صفحہ ۱۸۲

www.taemeernews.com

طعن وطنز کی شدت اکثر جگہ ناگوار گزرتی ہے۔ مثال ملاحظہ ہو۔

"رہی یہ بات کہ میر حسن کی ناف پر باتمدی ہونے کا شبہ کیا جاتا ہے۔ تو یہ کچھ قابل لحاظ بات نہیں۔ اور گیا وہ زمانہ جب فلاں بن فلاں کی بہت پہچان بین کی جاتی تھی۔ اب تو شریف خون کی قدر بھیڑ بکری کے خون کے برابر بھی نہیں کی جاتی ــــ تجارت کا بکھیڑا بھی ٹھکانے لگا دیا اور پرانے خیالات کی بھوتنی یکلخت اتار پھینکی۔ اب کونسی بات ہے جس پر کوئی بھول کر بھی انگلی اٹھا سکے۔ ماں باپ کی پیدائی ہوئی چار سو ماہوار کی جائداد اور چالیس ہزار نقد بنک میں چھوڑ جائیں۔ انگلستان جانا اور پورے آٹھ سال میں بیرسٹر ہو آنا کیا مشکل تھا چلو یونہی سہی کہ میر حسن صاحب آٹھ سال کے بعد کچھ اتار کر مسٹر مارسن بار ایٹ لا بنکر ولایت سے واپس گئے تو چالیس ہزار نقد کے بجائے دو ٹرنک سوٹوں سے پُر تھے اور کچھ بیش قیمت بوٹ اور شوز مگر پھر بھی بیرسٹری کی سند اور چار سو ماہوار کی مستقل آمدنی موجودہ زمانہ میں بڑی چیز تھی بکریلا اور نیم چڑھا!!" [1]

"سنسر..... کل کے برخوردار آج کے پدر بزرگوار ہیں۔ ہر چیز ترقی کے دنگ میں کینچلی اتارتے رہنے کی عادی ہے۔ سنسر کی شخصیت نے بھی زمانہ کے قدم بقدم چل کر حسب حاجت ہمیشہ نئے قالب اختیار کئے ہیں۔ جس وقت سے اسکول اور نئی لیجسلیٹو نے جنم لیا سنسر کی ذات نے بھی اس دائرہ میں شکل ممتحن میں جلوہ فرمایا۔ جس تدر تعلیم کی تیز روشنی کے ساتھ طلباء کی تعداد بڑھتی گئی اسی نسبت سے جزو سنسری ممتحن کی ذات وصفات پر غالب آتا گیا۔ چنانچہ فی زمانہ اگر تعلیم اس حد پر پہنچ گئی ہے کہ قلی بھی انٹرنس پاس کئے بغیر نہیں لیا جاتا۔ تو ممتحن کا فصل قطع وبرید بھی اس درجہ بڑھ گیا ہے کہ اگر سو لڑکے انٹرنس میں شامل ہوں تو ایم۔ اے پاس کرنے تک بلا مبالغہ صرف ایک ذات واحد رہ جائے گی۔"[2]

محفوظ علی: اودھ پنچ لکھنؤ اور اخبار ہمدرد (دہلی) میں محفوظ علی کے مضامین بالالتزام چھپتے رہتے ہیں۔ ان کے مضامین باوجود تلاش کے نہیں ملتے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ مرحوم مختلف قلمی ناموں سے لکھتے رہے۔ حاجی بغلول اور ملا علی کاتب، بوڑھا موی ان کے دو قلمی نام معلوم ہو سکے ہیں۔

۱۲ جولائی ۱۹۱۰ء کے اخبار ہمدرد میں ان کا ایک مضمون "حاجی صاحب کی تقریر اور کارروائی جلسہ" ہماری نظر سے گزرا۔ اور چند مضامین کے اقتباسات "طنزیات و مضحکات" میں درج ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ مرحوم زندگی کے حقائق سے بڑی اچھی طرح واقف تھے ان کی ظرافت نگاری میں احساس برتری یا جذبہ تنفر نہیں بلکہ ہمدردی کا عنصر غالب ہے۔ ان کی ظرافت میں ایک قسم کی چبھن اور درد کی ٹیس پنہاں ہے۔ طنز میں شدت ہے جس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ نظام تمدن کی اصلاح چاہتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی صاحب ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

"طنز میں سب سے بہتر ظرافت لکھنے والے مولوی محفوظ علی صاحب بی۔ اے سامان بدایوں ہیں۔ ان سے زیادہ نیچرل اور بے ساختہ چلبلی اور از سرتا پا مرصع ظرافت کوئی نہیں لکھتا۔ یا میرے علم میں نہیں ہے۔"[3]

---

[1] پھر بھی عمر قید۔ از شمع سبستان۔ [2] پھر بھی عمر قید" ۴۲ [3] منقول از طنزیات و مضحکات صفحہ ۱۲۴۔

www.taemeernews.com

رشید صاحب کی رائے ہے کہ "بعض دیگر انشا پردازوں کے مضامین کے خلاف سید محفوظ علی صاحب کا ہر لفظ کانٹے کا تُلا معلوم ہوتا ہے اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حقیر ترین جزئیات پر بھی ان کو عبور ہے۔ ان کا طرز بیان اور انتخاب الفاظ اپنے اندر بہت سی گہرائیاں رکھتا ہے لیکن راقم السطور کو یہ کہنے میں بھی تامل نہیں کہ سید صاحب رعایت لفظی کی گمراہیوں میں اکثر اسیر نظر آتے ہیں۔"

مرحوم کی تحریروں میں دقت پسندی کا عنصر زیادہ ہے۔ الفاظ کانٹے کے تُلے ضرور ہوتے ہیں لیکن ان میں بے ساختگی اور لوچ نہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر وہ گراں گزرنے لگتے ہیں۔

"اپنے حقوق کا تحفظ لازمی و لابدی ہے۔ اصل عزت و عظمت کی مستحق زوجہ ہے نہ کہ ماں ــــ جس طرح ہمارے یونانی اطبا نے آلو انڈے وہی اور بھر کے کھانے پینے کی چیزوں کا مزاج نکال لیا ہے اور درجہ قائم کر کے یہ قرار دے دیا ہے کہ کون چیز کس درجہ میں گرم ہے۔ اور کس درجہ میں سرد۔ کس درجہ تر ہے۔ اور کس درجہ خشک۔ معلوم نہیں۔ اسی طرح صاحب دین کو بھی اشیائے ماکول میں سمجھ کر کسی طبیعت نے اس کا مزاج بھی نکالا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اس فروگذاشت پر افسوس کرتے ہوئے فقیر اپنا اجتہاد پیش کرتا ہے کہ میرے تجربے میں صاحب دین ایک مختلف المزاج والکیفیت چیز ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ صاحب دین کا مزاج کسی دوسرے صاحب دین کے مزاج کے ساتھ تو ہمیشہ گرم رہتا ہے۔ لیکن غیر صاحب دین کے ساتھ سرد خشک اور غصہ اور ریا کے سفر کی حالت میں گرم خشک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے صاحب دین کے لئے چاہے وہ فہرست پندرہ کر آئے یا دعوت چاہے۔ ایک صاحب دین ہمیشہ سریع الفہم ہے مگر غیر صاحب دین کے لئے خواہ وہ خفیف سی خفیف درخواست ہی لیکر آئے وہ نہایت بطی الفہم ہے۔"

راشد الخیری: مولانا راشد الخیری مرحوم کی قلم انگیز تصانیف اردو ادب میں بہت مشہور ہیں۔ عورتوں کے ہمدرد کی حیثیت سے انہیں طبقۂ اناث میں زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ اور ان کی تصانیف زیادہ تر عورتوں ہی کے مطالعہ کے لئے ہوتی ہیں۔

راشد الخیری کی یہ تصانیف تو نوعیت ہی کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ظرافت نگار کی حیثیت سے انہوں نے ادب کو کیا دیا ہے۔ ان کی ایک کتاب "نائی عشو" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

راشد الخیری مرحوم کی ظرافت نگاری درحقیقت ظرافت اور غم کی ایک کشمکش معلوم ہوتی ہے۔ سب سے پہلے سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے اس صنف میں قلم کیوں اٹھایا۔ اس کی تین وجوہات ہیں۔

(۱) راشد الخیری مرحوم نے ہندوستانی عورتوں کی معاشرتی زندگی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اس لئے عورتوں کی نفسیات کو وہ خوب جانتے ہیں۔ (۲) ان کا انداز تحریر بہت زیادہ تصویری (PICTURESQUE) ہے۔ اس کے ذریعہ وہ ماحول کا نقشہ کھینچنے میں اپنا کمال ظاہر کر سکتے ہیں۔ (۳) ان میں مبالغہ آمیز کردار نگاری کے ذریعہ اثر پیدا کرنے کی قوت موجود ہے۔ کردار نگاری میں وہ نذیر احمد سے بھی زیادہ تفصیلی ہیں۔ ان مخصوصیات نے ان کی تحریروں کو مقبولیت بخشی۔ ان تین خصوصیات نے انھیں ظرافت

www.taemeernews.com

کی طرف بھی متوجہ کیا۔ ان کی ظرافت میں ان امور کا پتہ چلتا ہے۔

(۱) لفظی اُلٹ پھیر سے مزاح کی کوشش زبان گو صحیح اور اچھی لکھتے ہیں لیکن مترادف الفاظ اور ہم معنی جملوں کا بکثرت استعمال کرتے ہیں طوالت کلام اکثر جگہ گراں گزرنے لگتی ہے۔ لفظی کھیل سے ظرافت پیدا کرنے کی کوشش میں راشد الخیری پڑھنے والے کی طبیعت میں انقباض پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً

"ڈاکٹرنی" "آل رائٹ عشو کیا کہا"

گھر والی "کہتی ہیں ال لیٹ"

عشو۔ میم صاحب بیوی یہ ال لیٹ بل لیٹ تو میں جانتی نہیں۔ بچہ کو دوا پلاؤ یہ

"لیڈی۔ ویری ول"

عشو ململ نما کیا کروگی۔ سیدھی بات کرو۔ یہ بابل لیٹ اور ململ کیسی[1]

سنو چڑیلو میں ہمیشہ قرآنی آیات کہا کرتی ہوں..... مگر تم جوتی خوریوں کی ایسی آنکھیں پھوٹی ہیں کہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ مردو جب قبر میں پیٹ پھولے گا تو خون کی ایسی نہریں بہیں گی کہ ابابیلیں تیریں گی[2]

اس کتاب میں تین افسانے اور شامل ہیں جنہیں پُربط افسانوں کا نام دیا گیا ہے لیکن ان میں راشد الخیری مرحوم نے پھر اپنا اصلی انداز اختیار کر لیا ہے۔ جو خود رونے اور دوسروں کو رُلانے کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

"سجدہ ندامت" اور "رنگینی" ایسے ہی افسانے ہیں۔

مجموعی حیثیت سے ان کی ظرافت ایک پیش پا افتادہ مقصد کی تابع معلوم ہوتی ہے۔ مغربی تہذیب کا مضحکہ اڑانے میں انتہا پسندی کا اظہار کیا گیا ہے۔ خیال سے زیادہ ان کی زبان انتہا پسند معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ان کی ظرافت میں اصلیت اور آمد کے جوہر کم ہیں۔ منظر کشی قوت بیان کردار نگاری سب کچھ ہے لیکن ظرافت کسی داخلی اور ذہنی تہذیب سے عاری ہے۔

خواجہ حسن نظامی: اپنی ظرافت کے متعلق ان کی اپنی رائے۔

میری طبیعت کی افتاد شوخی اور ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے۔ مگر جناب اکبر الہ آبادی کی ہم نشینی اور اس احساس کے سبب کہ نثر اردو میں مفید ظرافت کا رواج پڑھے مجھ کو بھی شوق ہوا کہ اردو کے اس میدان میں طبع آزمائی کروں۔ ہنسی مذاق میرا کام نہ تھا۔ مگر میں نے محض زبان اردو کی خاطر اس کام کو دخل دیا اور کچھ لکھا میرے تازہ مجموعہ مضامین پر جو "سیپارہ دل" کے نام سے گزشتہ ہفتے شائع ہوا ہے جناب مولوی عبدالحق بی اے سکریٹری انجمن ترقی اردو نے دیباچہ لکھتے ایک فقرہ یہ بھی لکھا تھا کہ ان مضامین میں غالب کی طرح ظرافت کی چاشنی نہیں ہے۔ لہٰذا آج مطلوب کی طرح ظرافت کی چاشنی چکھانے لایا ہوں[3]

---

[1] نائی عشو صفحہ ۷۔ [2] نائی عشو صفحہ ۸۔ [3] منقول از مضامین و مفکوکات صفحہ (۱۵۲)

www.taemeernews.com

ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی رائے۔

"خواجہ صاحب کے چٹکلے اور فقرے بھی اگرچہ فکر و تراش سے خالی نہیں ہوتے لیکن اسے اس خوبی سے چھپایا ہے کہ بے تکلفی اور بے ساختہ پن قربان ہو جاتا ہے بلکہ دیکھا جائے تو خواجہ صاحب کا رنگ مرزا غالب سے بہت ملتا جلتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ظرافت کی چاشنی نہیں مگر اس کے بجائے سوز و گداز ہے مرزا کے فقرے ظرافت سے ہاتھ بیت میں کھلے ہوئے ہوتے ہیں۔"[1]

پتہ نہیں کہ حسن نظامی صاحب نے مولوی عبدالحق صاحب پر طنز کیا ہے یا اعتراف حقیقت بہرحال جو کچھ بھی ہو۔ خواجہ حسن نظامی نے اردو مزاح نگاری میں ایک خاص راہ پیدا کی۔ ان کی ظرافت میں بذلہ سنجی اور ادبی لطائف کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ گو ان کی شخصیت اور طرز زندگی شوخی اور ظرافت کے خلاف واقع ہوئی ہے پھر بھی انکی تحریریں یہ رنگ موجود ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ رعایت لفظی اور استعارات و تشبیہات کی الجھنوں میں گرفتار نظر آتے ہیں۔ اور بعض جگہ الفاظ کی بے مزہ الٹ پھیر سے کام لے کر ظرافت پیدا کرنے کی ناکام کوششیں بھی کرتے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو ان کی ظرافت نگاری کو ناپسندیدہ نہیں کہا جا سکتا۔

"پیاری ڈکار" کو ان کی ظرافت نگاری کا شاہکار کہنا چاہیئے لکھتے ہیں،

"کونسل کی ممبری نہیں چاہتا۔ قوم کی لیڈری نہیں مانگتا۔ اول کا خطاب درکار نہیں۔ موٹر اور شملہ کی کسی کوٹھی کی تمنا نہیں میں تو فرماسے اور اگر کسی دوسرے میں دینے کی قدرت ہو تو اس سے بھی صرف ایک ڈکار طلب کرتا ہوں چاہتا یہ ہوں کہ اپنے طوفانی پیٹ کے بادلوں کو حلق میں بلا لوں اور پوری گرج کے ساتھ باہر برسا دوں یعنی کڑاکے دار ڈکار لوں۔ پر کیا کروں یہ نئے فیشن والے حضور دربار سے ڈکار لینے نہیں دیتے۔ کہتے ہیں ڈکار آنے لگے تو ہونٹوں کو بھینچ لو۔ اور ناک کے نتھنوں سے اسے چپ چاپ اڑا دو۔ یہ ڈکار لینی بڑی بدتہذیبی ہے۔

مجھے یاد ہے سر جیمس لاٹوش یو۔ پی کے لفٹننٹ گورنر علیگڑھ کالج میں مہمان تھے رات کے کھانے میں مجھ جیسے ایک گنوار نے بیزبردستی سے ڈکار لے لی۔ سب جنٹلمین اس بچارے دہقانی کو نفرت سے دیکھنے لگے۔ برابر ایک شوخ و طرار نیشن ایبل تشریف فرما تھے انہوں نے نظر حقارت سے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا۔ جیب سے گھڑی نکالی اور اس کو بغور دیکھنے لگے۔ غریب دہقانی پہلے ہی سے گھبرا گیا تھا۔ مجمع کی حالت سے متاثر ہو رہا تھا۔ برابر میں گھڑی دیکھی گئی تو اس نے بے اختیار پوچھا جناب کیا وقت ہے۔ شریف نیشن پرست بولا گھڑی شاید غلط ہے۔ اس میں نو بجے ہیں مگر وقت بارہ بجے کا ہے۔ کیونکہ ابھی توپ کی آواز آئی تھی۔ بیچارہ ڈکار لینے والا سن کر پانی پانی ہو گیا۔ کہ اس کی ڈکار کو توپ سے تشبیہ دی گئی۔"

رشید احمد صدیقی: رشید صدیقی کی ظرافت نگاری سے متعلق اتنی متضاد اور مختلف رائیں ہیں کہ اگر ان پر اعتبار کر لیا جائے تو ملا رشید صدیقی کو ظرافت نگار کہا ہی نہیں جا سکتا۔ مثلاً شوکت تھانوی لکھتے ہیں۔

حضور ضیاء الملک گلابی اردو صاحب کے متعلق اس لئے کچھ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ آج تو وہ اپنے

---

[1] خواجہ حسن نظامی بیچارہ دل صفحہ ۹

www.taemeernews.com

کو مزاح نگار سمجھ رہے ہیں. کل خدا جانے اور کس کس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے تو میں ہر ایک کا تردید کہاں تک کرتا پھروں گا؟" [1]

رشید صاحب کی رائے ہے۔

"ملا رموزی کا صاغ ظرافت کے لئے نہایت رسا ہے. وہ جس موقع کا تذکرہ کریں گے اس میں ظرافت یا طنز کے جتنے پہلو ممکن ہیں سب ان کے سامنے آجائیں گے. لیکن لکھتے وقت وہ اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ سب باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں. یا ان الفاظ اور لہجہ میں نہیں لکھنا چاہیئے. جن میں ملا صاحب لکھنے کے عادی ہیں. ملا صاحب کی تحریروں میں ایک چیز اکثر کھٹکتی ہے اور اس چیز کا احساس سوا ملا صاحب کے ہر ایک کو ہے یعنی وہ دوسروں کی پگڑی اور اپنا نام اچھالنے کی زیادہ فکر رکھتے ہیں. ملا رموزی صاحب نے ظرافت کو اپنا پیشہ سا بنا لیا ہے. اور یہی سبب ہے کہ بسا اوقات وہ لکھتے لکھتے ایسا لب و لہجہ اختیار کر لیتے ہیں یا ایسے الفاظ اور فقرے لکھ جاتے ہیں جو ان کے جیسے رتبہ کے انشاء پردازوں کے شایان شان نہیں ہوتے"

عظیم بیگ چغتائی کا خیال ہے کہ ملا صاحب ایک "غور طلب مصلح" ہیں نہ کہ مزاحیہ نگار" [2]

عبدالقادر صاحب سروری ان کے متعلق لکھتے ہیں۔

".... فرض ابھی ایک وسیع اور شاندار مستقبل ہمارے سامنے ہے. جس کا راستہ ملا رموزی صاحب نے کھول دیا ہے. یقیناً ملا رموزی کی ظرافت نگاری اخبارات اور رسائل سے نکل کر مستقل ادبیات میں جگہ کرے گی. اور قوم کے پژمردہ دلوں کے لئے مسرت پائدار ثابت ہوگی اور ملک کے تاریک ترین گوشوں کیلئے بھی روشنی کا سامان دے گی۔

ملا رموزی واقعہ یہ ہے کہ ایک مصلح کی حیثیت رکھتے ہیں. گلابی اردو کے رنگ میں انہوں نے جو کچھ بھی لکھا اسی حیثیت سے لکھا ان کی تحریر میں ایک تبسم کا خطیبانہ جوش پایا جاتا ہے. وہ بڑی شد و مد کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں یا کہا جائے طرز جیسے ایک لیڈر پلیٹ فارم پر تقریر کرتا ہے. جہاں تک اس رنگ کا تعلق ہے ملا رموزی اس میں مسلم ہیں. لیکن ظرافت نگاری میں اُن کی مصلحانہ شان اور انشاء پردازی کا رنگ نکھر نہ سکا. رشید احمد صدیقی کی رائے کی روشنی میں ملا صاحب کی "پیشہ ورانہ ذہنیت" نے ان کی عبارت کو بہت پست کر دیا ہے. ان کی ظرافت میں "شخصیت" کا رنگ بھی جھلکتا ہے. شخصی خصوصیات نے ان کے مزاح کو وسیع تر بنانے بلکہ سب وستم کا درجہ دے دیا ہے. سیاسی اخبار پرداز کی حیثیت سے ملا صاحب لقب کے لائق ذکر ہیں. لیکن ظرافت نگار کی حیثیت سے وہ اس درجے پر نہیں پہنچ سکے. عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی نے ان کو مزاح نگار تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیا. پروفیسر عبدالقادر سروری کی رائے اصل میں تقریظ ہے لیکن بیرونی دباؤ نے ملا رموزی کی تعریف سے وابستہ کی حق وہ پوری نہ ہو سکی۔

---

[1] سیلاب تبسم صفحہ ۱۶۔ [2] طنزیات و مضحکات صفحہ ۱۵۴، [3] مقدمہ سیلاب تبسم۔

www.taemeernews.com

ملا صاحب کی نگارشی اردو کا ایک نمونہ دیکھئے۔

"مسلمان کی باسی عید" ۔۔۔ اے محترم تمباکو فروشو۔ کیا نہ دیکھا تم نے کہ جاتی رہی حقہ نوشی ہندوستان سے سبب سے نوست تینپی چھاپ سگریٹ کے اور نہیں سیکھا پینا تینپی چھاپ سگریٹ کا ہندوستانیوں کی غلام خصلت نے مگر نقل کی اُنہوں نے ان ہندوستانی غلام سرشت ماسٹروں اور پروفیسروں کی۔ کرآتے ہیں بیچ اسکولوں کے وہ ہمراہ پانیرا خبار کے۔ پس ایسے ہی ماسٹر اور پروفیسر ہندوستانی ہیں کہ پاس کرتے ہیں وہ بیچ دن امتحان کے لڑکوں دوستوں۔۔۔؟ [1]

ملا صاحب پڑھنے والوں کو مخاطب کرتے ہی بالعموم اپنا طنز ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ خصوصیت ان کی تحریروں میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ مثلاً۔

۱۔ اے انگریزی میں دستخط کرنے والو۔ (اسلامی نوروز)

۲۔ اے سینما میں جھانکنے والو۔ (اے بیوی کے احکام پر چلنے والو)

۳۔ اے موٹے موٹے کوٹ والے صاحبو۔ (نیلا کمیشن اور پیلا بائیکاٹ)

۴۔ اے وعظ میں محترم اونگھنے والو۔ (ہسپانیہ کی سیاہ بغاوت)

۵۔ اے ٹائمس آف انڈیا کے ملے حل کرنے والو۔ (جاپان کی سیاہ گولہ باری)

۶۔ اے محترم غیر انگریزی دان شہرو۔ (جنگ کی دھواں گھبراہٹ)

ایک جگہ لکھتے ہیں!

اگر یہ صحیح ہے کہ بڑے بڑے لارڈ "آپریشن" سے شفاخانوں میں مرجاتے ہیں اگر ہندوستانی راجے مہاراجے قوت باہ اور طلاق کی گولیوں سے ہلاک ہوتے رہتے ہیں اگر ہندوستانی قلی صاحب لوگوں کی ٹھوکر سے مرجاتے ہیں تو دیکھ لینا کہ ہم کسی دن مضمون نگاروں میں۔۔۔۔۔ ہو جائیں گے اور یار لوگ اِنا للہ پڑھ کر فارغ ہو جائیں گے ..... وہ تو قوم نے مالداری کی وجہ سے خواجہ حسن نظامی صاحب کو "مصور فطرت" کہدیا ہے۔ ورنہ اصل میں مصور فطرت تو ہم تھے جب کہ ہم ہر شخص کا حلیہ چھاپ کر رکھ لیتے ہیں عبدالرحمن چغتائی سے کیا کم ہیں۔ اور بہار کونسا مضمون ہوتا ہے جو "عمل چغتائی" کا کام نہ دیتا ہو۔"

نیاز فتحپوری: نیاز فتحپوری کی کئی حیثیتیں ہیں مدیر، نقاد، افسانہ نگار، مضمون نگار، مترجم وغیرہ۔ انشاء پرداز وہ تو ہیں ہی لیکن ان کی ادبی کاوشوں کا ایک جز وایسا ہے جو ادبی ظرافت سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا ہے۔ ان کے خطوط اور چند مضامین ان کی شوخیٔ طبع اور ظرافت کے آئینے ہیں۔ نیاز فتحپوری کی ظرافت کے دو انداز ہیں ایک یہ کہ وہ باریک اور باریک بینی کے ساتھ وہ کسی نکتے تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اس نکتے پر پہنچ کر ایسے ایسے ریمارک دلخوش کن انداز میں کر جاتے ہیں کہ اس سے مختصر تنقید کا پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً انہوں نے جوشؔ کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے خوب لکھا ہے۔

[1] گلبانگ اردو۔ صفحہ (۱۸۱)

www.taemeernews.com

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گالی دینے کا جذبہ گھٹ کر شعر بن گیا ہے" دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ ادب اور معاشرت کے اچھے نباض اور نقاد ہیں۔ اور اپنی ادبی نفسیاتی گرفت کو خوشگوار بنانے کے لئے ادبی ظرافت کا رنگ اختیار کرتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ وہ جس کی طرفداری کرنا چاہتے ہیں طرفداری کرتے ہیں۔ اور جس کے مخالف ہو جانا چاہتے ہیں، مخالف ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ دونوں حیثیتوں میں ان کی شوخی طبع برابر کام کرتی ہے۔

مکتوبات نیاز میں اکثر و بیشتر وہی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ جو رقعات غالب کی ممتاز خصوصیات ہیں۔ نیاز کی زبان انشاء کے اعتبار سے ادب کے تمام تر محاسن اپنے اندر رکھتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان کے ہاں عربی اور فارسی کے ادق الفاظ کا کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہ الفاظ ان کی عبارت کی خوبیوں پر کوئی بُرا اثر نہیں ڈالتے۔ بلکہ بیان میں زور پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کا انداز بیان چسٹرفیلڈ کے اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ بہت سے ادیب اپنے اسلوب ہی سے پڑھنے والے کو مسحور کر لیتے ہیں۔ اب رہ گئی تیسری چیز مزاح اور ظرافت تو ان خطوط میں ہمیں ادبی ظرافت کے بیشتر نمونے ایسے ملیں گے جو اکثر اچھے ظرافت نگاروں کی تحریروں میں نہیں پائے جاتے۔

ان کی خوش طبعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چٹکلے چھوڑتی ہے ان خطوط میں مزاح بھی ہے اور کہیں کہیں طنز بھی۔ اگرچہ ان کا مزاح اکثر اوقات سنجیدگی کی حدود سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی نیاز کے خطوط کی ظرافت دل کو لبھاتی ہے۔ ان خطوط میں بول چال کا انداز بھی نمایاں ہے۔ بے تکلفی اور بے ساختگی نے ان میں اور زیادہ لطافت پیدا کر دی ہے۔

"ہر چند شادی کوئی اچھی چیز نہیں مگر آپ ضرور کیجئے کیوں کہ اگر یہ حرکت آپ نے نہ کی تو کوئی اور اس سے زیادہ خراب حرکت کر بیٹھیں گے... لیکن مجھے معلوم ہے کہ آپ میری اس نصیحت کی مطلق کوئی پرواہ نہ کریں گے اور "ضرورت شادی" کا جو اشتہار دیں گے تو اس میں سب سے پہلی شرط جمیل دلربا ہونے کی درج ہوگی حالانکہ آپ خود اس لحاظ سے ماشاء اللہ صفر ہی صفر ہیں میری سمجھ میں یہ بات کبھی نہیں آئی کہ ایک معمولی صورت کا مرد کیوں خواہش کرتا ہے کہ عورت اُسے بہت حسین ملے پھر یک طرفہ تماشا یہ ہے کہ اگر کوئی بدقسمت اسے مل بھی گئی تو پھر یہ چاہتا ہے کہ وہ اس سے محبت بھی کرے"[1]

جان عالم چچا اپنے بعد کوئی اولاد چھوڑ گئے ہوں یا نہ چھوڑ گئے ہوں۔ لیکن تمہیں اپنا جانشین ضرور بنا گئے ہیں۔ ماشاء اللہ کیا کہنا۔ وہی تیور وہی رنگ رلیاں وہی آن بان کیوں نہ ہو جوانی ہے جوانی۔ باپ کی کمائی ہوئی دولت مفت کی ہاتھ آئی ہے۔ تم نہ ایسا کرو گے تو کیا واجد علی شاہ کی سنت ادا کرنے کے لئے کوئی فرشتہ آسمان سے آئے گا"[2]

جیسا کہ ابھی کہا گیا کہ نیاز کے ہاں بعض اوقات طنز و مزاح میں شدت اور عریانی در آتی ہے۔ چند نمونے اس بیان کی تائید میں درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

---

[1] منتخبات نیاز صفحہ ۶۱، [2] مکتوبات نیاز صفحہ ۱۰۵۔

www.taemeernews.com

اگر معمولی صورت کی کوئی بے انتہا شریف سلیقہ مند دلکش ہو تو میری نگاہ میں دو چار جگہ ایسی ہیں جہاں یہ رشتہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر انہیں صرف "حرمزدگی" کرنا ہو تو شادی کا خیال ترک کر دو۔ اور جس طرح قربانی کے سانڈ بازاروں میں آزاد زندگی بسر کرتے ہیں تم بھی بسر کرو۔ ذمہ داری کچھ نہیں۔ اور لذتیں وافر۔[1]

نیاز فتحپوری کے مولویت، تنگ نظری اور کٹھ ملّا پن کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ اور اس مخالفت کے اظہار کا ذریعہ بالعموم طنز رہا ہے۔ اس طنز میں نیک نیتی ضرور کارفرما ہے لیکن اس میں شدت، عناد اور تعصب کا پہلو بھی موجود ہے۔ جو اصول ظرافت کے منافی ہے۔

قاضی عبدالغفار: قاضی عبدالغفار مدیر روزنامہ پیام حیدرآباد کو نہ صرف اردو صحافت میں بلکہ اردو ادب میں بھی خاص مقام حاصل ہے۔ قاضی صاحب کی صحافتی زندگی اخبار "ہمدرد" سے شروع ہوئی۔ جو مولانا محمد علی مرحوم کے حسب ایماء دہلی سے شائع ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۱۲ء میں اس کا اجراء ہوا۔ قاضی صاحب اس کے شعبۂ ادارت میں شریک تھے اور اپنی باری پر اداریہ لکھتے تھے۔ اخبار نویس کا سب سے اہم کام ملک کے سیاسی و معاشرتی حالات پر اظہار خیال کرنا ہوتا ہے اس رسالے میں ان مسائل میں خود اختیاری تعلیم، سوم رواج اور اس قسم کی ہزاروں باتیں شریک تھیں۔ قاضی صاحب انہیں مسائل پر لکھا کرتے تھے۔ اور یہی مسائل ان کی ظریفانہ نثر کا پس منظر ہیں۔

قاضی صاحب کی ظریفانہ نثر کا نمونہ ان کا "سہرا ہے" کا کالم ہے۔ جو پیام کیلئے بالعموم روزانہ چھپتا تھا اس کالم میں قاضی صاحب اپنے ان خیالات کو جو راست طریقے پر نہیں ظاہر کئے جا سکتے تھے ظرافت کے لباس میں ظاہر کرتے تھے ظرافت برائے ظرافت کے لئے ان کے پاس وقت نہیں تھا۔ ان کا مقصد الفاظ کے پردوں میں چھپ نہیں جاتا۔ ان کی ظرافت نگاری ان کی تنقیدی صلاحیتوں کی عکاس ہے۔ وہ یا تو کسی مسئلہ پر نکتہ چینی کرتے ہیں یا اس کا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ لیکن اس انداز سے کہ تنقیص کا پہلو نمایاں نہ ہو۔ اگر وہ کسی چیز کی اہمیت گھٹانا چاہتے ہیں تو اس پر ظریفانہ انداز میں طنز کرتے ہیں۔ قاضی صاحب کی زبان صاف اور شستہ ہے۔ گو بعض مقامات پر وہ لوث عبارت بھی لکھ جاتے ہیں لیکن ان کے اسلوب اور طرز نگارش میں وضاحت اور دلآویزی ہے۔ لیلیٰ کے خطوط میں انہوں نے جو اسلوب اختیار کیا ہے وہ ان کے انفرادی رنگ کا نمونہ ہے۔

کبھی کبھی قاضی صاحب کی ظرافت میں "احساس برتری" کا جذبہ بھی کارفرما ہو جاتا ہے۔ وہ ماحول کے متعلقہ مسائل کو اگر بنظر تحقیر نہیں دیکھتے تو کم سے کم پست ضرور سمجھتے ہیں۔

مسٹر ایری کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں غلہ کی کمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ چونکہ دیہاتی آبادی کی معاشی حالت بہتر ہو گئی اس لئے وہ زیادہ غلہ کھا گئی!

ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس وقت "غلہ زیادہ اگاؤ" کے بجائے "غلہ کم کھاؤ" کی تحریک شروع کی جاتی!

(پیام ۱۹ شہریور ۱۳۵۲ف)

---

[1] مکتوبات نیاز صفحہ ۶۳

www.taemeernews.com

حیدرآباد کے گداگران عالی مقام کے متعلق یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ ۸ گداگر گرفتار کئے گئے اور ان کو تنبیہہ کے بعد تشریف لے جانے کی اجازت دے دی گئی۔

ہمارے لئے اس گرفتاری کے حادثہ کی خبر نہایت حیرت انگیز ہے۔ کہ مرحوم قانون انسداد گداگری کی وفات حسرت آیات کے بعد اس قسم کے اقدامات کا امکان ہماری رائے میں خارج از قیاس تھا! کیا یہ خبریں اس امر کو ثابت کرنے کے لئے دی جارہی ہیں کہ متوفی قانون کے جسد مجروح میں ابھی کوئی سانس باقی ہے ــ ہم ان ۸ گداگروں کو ان کی رہائی پر دلی مبارک باد پیش کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ ان کی آزادیاں برقرار رہیں اور وہ اپنے پیشہ کے مشاغل میں اطمینان قلب کے ساتھ مصروف رہ کر ہمارے شہر کے کوچہ و بازار کی رونق میں حسب دستور قدیم اضافہ کرتے رہیں!!! (پیام ۲۱ ـ ۱ اسفندار ۱۳۵۳ ش)

فلک پیما: ہمایوں کے پرانے پرچوں میں فلک پیما کے مضامین بالالتزام چھپتے رہے ہیں۔ فلک پیما اصل میں خان بہادر میاں عبدالعزیز ہیں۔ خان بہادر میاں عبدالعزیز اخباری دنیا میں کافی مشہور ہیں۔ لاہور کی لیجسلیٹو اسمبلی کے سرکاری رکن کی حیثیت سے چار سال تک کام کرتے رہے اکتوبر ۱۹۲۶ء میں گول میز کانفرنس کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ ساڑھے چار سال تک انبالہ کے کمشنر رہے۔ پنجاب کے فینانشیل کمشنر مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں وہاں سے پنشن پائی اور بعد میں ریاست جے پور کے ریونیو ممبر ہوئے۔ ان کے "مضامین فلک پیما" تنوع اور اپنے مقصد کے لحاظ سے دلچسپ اور نصیحت آمیز ہیں۔ ان کی تحریر میں حکمت اور تفکر پایا جاتا ہے۔ وہ بے مقصد کوئی بات نہیں لکھتے۔ ان کی ظرافت نگاری کا انداز بھی انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ میاں بشیر احمد نے لکھا ہے "فلک پیما کی زبان سلجھی ہوئی اور سادہ ہے اور ان کا طرز بیاں نہایت دلکش اور انوکھا۔ لیکن ان کے خیالات کو سمجھنے کے لئے کبھی غوطہ زنی کی ضرورت ہوتی ہے اور کبھی بلند پروازی کی۔"[1]

انداز بیاں کی ندرت اور اچھوتے پن نے مضامین فلک پیما کو پُر لطف بنا دیا ہے۔ تشبیہات و استعارات کا وہ بکثرت استعمال کرتے ہیں اور کبھی کبھار گراں بھی گزرنے لگتے ہیں۔ لیکن بالعموم ان کی تشبیہیں اور استعارے پُر لطف ہوتے ہیں مثلاً مروجہ اردو شاعری کے متعلق لکھتے ہیں "کبھی حیرت خم ظلمت کر آئینہ کے بالمقابل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اس سے گتھم گتھا۔ کبھی بالکل آپے سے باہر۔ کبھی خموشی میں کبھی خواب میں غرض سو سو طرح ذلیل ہوتی ہے۔ یہی حال دوسرے الفاظ کا ہے۔ شوق بیچارا تو بالخصوص اس قدر ہرجائی ہوا ہے کہ کہیں کا نہ رہا۔ کبھی آغوش حیرت میں کبھی شعلہ سے ہم نوالہ و ہم پیالہ۔ کہیں غم کا میاں کہیں تپن کا خانہ زاد غلام دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا ہے اور بعض دفعہ بے تاب ہو کر خواہش کرتا ہے کہ کاش میں بیدیا ہوتا۔ مگر شوق نہ ہوتا۔ اردو شعر گویوں کے ظلم سے تو بچتا۔ باقی رہا چاند تو کچھ تعجب نہیں کہ ۔۔۔ طور پر ہجرت کر جاتے۔ چندون شاعروں نے مناظر قدرت پر سواری گانٹھنے کی ٹھیرائی تھی۔ بیچارے دشت و کہسار زمی ہوئے بادلوں کے پرخچے اڑے چاندنی بلبلا اٹھی۔۔۔۔ تصوف و شاعری بھی شعرا کی چکی میں پس کر سُرمہ ہو چلے۔ اس خاک کے اڑانے سے بھی کچھ نہ بنے گا تو آخر پھر اب کیا ہوگا۔ اسٹرا کٹ

[1] مضامین فلک پیما۔ دیباچہ

www.taemeernews.com

یا ہڑتال۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" [1]

میاں عبدالعزیز کے سیاسی و سماجی رجحانات ان کے ہر مضمون پر چھائے ہوئے رہتے ہیں۔ "ابلیس اور عورت" میں انہوں نے شراب کی مذمت عمدہ پیرایہ میں کی ہے۔ اور ہندوستانی عورت کی وفاداریوں پر روشنی ڈالی ہے۔ جناب سید محمد خاں آزاد کی طرح انہوں نے بھی "لغات الجاہلین" کے نام سے چند الفاظ کے معنی و مطالب ظریفانہ پیرایہ میں بیان کئے ہیں مثلاً۔

"لڑکی۔ ہندوستانی گھرانوں کا ایک پالتو جانور ہے۔ جسے پالنے والے عارضی نمود ار کی خاطر وقتاً فوقتاً ذبح کرتے رہتے ہیں۔ ذبح ہونے پر اس جانور کی نسل بڑھتی ہے۔

لڑکا۔ ہندو گھر میں نجات کا تعویذ۔ مسلمان گھر میں ادھم کا پٹاخہ۔ مدرسہ کی بچوں کا گلکار۔ سیاسی انجمنوں کا آنے والا خطرہ"۔

ان کی شوخیٔ طبع اور ذہانت نئے نئے معنا بین ڈھونڈ لاتی ہے اور تخیل نت نئے انداز سے ظرافت پیدا کرنے پر قادر ہے۔

"دقیق" ہندوستانی طرز معاشرت کے موجودہ رجحانات پر روشنی ڈالتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

نرم دل ہونا بھی کیا مصیبت ہے۔ دن کے نو بج جاتے ہیں مگر بستر میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ کبھی کہتا ہے ایک انگڑائی تو اور لے لو کبھی کہتا ہے آخر جلدی کیا ہے۔ چائے بھی لیٹے لیٹے نوش کی جائے۔ لیجئے اس ایک تکیے کو بغل کے نیچے دوہرا کر کے رکھئے اور دوسرے کو زانوں کے نیچے دبا لیجئے تاکہ پٹی کی سختی محسوس نہ ہو اور میز کی طرف جھک جائے۔ بے وجہ دل دکھانا میرے مذہب میں کفر ہے۔ چنانچہ بستر کا کہنا ماننا بھی پڑتا ہے۔۔۔۔ بستر سے رہائی ہوتی ہے تو غسل خانے کا سفید براق ٹب اپنی طرف کھینچتا ہے ایسا چلبلا ہے کہ کوئی بچہ کیا ضد کرے گا۔ دبی آواز سے گنگنائے گا کر ذرا اور۔۔۔۔ تو شہ خانہ میں پہلے کنگھی اور برش اپنی مقررہ ورزش میرے بالوں سے کرتے ہیں۔ کنگھی تھک تو بلدار برش اور وہ ہانپا تو نرم برش، بعض دفعہ تو کھڑی کھڑی تھک جاتی ہوں۔ میری نرم گدے والی کرسی مجھے بٹھا لیتی ہے"۔ [2]

ذیل میں دو خطوط درج کئے جاتے ہیں۔ یہ خط و کتابت آسمان اور سورج کے درمیان ہوئی ہے۔ فلک پیما کی یہ جدت اردو ادب میں "انفرادیت" کا رنگ رکھتی ہے ان خطوط میں ادبی لطائف بھی ہیں اور حقائق بھی۔ طنز کا ہلکا سا پہلو بھی ہے اور ظرافت کا مسرت بخش انداز بھی۔

آسمان کا خط سورج کے نام۔

عزیزم! تم شکر کرو کہ آج کل دفتر میں خود کام کرتا ہوں اور تمہارا خط میرے ہاتھ آیا۔ اور ہاتھ سے سیدھا ردی کی ٹوکری میں پہنچا۔ اگر کسی اہلکار کے ہاتھ آجاتا تو بات شاید باہر نکل جاتی مجھے اور مصیبتوں کا سامنا ہوتا۔۔۔۔ پیشتر اس کے کہ صدر اعلیٰ سے احکام جاری ہوں میں نے اپنے ہاں ریزیڈنٹی کے لئے خود درخواست دیدی ہے۔ آئندہ جو احکام ہمارے ہاں کی ریزیڈنٹی سے جاری ہوں ان کی تعمیل تم پر فرض ہے۔ تمہاری بہترین کوشش یہی ہو سکتی ہے کہ تم فاتر العقل ہونے کی بناء پر کام سے سبکدوش کئے جانے کے متعلق تحریری درخواست کر دو۔

---

[1] مضامین فلک پیما صفحہ ۳۱ و ۳۲ [2] مضامین فلک پیما صفحہ ۲۸۴ [3] مضامین فلک پیما صفحہ ۲۷۰

www.taemeernews.com

درخواست کی منظوری میں کچھ دقت نہ ہوگی. کیوں کہ بات تقریباً طے ہے اور اطباء تمہیں ضرور سرٹیفکیٹ دیدیں گے...
مجھے فضول تحریرات پڑھنے کے لئے وقت نہیں ملتا..... فقط

آسمان [1]

عظیم بیگ چغتائی: (۱) عظیم بیگ چغتائی ایک حیثیت سے بسیار نویس اور پیشہ ور مزاح نگار کہے جا سکتے ہیں. ان کی ادبی کوششوں کا آغاز عمدہ ظرافت نگاری سے ہوا لیکن بسیار نویسی سے تکرار اور تواتر پیدا ہوگیا اور ظرافت بے مزہ ہوگئی. اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ ہندوستانی زندگی ان کے نزدیک سوائے مضحکہ کے کچھ نہیں.

(۲) ان کے افسانے پلاٹ کے لحاظ سے دلچسپ ہوتے ہیں اور جہاں تک مزاحیہ افسانہ نگاری کا تعلق ہے چغتائی دوسرے تمام ظرافت نگاروں سے آگے ہیں. وہ واقعات سے بحث کرتے ہیں. ان کی ظرافت کے پیچھے بلند قوت فکر بلند حوصلگی اور تخلیق وجدت نہیں. معمولی اصطلاحیں اور روزمرہ کی وہ باتیں ہیں جو ہر آدمی کو ہنساتی ہیں تکرار اور اعادہ بھی جگہ جگہ ہے.

(۳) ان کی ظرافت کو واقعات سے متعلق سمجھنا چاہیئے. زبان ان کے تخیل کا ساتھ نہیں دیتی. طرز ادا میں شگفتگی کم ہوتی ہے.

(۴) ان کی عبارت میں اکثر مقامات پر فحش نگاری اور عریانی کا عیب بھی نظر آتا ہے. اور وہ ظرافت کی حدود سے گزر کر مسخرے پن پر اتر آتے ہیں.

عظیم بیگ کی ظرافت نگاری کی فضا مشرقی ہے. وہ اپنی مزاحیہ نثر میں غیر ملکی رنگ کا شائبہ بھی نہیں آنے دیتے. اس لئے ان کی تحریروں کو ان کے مشاہدے کا احساس اور دل و دماغ کا نقش سمجھنا چاہیئے. ہندوستانی معاشرت پر نکتہ چینی بالعموم ان کا مطمح نظر رہا ہے. گھریلو زندگی کے واقعات کو وہ دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں. بعض مقامات پر انہوں نے اپنے پلاٹ میں غیر یقینی باتوں کو بھی دخل دیا ہے. مثلاً "عورت تیرا نام شہزوری ہے" میں عورت کی شہزوری بتاتے ہوئے وہ اتنا غلو کر گئے ہیں کہ ان کی ستم ظریفی پر ہنسی آنے لگتی ہے.

ظفر قریشی دہلوی نے ان کی ظرافت نگاری کے متعلق لکھا ہے "مرزا کی تحریر سوسائٹی کے کسی پہلو پر تنقید ہوتی ہے. یا کسی معاملہ زندگی پر تبصرہ ہوتا ہے. عورتوں کی حمایت یا کچھ نہ کچھ مطلب کی بات ہوتی ہے. بظاہر وہ ایک چلتی ہوئی بات کہتے ہیں مگر در اصل قہقہے کی تہ میں اصلاح و عمل کی کونین لپٹی ہوئی ہوتی ہے. آپ کو ان کے افسانوی آئینوں میں اپنا ہی جمال دکھائی دے گا. وہ ہندوستانی تصویروں ہی سے اپنا مرقع سجاتے ہیں. اور ہر پڑھنے والا بھی سمجھتا ہے کہ یہ تو گویا خود اپنی کہانی ہے" [2]

نیاز فتحپوری نے ان کے متعلق صرف اتنا ہی لکھا ہے کہ "چغتائی صاحب کی مزاح نگاری اکثر و بیشتر مختصر ہوتی ہے صرف پلاٹ یا واقعات پر. یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاہدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں.

لیکن نیاز صاحب کی باریک بین نظر چغتائی صاحب کی دوسری خوبیوں پر نہیں پڑی. مثلاً اثر کی حد تک درد کی جو کسک ان کے مضامین میں پائی جاتی ہے وہی ان کی تحریروں کا طرۂ امتیاز ہے.

---

[1] مضامین نلک پیما صفحہ ۶۱ و ۶۲ [2] دیباچہ خطوط کی ستم ظریفی صفحہ ۴.

www.taemeernews.com

"آلو کا بھرتہ" ان کا ایک مضمون ہو کئی رسائل میں چھپ چکا ہے ان کی ہمدردانہ ظرافت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ ہندوستانی عورتوں پر غیر ذمہ دار شوہر جو مظالم توڑتے ہیں۔ عظیم بیگ نے اس واقعہ کو اپنے مضمون میں درد انگیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی : فرحت اللہ بیگ کی ظرافت نگاری سے متعلق ہمارے پیش نظر مختلف آراء ہیں۔ زیادہ تر تعریفی اور بہت کم تنقیدی۔ عظیم بیگ لکھتے ہیں۔

"ادب کے تمام حیفے اور محکمے ان کے غلام ہیں۔ افسانہ نویسی مزاحیہ نگاری اور حد ہو گئی شاعری بھی..... آکا فرحت کو زبان کی بڑی بھاری جیت ہے۔ جی میں آتا ہے پلاٹ سے مزاحیہ نگاری پیدا کر دیتے ہیں۔ اور جی میں آتا ہے تو زبان سے[1]

مولانا عنایت اللہ دہلوی مرحوم سابق ناظم دارالترجمہ ان کے مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عبارت میں روانی اور زبان پر قدرت، بیان میں بلا کا زور، لکھتے ہیں مضمون پڑھتے جایئے اور جی نہ بھرے حیران رہیئے کہ اس طغیانی کو دیکھ کر کیا جائے تو کیا کیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ زبان ہو تو ایسی ہو۔ ادب بے ساختہ پن ہو تو ایسا ہو[2]

مولوی عبدالحق صاحب کی رائے ہے "ادھر مطالب کے بہت سے ڈھنگ ہوتے ہیں اور جیسا جس کا مزاج ہوتا ہے اسی ڈھب کا اس کا اسلوب بیان بھی ہوتا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب کا طرز تحریر بھی ان کی طبیعت سے ملتا جلتا ہے۔ بیان سادہ ہے تصنع نام کو نہیں۔ ٹھیٹ دلی کی زبان لکھتے ہیں تحریر میں شوخی بھی ہے اور ظرافت کی چاشنی بھی ملی

ان آراء کو پیش نظر رکھتے ہوئے مرزا صاحب کی ظرافت نگاری پر تفصیلی بحث کے لئے ان کی تحریروں پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

مزاح نگاری میں فرحت صاحب کی تین حیثیتیں ہیں۔

۱۔ مضمون نگار، اس حیثیت میں وہ واقعہ نگاری بیانیہ نثر اور اصلاح و تنقید کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتے ہیں۔

۲۔ افسانہ نگار، افسانوں اور واقعات کو بلا جھجک لکھتے ہیں۔

۳۔ تذکرہ نویسی۔ ان کے تذکرے یا تو نیم تاریخی ہوتے ہیں یا ادبی۔

ان تینوں اصناف میں ان کی تحریر کی تین خصوصیات ہیں۔

۱۔ بے تکلف سادہ اور شوخ، ۲۔ طنز، ۳۔ ظرافت۔

حصۂ اصول ظرافت میں بتایا گیا ہے ظرافت نام ہے تین اہم عناصر کے امتزاج کا۔ ہمدردی، احساس برتری اور جذبہ تنفر مرزا صاحب کی تحریریں پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی ظرافت نگاری کا دار و مدار ایک قسم کے احساس برتری پر ہے وہ ماحول کو حمق اور تضحیک کا ایک خوشگوار امتزاج سمجھتے ہیں۔ چیزوں کی اہمیت کو گھٹانا اور بڑھانا ہی ان کا مشغلہ ہے افسانہ نگاری کے معاملے میں مرزا صاحب جگہ جگہ چوک جاتے ہیں وہ مسائل حیات کو چھیڑتے ضرور ہیں لیکن نہ تو ان کی ماہیت ظاہر کرتے ہیں نہ ان سے کوئی نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ جہاں تک ان کی خوبیوں کا تعلق ہے ان کی پہلی اور ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ شوخی اور ذہانت کے ساتھ با محاورہ زبان کا استعمال کرتے ہیں۔ اور دوسری خصوصیت ان کے انداز بیان کی سادگی اور بے تکلفی ہے اسی خوشگوار فضا میں

---

[1] مقدمہ سیلاب تبسم۔ [2] مضامین فرحت اللہ حصہ اول صفحہ (۱۸۲)؛ کے مضامین فرحت اللہ حصہ اول صفحہ (۱۸۴)

www.taemeernews.com

ان کی ظرافت چلتی اور سطحی ہے۔ مضمون نگاری، تذکرہ اور افسانہ، ان تینوں اصناف میں وہ اپنی قوت بیانیہ اور قوت مشاہدہ کو بغیر کسی تکلف کے پیش کرتے ہیں۔ لیکن سولیر یا والٹیر کی طرح اپنے انداز بیان کو اور واقعات کو ماہیت اور فطرت کے اعتبار سے طنزیہ نہیں بناتے۔ بلکہ اپنی عبارت کو مشغول مضحکہ، شگفتگی کا مجموعہ بنا کر خوشگوار رنگ میں پیش کر دیتے ہیں۔ ظرافت نگاری میں زبان کی چاشنی ضروری ہے لیکن صرف انشاء پردازی اعلیٰ ظرافت کی بنیاد نہیں ہے۔ اس لئے جہاں تک اصول ظرافت نگاری کا تعلق ہے فرحت اللہ بیگ دبے دبے دکھائی دیتے ہیں ان کی زبان اور طرز بیان اپنی جگہ مسلّم۔ لیکن بحث ظرافت سے ہے۔ جو خیال اور زبان دونوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کی ظرافت کا تعلق ان کی زبان اور شگفتہ نگاری سے ہے۔ رشید صاحب نے ان کے متعلق خوب لکھا ہے:" فرحت صاحب کے مضامین کے مطالعہ کے بعد ہم بے اختیار کہہ پڑتے ہیں۔

ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی[1]

نیاز فتحپوری نے اردو کے مزاح نگاروں کی فہرست مرتب کرتے ہوئے فرحت اللہ بیگ کو نظر انداز کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ مزاح نگار کی حیثیت سے اس وقت پطرس رموزی" رشید اور عظیم بیگ چغتائی بہت مشہور ہیں[2] حالانکہ شگفتہ نگاری کے لحاظ سے مرزا صاحب کو اردو کے مزاح نگاروں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے ان کی تحریر میں تصنع نہیں ہے تشبیہات و استعارات بھی وہ استعمال کرتے ہیں۔ لیکن اُلجھاؤ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ وہ اپنی تحریر سے لذت و مسرت کی ایک فضا پیدا کر دیتے ہیں۔

مولوی وحید الدین سلیم نے مضامین فرحت حصہ اول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس مجموعہ میں وہ ادب لطیف ہے جس پر ہماری زبان جس قدر ناز کرے بجا ہے مرزا صاحب کو مکالموں، کیفیتوں کا حلیہ بیان کرنے اور واقعات کا نقشہ کھینچنے میں کمال ہے[3]۔

اس میں شک نہیں کہ مولوی صاحب مرحوم بڑی رعایت اور مروت کے آدمی تھے۔ تاہم ان کی اس رائے میں حقیقت کی بھی جھلک ہے۔" ایک دعوت کی تعمیل" کرتے ہوئے مرزا صاحب نے مولوی وحید الدین صاحب سلیم سے بھی اپنی ملاقات کا نقشہ کھینچا ہے ان ہی کی زبانی سنئے۔" خدا بخشے مولوی وحید الدین سلیم بھی ایک عجیب چیز تھے۔ ایک نگینہ سمجھئے کہ برسوں ناتراشیدہ رہا جب تراشا گیا بھل نکلے چمک بڑھی اہل نظر میں قدر ہوئی اس وقت چٹ سے ٹوٹ گیا۔ شہرت بھی آج کل غالب کے قصیدے کی طرح کسی کو راس نہیں آتی۔ ادھر نام بڑھا اور اُدھر مراصف سے آگے نکلا اور تیر قضا کا نشانہ ہوا۔ چل چلاؤ کا دور ہے۔ آج یہ گیا کل وہ گیا۔ مولوی نذیر احمد گئے شبلی گئے حالی گئے وحید الدین گئے اب بڑوں میں مولوی عبدالحق رہ گئے ہیں ان کو بھی شہرت کی ہوا لگ گئی ہے۔ سوکھے پتے جا رہے ہیں۔ کسی دن بھی خشک ہو کر رہ جائیں گے۔

میں خیریت سے حیدرآباد میں ہوں مولوی وحید الدین بھی برسوں سے یہاں تھے۔ لیکن کبھی ملنا نہیں ہوا۔ آخر ملے تو کب ملے کہ مولوی صاحب نے مجھے اورنگ آباد کھینچ بلایا۔ روانہ ہونے کے لئے حیدرآباد اسٹیشن پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسٹیشن کا اسٹیشن اورنگ آباد جانے والوں سے بھرا پڑا ہے۔

طالب علم بھی ہے ماسٹر بھی ہیں۔ کچھ ضرورت سے جا رہے ہیں کچھ بے ضرورت پہلے جا رہے ہیں۔ کچھ واقعی مسلمان ہیں

---

[1] طنزیات و مضحکات صفحہ (۲۱۳) [2] منقول از طنزیات و مضحکات صفحہ (۲۲۷) [3] مضامین فرحت جلد اول صفحہ (۱۸۴)

www.taemeernews.com

کچھ بن بلائے مسلمان ہیں۔ غرض کہ آدھی ریل انہیں اورنگ آباد کے مسافروں نے گھیر رکھی ہے۔ ریل کی روانگی میں دیر تھی سب کے سب پلیٹ فارم پر کھڑے ٹہلیں مار رہے تھے۔ میں بھی ایک صاحب سے کھڑا باتیں کر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بڑے میاں بھیڑ کو چیرتے پھاڑتے بڑے بڑے ڈگ بھرتے میری طرف چلے آرہے ہیں۔ متوسط قد بھاری کھٹیلا بدن، بڑی سی توند، کالی سیاہ فام رنگت۔ اس پر سفید چھوٹی سی گول داڑھی، چھوٹی چھوٹی کرنجی آنکھیں، شرعی سفید پاجامہ کتھئی رنگ کے کشمیرے کی شیروانی، سر پر عنابی ترکی ٹوپی، اور پاؤں میں جرابیں اور انگریزی جوتا آئے۔ اور آتے ہی مجھے گلے لگالیا۔ حیران تھا کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ حبیب اللہ خاں اور مولوی نذیر احمد مرحوم کی ملاقات کا دوسرا سین ہونے والا ہے۔ جب ان کی اور میری ہڈی پسلیاں گلے ملتے ملتے تھک کر چور ہوگئیں اس وقت انہوں نے فرمایا میاں فرحت مجھے تم سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ جب سے تمہارا نذیر احمد والا مضمون دیکھا ہے کئی دفعہ ارادہ کیا کہ گھر پر آکر ملوں۔ مگر موقعہ نہ ملا قسمت میں ملنا تو آج لکھا تھا۔

جی مجھے نذیر احمد کی قسمت پر رشک آتا ہے کہ تجھ جیسا شاگرد اس کو ملا۔ مرنے کے بعد ان کا نام زندہ کردیا۔ افسوس ہے کہ ہم کو کوئی ایسا شاگرد نہیں ملتا۔ جو مرنے کے بعد اسی رنگ میں ہمارا حال بھی لکھتا"

مرزا فرحت اللہ بیگ، منظر کشی بھی خوب کرتے ہیں۔ "کہانی" میں انہوں نے گرمی بارش اور سردی کے موسموں کا نہایت عمدگی سے نقشہ کھینچا ہے۔ حکیم آغا جان عیش دہلوی کی سوانح حیات بھی اسی انداز میں لکھی ہے۔ پرانی اور نئی تہذیب کی ٹکر میں نوابوں کے گھر کی شان امارت کو دلفریب انداز میں پیش کیا ہے۔

مضامین فرحت حصہ سوم میں مرزا صاحب نے "لیلیٰ و مجنوں" فلم پر تنقید کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ ان کے انفرادی رنگ کی اچھی مثال ہے۔ ظرافت میں طنز تفریح کے ساتھ اصلاح کا مقصد اس مضمون کی نمایاں خوبیاں ہیں دلور بیگان خورد کا حلیہ اور حالات، عشق کی گولیاں۔ ایک نواب کی ڈائری۔ یہ مرزا صاحب کے عمدہ مضامین ہیں۔ انہوں نے پلاٹ سے بھی ظرافت پیدا کی ہے۔ اور انداز بیان سے بھی۔

رشید احمد صدیقی: رشید احمد صدیقی بنیادی طور پر انشاء پرداز ہیں اور ظرافت نگاری کے لئے انشاء پردازی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کھانا پکانے کے لئے آگ۔ رشید احمد صدیقی قوت مشاہدہ اور احساس کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ظرافت نگاری کے لئے تمام خصوصیات سے پوری طرح لیس ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا ظرافت نگار کا نصب العین کوئی مستقل حیثیت رکھتا ہے یا نہیں۔

رشید احمد صدیقی کے ہاں خیال اور تصور کی حد تک بڑی رعنائی ہے۔ زبان بھی بڑی بلیغ ہے لیکن اُن کی ظرافت کا دائرہ عمل محدود ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے وہ اپنی ظرافت کو چند مخصوص موضوعات کے لئے استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔

نیاز فتحپوری نے رشید صاحب سے متعلق یہ رائے دی ہے۔

رشید صاحب کی مزاح نگاری کا دور اولین فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ تھا لیکن اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دماغ زیادہ تھک گیا ہے۔ اور وہ غور و تامل کی کلفت میں نہ خود مبتلا ہونا چاہتے ہیں نہ کسی اور کو مبتلا کرنا چاہتے ہیں [1]

www.taemeernews.com

رشید صاحب کو روایتی میں نہیں پڑھا جاسکتا. وہ زندگی کے حقائق اور روزمرہ واقعات پر بڑی خوبی کے ساتھ طنز کرتے ہیں ان کی تحریر کی خصوصیات یہ ہیں.

۱. ان کے طنز میں شوخی اور زندہ دلی کا عنصر ہے. شدت سے اُنہوں نے گریز کیا ہے اس لئے ان کے طنز کو خوشگوار، دلچسپ کہنا مناسب ہوگا. وہ کہیں کہیں غضب کے چٹکلے چھوڑ جاتے ہیں.

۲. وہ واقعات یا پلاٹ سے کام نہیں لیتے بلکہ ادبی ظرائف، لطیفوں ریمارک اور بذلہ سنجی کی بنیادوں پر اپنے ظریفانہ طنز کی عمارت تعمیر کرتے ہیں. (۳) ان کی تحریر میں روانی اور سلاست سے زیادہ بلاغت ہے. اور اسی بلاغت پر ان کی مزاح نگاری کا دارومدار ہے. رشید صاحب کی عبارت ان کی وقت پسندانہ ذہنیت کو بھی نمایاں کرتی ہے. یہ وقت پسندی اور بلاغت ان کی عبارت میں شگفتگی کو دبائے رکھتی ہے. وقت پسندی جیسا کہ نیاز صاحب نے فرمایا دوسروں کو یقیناً غور و فکر کی کلفت میں مبتلا کرتی ہے. رشید احمد صدیقی اور فرحت اللہ بیگ میں یہی فرق ہے رشید صاحب وقت پسند ہیں اور فرحت اللہ شگفتہ نگار.

رشید احمد صدیقی اور فرحت اللہ بیگ: رشید احمد صدیقی استعارات و تشبیہات سے کام نہیں لیتے. لیکن عربی و فارسی کے مغلق الفاظ استعمال کرتے ہیں. جس سے عبارت کا حسن مدہم پڑجاتا ہے. فرحت اللہ بیگ تشبیہات و استعارات اور دوسرے محاورہ وغیرہ سے کام لیتے ہیں لیکن ان کے پاس زبان کا چٹخارہ ہے. اور زبان کے چٹخارے سے ہر چیز کو ادبی ٹھٹول میں بدل کیا جاسکتا ہے. کائنات، خدا، روح، جنت. دوزخ جیسے عمیق مسائل کو بھی اظہار اور قوت بیان کے ذریعہ مضحکہ خیز بنایا جاسکتا ہے. لیکن دو سوالات پیدا ہوتے ہیں. کیا اس کی ضرورت ہے؟ اور دوسرے کیا اس کے جواز میں کوئی بلند تصور ہے، فرحت اللہ بیگ کی ظرافت ان سوالوں کا جواب نہیں دیتی اس کے باوجود ان کی عبارت میں روانی اور حسن ہے.

وہ مزاحاً شگفتہ نگار ہیں. رشید صاحب کے ہاں خیالات کی گہرائی اور ظرافت کے موقع محل کی شناسائی ہے اور جہاں تک ادبی ظرافت اور نکتہ سنجی کا تعلق ہے رشید صاحب بہت آگے ہیں. بیگ

افسانہ نگاری کے نقطہ نظر سے دیکھئے تو افسانہ کے تسلسل اور تیکنک کا لحاظ کرتے ہوئے فرحت اللہ بیگ بہتر مزاحیہ افسانہ نگار ہیں. ان کے افسانوں میں تسلسل قائم رہتا ہے اور وہ کبھی اپنے اصل موضوع سے گریز نہیں کرتے. بہرحال دونوں کی مزاح نگاری کا انداز جداگانہ حیثیتیں رکھتا ہے. اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رشید صاحب بہتر ظریف اور فرحت صاحب بہتر ظرافت نگار ہیں.

پطرس: احمد شاہ بخاری نے بہت کم لکھا ہے لیکن جو کچھ بھی لکھا ادب میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے (مضامین پطرس) ان کی پہلی اور آخری کتاب ہے. ان کی ظرافت نگاری کو مندرجہ ذیل تنقیحات کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے.

۱. واقعات ۲. مقصد ۳. زبان و اسلوب ۴. ظرافت.

۱. واقعات:- پطرس محض خیالی افسانے نہیں لکھتے بلکہ ایک قسم کے واقعاتی بیان پیش کرتے ہیں تاکہ موقع محل کا لطف پیدا ہوسکے. اس لئے اُن کی ظرافت کو واقعات کا تابع سمجھنا چاہیئے. جن میں ان کے مشاہدے کی قوت نمایاں ہے. استعارات اور شاعرانہ تشبیہات یا لفظی الٹ پھیر ان کا شیوہ نہیں. وہ واقعات ہی کچھ ایسے دلچسپ پیش کرتے ہیں کہ ظرافت خود بہ خود کھنچی چلی آتی ہے.

www.taemeernews.com

"میں ایک میاں ہوں" ان کا بڑا دلچسپ مضمون ہے۔ بیوی کے جانے کے بعد میاں کی آوارہ گردی اور بے مقصد تعطیل منانے کی خواہش کو انہوں نے عمدہ پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"شام بڑے لطف میں کٹی کھانا کلب میں کھایا۔ اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لئے تھیٹر گئے رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔ ..... صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی کو دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اٹھایا۔ اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا۔ اور پھر اونگھنے لگا۔ گیارہ بجے مجدکرہ میں داخل ہوا کہنے لگا "حضور حجام آیا ہے" ہم نے کہا "یہیں بلا لاؤ"۔

یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا ہے کہ بستر میں لیٹے لیٹے حجامت بنوالیں۔

ان کا دوسرا دلچسپ مضمون "میل اور میں" ہے جس میں انہوں نے عورتوں مردوں کی نفسیات کو واقعاتی انداز میں پیش کیا ہے انہوں نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے پر فوقیت جتانے کے کتنے خواہش مند اور کوشاں رہتے ہیں۔

۲۔ مقصد:۔ ان کی ظرافت کو فرائڈ کے نقطہ نظر کے مطابق بے مقصد ظرافت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ پطرس کی ظرافت علمیت اور افادیت کا کوئی عنصر اپنے اندر نہیں رکھتی۔ بیاز نچوڑی لکھتے ہیں کہ ان کی تحریر میں کسی تلخ حقیقت کا مطالبہ نہیں پایا جاتا ہے۔

۳۔ زبان اور اسلوب:۔ رشید احمد صدیقی نے ان کی زبان کے متعلق خوب لکھا ہے۔ پطرس اچھی اردو اب بھی لکھتے ہیں اور یقین ہے کہ سر بننے یا جیل جانے سے پہلے وہ صحیح اردو بھی لکھنے لگیں گے[1]۔ رشید صاحب کی ظرافت یہاں بھی کام آئی۔

پطرس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ تصنع سے عاری زبان لکھتے ہیں۔ اور شگفتگی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کا اسلوب اور انداز بیان دلچسپ رواں اور لطیف ہے۔ وہ اپنے مطلب کو پوری طرح ادا کر دیتے ہیں۔ اور انداز بیان سے لطف و مسرت کی ایک خاص فضاء پیدا کر کے قاری کو مسحور کر دیتے ہیں۔ ان کے انداز بیان اور طرز نگارش پر مغربی ادب کے اثرات نے اپنے کچھ نقوش چھوڑے ہیں۔ فن مضمون نگاری کے جدید ترین اصول کے مطابق ان کی عبارت مختصر لیکن جامع، تکلف اور تصنع سے عاری لیکن خوشگوار اور دلنشین ہوتی ہے۔ ان کے طرز ادا میں ایک قسم کی ندرت پائی جاتی ہے۔ اس لئے ان کا اسلوب پڑھنے والوں کو متاثر کرتا اور بہت زیادہ خندہ پیدا کرتا ہے۔

۴۔ ظرافت:۔ پطرس کی ظرافت نگاری لذت و مسرت اور حظ و انبساط کی پیداوار ہے۔ ان کے مزاح کی شگفتگی اور شوخی نے ان کی تحریروں میں لطائف و ظرائف کا سا شوخ رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اگر ہم مزاح و ظرافت کو پیش نظر رکھیں تو اور دوسرے ظرافت نگاروں سے پطرس کا مقابلہ کریں تو ہمیں ان کا سر بلند نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ظرافت ہمارے دلوں سے اٹکھیلیاں کر رہی ہے۔ ان کی ظرافت در حقیقت اس جذبہ مسرت کی پیداوار ہے۔ جو انسان کے دل میں غیر شعوری طریقہ پر پرورش پاتا رہتا ہے۔ اس میں نہ تو احساس برتری ہے اور نہ جذبہ تنفر۔ پطرس کوئی تکدر نہیں پیدا کرتے۔ وہ کسی کا خاکہ یا مضحکہ اسے حقارت سے دیکھنے کے لئے نہیں اڑاتے۔ ان کی لطیف ظرافت طنز کے بار کو بھی ناقابل برداشت سمجھتی ہے۔ اس لئے عموماً وہ طنز سے گریز کرتے ہیں۔

---

[1] طنزیات و مضحکات صفحہ (۲۰۲)

www.taemeernews.com

یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی خوش طبعی چٹکلے چھوڑتی ہے۔ اور ہر بات میں کوئی نہ کوئی نکتہ پیدا کر دیتی ہے۔ مثلاً انہوں نے "اودھ کی آخری کتاب" لکھتے ہوئے خوش مذاقی کا بہت اچھا ثبوت دیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"کھانا خود بخود پک رہا ہے" دیکھنا ہو تو آپ بھٹی پکا رہی ہے ورنہ دراصل یہ کام بیاں کا ہے۔ ہر چیز کیا قرینے سے رکھی ہے۔ دھوئے دھائے برتن صندوق پر ہیں تاکہ صندوق نہ کھل سکے۔ ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں کسی میں دال ہے کسی میں آٹا کسی میں چوہے۔ پھکنی اور پانی کا لوٹا پاس ہے۔ تاکہ جب چاہے آگ جلالے جب چاہے پانی ڈال کر بجھا دے۔"[1]

"دھوبی آج کپڑے دھو رہا ہے۔ بڑی محنت کرتا ہے۔ شام کو بھٹی چڑھاتا ہے دن بھر بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ کبھی کبھی بیل پر لاد تا ہے۔ اور گھاٹ کا راستہ لیتا ہے۔ کبھی نالے پر دھوتا ہے کبھی دریا پر۔ تاکہ کپڑوں والے کبھی نہ پڑ سکیں..... دن بھر میں روٹی لائی ہے۔ دھوبی کو بہانہ ہاتھ آیا ہے۔ کپڑا پٹرے پر رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ کتے نے بھی دیکھ کر کان کھڑے کئے اب دھوبی گانا گائے گی۔ دھوبی دریا سے نکلے گا۔ دریا کا پانی پھر نیچا ہو جائے گا۔"[2]

"لاہور کا جغرافیہ" ان کی شوخی اور ذہانت کا عمدہ نمونہ ہے۔ ان کی ظرافت دل کو لبھاتی ہے اور ہنسنے ہنسانے پر مجبور کرتی ہے۔ پطرس واقعات کی بڑی عمدہ تصویر کھینچتے ہیں۔ اور جیسا کہ ہم نے باب اول میں بتایا ہے کہ ظرافت کا کام مشابہت دکھانا ہے۔ پطرس بھی بڑی عمدہ تشبیہات دیتے ہیں۔

"مرحوم کی یادیں" اپنی سیکل کی سواری کے متعلق لکھتے ہیں۔

"دس قدم گیا چلتے نہ پایا تھا کہ ایک ہینڈل یکلخت نیچا ہو گیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی۔ باقی جسم کے کو جھکا ہوا تھا تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا۔ جو ہینڈل پر رکھے تھے۔ اور برابر جھٹکے کھا رہے تھے آپ میری حالت کو تصور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہے۔"

بائیسکل کے ٹھہر جانے سے یک لخت جیسے دنیا میں ایک خاموشی سی چھا گئی ایسا معلوم ہوا جیسے میں کسی [illegible] نکل کر باہر آ گیا ہوں۔"[1]

پطرس واقعات کی جو تصویر کھینچتے ہیں۔ ان میں بڑا فطری آہنگ اور اصلیت کا رنگ ہوتا ہے۔ "میں ایک میاں ہوں" اور "مرحوم کی یاد میں" ان دونوں مضامین میں انہوں نے برج پارٹی اور سائیکل کی سواری کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا حقیقی کھیل کتنا دلچسپ اور ہنسی پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔

فرحت اور پطرس :۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ شگفتہ نگاری میں فرحت کو اردو کے مزاح نگاروں میں اولیت کا درجہ حاصل ہے۔ اب رہی ظرافت نگاری تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ نصب العین کی دونوں مصنفین کے پاس کمی ہے۔ دونوں کی تحریر خوش مذاقی اور بذلہ سنجی کے سوائے بہت کم افادیت رکھتی ہے۔ دونوں کی ظرافت لکھنے اور اپنے پڑھنے والوں کے لئے ہے۔ اور اس کی تہہ میں یہ بات پائی جاتی ہے کہ اپنی خداداد خوش طبعی کا مظاہرہ کیا جائے۔ لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں مجرد ظرافت کے نقطۂ نگاہ سے

---

[1] مضامین پطرس صفحہ ۶۱ [2] مضامین پطرس صفحہ ۶۲، [1] مضامین پطرس صفحات (۱۲۶ تا ۱۵۶)

www.taemeernews.com

دونوں میں کیا فرق و امتیاز ہے۔

پطرس اور فرحت میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ پطرس کی ظرافت واقعات کی تابع ہے اور فرحت کی ظرافت [illegible] اپنی جگہ ظرافت پیدا کرنے میں دونوں کامیاب ہیں۔ فرحت کی ظرافت میں شگفتگی زیادہ ہے اور پطرس میں شوخی [illegible] ظرافت نگاری لطائف و ظرائف کی تخلیق کرتی ہے۔ انداز بیان اور اسلوب دونوں کا دلچسپ ہے۔ زبان فرحت [illegible] پطرس کی ظرافت چونکہ واقعات سے متعلق ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ صرف زبان کی مدد سے [illegible] ظرافت کا معیار نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ فرحت کی ظرافت ان کے احساس برتری کی پیداوار معلوم ہوتی [illegible] جبکہ پطرس "یار شاطر" کی طرح مذاق کرتے ہیں۔ احساس برتری نہیں رکھتے۔ اس لئے مجموعی حیثیت سے پطرس بہتر ظرافت [illegible]

رشید احمد صدیقی اور پطرس: دونوں کی ظرافت نگاری کا میدان جداگانہ ہے۔ پطرس ظرافت نگار ہیں اور رشید احمد صدیقی زیادہ تر طنز نگار۔ کسی بلند نصب العین کا فقدان رشید کے پاس بھی ہے لیکن ان میں ضروریات [illegible] طرف اشارہ کرنے کا ایک جذبہ موجود ہے۔ پطرس اس لحاظ سے ان سے پیچھے ہیں۔

[illegible] پطرس کی شوخی طبع رشید صاحب کے لطائف و ظرائف پر حاوی ہے اور ظرافت نگاری کے لحاظ سے یعنی شوخی اور ظرافت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پطرس کو فوقیت حاصل ہے۔ رشید صاحب کی عبارت میں اکتا دینے والی کلفت ہے۔ [illegible] کے پاس نہیں ہیں۔

نتیجہ یہ کہ رشید صاحب اور پطرس میں زیادہ نمایاں فرق نہیں ہے۔ اگر رشید صاحب کی وقت پسندی کو نظر انداز کر دیا [illegible] دونوں کا مقام تقریباً ایک ہی ہے۔

شوکت تھانوی: شوکت تھانوی اردو کے ممتاز ظرافت نگاروں میں گنے جاتے ہیں ان کی کئی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں اور بالعموم مقبول بھی ہوئی ہیں۔ ان کی تحریر میں ظرافت کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ اور معلوم [illegible] کہ انہوں نے فطرت انسانی کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ اکثر مضامین میں انسان کی نفسیات پر بڑی اچھی طرح [illegible] مشاہدہ وسیع ہے۔ ان کا قلم جزئیات پر پوری طرح حاوی ہے۔ زبان صاف اور شیریں لکھتے ہیں۔ ان [illegible] کے پلاٹ کو اچھا کہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کے مضامین میں کوئی خاص مقصد اور نصب العین نہیں پایا جاتا۔ انہوں نے کہیں کہیں "کہانی حقیقت" سے کام لیا ہے۔ لیکن تنقید سے ہمیشہ دور رہے ہیں۔

عظیم بیگ چغتائی نے ایک جگہ لکھا ہے[1] اگر واقعی دیکھا جائے تو چوٹی کے مزاحیہ نگار صرف تین چار ہیں۔ ایک فرحت، [illegible] پطرس، پھر رشید احمد صدیقی اور شوکت تھانوی۔"

اس کے بعد انہوں نے شوکت کا دوسرے مزاح نگاروں سے موازنہ کیا ہے۔ خود اپنے آپ سے موازنہ کرتے ہوئے

---

[1] عظیم بیگ چغتائی "مجتبیٰ"

www.taemeernews.com

لکھتے ہیں کہ شوکت مزاحیہ نگاری میں ان سے بہت آگے ہیں لیکن افسانہ نویسی کی حد تک ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جب سے عظیم بیگ چغتائی جیسا صاحب کو شخص کیسے انکساری کر گیا اپنے مبتدی ہونے کا اعتراف تو وہ بڑی بلند ہمتی سے کر گئے ہیں۔ لیکن سیلاب تبسم کے دیباچہ میں انہوں نے بہت زیادہ انکسار و عاجزی سے کام لیا ہے۔

شوکت اور عظیم بیگ: افسانہ نویسی کی حد تک چغتائی صاحب اور شوکت کا کوئی مقابلہ ہے ہی نہیں افسانوں کا پلاٹ بنانے یا پیدا کرنے میں چغتائی کو کمال حاصل ہے۔ اور بہت کم افسانہ نگار ملیں گے جو اس خوبی سے عہدہ سکیں۔ اب رہی مزاحیہ نگاری تو واقعہ یہ ہے کہ عظیم بیگ چغتائی اور شوکت تھانوی کا موازنہ بڑی حد تک ایک نزاعی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مندرجہ ذیل تنقیحات کی روشنی میں دونوں کا تقابلی مطالعہ کرنا بہتر ہوگا۔

۱۔ نسب العین ۔ عظیم بیگ چغتائی ایک ذہنی سمجھ کے موجد معلوم ہوتے ہیں۔ سوسائٹی کے جس عیب پر انہوں نے بالعموم قلم چلائے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مقصد اور خاص جھلک نظر آتی ہے۔ شوکت کی تصانیف اس خوبی سے معرا ہیں۔ سودیشی راجواڑہ کا شاہکار مضمون ہے۔ بیشک انہوں نے ہندوستانیوں کی کارکردگی اور ذمہ داری کے احساس کی کمی پر نکتہ چینی کی ہے لیکن بالعموم وہ تنقید اور طنز سے گریز کرتے رہے ہیں۔ اس حیثیت سے عظیم بیگ کو ان پر فوقیت حاصل ہے۔

۲۔ زبان ۔ عظیم بیگ کی زبان میں آورد کا عیب نمایاں ہے۔ ان کی عبارتیں شوخی اور شگفتگی نہیں۔ لیکن شوکت کے مقابلہ میں ان سے آگے ہیں ان کی عبارت زیادہ شگفتہ اور رواں ہوتی ہے۔ چغتائی صاحب کی تحریر میں تکلف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

۳۔ جزئیات ۔ شوکت کی طرح یہ بھی جزئیات پر پوری طرح نظر رکھتے ہیں۔ عظیم بیگ، اس معاملہ میں ان سے بہت پیچھے ہیں۔

۴۔ ظرافت ۔ عظیم بیگ کی ظرافت نگاری میں عریانی اور سخرہ پن کے عیوب، اکثر و بیشتر مقامات پر پائے جاتے ہیں۔ لیکن شوکت بالعموم ان عیوب سے احتراز کرتے ہیں۔

لیکن مجموعی حیثیت سے دیکھئے تو عظیم بیگ کی تحریروں میں جو ہمدردی اور خلوص ہے وہ انہیں شوکت سے آگے بڑھا دیتا ہے۔ ان کا ایک نسب العین ہے اس اعتبار سے وہ بہرحال قابل ترجیح ہیں۔

شوکت اور ملا رموزی: شوکت اور ملا رموزی کا مقابلہ کرتے ہوئے عظیم بیگ لکھتے ہیں کہ "شوکت تھانوی کو ملا صاحب سے کوئی مناسبت نہیں۔ ملا صاحب کے مقابلے میں صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ شوکت ادیب اور مزاح نگار ہیں اور ملا صاحب محض ایک مصلح نہ کہ مزاحیہ نگار۔"[1]

رشید صاحب کی رائے ہے کہ "شوکت تھانوی اور ملا رموزی کا انداز تحریر تقریباً ملتا جلتا ہے۔ یہاں ملا رموزی صاحب کے اس رنگ سے بحث نہیں ہے جو انہوں نے ابتدا میں گلابی اردو کے تحت میں اختیار کر رکھا تھا۔ ملا رموزی نے وہ رنگ تقریباً ترک کر دیا۔ ان کا موجودہ انداز تحریر اور موضوع ایک حد تک عام پسند ہے ۔۔۔ شوکت تھانوی کے مضامین کی اٹھان اور

[1] مقدمہ سیلاب تبسم۔

www.taemeernews.com

[illegible] مزاحیہ نگاروں کی طرح قطعاً بازاری تو نہیں لیکن روزمرہ فقرہ ہے۔ جزئیات کے دونوں امام ہیں۔[1]

[illegible] میں شک نہیں کہ ملا موزوں مزاحیہ نگار سے زیادہ ایک مصلح کا انداز رکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ظرافت نگاری ان کا وسیلہ [illegible] ذریعہ اصلاح ہے۔ اس لئے بہ حیثیت ظرافت نگار رشید صاحب نے ان دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے جو رائے دی ہے زیادہ قابل قبول ہے۔ شوکت کو ملا صاحب پر ہر حیثیت سے ترجیح حاصل ہے اس لئے کہ شوکت کی عبارت میں عریانی نسبتاً بہت کم [illegible] ہے۔ ملا صاحب اکثر فواحش بھی لکھ جاتے ہیں۔ ممکن ہے آرٹ کے انتہا پسند نقطہ نظر سے عریانی کا جواز نکل آئے لیکن [illegible] تعلق اخلاق اور ادب کا تعلق ہے عریانی جائز نہیں اور فحش نگاری تو اس سے بھی زیادہ نامناسب ہے۔

علاوہ اس کے ملا موزوں نے کردار نگاری کی طرف کبھی توجہ نہیں کی لیکن شوکت مقانوی نے اس صنف میں بھی قلم اٹھایا ہے۔ [illegible] شوکت مقانوی کی کردار نگاری کی صلاحیت پر دلالت کرتے ہیں۔ روزمرہ شوکت کے مضامین میں فرد [illegible] پر بھی جزئیات پر پوری طرح توجہ دی ہے اور اکثر مقامات پر فطرت انسانی کی تمام خاصیتوں پر زور دیا ہے [illegible] ان کے شاہرے کا توازن اور احساس کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ "آرام کرسی" والے مضمون میں شوکت لکھتے ہیں: "خدا نے آرام کرسی کو [illegible] شرف بخشا ہے کہ خود تو وہ سب کرسیوں میں ممتاز ہوتی ہے۔ لیکن اس پر بیٹھنے والا بھی صدر منتخب نظر آنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تہذیب جدید۔ نے اس بات کی اجازت دیدی ہے کہ ہر صاحب خانہ اپنے دولت خانہ یا غریب خانہ میں جہاں لوگوں کے [illegible] لئے چھ سات معمولی کرسیوں کا انتظام کرے۔ وہاں اپنے لئے ایک آرام کرسی کا بھی انتظام ضرور کر لے .... وہ اپنے [illegible] ہر ممکن خاطر کرے گا۔ پان دے گا سگریٹ دے گا۔ چائے یا شربت پلائے گا مگر آرام کرسی کے معاملے میں مروت کو دخل [illegible]

[illegible] پر رشید صاحب کی اس رائے کا بھی اطلاق ہوتا ہے کہ "شوکت میں شگفتگی ضرور ہے لیکن ابھی شگفتہ مزاجی [illegible] تسلسل نہیں ہوئی ہے۔

[illegible] "شوکت کی مزاحیہ نگاری کے اچھے نمونے ہیں، انہوں نے ان مضامین میں تضاد سے ظرافت [illegible] ہے۔ اور کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن ظرافت نگاری کا یہ انداز ذرا پامال سا ہو گیا ہے۔ پھر بھی شوکت نے لطافت [illegible] مضامین کو شگفتہ بنا دیا ہے۔

"[illegible] والد بزرگوار انتقال فرما گئے تو ہم کو ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان کے ٹوٹ کر پھٹ پڑنے کے برابر تھا۔ لیکن اس سلسلہ میں ہم بھی کچھ مصیبت [illegible] لئے جو حقیقت درست کے ہم کو ریاض کے پاس تعزیت کے لئے جانا تھا۔ زندگی بھر میں پہلی مرتبہ ضرورت پیش آئی تھی اور [illegible] تھا نہیں کہ ہم تعزیت کے متعلق مفصل معلومات بہم پہنچا کر تھوڑی بہت مشق کر لیں۔ بہرحال ہم کو اطمینان تھا کہ ہم بالکل ورے ثابت نہ ہونگے .... لہٰذا ہم نے اللہ کا نام لیکر اپنے ارادہ کو پختہ کر لیا اور مختلف اوقات میں جو تعزیتی [illegible] الفاظ رہا [illegible] ہونوں میں پڑ چکے تھے، ان پر زور دیکر یکجا کرنا شروع کر دیا۔"

---

[1] طنزیات و مضحکات صفحہ ۱۸۸۔

www.taemeernews.com

اس تیاری کے بعد جب وہ ریاض کے گھر تعزیت کے لئے پہنچتے ہیں اور وہ بیچارا زار و زار رونے لگتا ہے تو شوکت صاحب اپنی رٹی رٹائی تقریر بھول جاتے ہیں اور گھبرا کر جلد جلد کہنا شروع کرتے ہیں۔

"آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ آپ کے والد مرحوم کو خدا صبر کی توفیق دے" اور آپ کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ یہ وہ نہیں قضا ہوئی زندگی بھر روزے رکھتے رہے آپ کے والد مرحوم۔ مشیت ایزدی میں کیا چارہ ہے۔ صبر کیجئے۔ اب رونا کیا ہوتا ہے۔ اور آپ کے والد ــــ آپ کے والد تھے۔ جس پہ گذری ہے یہ وہی جانے مگر۔ ۔ ۔

www.taemeernews.com

[illegible] کی راہ میں اور بالخصوص ظرافت نگاری میں تو بہت سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اس امر کا امکان ہے کہ ظرافت نگار [illegible] فحاشی اور مسخرہ پن میں فرق [illegible] نہ رکھ سکے۔ اور لکھنے والے کو ذرا سی بے توجہی اسے صحیح راستے سے ہٹا دے۔

آوارہ : حضرت آوارہ اردو کے پرانے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز علیگڈھ کالج سے ہوا۔ ان کے شریفانہ سفاریوں کا ایک مجموعہ "بے پرکی" شائع ہو چکا ہے۔

حضرت آوارہ کی تحریر پر "قدامت" کا رنگ غالب ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرشار اور سجاد حسین کی تحریروں کے معمار [illegible] تحریر میں طوالت ہے۔ ان کے جملے شروع تو روانی سے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ختم بڑی مشکل سے ہوتے ہیں۔ مثلاً "صدر دروازہ میں ٹاٹ کے پرانے بنسی پردوں کے نیچے سے رنگ [illegible] کی پیلی روشنی [illegible] چاندنی پر ایک بڈھا ستار اپنے [illegible] دونے آپ کی کھنیوں پر سکی ہوئی بوٹے دار ململ کی انگرکھا پہنے [illegible] سامنے بڑی زردوزی کی ٹوپی [illegible] تک مشدھے بلاؤں ٹھاٹھ کی ایک [illegible] سے ٹپ ٹپ سے سر تک مچل مچل کر کچھ اس طرح ہچکولے کھا رہا ہے کہ ڈر ہے کہیں [illegible] پہنچتے پہنچتے تان کا ڈورا بیچ ہی میں ٹوٹ جائے اور اس کے ساتھ سر بھی نہ ہاتھ سے جاتا رہے۔" [1]

طوالت کلام کے علاوہ حضرت آوارہ الفاظ کے انتخاب میں بھی زیادہ قدامت پسند واقع ہوئے ہیں۔ ان کی زبان بھی زیادہ گھریلو اور مقامی ہے۔ اور اکثر جگہ وہ ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو ادبی مضامین میں استعمال نہیں کئے جاتے۔ ان کی زبان غالباً لکھنؤ کی گلیوں کی زبان ہے۔ جزئیات پر پوری طرح نگاہ رکھتے ہیں۔

ان کی تحریر میں دو خصوصیات نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ مضحک کردار اور ان کی نفسیات کا مطالعہ وہ گہری نظر سے کرتے ہیں۔ ایسی خصوصیات کو جو حد اعتدال سے آگے بڑھی ہوتی ہوں حضرت آوارہ عمدہ طریقہ پر بیان کرتے ہیں۔ دوسرا بات یہ کہ وہ اپنے سلسلہ بیان میں کرداروں کی اس خصوصیت کو عینیت کی سرحد میں لاتے اور انہیں واقعاتی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

اب رہی ظرافت۔ تو حضرت آوارہ کی ظرافت بہت زیادہ متعلق ہوتی ہے ان کی طرز نگارش سے۔ واقعات سے وہ مزاح نہیں پیدا کرتے بلکہ الفاظ سے شوخی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً [illegible] چال کا انداز پیدا کر دیتے ہیں۔ زبان بالعموم اچھی ہے۔ جو اکثر مقامات پر لطف پیدا کر دیتی ہے۔

رشید احمد صدیقی نے ان کی ظرافت پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "[illegible] کی ظرافت محض سادہ اور تفریحی ہوتی ہے۔ وہ کسی قسم کے ایچ پیچ کو دخل نہیں دیتے ان کے بعض مضامین میں کہیں کہیں طنز کی جھلک آگئی ہے لیکن اس کا اصل [illegible] عبارت آرائی ہے۔ اور اس رنگ کو پسند کرنے والے موجودہ دور میں شائد کھنے والوں سے بھی کم ہوں گے۔ حضرت آوارہ شیفتہ و استعارات کے استاد ہیں۔ محاورے اور روزمرہ ان کے نوک قلم پر ہیں۔ انہیں رنگینیوں میں ان کی ظرافت کا رنگ کھلتا ہے۔

[illegible] زبان کے پھندنے پر جھولتے میں [illegible] کے اکثر مضامین چھپے ہیں۔ ابتدائی مضامین پر اکثر [illegible]
[illegible] لیکن آگے چل کر پختہ کار [illegible] مزاح نگار تھے

---

[1] [illegible] اقتباس ہے

www.taemeernews.com

سنہ بادجہازی پیچ در پیچ گفتگو نہیں کرتے اور اپنے طنز کو ظرافت اور مزاح کے پردے میں چھپا نہیں دیتے۔ بلکہ عریاں ہیں۔ شوان کا وہ "مضمون" بنام ہے عیش سکندر حیات خاں کے لئے "بہت زیادہ راست ہے ان کے طنز میں تلخی ہے لیکن ساتھ ساتھ شگفتگی بھی پائی جاتی ہے۔ اخبار کے ایڈیٹر تھے اس لئے بالعموم ملکی اور سیاسی امور پر قلم اُٹھایا ہے۔ ان کی طنز نگاری کا مقصد صرف طنز نہیں بلکہ اصلاح بھی ہوتا ہے۔ تحریر میں ان کی واقعیت پرستی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اکثر مقامات پر طنز کرتے وقت تلخی و تندی جھلک آگئی ہے۔ لیکن چونکہ اصلاح ان کا مقصد ہے اس لئے ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے یہ شدت ان کی حد تک نہ ہونی چاہیئے۔

سنہ بادجہازی کی تحریروں میں خوش مذاقی لطیف مزاح اور سنجیدہ ظرافت کے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ مبالغہ وہ ضرور کرتے ہیں لیکن غلو کی حد تک نہیں۔ زبان رواں اور بے ساختہ لکھتے ہیں۔ انہیں اپنے قلم پر قابو ہے۔ تحریر کا انداز دلچسپ اور شستہ ہے۔ ان کی تحریر کا انتخاب درج ذیل ہے۔

سرکلر روڈ۔ "احسان" کا دفتر جس سڑک پر واقع ہے اسے سرکلر روڈ کہتے ہیں۔ یوں تو یہ ساری سڑک دُنیا بھر کی "خطا بخشاں" کا جواب ہے لیکن اس کے جس حصہ پر "احسان" "مجاہد" "سیاست" اور "حریت" کے دفتر واقع ہیں اس کی تعریف میں پائے قلم لنگ ہو جاتا ہے۔ بلدیہ لاہور کا انتظام دیکھنا ہو تو ذرا لاہور آرکڈلی دروازے سے برانڈرتھ روڈ تک سیر کر آئیے۔ ملکوں میں سیلف گورنمنٹ کے معنی معلوم نہ ہو جائیں تو ہمارا ذمہ۔

سنا ہے کہ یو۔پی کے کوئی صاحب جو سلطان المجاہدین کے نام سے مشہور ہیں اس شان سے حج کو چلے ہیں کہ ہر پانچویں قدم پر دو رکعت نماز ادا کرتے ہیں۔ آپ کبھی سرکلر روڈ کی سیر کو جائیں تو مفت میں سلطان المجاہدین بن جائیں یعنی ہر قدم پر رکوع اور ہر تیسرے قدم پر سجدہ کرنا پڑے۔ اس طرح آپ کعبہ تو نہ پہنچیں گے نہیں "انسان و خیزان" برانڈرتھ روڈ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ انسان تو انسان یہاں بے زبان جانوروں کے دل میں بھی خضوع و خشوع کا ذوق اور عبادت کا شوق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہم نے گھوڑوں کو یہاں پہروں سجدے میں گرے ہوئے پایا اور انسانوں کو ان کی اقتداء میں زمین پر ماتھا گھستے۔[1]

تاکارہ حیدرآبادی: "صدائی" (کتاب) کے علاوہ تاکارہ حیدرآبادی کے کئی مضامین ہندوستان کے موقر رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ تاکارہ حیدرآبادی کی ظرافت نگاری معائب سے پاک ہے۔ زبان صاف ستھری اور عبارت شگفتہ ہوتی ہے۔ مزاح اور ظرافت کی مٹھاس تقریباً ہر فقرے میں موجود ہوتی ہے۔ مبالغہ سے بھی اکثر کام لیتے ہیں لیکن غلو نہیں کرتے کہیں کہیں طنز کی ہلکی سی چوٹ بھی ظرافت میں پنہاں ہوتی ہے۔ ان کے مضامین اپنی شگفتگی اور فکاہیہ انداز کے اعتبار سے دلچسپ اور مزیدار ہوتے ہیں۔ تاکارہ بالعموم اپنے مضمون کے تمام تر متعلقات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی غیر متعلق باتوں میں بھی اُلجھ جاتے ہیں۔ لیکن ایک آدھ مزاحیہ فقرہ چھوڑ کر بہت جلد اصل موضوع کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ ان کی ظرافت کا موضوع معاشرت اور خصوصاً وہ خیالات ہیں جو ادبی اور سیاسی ہنگاموں میں جلوہ آرا ہوتے ہیں اور جو قریب قریب ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے شمائل نفسی بن گئے ہیں۔

---

[1] مطائبات۔ صفحہ ۲۸، ۲۹

www.taemeernews.com

ایک مضمون کے کچھ اقتباسات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

"ایک شاعر ایک ادارہ ہے۔ دو شاعر ایک مشاعرہ اور تین شاعر ایک ہنگامہ۔۔۔۔ اگر ترنم کو پیش نظر رکھا جائے تو آپ جانتے ہیں کہ کلام کی ادائیگی ہوتا ہے۔ تو کہہ سکتے ہیں کہ ایک شاعر ایک موسیقار ہے دو شاعر قوالی کی چوکی اور تین شاعر آرکسٹرا۔ ممکن ہے کہ آپ کہیں کہ یہ تعریفیں یا یہ وجہ بندیاں مبالغہ آمیز ہیں یا وجد دلآزاری ہیں۔ اگر آپ واقعی ایسا ہی سمجھتے ہیں تو پھر میں نیک نیتی کے پورے احساس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ یہ مقولے شاید میرے نہیں ہیں۔۔۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مضمون کی بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ در حقیقت میں مضمون کو فلسفانہ طریقے پر شروع کر کے محتاط طریقے ہی پر ختم کرنا چاہتا تھا۔ یہ اور بات ہوتی کہ بیچ میں ایسی ویسی باتیں قلم سے نکل جائیں مگر یہاں تو مطلع ہی میں سخن گسترانہ بات آپڑی ہے۔ اور مقطع تو ابھی بہت دور ہے۔ مگر میرا ضمیر مطمئن ہے۔ ضمیر کا اطمینان بڑی چیز ہے مگر کچھ ایسی بڑی چیز بھی نہیں اس لئے تہذیب و شائستگی کے اس دور میں ہمارا آپ کا ضمیر بڑی آسانی سے مطمئن اور پاک ہو جاتا ہے۔ فطرت میرا بچہ نہیں سہی۔ لیکن ضمیر میں لچک ضرور ہے۔ ہر بات پر بڑا پاپا ہے۔ دیکھئے نا کتنا اعلیٰ تخیل ہے۔ افسوس ہے میں شاعر نہیں ہوں ورنہ اس خیال کو ردیفی ہیپکل نثر کے بجائے ایسے موثر انداز میں شعر میں ظاہر کرتا کہ معلمین اخلاق دنگ ہو کر رہ جاتے اور میں تبقہ لگا کر آگے بڑھ جاتا۔ مطلب یہ ہے کہ شاعری اب ایک معزز پیشہ ہے۔ ملازمت کے لئے میٹرک پاس ہونا اور شرافت خاندانی کا مجسٹریٹ سرٹیفکیٹ حاصل کرنا ضروری ہے۔ مگر شاعر ان قیود سے بھی آزاد ہے۔ الحمد للہ!"

حاجی لق لق: اخبار زمیندار (لاہور) کے مزاحیہ کالم حاجی لق لق لکھا کرتے تھے۔ ان کی کئی تصانیف مثلاً پرواز لق لق، ادبی کثیف اور اضافوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ظرافت زیادہ تر بیانیہ ہوتی ہے جو صرف تفریح طبع کی خاطر لکھی جاتی ہے اس میں گہرائی تو نہیں ہوتی۔ لیکن شگفتگی ضرور ہوتی ہے۔ بعض مقامات پر انہوں نے طنز کی بھی کوشش کی ہے لیکن اس میں ان کا قلم چلتا نہیں ہے۔

ان کے اداریوں کے پلاٹ بالعموم غیر دلچسپ سے ہوتے ہیں اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کا قصہ کھینچ تان کر بنایا گیا ہے۔ مثلاً ان کے اداریوں کے چند عنوان درج ذیل ہیں جن سے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ نمونہ درج ذیل ہے۔

"بیسرہ۔۔۔ بڑی شان کا انسان ہے۔ گھر سے نکل کر دفتر کو جاتا ہے تو دنیا پر اس طرح نظر ڈالتا ہے جس طرح مسولینی کو پیار آ رہا ہے۔ ہٹلر برمنی کی خیر مناتا ہے۔ اتاترک ترکیہ کی ترقی چاہتا ہے۔ ابن سعود حجاز کی ترقی میں منہمک ہے لیکن ایڈیٹر کے جگر میں تمام دنیا کا درد ہے۔

اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھ کر تمام دنیا بھر کی قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے تمام عالم کی سیاسیات میں ٹانگ اڑاتا ہے۔ مسولینی نے حبشہ پر حملہ کیا تو ایڈیٹر کا قلم حرکت میں آیا۔ اور اس نے غضب میں آ کر دھمکی دی کہ بس یہیں رک جاؤ اگر آگے بڑھے تو یاد رکھو مالے غنیمت کا پانچواں حصہ نکال دیا جائے گا۔ چرچل نے ہندوستان کے متعلق کچھ کہا کہ بیٹا وہیں بیٹھے اکڑتے رہو۔ ذرا آؤ ہندوستان

۱۔ یہ مضمون از سائی سائنامہ شمارہ ۵۶ ۔۔۔

www.taemeernews.com

میں واسرائے بن کر جو ایک ہی نظم میں "جلیبہ نہ بگاڑ دوں۔

دفتر میں اڈیٹر کی بڑی شان ہوتی ہے بڑے سے بڑا آدمی سائل بن کر آتا ہے۔ ہر شخص اپنی کامیابی کے لئے اڈیٹر کا محتاج ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق اقتصادیات سے ہو یا سیاسیات سے انجمن بازی سے ہو یا تحریک بازی سے ہر حالت میں وہ اڈیٹر کی اعانت قلمی کا آرزو مند ہوتا ہے۔ ہم نے نوابوں اور راجوں تک کو اڈیٹر کے حضور میں معروضات پیش کرتے دیکھا ہے۔ ہر سائل کی قسمت کا فیصلہ اڈیٹر کی ہاں یا نہ پر ہوتا ہے۔

"دیسی لاٹ صاحب" میں بھی مرزا جی لق لق نے ہندوستانیوں کی فیشن پرستی پر افسانوی انداز میں طنز کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے کہا بحیثیت طنز نگار مرزا جی لق لق ایک ناکام ادیب ہیں۔ ان کے طنز میں ہمدردی مطلق نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طنز نگاری گراں گزرتی ہے۔ طنز کرتے وقت شگفتگی بھی ان کی عبارت کا دامن چھوڑ دیتی ہے۔ البتہ ظرافت نگار کی حیثیت سے مرزا جی لق لق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ایم۔ اسلم: ایم۔ اسلم اردو کے بسیار نویس ادیبوں میں سے ہیں۔ ناول افسانوں اور مضامین کی صورت میں انہوں نے ظرافت نگاری کو اپنا موضوع بنایا ہے ان کی کتاب "مرزا جی" کو امتیاز علی تاج کے "چچا چھکن" کا ناقص چربہ سمجھنا چاہیئے کردار نگاری کی کوشش ضرور کی ہے اور اکثر جگہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن :۔

۱۔ ان کی ظرافت تصنع اور بناوٹ کی پیداوار ہوتی ہے۔ وہ زبان سے کھیلتے ہیں۔ یعنی کبھی غلط جملے استعمال کرتے ہیں اور ان کو درست کر کے مزاح پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً کانگریس ہائی کمانڈ..... استغفر اللہ ہائی کمانڈ کے نقطۂ نظر سے....

۲۔ ان کی ظرافت میں شدت اور تلخی ہے۔ بلکہ بعض جگہ پھکڑپن کا رنگ بھی آگیا ہے۔

۳۔ ان کی تحریر میں تعصب کا رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی کتاب "نمستے علیکم" نام کی روایت سے تو ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ ہے لیکن جب ہم ان مضامین کو پڑھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ایم۔ اسلم صاحب نے یہ روایت فقط نام کی حد تک برقرار رکھی ہے۔ کتاب کے دیباچہ میں وہ فرماتے ہیں۔

سنا ہے کہ کوئی بنارس کا پنڈت — بغل میں لئے اپنے ویدوں کے بستے
عراق و عرب میں یہ ہانکے پکارا — نمستے علیکم علیکم نمستے

ان دو اشعار کی شعری خوبیوں سے قطع نظر کرتے ہوئے جب ہم مضامین پر نظر ڈالتے ہیں تو معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں "ایک زمانہ تھا جب ہندوستان میں جسے اب اگر گدھستان کہا جائے تو شاید کچھ غلط نہ ہوگا صرف انگریزی قسم کے گدھے بستے تھے۔ لیکن اب مہاتما گاندھی جی کے برتوں کے صدقے سودیشی گدھے بھی پیدا ہو گئے ہیں..... تو خیر یہ تحریک چونکہ ایک مہاتما کی طرف سے ہوئی ہے اور شریمتی ہائی کمانڈ کی آرڈر بائی ہو چکی ہے۔ اس لئے ہمارے ہندو دوست دھوتیاں کس کس کر اسے کامیاب بنانے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔" یہ بھی کوئی ظرافت ہوئی۔

---

۱ نمستے علیکم۔ صفحہ ۵۵۔۶۰

www.taemeernews.com

۴۔ ایم۔ اسلم دل آزار تنقیدوں کو مزاح نگاری سمجھتے ہیں۔ طنز کرنے کا یہ انداز بے حد ناقص اور ناپسندیدہ ہے۔ ایسی تنقیدیں جس پر کی جائیں اس کی دلشکنی کا باعث تو خیر ہیں ہی۔ لیکن خود پڑھنے والے بھی اس قسم کی عبارت کو پسند نہیں کر سکتے۔ ان کے مذاق میں عامیانہ پن جھلکتا ہے۔ جو ان کی بدمذاقی کی ایک اچھی دلیل ہے۔ وہ غیر ذمہ دارانہ خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

ایم۔ اسلم کی یہ کتاب اردو ادب پر ایک بار گراں ہے۔ مزاحیہ نگاری کے فن کو تو انہوں نے اپنی بے راہ روی سے بچائے فائدہ کے نقصان پہنچایا ہے۔

ان خیالات سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر ہم ان کے دوسرے مضامین کی ظرافت سے بحث کی جائے تب بھی مزاح نگار کی حیثیت سے ان کا مذاق دل آزاری کا باعث ہے۔

امتیاز علی تاج: امتیاز علی تاج بیسویں صدی کے ادیبوں میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا میدان تمثیل نگاری اور افسانہ نگاری ہے لیکن مزاحیہ نگاری میں بھی ان کے جوہر صاف نظر آتے ہیں۔ ان کی مزاحیہ کتاب "چچا چھکن" ہندوستان کے پڑھے لکھے لوگوں میں مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ چچا چھکن کا خاکہ درحقیقت کے جیروم K. Jerome کی ایک تصنیف سے لیا گیا ہے لیکن امتیاز علی نے اس میں مقامی رنگ پیدا کر کے اس کو اپنا بنا لیا ہے۔ "چچا چھکن" میں کوئی دس مضامین ہیں۔ جن میں چچا موصوف ہی کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تاج کی ظرافت نگاری کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:۔

۱۔ کردار نگاری۔ یہ کہنے میں ہمیں تامل نہیں کہ اردو ادب میں ظریفانہ انداز میں کردار نگاری کی بنیاد امتیاز علی تاج ہی نے ڈالی۔ چچا چھکن کی تمام تر خصوصیات و حرکات کو تاج نے نہایت عمدہ پیرایہ میں بے نقاب کیا ہے اور ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم خود چچا موصوف سے مل چکے ہیں۔

۲۔ جزئیات:۔ ان کا قلم جزئیات پر پوری طرح حاوی ہے چچا چھکن کا کردار اپنی خصوصیات کے لحاظ سے مکمل حیثیت رکھتا ہے ایسی وضع قطع اور رنگ ڈھنگ کے آدمی میں جتنی بھی خصوصیات ہونی چاہئیں امتیاز علی تاج نے ان سب کو بڑے پُر لطف انداز میں ظاہر کیا ہے۔

۳۔ لکھنے والے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ پڑھنے والا اسے غیر نہ سمجھے (INTIMACY) کا یہی رنگ ان میں موجود ہے۔

۴۔ زبان و اسلوب۔ امتیاز علی تاج کی زبان اور طرز تحریر کسی اعتراض کی گرفت سے باہر ہے۔ وہ صاف اور رواں زبان لکھتے ہیں۔ تشبیہات اور استعارات اور ادق الفاظ کا مطلق استعمال نہیں کرتے۔ مکالموں میں بے ساختگی ہے۔ ان کا انداز تحریر نہایت شگفتہ اور دلکش ہے۔

۵۔ ظرافت۔ سنجیدہ ظرافت جو قہقہہ بردوش نہیں بلکہ تبسم زیر لبی کا پیام ہے امتیاز علی تاج کے مضامین کی نمایاں خصوصیت ہے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے پاس واقعات اور انداز بیاں دونوں مزاح کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کے مزاح کا اثر ہونٹوں پر نہیں دل پر ہوتا ہے۔ ان کے مضامین پر ظرافت کی ہلکی سی [illegible] چھائی رہتی ہے جو پڑھنے والے کی طبیعت میں

www.taemeernews.com

شگفتگی اور انبساط پیدا کر دیتی ہے۔ نہ تو وہ زبان سے کہتے ہیں اور نہ سامع کی آمیزش سے ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ بلکہ ان کی فطری خوش مزاجی ان کی شگفتہ ظرافت کو تخلیق کرتی ہے۔

"چچا چمن کہاں [illegible] اپنے ذمہ لیا ہے میں گھر جا کر دیکھتی ہوں اپنے پاس دیتے ہیں اپنے لونڈے۔ جاؤ لونڈے۔ یہ کھجور وہ دیجیو۔ گو بازار ایک [illegible] ہے۔"

چچا [illegible] تصویر مانگنے پر وہ کہہ [illegible] شیرواٹا اتار چچا تصویر مانگنے کے درپے ہو گئے۔ امامی سے کہا تصویر سے دونے پیسے لے کر میں لے آ۔ ادھر وہ دروازے سے نکل کر چلا ادھر موذے سے کہا موذے موذے جانا امامی کے پیچھے کہیو تین تین اچکی ہوں۔ بھاگ کر جا جلیبوا سے راستے ہی میں لیجیو تصویر مانگنے کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور اب آنی گھر کی شامت۔

ننھے کو پکارا او جانا ذرا میرا ہتھوڑا لے آنا۔ بنو جاؤ اپنے بستے میں سے چھنی نکال لاؤ اور سیڑھی کی ضرورت بھی تو ہوگی ہم کو۔ ارے بھئی طوفان تم جا کر کسی سے کہہ دیتے سیڑھی یہاں لا کر لگا دے۔ چھٹن بیٹے چائے پی تم نے ذرا جانا تو اپنے ان ہمسائے میر باقر علی کے گھر سے۔[1]

چچا کی [illegible] اور [illegible] کی تاج صاحب کے ہر مضمون میں نئے نئے طریقوں سے کی پایا ہے۔ اور چچا کی یہ مخصوص عادت ہر جگہ نیا لطف دیتی ہے۔ [illegible] دیکھتے جا رہے ہیں تو ان کے ایک ہی جملے نے [illegible] خطرہ کی گھنٹی بجا دی۔ آواز آئی اور [illegible] کھڑے ہوئے کہ ہوئیں سفر کی تیاریاں شروع۔ ملازم کام پر روانہ ہوئے تو گھر والوں کی باری آئی [illegible] چپ کر بیٹھ رہے تم سب لوگ۔ کام نظر آیا بس ہوئی روح فنا۔ یوں نہیں کہ مل مار کر [illegible] قصہ۔ ارے بھئی تم [illegible] اور تم میرا بستر اتار لاؤ۔ للو جو بیٹی جاؤ تم غسل خانے میں سے ہماری صابن دانی سنجن کی ڈبیا اور تولیا لے آؤ چھٹن اے چھٹن [illegible] اماں کے کرے میں۔ وہاں سے ہمارا آئینہ کنگھا اور بیل کا شیشی اٹھا [illegible] ہم کہاں [illegible] وہ دے بھئی کہا جو ہے کہ شیرے رہو تو [illegible] دیر [illegible] جانتے ہو شام کی گاڑی سے نوچندی میں [illegible] ہوں۔ کام [illegible] کثرت ہے اور سڑک [illegible]

[illegible] لکھنے کی اور ظرافت کی [illegible] ان کے تمام مضامین میں موجود ہے۔ مثلاً چچا جان نے ایک [illegible] سنی، بھگڑا چکایا اور [illegible] دلچسپ اور مزیدار ہیں کہ کتاب ہاتھ سے نہیں چھوٹتی۔ واقعہ یہ ہے کہ امتیاز علی تاج مزاحیہ کردار نگاری میں اپنا [illegible] نہیں رکھتے۔ ان سے پہلے اردو میں کردار نگاری کی طرف کوئی خاص توجہ کی ہی نہیں گئی۔ سرشار کے خوش گپیر کردار میں تو ناد پایا جاتا ہے۔ سرشار بھی بقول کا ایک کیرکٹر ایسا ہے۔ جسے مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ تاج صاحب [illegible] کے جیروم سے سیکھا ہے لیکن ماننا پڑتا ہے کہ اردو میں مزاحیہ کردار نگاری کے فن کو سب سے پہلے تاج صاحب نے مستقل حیثیت دی۔ ان کے مضامین کی اشاعت کے بعد دوسرے ادیبوں نے اسی رنگ میں لکھنا شروع کیا۔ بالخصوص ابو تیم فرید آبادی تاج کے مقلد کی حیثیت سے کافی مشہور ہیں۔

اس جگہ میں تاج کا [illegible] اگرچہ کہ مختصر ہے لیکن انہوں نے جو کچھ بھی اردو کے مزاحیہ ادب میں کیا ہے یقیناً

---

[1] چچا نے [illegible] کہ چچا نوچندی دیکھنے چلے۔

www.taemeernews.com

قابلِ قدر ہے۔

راؤ شفیق الرحمٰن راؤ شفیق الرحمٰن موجودہ دور کے افسانہ لکھنے والوں میں اپنی کثرت نگاری کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

شفیق الرحمٰن کے افسانوں کے پلاٹ خود ان کے تخیل کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ان کی مزاح نگاری میں واقعات کا دخل ہوتا ہے لیکن یہ واقعات بالعموم غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔

ان کی زبان اور اسلوب بھی معیاری نہیں ہے۔ طرزِ ادا میں خشکی اور آورد کا صاف پتہ چلتا ہے۔ تکرارِ خیالات کا نقص بھی ان میں موجود ہے۔ وہ بے سروپا باتیں بھی لکھ کر مزاح پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً "ہاتھی کا شکار بہت مشکل ہے۔ کیوں کہ ہاتھی اسپورٹسمین بالکل نہیں ہوتا۔ ہاتھی ایک کینہ پرور کینہ توز جانور ہوتا ہے۔ اگر کوئی ہاتھی سن رہا ہو تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن یہ بات سچ ہے اگر ہاتھی ایسا نہ ہوتا تو شکاریوں سے اتنی سی بات پر لڑنا جھگڑنا کیوں۔ دیکھئے شکاری فقط اسے مارنا ہی چاہتے ہیں نا اور تو کچھ کرنا نہیں چاہتے اور اتنی سی بات کے لئے بغض رکھنا بدلے لینا یہ کرنا وہ کرنا یہ سب باتیں ہاتھی کو انسانیت سے گرا دیتی ہیں۔"

ایک جگہ اور لکھتے ہیں "نئی دہلی۔ آج ریلوے کے بڑے بڑے افسروں کی ایک کانفرنس ہوئی۔ جس میں یہ طے ہوا کہ چوں کہ ریل کے آخری ڈبے میں جھٹکے بہت لگتے ہیں اس لئے آئندہ ریل میں آخری ڈبہ نہ لگایا جائے۔"

ان کی تحریروں میں اعلیٰ قسم کی ظرافت مشکل سے پائی جاتی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "اب میری باری تھی میں نے ایک ماہر گدھا نوچی کی طرح منہ بناتے ہوئے کہا۔ "خیر اور چیزوں کو تو دفع کیجئے۔ میں تو اس کی لوچ دار آواز پر بری طرح فدا ہوں۔ کیا رعب ہے! توہ کیا دبدبہ ہے۔ بلی کی طرح میاؤں میاؤں یا گھوڑے کی طرح ہیں ہیں نہیں کرتا۔ کس شان سے ایک مرتبہ عظیم الشان ڈھینچو کر کے دشمنوں کے حوصلے پست کر دیتا ہے لوگوں کے دل دہل جاتے ہیں۔ میں نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ پہلے زمانہ میں لوگ لڑتے وقت اگلی صف میں گدھوں کی ایک قطار رکھتے تھے جنہیں "ڈھینچو" کرایا جاتا تھا اور اس طرح سپاہیوں کے دل بڑھتے تھے۔"[1]

البتہ ہماری فلمیں شفیق الرحمٰن صاحب کا ایک اچھا مضمون ہے۔ جس میں انہوں نے ہندوستانی فلموں پر عمدہ پیرایہ میں تنقید کی ہے۔ لیکن زبان زیادہ سٹھاس ہی نہیں جو مزاح نگاری کے لئے ضروری ہے۔ طنز نگاری کا یہ انداز ایک پامال انداز ہے ان کا یہ مضمون نرحت اللہ بیگ، کی اس تنقید سے متاثر معلوم ہوتا ہے جو موصوف نے لیلیٰ مجنوں فلم پر کی ہے۔ بہرحال مضمون دلچسپ ضرور ہے۔

شفیق الرحمٰن صاحب نے "قصہ چہار درویش" کو مزاحیہ رنگ میں پیش کیا ہے۔ اور بالکل اسی اسلوب پر لکھا ہے۔ تضاد سے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔

ذرا کان دھر کے سنو۔ راوی بیان کرتا ہے۔ دو کلیدِ داستان۔ سنا ہے ملک ہندوستان میں ایک تھانیدار رہتا تھا۔ جو اپنے تئیں بادشاہ تھا۔ ہمارا تمہارا حضور بادشاہ ہے۔ اس کے انصاف کا ڈنکا دور دور تک ایسے دانگے میں بج رہا تھا

---

[1] لہریں۔ زیادتی۔ صفحہ ۱۱۵۔ سے "گدھا" منقول از نیرنگِ خیال۔

www.taemeernews.com

جس کا نصف نظر پھیپھڑے میں تھا۔ اس نے عدل میں نوشیرواں کو کئی بار مات کیا تھا۔ وہ کسی کا غلام نہیں مانتا تھا لیکن رعایا اور عملہ اس کا حکم مانتے تھے۔ ایسا امن ملک کے کسی اور حصہ میں نہیں تھا۔ رعایا سکھ اور چین کی بنسی بجاتی تھی۔ ہر روز چوریاں ہوتی تھیں ڈاکے پڑتے تھے لوگ ایک دوسرے کو مذاق مذاق میں جان سے مار ڈالتے تھے۔ اور کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔"

قصہ کی اٹھان اچھی خاصی تھی۔ لیکن درمیان میں پہنچ کر شفیق صاحب کی شاعری نے سارے مضمون پر پانی پھیر دیا ہے۔

کنہیالال کپور : اردو نثر میں جہاں تک پیروڈی (PARODY) لکھنے کا تعلق ہے کنہیالال اولیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ مزاح اور طنز نگاری کا موثر ترین ذریعہ پیروڈی نگاری ہو سکتا ہے۔ پیروڈی کو کسی دوسرے کے مضمون یا قلم کی نقل، ادبی تصویر کہنا مناسب ہوگا۔ کسی دوسرے کے انداز تحریر کا خاکہ اڑانے کا یہ آسان ذریعہ ہے گو اس کا لکھنا مشکل ہے لیکن کنہیالال کپور نے اس طرز میں اپنے مزاحیہ انداز کو برقرار رکھا ہے کتابوں کے انتسابات میں جو جدتیں برتی جا رہی ہیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی طرف سے انتساب کے چند نمونے پیش کئے ہیں۔ جو درج ذیل ہیں :-

۱۔ انتساب :۔ بھلا بوجھئے کس کے نام

نوٹ :۔ صحیح نام بتانے والے کو اس کتاب کی ایک جلد بلا قیمت پیش کی جائے گی۔

۲۔ انتساب :۔ (یہ نہیں بتاؤں گا کس کے نام)

اور نیچے باریک قلم میں۔ اگر قبول افتد زہے عز و شرف۔

۳۔ انتساب۔

بعض ادیب انتساب تجویز کرتے وقت یہ وقت محسوس کرتے ہیں کہ اپنے متعدد احباب میں سے کس کے نام انتساب کیا جائے۔ میرے خیال میں اس سوال کا حل یہ ہوگا کہ کتاب کے صفحات کو اپنے دوستوں کی تعداد پر تقسیم کر لیا جائے اور جو حصہ آئے اتنے صفحے ایک دوست کے نام منسوب کئے جائیں۔ مثلاً ایک سے ۲۵ صفحہ تک افضل کے نام۔ ۲۵ سے ۵۰ تک اختر کے نام اور باقی الفونسے کے نام۔"

دو مختلف طبقۂ خیال کے ایڈیٹروں میں جس قسم کی خط و کتابت بالعموم ہوتی ہے۔ اس کا نمونہ بھی کپور صاحب نے پیش کیا ہے۔ اکبر علی اور ہیرالال ہندوستان کے قومی لباس کے تعین کی فکر میں ہیں ان کے خطوط ان کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

"کرشن نواس"۔ بنارس

مائی ڈیر اکبر علی

تسلیم۔ خط ملا۔ آپ کی ارسال کردہ فہرست قدرے نامکمل معلوم ہوتی ہے۔ آپ نے ہندوؤں کے لباس کا ذکر تک نہیں کیا۔ اور اس طرح تیس کروڑ ہندوؤں کے جذبات کو ٹھیس لگائی ہے۔ گو یہ صحیح ہے

۱؎ سنگ و خشت۔ صفحہ ۴۷، ۴۸۔

www.taemeernews.com

کر کسی حد تک ، بہت سے ہندو بھی تقریباً اسی قسم کا لباس پہنتے ہیں جس قسم کا آپ کے خاندان کے افراد۔
مگر ہم نے ہندوستان کی تمام ریاستوں کی تمام نمائشوں میں "دھوتی" کا ذکر ضرور آنا چاہیئے کہ ہندوؤں کا مقبول اور مرغوب لباس ہے"
"جدید شاعری" پر کنہیالال نے نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایے میں تنقید کی ہے۔ ان کا مضمون "غالب جدید شعرا کی محفل میں" یقیناً اس قابل ہے کہ اس پر سنجیدگی اور متانت سے غور کیا جائے۔ یہ مکالمہ کی صورت میں ہے۔ اس کا اسٹیج کیا جانا بھی بلا کسی دقت کے ممکن ہے۔ صرف بخوف طوالت اس کو پوری طرح نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا اس لئے تھوڑا سا حصہ بطور نمونہ پیش کیا جاتا ہے:-

راجہ مہدی علی خاں . . . . . ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون "ڈاک خانہ" ہے جو میری اس نظم کا جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا موضوع ہے۔

غالب ۔۔ ڈاک خانہ!؟

راجہ مہدی علی خاں۔ مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے سنئے عرض کیا ہے۔

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اُف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اُف آدمی
ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط ! پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اُس کی سائیکل
ہے پڑی یا ہیرو یہاں رکھ کر گیا ہے
ڈاک خانے میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
بار ہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو مصر کو لندن کو کوہ قاف کو
دیکھنا آتی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
یہ تو ڑ کا ہے۔ کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خدوخال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اُف ہماری لغزشیں

www.taemeernews.com

زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا۔ بھئی کمال کر دیا کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالب کی سراہیلی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی ہے۔"

کنہیالال بعموم حقائق واقعات پر اظہار خیال کرتے ہیں۔ اور ان کا طرز نگارش چونکہ مزاحیہ ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے خیال کو خوشگوار اور موثر بنا سکتے ہیں طنز کی چوٹ اسی وقت پُر لطف ہوتی ہے جب کہ اس میں ظرافت کی چاشنی ہو۔ الفاظ میں شگفتگی ہو۔ کنہیالال کا ظرافت آمیز طنز اس کی عمدہ مثال ہے۔ ترقی پسند افسانوں کے متعلق وہ لکھتے ہیں:۔

"سب سے پہلے ترقی پسند افسانے ہیں۔ یہ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی وہ قسم ہے جس میں ایک مزدور پر حد سے زیادہ ظلم ڈھایا جاتا ہے۔ اور آخر میں اسے مار کر پڑھنے والے کے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا کی جاتی ہے عموماً یہ مزدور تار کے کھمبوں پہاڑوں کی چوٹیوں سے گر کر مرتے ہیں۔ کئی دفعہ سڑکوں پر پتھر کوٹتے ان کا دمہ یا تپ دق کا شدت سے دورہ پڑتا ہے۔ اور اتنے تھوک میں لال رنگ کی ایک گہری لکیر دیکھی جاتی ہے۔ بعض دفعہ ان کو اس قدر بید یا چابک لگائے جاتے ہیں کہ وہ کھڑے کھڑے مر جاتے ہیں۔ یہ ترقی پسند افسانہ نویسی کی سب سے پہلی منزل ہے یا یوں سمجھئے کہ اس قسم کے افسانے صرف پچیس فیصد ترقی پسند ہیں۔

اس سے زیادہ ترقی پسند افسانے ہیں جن میں مزدور سرمایہ دار کی بیوی سے عشق کرتا ہے۔ عموماً یہ مزدور ایسے بوڑھے سرمایہ دار کے گھر ملازم ہوتا ہے جس نے بڑھاپے میں دوسری یا تیسری شادی کرنے کی غلطی کی ہے۔ چند دن کے راز و نیاز کے بعد یہ مزدور اپنے مالک کی بیوی کو ساتھ لے کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ یا موقع پا کر بوڑھے سرمایہ دار کو زہر وغیرہ کھلا کر اپنا راستہ صاف کرتا ہے۔ سو فیصدی ترقی پسند افسانے وہ ہیں جن میں بھائی بہن سے یا بیٹا ماں سے عشق کرتا ہے۔ عموماً یہ بہن بھائی نہایت تعلیم یافتہ ہوتے ہیں انہوں نے ڈاکٹر فرائیڈ کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا ہے۔ اور ان کی نظر میں بہن بہن نہیں بلکہ ایک عورت ہوتی ہے۔"[1]

۳۔ طنز کا دوسرا انداز ــــ کنہیالال کپور اپنی تحریر میں مبالغہ سے بھی کام لیتے ہیں۔ لیکن یہ مبالغہ ناگوار نہیں گزرتا بلکہ ان کی شوخی طبع کو نمایاں کرتا ہے۔ مثلاً

تین ماہ کا عرصہ ہوا حماقت کے کسی لمحے میں میں نے بھی ایک ریڈیو خرید لیا اب یہ حالت ہے کہ ریڈیو سننا تو کجا اس کا سٹیشن دیکھنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی۔ ان تین ماہ کے عرصہ میں مجھے ریڈیو کے پروگرام سے اپنی طرز واقفیت حاصل ہوگئی ہے مثلاً پہلے جب میں ریڈیو میں سے پے در پے دھماکوں کی آوازیں سنتا تھا تو سمجھتا تھا کہ شاید کہیں ہوائی حملہ ہو رہا ہے۔ اب مجھے پتہ ہے کہ اگر ایسی آوازیں سنائی دیں تو اس کا مطلب ہے کہ لاہور ریڈیو اسٹیشن پر قوال گائی جا رہی ہے۔ اس طرح اگر عالم نزع میں ایڑیاں رگڑنے اور گڑگڑانے کی سی آوازیں سنائی دیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ کوئی بزرگ دم توڑ رہے ہیں بلکہ یہ کہ دہلی ریڈیو اسٹیشن سے پکا گانا نشر کیا جا رہا ہے۔

---

[1] سنگ و خشت، صفحات ۹۰ و ۹۱

www.taemeernews.com

اگر بار بار کھڑکی کے کھلنے اور بند ہونے اور بادل کی مصنوعی گرج کی آواز سنائی دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن ڈراما براڈ کاسٹ کر رہا ہے۔

ساتھ ہی اب میں گانے والوں اور گانے والیوں میں اچھی طرح تمیز کر سکتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ گانے والے عموماً تیسرے شعر یا دوسرے بند پر سُر اور تال سے چوکتے ہیں اور گانے والیاں عموماً شروع سے لیکر آخر تک بغیر سُر اور تال کے گا سکتی ہیں"۔ لے

کنہیا لال نے اپنے مشاہدہ اور قوت احساس سے زندگی کے عام رجحانات پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ شاعر اور ادیب کس طرح مقبولیت حاصل کرتے ہیں اور عوام کے دلوں میں کیوں کر جگہ پاتے ہیں، کنہیا لال کی زبان سے سنئے:۔

" علامہ ظہور کی وفات کے دو گھنٹے کے بعد ہی لوگوں نے ان کی زندگی اور ان کی شاعری اور ان کے تخلیقی پہلو پر مضامین لکھنے شروع کر دیئے۔ معلوم یہ ہوتا تھا کہ ملک کا ہر چھوٹا موٹا اخبار نویس اور شاعر اگر علامہ کا ہم نوالہ نہیں تو پیالہ ضرور تھا۔ اخبارات و رسائل نے ظہور نمبر نکالنے، ادبی مجلسوں نے ظہور میموریل قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان نوجوان ملت نے ظہور کیڈی ٹورنامنٹ، ظہور مائنڈری اور ظہور فنڈ (اس وقت بھی تمام ہونے کی حد تک بلغ کی) مقرران آتش نوا نے علامہ کے کلام پر تقریریں کر کے خراج تحسین حاصل کیا۔

الغرض علامہ کی موت ایک شخص کے لئے رحمت بار ثابت ہوئی۔ جو شخص بھی علامہ ظہور پر مضمون لکھتا ہفتوں اس کی مجلس میں اس طرح استقبال کیا جاتا۔ "یہ صاحب علامہ کے گنتی کے چند دوستوں میں سے ایک ہیں"۔ شہرت حاصل کرنے کا اس سے نادر موقع شاید ہی کسی کو ملا ہو۔ لے

۵۔ کنہیا لال کپور کی مزاح نگاری کی عمر زیادہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اندر ظرافت کی تمام خوبیاں رکھتی ہے۔ وہ ایک خوش گو طنز نگار ہیں۔ شستہ مزاح اور لطیف ظرافت ان کی مزاحیہ نثر کی نمایاں خوبیاں ہیں۔ ان کے طنز میں ناقدانہ [illegible] کرنے کی [illegible] وہ رشید احمد صدیقی سے کم نہیں لیکن طنز کرتے وقت وہ بہت زیادہ رائے گو ہوتے ہیں۔ کسی بات یا شخص پر یہ مارن کرتے وقت وہ خندہ جبینی نہیں برتتے۔ بلکہ جو کچھ ان کو کہنا ہوتا ہے بلا تکلف کہہ دیتے ہیں۔ ان کی زبان خامیوں سے پاک ہے بحیثیت سے کنہیا لال کپور کی مزاح نگاری پسندیدہ اور شائستہ ہے۔ [illegible]

(۱۹۴۴)

جناب یوسف ناظم
کے
مضامین کا مجموعہ
البتہ
بتوسط "شگوفہ"
قیمت دس روپے

لے رنگ و خوشبو صفحہ ۲

www.taemeernews.com

اڑیا۔ شیام سندر مشرا

ترجمہ : اسمٰعیل آذر

اڑیا نثر میں طنز و مزاح کا ارتقاء

(۱۹۲۰ء کے بعد)

(شیام سندر مشرا۔ تاریخ پیدائش ۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۲ء بمقام کٹک۔ والد کا نام۔ پدمناجھ مشرا۔ والدہ کا نام ۔ مانکیہ دیوی۔ ۱۹۵۵ء میں اتکل یونیورسٹی سے اڑیا میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔ لکھنے لکھانے کا شوق سولہ سال کی عمر سے پیدا ہوا۔ شاعر رادھا ناتھ پر آپ کی پہلی تنقیدی تصنیف "رادھا ناتھ درشن" پہلی بار ۱۹۵۹ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی۔ ایک ناول "چکوری" ۱۹۶۱ء میں چھپا۔ یا کی طنزیہ مجموعہ ایک دوسرا ناول ۱۹۶۶ء میں "جوگ جنما" کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۷۶ء میں "کتھا سریت ساگر" (سنسکرت کا ترجمہ) اور ۱۹۷۸ء میں "دیباگرد" (انگریزی کا ترجمہ) اشاعت پذیر ہو کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ ان کے مختلف افسانے، مضامین، شعری اور تنقیدی کارنامے اڑیا کے مختلف جرائد میں اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں۔ ان دنوں رونشا کالج، کٹک میں شعبۂ اڑیا سے وابستہ ہیں۔ اڑیا کے مشہور مزاحیہ رسالہ "ڈگرو" میں پابندی سے لکھتے ہیں)۔

سنسکرت ادب کی طرح قدیم اڑیا میں بھی علم بدیع کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے مزاح کو ادب کے نو رسوں (لطیف جذبات) میں سے ایک قرار دیا جاتا تھا۔ لیکن عہد قدیم اور عہد وسطیٰ کی شاعری میں جذبۂ عشق و محبت، جذبۂ سوز و گداز، جذبۂ امن و سکون کو جو مقام ملا، وہ جذبۂ مزاح کو نہ مل سکا۔ دیوتوں دیوتاؤں یا طبقۂ امراء کو مخصوص کر کے جو کچھ بھی لکھا جاتا تھا اس میں ظاہر ہے سنجیدگی کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ تاہم ہمیں اس عہد کی تحریروں میں مزاح کی شمائیں کہیں کہیں دیکھنے کو ضرور مل جاتی ہیں۔ چودھویں صدی کے شاعر بلرام داس کی نظم "کلسا چوتیسا" میں شیو جی کی شادی کیلئے ان کی آمد کی کریہہ المنظری، سرلا داس کی مہابھارت میں بھیم کی سیرت نگاری اور دیگر پرانوں مثلاً "مدھوسنگل" اور

www.taemeernews.com

"بیدوس کر" میں شخصی خصوصیات کا تذکرہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ مزاح کی تخلیق جدوجہد اپنے اپنے دور میں ہوتی رہی ہے۔ روایتی شاعری میں مزاح کی نوعیت عام طور پر عشق و محبت سے متعلق ہوا کرتی تھی۔ یعنی یہ عاشق و معشوق کی نقرے بازی، کم سن دوشیزاؤں اور عمر رسیدہ عورتوں کے درمیان ٹھٹول تک محدود تھی۔

اٹھارویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کے اوائل کے کئی ادیبوں کی نثری تحریروں میں مزاح کی شعوری کوشش پائی جاتی ہے۔ ان ادیبوں میں برج ناتھ بڑجینا اور بل دیو رتھ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ نثری ادب میں مزاح کی وہ تخلیقی کاوشیں اپنی مثال آپ تھیں۔ برج ناتھ کی "چتور ونود" اور بل دیو کی "ہاسیہ کلوڈ" میں ماہر صرف و نحو کے لسانی انداز کا اتباع کرتے ہوئے لسانی پیچ و خم، بدہیتی اور خلاف فطرت ماحول کی عکاسی کے ساتھ مزاح کی تخلیق کی گئی ہے۔ گربہ دہن، معشوقہ کی توند، مردنگ جیسی کمر اور عاشق کا اپنی معشوقہ سے کہنا ؎

دوڑی رے گنتھی دِیا کوڑی رو ماڑا
بڑو بڑو گرڈو کنٹھے دیی ہاڑا

(میں تیرے لئے کوڑی کی مالا رستی میں پرو کر لاؤں گا۔ بڑے بڑے گرڈو کا ایک ہار تیرے گلے میں پہناؤں گا) ایسی ہی خلاف فطرت مثالیں ہیں جو نثری تحریروں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح عشق و محبت میں سفاک اور بھونڈا مذاق بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مثلاً "چتور ونود" میں معشوقہ عاشق کی زبان سے اپنی تعریف سن کر اتنی خوش ہو جاتی ہے کہ اپنے پستان کی بھٹنی کاٹ کر سپاری کے طور پر اسے پیش کرتی ہے۔ اس پر عاشق زخمی پستان کو دیکھ کر رکیک ریمارک کرتا ہے!

انیسویں صدی کے اواخر سے اڑیا ادب کا جدید دور شروع ہوتا ہے۔ اسی عہد میں مزاحیہ ادب کو ایک نیا موڑ ملا۔ رادھا ناتھ رائے، گوبند رتھ اور دیگر مزاح نگار اس عہد کے موجد تھے۔ جنھوں نے معاشرے کی کج روی کو طنز کا نشانہ بنایا۔ ان نثر نگاروں میں ایک فقیر موہن سیناپتی بھی تھے جنھیں اس وقت کا سب سے بڑا مزاح نگار تصور کیا جاتا تھا۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کی مزاحیہ تکنیک آنے والے عہد کے لئے مشعل راہ ثابت ہوئی جس سے آج بھی اڑیا ادیب استفادہ حاصل کر رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں سادہ واقعاتی مزاح پایا جاتا ہے اور ساتھ ہی سماجی طنز بھی۔ ان کی تحریروں کا مقصد محض سماجی برائی، اندھی تقلید اور خود غرضی کا قلع قمع کرنا تھا جو اپنے وقت کے مذہبی، معاشرتی اور شخصی سطحوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ ناولوں میں "چھوان آٹھو گنٹھو" اور "ماموں پرانسچیت" مضامین میں "پنٹ میڈلین"، "انڈی پوڈ اننا"، "سبیہ زمیندار" "بیرئی بسالو" وغیرہ ان کی تصانیف ہیں جن میں خالص مزاح پایا جاتا ہے۔ ان کی خود نوشت سوانح عمری بہت سارے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اس میں انہوں نے مزاح کے جوہر کو خوب نکھارا ہے۔

فقیر موہن کے بعد جن ادیبوں نے ان کے اسلوب فن سے استفادہ حاصل کیا ان میں گوپال چندر پرہراج

[illegible] لکھا۔

www.taemeernews.com

اور گوبند چندر تریپاٹھی قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک بڑی مستعدی سے لکھا۔ گوپال چندر پرہراج کی دو تصانیف "بھگوت ٹنگی رے سندھیا" (بھگوت ٹنگی کی ایک شام) اور "نانکو بستانی" (بڑے بھائی فائیل) خالص مزاح کے مجموعے ہیں۔ ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں ایک اور خوبصورت مجموعہ "آموگھرو رو حال چال" بھی ہے جس میں انہوں نے معاشرے پر طنز کے نشتر لگائے ہیں۔ اسی طرح "گھرڈیں" (گھر عورت) ایک ایسا ہی مجموعہ مضامین ہے۔ اس مجموعے میں مختلف درجات کی عورتوں کی سیرت اور طور طریقوں کے تذکرے سے شگفتہ مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ پرہراج کی تحریر مختلف ادوار میں تنقیدی اور تحلیلی رنگ اختیار کرتی رہی ہے۔

ہر چند کہ گوبند چندر تریپاٹھی کی طرز تحریر پرہراج کی تحریر سے ملتی جلتی ہے لیکن تریپاٹھی کی نگارشات میں معاشرے نے زیادہ حب الوطنی کی جھلک ملتی ہے۔ اڑیا قومیت کے حامیوں میں ارباب علم کا ایک ستیہ وادی گروپ تھا۔ تریپاٹھی خود ستیہ وادی ودیالیہ کے طالب علم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "بٹوہ"، "کو کھار دھولو" (کدو کا پھول) جیسے ان کے کئی مضامین ہیں جن میں ان اڑیا لوگوں پر تیکھا طنز کیا ہے جو اڑیسہ کی تہذیب سے تغافل برتتے ہوئے دوسروں کی تہذیب کے اندھے مقلد بن جاتے ہیں۔ انھیں وجوہ کی بناء پر مزاح کی چاشنی کے باوجود ان کی تصنیفات پر کبھی کبھی سنجیدگی کا گہرا غبار چھا جاتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں اڑیسہ کو جب ایک علیحدہ ریاست قرار دیا گیا تو اس کا اثر نمایاں طور پر ادب پر بھی پڑا۔ اسی عہد سے اڑیا کے ادیبوں کا رجحان معاشرتی مسائل کے علاوہ سیاسی مسائل کی طرف بھی مائل ہونے لگا۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ اس دور میں سیاسی طرز فکر کے حامل دو رسائل منظر عام پر آئے۔ ان میں سے ایک رسالہ "ڈگر" ہے جو پہلی بار بھدرک سے لکشمی کانت مہاپاترا کی ادارت میں شائع ہوا۔ دوسرا رسالہ "بنیا گھنٹا" ہے جو کٹک سے ۱۹۳۰ء میں گودا درش مہاپاترا کی زیر نگرانی وجود میں آیا۔ یہ دو رسائل اور ان کے مؤسس اڑیا مزاحیہ ادب کے جدید عہد کے بانی تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان مزاح نگاروں نے اپنے زمانے کے سیاسی حالات پر طنز کے تیر و نشتر خوب چلائے ہیں۔ "اسہو جوگی روا تم کتھا" لکشمی کانت مہاپاترا کی ایک ایسی کتاب ہے جو کئی ایسے لیڈروں کی قلعی کھولتی ہے جنھوں نے تحریک عدم اعتماد میں حصہ لیا تھا۔ اڑیسہ میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی کتاب تھی۔ لکشمی کانت عوامی ڈراموں کے ایک اچھے فنکار تھے۔ اس میدان میں انہوں نے مزاحیہ لوک ڈرامے لکھنے میں بھی پہل کی اور اس جدوجہد میں خوب کامیاب رہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے کئی مزاحیہ مضامین بھی لکھے جو ڈگر اور کئی دیگر رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ بعد میں ان منتشر مضامین کو یکجا کر کے "دیہی پڑ دیلپو مودارم" کے نام سے شائع کیا گیا۔ ان مضامین میں ہلکے پھلکے مزاحیہ انداز میں معاشرتی موضوعات کی تصویریں ملتی ہیں۔ موصوف ۱۹۵۰ء میں دیہاتی زندگی پر مبنی ایک ناول "کوڑاں ماموں" (کانا ماموں) لکھ رہے تھے جس کی بنیاد صرف ایک فرضی کردار پر تھی۔ اگرچہ مصنف نے اس ناول میں کئی مقامات پر فقیر موہن سیناپتی کے اسلوب کا اتباع کیا ہے تاہم اس کی روانی مزاح کی ایک جدید روش کی طرف لے جاتی ہے۔ اس میں موصوف نے روزمرہ کی جیتی جاگتی مثالیں پیش کرتے ہوئے بتایا ہے کہ جنوبی اڑیسہ کی مابعد آزادی دیہاتی زندگی کو اگر قلم بند کرنا ہو تو مزاح کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔ بدقسمتی سے وہ ناول موصوف کی اچانک موت کی

www.taemeernews.com

وجہ سے نامکمل رہ گیا۔ مگر فن مزاح کے نقوش قرطاس ذہن میں محفوظ ہو گئے۔

اڑیسہ میں تحریف نگاری کا اعزاز سب سے پہلے فقیر موہن سینا پتی کو حاصل ہوا تھا۔ لیکن اس کا مکمل نشو و نما لکشمی کانت کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے ویشنوؤں کی کئی غنائی نظموں کی بڑے خوبصورت انداز میں پیروڈیاں تو خیر لکھی ہیں۔ لیکن ان میں کوئی سریہ پل دیورتھ کی "کشور چندر انند چمپو" کی پیروڈی نثری ادب کا ایک خوبصورت شاہکار ہے۔ جس میں انہوں نے مذکورہ چمپو کے چند سنسکرت بندوں کی نثری پیروڈی کرتے ہوئے کمال ظرافت کا مظاہرہ کیا ہے۔ نیا کھنٹا کے نئے گورو درش مہاپاترا کی تصنیفات اگرچہ سیاسی طنز کی حامل تھیں، لیکن انھوں نے مختلف موضوعات پر بھی قلم اٹھایا ہے اور اعلیٰ ظرافت کی مثالیں پیش کر کے شہرت حاصل کی ہے۔ ان معیاری مضامین میں "ہانڈی ساڑو رے بیڑ دلو" (باورچی خانے میں انقلاب)، "ہٹھات بھارجا لابھو" (حصول ناگہانی ایک بیگم کی) "مو دے منتری تھل" (میں کبھی وزیر تھا) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موصوف نے بچوں کے ادب میں بھی اپنی ظرافت بیانی کا کمال دکھایا۔ شری مہاپاترا بلاشبہ ایک غیر معمولی استعداد کے مالک تھے جن کی مزاحیہ اور سنجیدہ تصانیف قارئین کے دلوں کو چھو لیتی ہیں۔

عین آزادی سے قبل ایک دوسری نسل کا تابندہ ستارہ اڑیسہ کے مزاحیہ ادب کے آسمان پر نمودار ہوا۔ وہ ہے فتو رانند۔ حقیقی نام رام چندر مشرا۔ ۱۹۴۶ء میں آپ کی تحریف نگاری کا ایک گچھا بعنوان "کوی لڑھئی" (شاعروں کی جنگ) ڈگر" میں سلسلہ وار چھپنے لگا اور فوراً قارئین کی قدر افزا توجہ کا مرکز بن گیا۔ ۱۹۵۲ء میں آپ کا پہلا ناول "ناکٹ چتر کار" (نکما مصور) بڑے صبر آزما انتظار کے بعد قارئین کے ہاتھ آیا۔ اس ناول میں موصوف نے اگرچہ اپنی زندگی کے پُرخطر نشیب و فراز کی عکاسی کی ہے اور اس کا اختتام المیے پر ہوتا ہے، لیکن اس ناول کا پورا متن اور اس کے مختلف کردار بڑے دل خوش کن سیلاب میں بہتے نظر آتے ہیں اس ناول کا مقابلہ اگر فقیر موہن سینا پتی کے "چھمان آٹھ گنٹھو" اور لکشمی کانت کے "کوڑاں ماموں" سے کیا جائے تو یہ بلاشبہ سنجیدہ اور مزاحیہ ادب کا ایک غیر معمولی مرکب ثابت ہوگا۔

اپنی ادبی زندگی کی ابتداء میں فتو رانند چند سنجیدہ اور المیہ افسانے، مثلاً "کیشو" (جانور) "سوادھینتا" (آزادی) "مردیا" (نخلستان) لکھتے رہے۔ لیکن بعد میں غالباً انھیں خود احساس ہوا کہ ان کا تلم صنف مزاح کی خدمت بہ نسبت کسی اور صنف کے بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے خود کو مزاح اور صرف مزاح کے لئے مخصوص کر دیا۔ اور ان کا یہ فیصلہ بالکل درست ثابت ہوا۔

۱۹۶۰ء تک فتو رانند کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے "ساہتیہ چاسو" (ادبی کاشت) اور "ہیریشا" (ہنسانے والا آدمی) کے عنوان سے چھپ کر منظر عام پر آگئے "ہیریشا" میں سماجی موضوعات پر مبنی مزاحیہ مضامین کو تقویت ملی ہے جبکہ "ساہتیہ چاسو" میں شعراء، ادباء، اور تعلیمی اداروں کی سرگرمیوں پر طنز کے تیر و نشتر چلائے گئے ہیں۔ بعد ازاں ان کے دیگر مجموعے "بوئیدوسوکو"، "سنگھڈ باری ساہتیہ سمیلن"، "برد ہتو بھانڈو"، "امرت بے ہیا"، "تندا بیہلو" وغیرہ یکے بعد دیگرے شائع ہوتے گئے۔

www.taemeernews.com

فتورانند کی غیر معمولی لیاقت نے مزاحیہ اسلوب بیان کی بہت سی نئی راہیں نکالیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء سے ڈگرؔ کے شماروں میں آپ کے بے شمار سیاسی طنزیات و مضحکات، پیروڈیاں، مزاحیہ نظمیں وغیرہ فرضی نام سے چھپتی آرہی ہیں۔ سیاسی طنزیات کے میدان میں ان کی سالہا سال کی جد وجہد ایک اور مجموعہ "ووٹ" نکالنے میں ثمر ور ثابت ہوئی، جس میں انہوں نے انتخابی اداروں، انتخابی طریقہ کار اور انتخابی جوڑ توڑ کی بڑے کڑوے کسیلے انداز میں تضحیک کی ہے۔ ساتھ ہی اپنی گہری بصیرت سے لیڈروں کی بے راہ روی کی نشاندہی بھی کردی ہے جو اپنی ناک کی سیدھ میں چل کر معاشرے کو خراب کرتے ہیں۔

فتورانند ایک طبی ڈاکٹر ہیں۔ ان کا میلان رجحان سائنسی مطالعے کی طرف ہوتے ہوئے بھی ان کے مزاح کا تخلیقی دائرہ بیحد وسیع اور پختہ ہے۔ اس کا ثبوت ہیں "میڈیکل کالج رے مہر جینتی" (میڈیکل کالج میں شاعر مہر کی برسی) "الو لیبو راکٹ" (راکٹ جو نہیں لوٹا)، "ابا نچھیتو آسیتھی" (غیر ضروری مہمان) جیسے مضامین سے ملتا ہے۔

فتورانند کی اب ایک دوسری تصنیفی کاوش "رمیہ رچنا" (انشائیہ) ان کی مزاح نگاری میں اضافہ کررہی ہے۔ یہ کوشش بے شک ان سے پہلے بھی کی جاچکی ہے۔ گوپال چندر پرہراج اور گوبند چندر تریاپٹھی اس باب میں طبع آزمائی کرچکے ہیں۔ تاہم فتورانند کے انشائیوں میں ایک طرح کا انوکھا پن ہے۔ کسی شاعر یا ادیب کی مشہور سطر یا بند کی تشریح فتورانند کی اپنی طبع زاد چیز ہوتی ہے۔ ان کے تشریحی مضامین کا مجموعہ بعنوان "پھالو چنا" بھی حال ہی میں چھپ کر قارئین کرام کے ہاتھوں میں آچکا ہے۔

فتورانند کی لیاقت صرف نظم و نثر تک ہی محدود نہیں، وہ ایک اچھے کارٹونسٹ بھی ہیں۔ موصوف تقریباً نابینا ہی بن چکے ہیں اور جسمانی طور پر بے حد کمزور عمر نشتر کے لگ بھگ ہے۔ اس کے باوجود ان کا قلم اڑیا قارئین کے لئے انتہائی باقاعدگی اور فراخ دلی سے ذہانت اور ظرافت دونوں کی دولت لٹا رہا ہے۔ انہوں نے مزاح کے تقریباً سارے پہلوؤں کو آزمایا ہے مگر اس پر بھی ہمیشہ نئے زاویوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی طنز و ظرافت کے موجودہ دور کو فتورانند سے منسوب کیا جاتا ہے۔

سنہ ۱۹۵۰ء کے بعد چند دیگر قلم کار بھی میدان ظرافت میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں۔ ان مزاح نگاروں میں دیو مہاپاترا، چودھری ہیم کانت مشرا اور مہاپاترا نیل منی ساہو کے نام قابل ذکر ہیں۔ موجودہ صدی کی پانچویں دہائی میں دیو مہاپاترا کا قیام بمبئی میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں سے آپ ایک مزاحیہ رسالہ "کُم کُم" اپنی ادارت میں نکالنے لگے۔ جس کی مقبولیت نے قارئین میں ایک ہیجان پیدا کردیا۔ حاضر جوابی، طنز اور خالص مزاح سے بھرپور یہ رسالہ تقریباً کا اچھا خاصا سواد فراہم کرتا تھا۔ فتورانند کو منظر عام پر لانے کا سہرا تو 'کُم کُم' ہی کے سر جاتا ہے۔ دیو مہاپاترا کے مضامین کا صرف ایک مجموعہ "رنگو تو" ہی رسو" شائع ہوا تھا۔ لیکن یہ واحد کتاب ہی مصنف کی حیرت ناک تخلیقی صلاحیت کا پتہ دیتی ہے۔ بدقسمتی سے چند نجی اور خانگی وجوہ کی بناء پر شری مہاپاترا نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ بہ الفاظ دیگر مزاحیہ ادب نے ایک ہونہار فنکار کو گنوا دیا۔

مہاپاترا نیل منی ساہو اور چودھری ہیم کانت مشرا کی ادبی خدمات جاری و ساری ہیں۔ چونکہ یہ دونوں حضرات تعلیم و تدریس سے وابستہ ہیں اس لئے مزاح کے تعقل پسندانہ پہلوؤں سے بہت اچھی طرح باخبر ہیں۔ نیل منی ساہو کے

www.taemeernews.com

مضامین کا پہلا مجموعہ "ماچھوا گھوٹ" بلاشبہ ان کی اعلیٰ طباعی کا نمونہ ہے۔ ان کی تحریروں میں کئی مقامات پر ہمیں نفسیاتی تجزیے ملتے ہیں۔ موصوف کے دیگر مجموعے "پریم اوتر بھوجو"، "گنجی اور گو بیشٹراں" قارئین کے ذہن پر گہرے نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ کچھ تاثرات ایسی ہیں جو مزاحیہ اور المیہ دونوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

چودھری ہیم کانت مشرا کی تحریروں میں تحلیلی نشانات پائے جاتے ہیں۔ ان کے مجموعہ مضامین "بھلو کردو پرانیت" اور "نیا ڈگر پو" کے مطالعہ سے ان کی ذہنی صلاحیت کا اندازہ لگ جاتا ہے۔ دوران ملازمت موصوف انگریزی اور دیگر ہندستانی ادب کا بدرجۂ غائر مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تحلیلی اسلوب جامع اور وسیع ہوتا ہے۔ ایک اور بات قابل ذکر یہ ہے کہ اگرچہ ان کی تحریریں تجزیاتی اسلوب کی حامل ہیں تاہم زبان نہایت ہی سلیس، سادہ اور رواں دواں ہے۔ ان کے بعد والے مجموعوں "کوردلیا گڑبو"، "ترچھا گوپو"، "نسدھو پستکو" میں فتورانند کے اسلوب کا عکس نظر آتا ہے۔

سنہ ۱۹۶۰ء کے بعد متعدد مزاح نگار میدان میں آئے اور اپنے کمال فن کے جوہر دکھلاتے رہے۔ ان میں آنجہانی پون بہاری رائے، ڈاکٹر پرفلو کار داس، چندر منی پنڈا، اودے ناتھ سڑگی، سنل مشرا، شردھا کار سوپ کار، چندر بھال ششتھی، رادھو مشرا، لوٹو سامل، چنتا چرن ملک، انادی ساہو، بپن بہاری مشرا اور شریف احمد کے اضافے گرامی نمایاں ہیں۔ یہ سارے مزاح نگار "ڈگر" کے لئے لکھتے رہے ہیں۔ ان کے اسلوب بیان پر اگر کوئی نظر ڈالنا چاہے تو ان کے مضامین میں بالواسطہ یا بلاواسطہ فتورانند کے انداز کی جھلک نظر آئے گی۔ آنجہانی پون بہاری رائے اپنے مجموعۂ مضامین "بسیلایا" کے پیش لفظ میں یہ اقرار کرتے ہیں کہ ان کی ادبی زندگی سنجیدہ افسانوں سے شروع ہوئی تھی لیکن فتورانند سے متاثر ہو کر ان کے مزاج کا رخ طنز و مزاح کی جانب مڑ گیا۔

فتورانند ہی کی رہنمائی میں طنز و مزاح کی ایک انجمن "سرس ساہتیہ سمیتی" کے نام سے قائم کی گئی ہے، جس کے اغراض و مقاصد اڑیا مزاحیہ ادب کو فروغ دینا ہے۔ اسی مقصد کے تحت انجمن ہر سال ایک خصوصی جلسہ منعقد کرتی ہے اور ممتاز مزاح نگاروں کو "رس راج" کے خطاب سے نوازا کرتی ہے۔

ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح فن ظرافت کے کمالات اڑیا ڈراموں میں بھی دکھائے گئے ہیں۔ ڈرامہ نویسی کے ابتدائی دور میں کوئی ایسا ڈرامہ نہیں لکھا گیا جسے کلیتہً مزاحیہ کہا جا سکے۔ البتہ ان ڈراموں میں چاشنی کے طور پر کچھ مزاحیہ مکالمے اور ایک آدھ مزاحیہ کردار ضرور شامل کر لئے جاتے۔ بے شک بکشی کانت مہاپاترا، کرشن پرساد باسو اور چند ایسے ہی دیگر ہمعصر ڈرامہ نگار "پرہسن" کے نام سے خالص مزاحیہ ڈرامے لکھ کر اور انھیں اسٹیج کر کے کسی حد تک کامیاب ثابت ہوئے تھے۔ لیکن عصر حاضر میں سماجی ڈرامے کثرت سے لکھے جا رہے ہیں۔ موجودہ دور کے ڈرامہ نویسوں میں ایک گوپال چھوٹرائے ہیں جن کا ریڈیو ڈرامہ "شریمتی ستر جنی" کافی مشہور ہوا۔ دوسرا نام ڈاکٹر کُل منی مہاپاترا کا ہے جن کا ایک ایسا ہی ڈرامہ "درنیتی پڑھیہ" بہت ہی مقبول ہوا ہے۔ ان کے علاوہ فتورانند نے بھی ڈرامے لکھے "بن بی کلپتی چینکا" نے کافی شہرت پائی۔ چند دہائی قبل اودے ناتھ شرا نے بھی کچھ ڈرامے لکھے تھے جن میں مزاح کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ اب اڑیا ادب کو فروغ دینے کی غرض سے انگریزی، ہندی، بنگالی، اور اردو کے مزاحیہ شاہکار ترجمہ ہو رہے ہیں۔ توقع ہے کہ تراجم کا یہ سلسلہ اڑیا زبان کے مزاح نگاروں کے لئے تخلیق

www.taemeernews.com

تحریک کا ایک وسیع تر میدان فراہم کرے گا۔

پچھلے کچھ عرصے تک خالص مزاحیہ رسائل بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہے۔ "ہری بول" رادھو مشرا کی ادارت میں راؤ رکیلا سے شائع ہوا۔ "رنگیا دواری" منوریجن ساہو کی ادارت میں سمبل پور سے اور گوپال بھانڈ کے زیر ادارت "یگیہ دت آریہ شائع ہوا۔ یہ سبھی رسالے قارئین کے درمیان ایک دھوم مچائے ہوئے تھے۔ لیکن افسوس کہ ان رسالوں کی ثابت قدمی قائم نہ رہ سکی۔ تاہم یہ دیکھتے ہوئے ہمت بندھتی ہے کہ اڑیا ادیبوں کی نئی نسل مزاح نگاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی ہے اور مزاحیہ ادب کے فروغ میں یکساں طور پر کوشاں نظر آتی ہے۔ OO

"مذہبی قدروں کی تبلیغ کے لئے اڑیا مزاح کا استعمال آٹھویں صدی عیسوی سے ہونے لگا تھا۔ لیکن اڑیا نثر میں خالص مزاح پیش کرنے والے براجا ناتھ بدا جینا (۱۸۴۳-۱۹۱۲) ہیں جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ تفریحی ادب کا آغاز کیا انھوں نے اپنے بادشاہ کے خلاف ایک خوبصورت اور موثر طنزیہ بھی لکھا اور اس طرح سیاسی و سماجی عناصر سے مزاح کو روشناس کرایا۔ جس کا تسلسل آج بھی ملتا ہے اڑیا مزاح کو ایک نئے زاویہ سے کوی سوریا بالا دیبا راتھو نے واقف کروایا۔ اس بے مثال شاعر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے "مہا سیہ کلولا" سنا کر اپنے آقا اور بادشاہ عطا گڑھ کا علاج کیا تھا۔ یہ بادشاہ "راج بھوڑے" کی وجہ سے سخت تکلیف میں مبتلا تھا۔ اور جب بالا دیبا راتھو نے اپنی مزاحیہ تخلیقات سنائیں تو وہ اتنا ہنسا کہ بھوڑے کا منہ کھل گیا اور اس طرح بادشاہ کو درد سے نجات مل گئی ــــ"

چودھری ہیم کنت سہرا

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سید حامد حسین

انگریزی کا دیسی مزاح

خلاصۂ حالات:

۱۹۳۵ء میں پیدا ہوا۔ ۱۹۵۵ء میں اقتصادیات میں اور ۱۹۵۷ء میں انگریزی میں ایم اے کیا ۱۹۶۳ء میں انگریزی میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۵۷ء میں انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۱ء میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوا اور دس سال سے زیادہ عرصہ ٹرائبل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بھوپال میں کام کیا۔ اس وقت گورنمنٹ موتی لال رضوی کالج بھوپال کے شعبۂ انگریزی سے وابستہ ہوں۔

زبانوں کے مطالعے میں خاص دلچسپی رہی۔ ابتدائی عربی اور فارسی پڑھی۔ بعد میں اُردو میں ادیب کامل کی ڈگری اور جرمن اور روسی زبانوں میں ڈپلومے حاصل کیے۔ ادب، تاریخ، فلسفہ اور ریاضی کی جانب خصوصی رجحان رہا۔ پہلا مزاحیہ مضمون اسکول میں زمانۂ طالب علمی کے دوران ۱۹۴۸ء میں لکھا۔ ۱۹۵۱ء سے تنقیدی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ غالب صدی کے دوران غالب پر کئی تحقیقی مضامین تحریر کیے جنہوں نے مقتدر رسائل کے خصوصی نمبروں میں جگہ پائی۔ انشائیے اور مزاحیہ مضامین بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔

"اردو شاعری مستعمل تلمیحات و مصطلحات" کے عنوان سے مطالعہ شاعری کے لیے مفید ایک فرہنگ اصطلاحات ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اقبال صدی کے دوران "اردو ترجمۂ اسرار خودی" چھپ کر سامنے آیا۔ ۱۹۸۲ء میں "تحقیق اور حاصل تحقیق" کے عنوان سے تحقیقی مضامین کا ایک مجموعہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی نے چھاپا۔ اس کے علاوہ مکتبہ جامعہ دہلی نے "مشرقی علوم و السنہ پر تحقیق" کے زیر عنوان ایک بلبوگرافی ۱۹۸۰ء میں شائع کی ہے۔ اس سال نثر اور انداز نثر" کے عنوان سے نثر اضافی اور نثر نگاروں سے متعلق مضامین پر مشتمل ایک مجموعہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ شائع کر رہا ہے۔ ایک اور تالیف "اردو زبان ہندی دانش وروں کی نظر میں" انجمن ترقی اردو نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہو رہی ہے۔ "ہندو فلسفہ، مذہب و معاشرت" غالباً اگلے سال کے اوائل میں ترقی اردو بیورو نئی دہلی شائع کرے گا۔

بیورو نے ایک ترجمہ "اخلاقیات" کے زیر عنوان کرایا ہے۔ جس کے جلد شائع ہونے کی اُمید ہے۔
"دیوان غالب نسخہ حمیدیہ بہ تدوین نو" تقریباً سات سال سے تیار ہے۔ لیکن اس کی اشاعت کا معاملہ اکیڈمیوں کی داخلی مصلحتوں اور سیاستوں کا شکار ہوگیا۔ دوسری تصانیف میں "اردو میں عربی کلمات" "تنقید: اصول و مسائل" "شعر اور اسلوب شعر" شامل ہیں۔ فی الوقت "اردو کا جدید نثری مزاح" پر کام کر رہا ہوں جس میں آزادی کے بعد ہندوستانی مزاحیہ فنکاروں کی تحریرات کا جائزہ لینا مقصود ہے۔

انگریزی زبان کی مطبوعات میں ای ایم فارسٹر کے خطوط کا ایک مجموعہ ONLY CONNECT کے عنوان سے دہلی کے ناشر آرنلڈ ہائینمن نے شائع کیا۔ انگریزی زبان و ادب، نفسیات، اسنانیات، تعلیم، اردو، فارسی اور عربی پر ہندوستانی یونیورسٹیوں میں ہونے والی تحقیق پر چھ جلدوں میں ببلوگرافی اور مینوئل ریسرچ انسٹیٹیوٹ بھوپال نے شائع کی۔ اس کے علاوہ کولرج کی نظموں پر تبصرہ و تشریح اور انگریزی زبان و قواعد پر ایک کتاب بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱۹۵۸ء میں ڈاکٹر حدیقہ بیگم سے شادی ہوئی۔ دو بچے ہیں۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔

انگریزی زبان میں ہندوستانی مصنفین نے ناول، افسانہ اور شاعری کے میدان میں قابل توجہ اضافے کیے ہیں۔ لیکن کسی ایسے مصنف کی تلاش جس نے مزاح نگاری کی بنا پر اپنا مقام پیدا کیا ہو، بڑی دشواری کا باعث ہے۔ نشونت سنگھ جو خود انگریزی کے نامور ادیب اور صحافی ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ نہ صرف ہندوستان کے انگریزی ادب میں مزاح کا فقدان ہے بلکہ خود ہندوستانی مزاح کی حس لطیف سے محروم ہیں۔ مشہور کارٹونسٹ شنکر پلّے بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہندوستان کی سب سے بڑی لعنت مزاحیہ حس کی کمی ہے۔

یہ مسئلہ تو بہرحال بحث طلب ہے کہ ہندوستانیوں میں مزاح کی حس ہے یا نہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ انگریزی کو اپنا وسیلہ اظہار بنا کر ہندوستانی ادیبوں نے جو ادب تخلیق کیا ہے اس میں خالص مزاح کی مثالیں بڑی محدود تعداد میں نظر آتی ہیں۔ اس کے بعض تاریخی وجوہ ہیں اور بعض نفسیاتی۔ تقریباً ایک صدی قبل جب ہندوستانیوں نے اعتماد کے ساتھ انگریزی میں تخلیق ادب کے لیے اپنا قلم اٹھایا۔ اُس وقت اُن کے سامنے چند اہم قومی اور تہذیبی تقاضے تھے۔ چنانچہ انھیں سیاست، معاشرتی اصلاح قومی سربلندی وغیرہ مسائل پر لکھنے کے لیے تحریک حاصل ہوئی۔ اس طرح سنجیدہ ادب کی تخلیق پہلے ضرورت اور پھر روایت بن گئی۔ ذہنی طور پر بھی بعض عوامل انگریزی میں مزاحیہ اسلوب اپنانے کے لیے مانع رہے۔ مزاح متعلقہ ثقافتی ماحول سے اُبھرتا ہے اور اس کی نازک جڑیں متعلقہ سماج کے اطوار و روایات میں دور

www.taemeernews.com

تک پھیلی ہوتی ہیں۔ لہٰذا ادیب اپنی مزاحیہ حس کو اظہار بخشنے کے لیے اسی لسانی وسیلے کو کارگر محسوس کرتا ہے جو اس کے ثقافتی ماحول کی لطیف نزاکتوں اور باریک تضادات کو اپنی پکڑ میں پکڑنے کی اہلیت رکھتا ہو۔ انگریزی زبان۔ ہندوستانی ادیب کی فطری زبان نہیں ہے۔ اس میں ایک واضح ثقافتی بُعد ہے اور اسی لیے جب کہ ہندوستان کی ہر زبان میں مزاحیہ ادب کی قابل توجہ حد تک تخلیق ہوئی ہے اور اُن میں اہم مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں، انگریزی زبان میں صرف محدود دائرے میں مزاحیہ اسلوب کو استعمال کیا گیا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زبان میں مزاحیہ تحریرات بالعموم محض اتفاقی نگارشات کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ہندوستان کے اہم انگریزی ناول نگاروں میں آر کے۔ نارائن نے مزاحیہ اسلوب سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کی ابتدائی ناولوں "مسٹر سمپت" "سوامی اینڈ ہز فرینڈز" "بچلر آف آرٹس" وغیرہ میں اور ان کے کئی افسانوں میں مزاحیہ صورت حال کا دلچسپ استعمال ملتا ہے۔ ان ناولوں اور افسانوں میں نارائن نے بالعموم مرکزی کردار کے پریشانی میں ڈالنے والے مواقع سے پیدا ہونے والی سراسیمگی سے مزاحیہ تاثر پیدا کیا ہے۔ بعد میں نارائن طنز اور ستم ظریفانہ صورت حال کی جانب زیادہ مائل نظر آتے ہیں۔ اُن کی ناول "گائیڈ" جس پر اُردو میں فلم بھی تیار ہو چکی ہے، اس کی اچھی مثال ہے۔

انگریزی کے سب سے معتبر ناول نگار ملک راج آنند کے یہاں وفور جذبات اور شدتِ احساس کے باوجود بعض مواقع پر دلچسپ کردار اور مزاح اُبھر کر آتا ہے۔ آنند اکثر اپنے کرداروں کی چھوٹی چھوٹی انفرادی خصوصیات کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض خصوصیات ان کرداروں کی کسی نفسیاتی ٹیڑھ، جسمانی سقم اور اطواری خم سے تعلق رکھتی ہیں اور اگر ان کرداروں کا ناول سے الگ کرکے جزوی طور پر مطالعہ کیا جائے تو وہ مزاحیہ تاثر پیدا کرتے ہیں۔ لیکن سماجی پست و بلند اور پیچ و خم سے پیدا ہونے والے ناول کے سنجیدہ پس منظر میں ان کے کرداروں کی یہ انفرادی خصوصیات اکثر ہمارے ہمدردی کے احساس کو انگیخت کرتی ہیں اور رقت کو ابھارتی ہیں۔ آنند اپنے بیانیہ کے ذریعے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے ہندوستانی گرد و پیش۔ ہندوستانیوں کے محاوروں، ان کے تکیہ کلام، ان کی گالیوں اور مہملات گفتگو کا انگریزی زبان میں ترجمہ جس طرح پیش کیا ہے وہ ایک خاص لطف رکھتا ہے۔

جی، وی، دیسانی کی ناول "آل اباوٹ ایچ ہیٹر" انگریزی زبان میں مزاحیہ اسلوب کی ایک دلچسپ مثال ہے۔ دیسانی نے اپنے عجیب و غریب کردار کے لیے ایک عجیب تر اندازِ تحریر اختیار کیا ہے جس میں فلسفیانہ اصطلاحات، کلکتہ کی بول چال، شیکسپیر کی فرسودہ تراکیب، ہندو دیومالا کے حوالے، مقدمہ بازوں کے محاورے اور بابوؤں کی بات چیت سب کچھ شامل ہے۔ یہ اسلوب بیان ایک وقت میں نہایت تصنع آمیز معلوم ہوتا ہے تو دوسرے موقع پر اپنے اسی تصنع کی وجہ سے ایک ایسا عجب پیدا کرتا ہے جس سے ایک مخصوص انداز کا مزاحیہ تاثر جنم لیتا ہے۔

www.taemeernews.com

ہندوستان کے انگریزی ناول نگاروں کا ایک محبوب موضوع مشرقی و مغربی تہذیب کا تصادم ہے۔ کملا مرکنڈیا، نین تارا سہگل، روتھ پرور جھبوالا وغیرہ کے متعدد ناولوں اور کہانیوں میں ایسی صورت حال اکثر پیدا کی گئی ہے جس میں ہندوستانی اور مغربی کردار ایک دوسرے سے معاملات رکھتے ہیں۔ اور ان کرداروں کے اطوار و روایات کا فرق بعض اوقات ایسی بے ہنگم صورت حال پیدا کرتا ہے جس سے مزاحیہ امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ ان طربیہ عناصر سے دراصل ان تصانیف کا ذیلی تاثر مرتب ہوتا ہے اور اس قسم کا تاثر بعض دوسرے سنجیدہ ناول نگاروں جیسے بال چندر راجن کی تصانیف میں بھی نظر آجاتا ہے۔

نظم میں بھی مزاحیہ عنصر محض اتفاقی شکل میں نظر آتا ہے مثلاً کسی زمانے میں السٹریٹیڈ ویکلی آف انڈیا میں نسیم ایزکیل کی "ویری انڈین پوئمس" شائع ہوئی تھیں جن میں ہندوستانیوں کی بول چال کی انگریزی کی مدد سے چابکدستی کے ساتھ مزاح پیدا کیا گیا تھا۔ پرانے لکھنے والوں میں آر مینڈو میسنزیس کا ذکر کیا جاسکتا ہے جنہوں نے ایک طویل نظم "دی فنڈ" مزاحیہ انداز میں تحریر کی تھی۔

ہلکے پھلکے مضامین کے لیے رسائل و اخبارات میں ہمیشہ گنجائش رہی ہے۔ مزاحیہ و طنزیہ نگارشات اور کارٹونوں پر مشتمل رسائل کا بھی وقتاً فوقتاً اجراء ہوتا رہا ہے جن میں سے "ماڈ میگزین اور شنکرس ویکلی کا خاص طور پر ذکر کیا جاسکتا ہے۔ کئی اخبارات میں اداریہ کے لیے مخصوص صفحے کے وسط میں وقتاً فوقتاً ہلکے پھلکے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن کے لیے "مڈل" کی اصطلاح مستعمل ہے۔ بعض اخبارات کے میگزین سیکشنس اور بعض ہفتہ وار رسائل میں مقررہ عنوانات کے تحت لطیف اسلوب میں تحریرات کینے گنجائش نکالی جاتی رہتی ہے۔

ان صحافتی نگارشات میں نئے اور پرانے کئی لکھنے والے اضافہ کرتے رہے ہیں۔ یہاں ان سب کے ذکر کی گنجائش نہیں۔ نمونہ کے طور پر چند ناموں کا حوالہ کافی ہوگا۔ خوشونت سنگھ کی صحافیانہ تحریرات کی خصوصیت نہ صرف وہ چوٹیں اور چبھن ہیں جن سے ان مضامین کا امتیازی لہجہ مرتب ہوتا ہے بلکہ ان کا وہ خلاف روایت بے باکانہ انداز بھی ہے جس کے تحت وہ جنس وغیرہ جیسے مسائل سے متعلق اشارے بڑی بے تکلفی اور بے ساختگی کے ساتھ استعمال کر جاتے ہیں۔

کئی ایسے فن کار جنھوں نے اپنی فنی زندگی کا آغاز کارٹون سازی سے کیا تھا رفتہ رفتہ مزاحیہ کالم نویسی کی جانب متوجہ ہوئے ہیں۔ ابراہام۔ لکشمن اور راجندر پوری نے اپنی ذکاوت طبع کا تعارف اپنے کارٹونوں کے ذریعے ہی پیش کیا تھا۔ لیکن بعد میں ابراہام نے اپنے مختصر مضامین، لکشمن نے اپنے تصویری اور لفظی خاکوں اور راجندر پوری نے اپنی لطیفے نگارشات کی شکل میں بھی اپنی طبیعت کی شگفتگی اور جودت فکر کی مثالیں بہم پہنچائی ہیں ان میں بالخصوص راجندر پوری کی تحریرات زیادہ پُر لطف ہیں جن میں انھوں نے اپنے ذہن کی اختراعی قوتوں سے خاص طور پر فائدہ

www.taemeernews.com

اٹھایا ہے۔ عام لوگوں کو پُر کرنے کی کوشش میں بعض وقت راجندر پوری کی تحریرات میں رپورٹ نگاری کی سطحیت بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ لیکن جب کوئی موضوع اُن کی حسِ مزاح کو تحریک دے دیتا ہے تو وہ اس کے لیے بڑی فن کاری سے ایک صورت حال وضع کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اکثر مکالماتی اسلوب میں ایک لطیف تحریر ترتیب دیتے ہیں۔

دی، ڈی، ترپاٹھی عرصہ سے ہلکے پھلکے مضامین تحریر کر رہے ہیں۔ ان کی تحریر کی خصوصیت موضوعات کا تنوع اور تفصیلات کی رنگا رنگی ہے۔ وہ انشائیہ کے لطف سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں اور بیان کے غیر متوقع پیچ و خم اور زبان کے پُرلطف تردد سے اپنی تحریرات کو پُرکشش بنانے کے گُر سے واقف ہیں۔

پی، ایل بھنڈاری عموماً اپنی سفارتی زندگی کے تجربوں پر مشتمل مزاحیہ خاکے تحریر کرتے ہیں جبکہ سی، ایل پرادڈفٹ کے مضامین میں اکثر فوجی زندگی کا پس منظر نظر آتا ہے۔ جارج میتھزیز، راج چٹرجی اور کئی دوسرے نثر نگار اخبارات کو اپنی مزاحیہ نگارشات سے ایک نیا لطف عطا کرتے رہتے ہیں۔ آر گوپال کرشن، ایس ملگاونکر وغیرہ کی تحریریں، ان کے لطفِ انشا سے شگفتگی اور کشش حاصل کرتی ہیں۔

ستیہ پال آنند ایسے ہی صحافتی "مڈلس" پر مشتمل اپنے دو مجموعے "سم شے لو، سیم ڈیپ اور شیڈو ز ایٹ نون" کے عنوان سے شائع کر چکے ہیں۔ ان کے بیشتر مضامین ایسے کے غیر رسمی اسلوب میں غیر روایتی زاویۂ نگاہ سے لکھے گئے ہیں۔ ان مضامین پر انشائیت کا اکثر غلبہ ہے اور بہت بار آنند دھیرے دھیرے سنجیدگی کے پچھاڑ سے جا نکلتے ہیں۔ انشائیوں کے بعض دوسرے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ جن میں سے چندوی، وی جان کا "لائٹ ایج" ہرگا ونکر کا "آل ان ڈلائٹ"، شکنتلا پانچے کا "سینس اینڈ نان سینس" ایل آر پربھاکر کا "ان لائٹر وین۔ ایسیز" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

انگریزی زبان میں ہندوستانی مصنفین نے جو ہلکا پھلکا ادب پیدا کیا ہے۔ اس میں سے بہت کم ایسا ہے جسے خالص مزاح کے ذیل رکھا جاسکے۔ سنجیدہ ناول نویسوں اور افسانہ نگاروں نے اپنی نظریاتی وابستگی یا جمالیاتی ترجیحات کی بنا پر خالص اور واضح مزاح سے گریز کیا ہے چنانچہ ان کے یہاں یا تو طنز کی گنجائش نظر آتی ہے یا بعض مواقع پر ستم ظریفانہ صورت حال ابھر آئی ہے۔ صحافیانہ کالم نویسی کا موضوع بسا اوقات فوری دلچسپی کے مسائل ہوتے ہیں اور ان میں چٹخارے کھل کر قہقہہ لگانے کے زہر خند کی کا فرمائی زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ چنانچہ کالم نویس چبھتے ہوئے فقروں، شرارت آمیز کنایوں، صورت بگاڑ کر پیش کرنے والے مبالغوں اور ذکاوت کے چھینٹوں سے کام نکالتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کی انگریزی تحریرات میں خالص مزاحیہ عناصر سے زیادہ طنز، ستم ظریفی اور ذکاوت کے نمونے پائے جاتے ہیں۔

جہاں تک زبان کے استعمال کا تعلق ہے بیشتر معیاری ناول نگاروں کے یہاں ایک پُرتکلف، کلف دار اسلوب

www.taemeernews.com

اپنانے کا رجحان ملتا ہے۔ یہ ناول نگار کہیں اسلوب کو معیاری بنانے کے شوق میں اور کہیں معنوی تہوں کا اضافہ کرنے کے ذوق میں، رسمی محاورہ دار اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ مناکشی مکرجی نے ان ناول نگاروں کے اسلوب پر تبصرہ کرتے ہوئے نثر آر کے نارائن کو استثنا قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ ایک زیادہ رواں اور لچکدار اسلوب اپناتے ہیں۔ زبان پر یہ کاوش اس پر دلالت کرتی ہے کہ ان ادیبوں کا انگریزی زبان کے ساتھ ایک اکتسابی وسیلۂ اظہار کی حیثیت سے معاملہ ہے اور کیونکہ وہ اس میں فطری اظہار کی قوت اور لچک نہیں پیدا کر پاتے، اس لیے یہ زبان مزاحیہ اظہار کے لیے ناکافی ثابت ہوتی ہے۔ اس رکاوٹ کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ کئی ناول نگاروں اور کالم نویسوں نے مزاحیہ مقاصد کے لیے ایک دولسانی پسِ منظر اختیار کیا ہے۔ ملک راج آنند نے ہندوستانی بول چال، محاورے، تکیہ کلام اور گالی گفتار کو انگریزی زبان کا لباس پہنا کر پیش کرنے کی طرح ڈالی تھی لیکن اب رفتہ رفتہ کئی مصنفین مقامی زبانوں کے الفاظ انگریزی میں شامل کر کے مزاح پیدا کرنے کے تجربات کر رہے ہیں۔ بعض انگریزی فلمی رسائل اور دیگر اخبارات میں اس قسم کی ملی جلی زبان سے ایک نیا پُرلطف اسلوب تیار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دلیپ بھگت فلمی صحافت میں اس انداز تحریر کا پیش رو دلیو بانی چوپل کو بتاتے ہیں۔ شوبھا کلا چندا اور دی گنگا دھر نے بھی انگریزی میں ہندی یا مراٹھی زبانوں کی آمیزش سے ایک مزاحیہ پیرایہ اختراع کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

یہ رجحان اس امر کی جانب نشاندہی کرتا ہے کہ خاص طور پر صحافتی تحریرات میں اپنی بات سے خود لطف لینے اور اسے اپنے ہم وطنوں کے لیے پرلطف بنانے کی جانب توجہ کی جا رہی ہے۔ لیکن ابھی انگریزی کے دیسی مزاح کو وہ وقار اعتبار حاصل نہیں ہوا ہے جو اسے ملنا چاہیے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ مغرب کی مزاحیہ تحریرات ہمیں بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں اور درآمدی مال کے سامنے دیسی مال پھیکا لگتا ہے اور کیونکہ ہمارے ملک میں دیسی مزاح کی خاص پذیرائی نہیں اس لیے ہمارے یہاں کے باصلاحیت ادیبوں نے زیادہ سنجیدہ اصناف میں تحریرات کی جانب تو توجہ کی لیکن اپنی مزاحیہ کاوشوں کو سرمایہ افتخار نہیں سمجھا اور مزاحیہ اسلوب کو محض ایک اتفاقی پیرائے کی حیثیت سے استعمال کیا ہے۔

مگر اب صورتحال بدل رہی ہے۔ گذشتہ چند سالوں میں اخبارات اور خاص طور پر رسائل کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہلکے پھلکے مضامین کی مانگ بھی بڑھی ہے۔ چنانچہ اچھی خاصی بڑی تعداد میں نئے لکھنے والے سامنے آ رہے ہیں۔ ان میں بعض خواتین بھی شامل ہیں جو بڑے اعتماد کے ساتھ صحافتی انشا کے میدان میں اتری ہیں اور دل چسپ تحریرات قلمبند کر رہی ہیں۔ کئی ہلکے پھلکے مضامین لکھنے والے علاقائی سطح پر ابھر رہے ہیں اور بعض سیاست، فلم، تنقید فن و ادب وغیرہ خصوصی میدانوں پر اپنی توجہ مرکوز کر کے لطیف انشاء کی ایک نئی روایت پیدا کر رہے ہیں۔

///

www.taemeernews.com

ہمانیشن گوسوامی

: ڈاکٹر یوسف کمال
(انگریزی سے ترجمہ)

بنگالی میں مزاح

بنگالی ادب میں مزاح کی ایک شاندار روایت ہے اور خصوصیت کے ساتھ طنزیہ ادب تو بنگالی زبان میں غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ سیدھے سادے مزاح سے لے کر عام اور فحش لطیفوں تک ہر شخص ان سے محظوظ ہوتا ہے خاص طور پر جب کہ ان کا نشانہ اغیار ہوں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ لطیفے سب سے زیادہ مقبول ہونے کے باوجود طباعت کی دنیا میں اب بھی بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ کیونکہ اکثر و بیشتر لطیفے کسی نہ کسی ذات، فرقے یا گروپ کو نشانہ بناتے ہیں۔ لطیفوں کے بارے میں ہندوستان میں بھی بڑی حد تک یہی رویہ اپنایا گیا ہے۔

چنانچہ مجھ سے ایک اسکاچ دوست نے کہا تھا کہ اسکاچ لوگوں کے بارے میں سب سے زیادہ لطیفے خود اسکاچ مصنفوں کی اپنی پیداوار ہوتے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہم لوگ ان کی طرح خود اپنے بارے میں لطیفے بنانے کی ہمت رکھتے ہیں! درحقیقت وہ سارے مزاح نگار جنہوں نے خود احتسابی کے ذریعہ قہقہوں کو اکسانے کی کوشش کی ہمارے درمیان سب سے غیر مقبول اور بدنام قرار پائے ہیں۔ نیکم چندر چٹوپادھیائے نے بڑی بے خوفی کے ساتھ اس قسم کا مزاح لکھا کیونکہ وہ پیشہ ور مزاح نگار نہیں تھے۔ وہ ایک بہت جاندار قسم کے ناول نگار تھے جو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہونے کے باوجود کسی پر بھی تنقید کرنے سے نہیں چوکتے تھے چاہے وہ برطانیہ کی حکومت ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ایک اور آزاد اور نڈر مزاح نگار ترلوک ناتھ گھما پا دیائے تھے جنھوں نے خود احتسابی میں ہندو بنگالیوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا۔ غالباً ان کی بھی یہی خوبی تھی کہ ادب ان کا ذریعہ معاش نہ تھا۔ وہ ایک غریب آدمی تھے لیکن ترقی کر کے ہندوستانی میوزیم کے کیوریٹر کے عہدے تک پہونچے۔ اسی لئے بھی غالباً وہ بنگالی ہندو سماج کو نظر انداز کرنے کی جرأت رکھتے تھے۔ ہمارے ادب کی تاریخ میں شاید ہی کوئی مصنف ہو جس نے محض مزاح نگاری کے ذریعے معاش پیدا کی ہو۔

یہ ضروری نہیں کہ مزاح بہ وقت احتسابی یا ہلاکو نوعیت کا ہی ہو۔ مزاح ممکنہ حد تک غیر جانبدار بھی ہو سکتا ہے۔ پھر بھی یہ بڑی حد تک فرد میوں، کمزوریوں اور فروگذاشتوں کو دکھاتا ہے جو کسی کے کردار یا شخصیت میں پائے جاتے ہیں جیسا کہ کسی کا بُری طرح کھوئے پر سے گر جانا، ایک پاؤں میں لال اور دوسرے پاؤں میں کالا جوتا پہن لینا وغیرہ۔ یہ ایسے مناظر ہیں جو ناظرین کو خود بخود احساس برتری عطا کرتے ہیں۔ ان واقعات کے اصلی کردار، ناظرین کو اس موقع پر سنجیدہ پاتے ہیں اور اس طرح ان میں کوئی بھی اس واقعہ کو دہرانے لگے تو پھر اس کی نظر میں وہ بہت زیادہ غیر مقبول ہو جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

آج کے مزاحیہ ادب کا رجحان ان امور سے ہٹ کر باریک بینی پر زیادہ مائل ہو گیا ہے۔ مثلاً اگر کوئی گنجے پن کے بارے میں لطیفہ سنا رہا ہو تو وہ اس وضاحت کے ساتھ سناتا ہے کہ خود وہ بھی گنجا ہے تاکہ ناظرین یا سامعین میں کوئی بھی بُرا نہ مانے۔ چاہے مزاح نگار کتنے ہی وسیع منظر میں مزاح لکھے یا کتنی ہی گہرائی کے ساتھ اپنی تخلیق پیش کرے، مزاح نگار کی انسان شناسی اور انسان دوستی کو دوسرے اصناف سخن کے مصنفوں سے کبھی بھی اونچا نہیں مانا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ادبی انعامات ہمیشہ ان مصنفوں کو عطا کئے جاتے ہیں جو آنسوؤں کو پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن کبھی قہقہوں اور خوشیوں کے بکھیرنے والے مصنفوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ پی۔ جی وڈہاؤز Wodehouse کو کبھی نوبل انعام کا مستحق نہیں سمجھا گیا جبکہ اسٹین بیاک کو ایسے اکرام سے نوازا گیا کیونکہ اس نے انسانیت کی خدمت کی۔ خود ہمارے ملک میں اکیڈیمیوں اور ریاستوں کے انعامات عام طور پر ان ادیبوں کو دیئے جاتے ہیں جو اپنے آپ کو مزاح سے دور رکھتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود مزاح کا لکھنا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ سردی بخار کے بعد کھانسنا۔ چنانچہ بنگالی زبان میں ۱۹ ویں صدی میں ہم کو ایشور چندر گپتا ملتے ہیں جنھوں نے مزاح کیلئے خاص طور پر ایک رسالہ 'سنگبار' پرکاشت کرنا شروع کیا۔ (میں چاہتا تھا کہ ان کی کچھ تحریروں کا ترجمہ غیر بنگالیوں کے لئے لکھوں مگر ترجمہ میں ان کا مزہ ختم ہو جائے گا۔) ایشور چندر نے بڑی حد تک نظم میں بھی لکھا ہے۔ اس لئے یہ ان کی مزاح نگاری کا دوسرا پہلو ہے جو ترجمہ کو اور بھی مشکل اور پیچیدہ بنا دیتا ہے۔ بنکم چندر نے بھی نثر میں مزاح لکھا ہے، چنانچہ "کملا کنت دفتر" ان کے اقبال مزاح کی ایک اچھی مثال ہے۔

۱۹ ویں صدی میں کچھ ایسے مصنف بھی پیدا ہوئے جنھوں نے انسانی عادات اور اطوار کا بڑا گہرا مطالعہ کیا۔ اور جن کی ناولوں اور کہانیوں نے بنگالی ادب کو عام طور پر اور مزاح کو خاص طور پر متاثر کیا۔ ان میں دو کتابیں اہم ہیں جن کا ذکر یہاں ضروری ہے (۱) پاری چند مترا کی ناول "الالیر گھارے دلال" (۱۸۵۴ء) عوامی زبان میں ہونے کے باوجود جگہ جگہ مزاح کی پھلجھڑیوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کتاب نے بنگالی ناول اور مزاح کو بہت متاثر کیا ہے۔ (۲) دوسری اہم کتاب "ہتم پیچار نکشا" کالی پرسنا سنہا کی ہے جس میں سنہا نے بڑی بے جگری کے ساتھ گذشتہ صدی کے طور طریق اور رسوم و رواج پر طنز کیا اور انہیں اپنی ناقدانہ حقارت کا نشانہ بنایا ہے۔ سنہا کی یہ تنقید اتنی طاقتور اور زبردست تھی کہ اس کی موت کے بعد بنکم چندر نے بھی سنہا پر غیر ضروری تنقید کی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بعد کے ایک نقاد نے لکھا "بدقسمتی سے کالی پرسنا سنہا، بنکم کی تنقید کا جواب دینے کے لئے موجود نہیں"۔

بنکم چندر کے ایک اور ہم عصر مزاح نگار دینا بندھو ترا تھے۔ ان کی بیشتر تحریریں سماجی طنز کی تعریف میں آتی ہیں۔ وہ ایک پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے لیکن انہوں نے بنگالی سماج کی خوب جراحی کی۔ اپنی ایک کتاب "نیل درپن" میں انہوں نے اپنی جرأت کا ثبوت بھی اس وقت فراہم کیا جب انہوں نے کھل کر انگریزوں، ہندوستانیوں کے ساتھ حقارت آمیز رویہ پر بھی حملہ کیا۔

میں بہت سے کم اہم ناموں سے گذر رہا ہوں جنھوں نے بنگالی مزاح کو آگے بڑھایا ہے لیکن میں ایک بار پھر ترلوک ناتھ کھپاریا کا ذکر ضرور کروں گا جنھوں نے بنگالی ادب کو بہت متاثر کیا ہے۔ وہ ۱۸۴۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۹ء میں انہوں نے انتقال کیا۔ ان کا مزاح تخیل کی جولانیوں سے بھرپور تھا۔ FANTASY ان کا خاص میدان تھا۔ ان کی ایک کہانی میں ایک کردار کا

www.taemeernews.com

نام بھی "لیزلا گو" ہے جس کا کام ہی زمین پر زلزلے لانا ہے۔ ان کی ایک تصنیف "کنکاوتی" اس زمانے کے ہندو معاشرہ پر بھرپور تنقید اور طنز کی ایک شاہکار مثال ہے جو آج بھی اتنی ہی برمحل لگتی ہے۔ اس کہانی میں ایک بات باپ اپنی جوان بیٹی سے کہتا ہے **اگر اب کوئی شیر بھی آجائے اور میری بیٹی (کنکاوتی) کے رشتے کے عوض بے حساب دولت پیش کرے تو اس کے بارے میں ..." جیسے ہی جملہ ختم ہوتا ہے** پس منظر سے زبردست ہنگامہ آرائی اور گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے اور کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شیر اپنے ہاتھوں میں سونا اور چاندی کے زیورات لئے داخل ہو رہا ہے۔ اس منظر کے نتیجے میں کیا کیا ہوتا ہے۔ یہی دراصل پوری طنزیہ کہانی کا مرکزی خیال ہے لیکن ہے کہ لکھا پاڈیائے انگریزی خیالی ادب کے مصنف لوئس کرال LEWIS CARROLL سے متاثر ہوئے ہوں۔ مگر یہ بات واضح ہے کہ لکھا پاڈیائے کے یہاں مزاح اور FANTASY کی فراوانی نے جس نے انھیں بنگالی مزاح میں منفرد مقام عطا کیا ہے۔ لیکن ان کا المیہ یہ تھا کہ اتنے منفرد اور بسیار زاد مزاح نگار ہونے کے باوجود وہ اپنے عہد میں کچھ زیادہ مقبول نہ تھے۔

بنگالی مزاح کے دوسرے غیر معمولی مصنف ہیں دیو بجھر رائے جو ڈی۔ رائے کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ بات سے بات بنانے کا ان کا اپنا ایک منفرد اسلوب نگارش ہے۔ انہوں نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی اور پیروڈی بھی ان کا محبوب مشغلہ رہی۔ اکثر و بیشتر انہوں نے ہمارے معاشرے کی مغرب زدگی اور فیشن پرستی کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا۔

عصر حاضر کے بنگالی مزاح کی تاریخ راج شیکھر باسو سے شروع ہوتی ہے جو خود ایک بڑا کیمسٹ تھا اور جس نے ۱۹۲۲ء میں ۴۲ سال کی عمر میں مزاح لکھنا شروع کیا۔ اس کے بارے میں یہ کہنا بالکل سچ ہے کہ "وہ آیا، دیکھا اور اس نے سب کو فتح کر لیا۔" اپنی پہلی ہی کہانیوں کے ذریعہ اس نے تعلیم یافتہ بنگالیوں کا دل جیت لیا اور ۱۹۶۰ء میں اپنی موت تک وہ بنگالی مزاح کا ایک ناقابل تسخیر مزاح نگار مانا گیا۔ اس کا قلمی نام تھا پرشورام۔

سوکمار رے بھی بنگالی مزاح کا ایک متاثر کرنے والا مصنف تھا۔ گو اس نے بہت کم لکھا مگر بنگالی مزاح پر اس نے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ سوکمار رے ۳۶ سال کی ایک ایسا جواں مرگ مصنف ہے جو زندگی میں کسی بھی تحریر کو کتاب کی صورت میں نہ دیکھ سکا۔ رے کی بہترین تحریریں "Non-Sense" نامی مضحکہ نگاروں کے زمرے میں شامل کی جاتی ہیں۔ مضامین، کہانیاں نظمیں اور سنجیدہ مضامین خوب کر رے ایک چونکا دینے والا ادیب تھا۔ مگر اس نے زیادہ تر مزاح ہی لکھا جو بچوں کے ادب کا بھی مصنف تھا جس کے لئے وہ ایک منفرد ماہنامہ "سندیش" نکالتا رہا۔ جس میں اپنی تحریروں کے ساتھ ساتھ اس کے والد اوپندر کشور بھی اپنی مزاحیہ تخلیقات "سندیش" میں شامل کرتے رہے۔ رے نے اپنی ایک نظم میں لکھا "لوگ عام طور پر سنجیدہ ہیں اور ہنسنے کے لئے وہ بالکل تیار نہیں۔ وہ دراصل رام گروڑا کی اولاد ہیں جو ہنسنے سے مسلسل انکار کرتے ہیں۔ ہم انھیں ایک مزاحیہ کہانی سنانے جا رہے ہیں لیکن وہ منہ بنا کر اعلان کرتے ہیں۔ نا بھائی ہم ہنسنے والے نہیں۔"

اور پھر بنگالی مزاح میں ایک نام کیدار ناتھ بندھو پادھیائے کا بھی ہے جو مزاح نگار سے زیادہ مزاح باز قسم کا مصنف تھا اس نے خوب لمبی عمر پائی۔ ۱۹۴۹ء میں ۸۷ سال کی عمر میں وہ چل بسا۔ کچھ دنوں کے لئے اس نے اخباروں میں کالم نگاری بھی کی۔

www.taemeernews.com

مگر حقیقت وہ ایک سٹ مزاح ناول نگار تھا۔

رابندر ناتھ ٹیگور سے کون واقف نہیں وہ خود ایک ہر فن مولا قسم کے ادیب تھے۔ ۱۸۶۱ء میں پیدا ہوئے۔ تین ہزار سے بھی زیادہ گیتوں، نظموں، کہانیوں، مضامین، ناولوں، ڈراموں کے خالق ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک غیر معمولی صلاحیتوں کے مزاح نگار بھی تھے مزاح ٹیگور کے خاندان اور خون میں شامل تھا۔ ٹیگور ان کا مزاح بہت زیادہ شستہ، شائستہ اور نازک تھا۔ نثری مزاح کے ساتھ ساتھ انہوں نے شعری مزاح یعنی HUMERICA بھی خوب لکھے۔ ٹیگور کی فیملی کے ابانندرا ناتھ ٹیگور بھی ایک اہم مصنف ہیں جنہوں نے اپنی مزاحیہ کہانیوں اور ڈراموں سے بنگالی مزاح میں ایک خاص مقام پایا ہے۔ ان کے علاوہ گوگندرا ناتھ ٹیگور بھی اسی فیملی کے ایک دیدہ چشم و چراغ ہیں جنہوں نے مزاح کے ساتھ ساتھ کارٹون کی دنیا میں بھی اپنے لئے ایک مقام پیدا کیا ہے۔

۱۹ ویں صدی کے تیسرے حصے میں بنگالی میں بہت مزاح لکھا گیا۔ چنانچہ رابندر ناتھ ٹیگور نے مزاحیہ کہانیاں اور مزاحیہ ڈرامے لکھے، افسوس کہ بہت جلد یعنی ۱۹۲۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اسی دوران ایسے مصنفوں نے جو طنز لکھنے کی خصوصی مہارت رکھتے تھے، مل کر ایک جماعت کی بنیاد ڈالی اور ایک میگزین رسالہ "شانتی نیکیتن" کی ابتدا کی۔ ان میں سب سے اہم سچن کا نام دار تھے جنہوں نے اشوک چٹوپادھیائے، پاری مل گنگولی، پرمانا تھ بشتی اور اجیت کرشنا باسو کے ساتھ بنگالی زبان کے مزاح میں غیر معمولی اضافہ کیا۔ "شانتی نیکیتن" کے اس گروپ سے ہٹ کر ایک شرت چندر پنڈت بھی تھے جنہوں نے دادا ٹھاکر کے قلمی نام سے خوب مزاح لکھا۔ مرشد آباد جیسے دیہی علاقے سے نکل کر وہ کلکتہ آئے، جہاں سے انہوں نے "ایک ہفتہ وار" جنگی پور سمندباد" نکالا جس میں بیشتر ان ہی کی نثری اور شعری مزاحیہ تخلیقات شامل ہوتی تھیں۔ جس غیر معمولی رفتار کے ساتھ دادا ٹھاکر نے لکھا، چھاپا اور اپنا رسالہ بیچا، اس کی بنیاد پر ہم انھیں ایک "ادبی تاجر" بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن افسوس کہ وہ غربت میں مرے۔ ان کی اس رسالہ میں مدد کرنے والوں میں ایک ٹیگور بھی تھے جو ایک مزاحیہ شاعر ہونے کے ساتھ بہت اچھے گائیک بھی تھے۔

تیسری دہائی کے چند اور قابل ذکر ناموں میں پرمانا تھ چودھری، پربھات کمار مکھوپادھیائے، بانا بہاری مکھوپادھیائے، بھی بہت بھوشن مکھوپادھیائے، بلائے چند مکھوپادھیائے، شیلا جندر بندھو پادھیائے شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنے منفرد نکتہ نظر اور اسلوب کی بناء پر بنگالی مزاح، اپنی کہانیوں، نظموں اور ڈراموں سے مقام پیدا کیا۔

میں نے ابھی تک اس عظیم شخصیت کا ذکر نہیں کیا جس نے بنگالی زبان کے مزاح میں اپنی زبردست صلاحیتوں سے ہر ایک کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اس کا نام ہے شیو رام چکرورتی۔ اس نے اپنے مزاح میں اس کاٹ کو برتا جسے انگریزی میں PUN کہتے ہیں۔ (یعنی ضلع جگت "الفاظ سے کھیلنا")۔ اس کے مضامین اور کہانیوں کے مرکزی خیال عام طور پر انگریزی اور انگریزی ادب سے مستعار ہوتے تھے۔ مگر انھیں اپنی کہانیوں اور ڈراموں میں اپنا کر اس نے جو مزاح تخلیق کیا اس نے اسے کمیونٹی کے بچوں اور بڑوں میں مقبولیت عطا کی۔ ویسے اس کے مخالف زندگی بھر پیچھا کرتے رہے۔ اس نے کوئی (۱۵۰) کتابیں لکھیں، ایک کہانی میں ایک مجرد ماہر خیال میں اس نے ایک مطمئن زندگی گزاری۔ اسی کھوج میں اس نے زندگی کی آخری سانس بھی لی۔ اس کے مزاح کا رخ یا نشانہ

www.taemeernews.com

کسی کی طرف نہیں ہوتا تھا۔ اسے مجموعی طور پر ایک بھرپور اور لاپرواہ قہقہے پیدا کرنے کے فن میں کمال حاصل تھا۔ شعری مزاح کی دوسری شخصیت سوینرل یاسو کی تھی مگر بریندر کرشنا بھدرا بھی ایک غیر معمولی مزاح نگار تھے جو لکھنے کے ساتھ ایک باصلاحیت براڈ کاسٹر کی حیثیت سے بھی بہت مقبول ہوئے۔

نارائن گنگو پادھیائے بھی بہت کامیاب کہانی کار اور مزاح نگار تھے جنھوں نے رسالہ "دیش" میں لکھ کر ایک سنسنی پیدا کردی۔ سید مجتبیٰ علی نے بھی بڑے ہی شائستہ اور مہذب اسلوب میں مزاح لکھ کر تعلیم یافتہ اور مہذب لوگوں کے دلوں کو جیت لیا۔ یہ لوگ ہم میں نہیں، لیکن ان کی یاد اب بھی ہمارے دلوں میں باقی ہے۔ اس زمانے کے صرف ایک مصنف اسّی (۸۰) سال کی عمر میں اب بھی زندہ ہیں، آنت شنکر رے۔ مگر وہ بڑی حد تک شعری مزاح ہی تخلیق کرتے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ شریمتی آشا پرنا دیوی اور شریمتی لیلا مجمدار بھی قابلِ فخر مزاح نگار ہیں۔

میرے اپنے دور میں (میری عمر ۵۸ سال ہے) اور اس کے بعد کی نسل میں، میں بنگالی مزاح میں زوال پاتا ہوں! ہم لوگ تو ۱۹۴۳ء کے عظیم قحط، فرقہ وارانہ فسادات اور تقسیم ہند جیسی مصیبتوں سے گذرے ہیں۔ یا یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہم جنگ آزادی کی صعوبتوں کو جھیل چکے ہیں۔ اگرچہ کہ اپنے سائز کے اعتبار سے بنگال اب اصلی بنگال کا تیسرا حصہ رہ گیا ہے مگر ہمارے مسائل اس کے باوجود کئی گنا زیادہ ہو گئے ہیں! ہمارے ولولے اب تقریباً ختم ہو گئے ہیں اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کو اپنے حقوق سے محروم کردیا گیا ہے یا کردیا جارہا ہے۔ زندگی کی ضروریات کی کفایت بھی مشکل ہو گئی ہے۔ برق کی سپلائی نہیں تو ٹیلی فون عدم کارکرد ہے تو سڑکیں ناقابلِ عبور اور بسوں میں بے پناہ ہجوم۔ ان حالات کے نتیجے میں ہر شخص ناامید اور قنوطی ہو گیا ہے اور ہم سمجھنے لگے ہیں کہ شاید ہی زندگی کی کسی نعمت کے ہم مستحق ہیں۔ یہ ایسے حالات ہیں جن میں ہنسنا مشکل ہو گیا ہے۔ پھر جس قسم کا CYNIC مزاح ان حالات سے پیدا ہو سکتا ہے۔ سنجیو چٹرجی نے اس میں مہارت حاصل کرلی ہے۔ اور غیر معمولی مقبولیت بھی۔ اس قبیل کے ایک اور مصنف ہیں، آنند باگچی بھی، جو بے حساب پڑھنے والوں کو اپنی ایسی کاٹ دار تحریروں سے "دیش" والیوں میں محظوظ کرتے ہیں۔ ان کا قلمی نام ہے ترکوچند قلم جی۔ ہمارے عہد کی گندگیوں، مصیبتوں اور مسائل سے تقریباً غیر متاثر ہو کر لکھنے والوں میں، فونیا دیو سین ایسی مزاحیہ ادیبہ ہیں جن کی کہانیوں میں ہمارے عہد کے تلخ مشاہدات مزاح کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مزاح کی تازگی کے ساتھ نا اُمیدی کے اس ماحول میں امید کی کرن پھوٹتی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے علاوہ سرشندر مکرجی بھی ایک اہم مزاح نگار ہیں مگر زیادہ تر وہ بچوں کے لئے ہی لکھتے ہیں۔

غالباً ادبی رسالوں کے مدیر مزاح شائع کرنے میں اب سرگرمی نہیں دکھا رہے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے گوتم کشور گھوش نے اپنی کالم نگاری ترک کردی ہے۔ اروبندو گوپا جو مزاحیہ کہانیاں لکھتے رہے تھے اب خاموش ہو گئے ہیں یا زیادہ سے زیادہ سال میں ایک دو کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ تارا پادا رائے ایک فطری مزاح نگار ہیں، جو ایک اخبار میں کالم نگاری کرتے ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور ان کی کئی کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

www.taemeernews.com

مغربی بنگال میں اب کوئی مزاحیہ رسالہ نہیں۔ ہاں ایک رسالہ "بچہ: بھارت" تھا جو دوسری جنگ عظیم کے بعد جاری ہوا تھا۔ اس رسالے کے اطراف کچھ ادیب اور مصنف جمع ہوئے جنھوں نے مزاح لکھنا شروع کیا تھا جن میں جیوتی مائے گھوش (بھاسکر)، نانی گوپال بگھوتی اور باگچی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چھٹی دہائی میں کچھ ادیبوں نے مل کر ایک رسالہ "ٹیکا" بھی جاری کیا مگر کچھ ہی دنوں میں ختم بھی ہوگیا۔ اب صرف ایک ماہنامہ باقی رہ گیا ہے جو کارتیش گھوش نکالتے ہیں وہ خود مزاح سے عشق رکھتے ہیں اور ایک اچھے مزاح نگار بھی ہیں۔ ۲۵ سال سے نکلنے والا یہ رسالہ جس کا نام ہے "جشتی مدھو" افسوس ہے کہ مقبول نہیں اور جیسے تیسے زندہ ہے۔

اس طرح موجودہ صورت حال یہ ہے کہ بنگالی ادب میں مزاح کمزور ہوچکا ہے یا کم سے کم اس میں دوسری اصناف کی طرح جان نہیں جیسا کہ ۳۰، ۳۵ سال پہلے بنگالی ادب میں دیکھا جاتا تھا۔

بنگال نمبر میں مزاح اور کارٹونوں کے بارے میں میں نے جائزہ نہیں لیا جو بنگالی ادب کے مزاح سے مختلف ہے۔

آپ کی پسندیدہ

لاسا اسپیشل چائے

اور

لما چاکلیٹ چائے

نے

اپنے ۵۰ سال بفضل تعالیٰ

مکمل کرلیے ہیں!

www.taemeernews.com

ڈاکٹر پریتم سنگھ عرشی

پنجابی سے ترجمہ راز سنتوکھ سری

پنجابی نثری ادب اور طنز و مزاح

اہلِ پنجاب کو جس طرح سڈول جسم اور دریا دل ارباب قضا و قدر کی جانب سے ودیعت ہوئی ہے، ایسی طرح زندہ دلی اور شگفتگی بھی ورثے میں ملی ہے جو بے مثال اہمیت کی حامل ہے۔ اپنی اوصاف کی بدولت پنجاب کے جیالے سپوت ان گنت لڑائیوں اور زندگی کی بے شمار مشکلات کے ساتھ لوہا لیتے رہے ہیں!

پنجابیوں کی ہر حرکت سے پیدا ہونے والی ظرافت اُن کے اخلاق کی نشان دہی کرتی ہے۔ سرزمین پنجاب پر روحانیت اور انسانیت کے تخم کی آبیاری کرنے والے گرو صاحبان نے بھی مزاح کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اُن کا فرمان ہے:

ہسنڈیاں، کھلنڈیاں، پہنڈیاں
کھاوندیاں، دیندیاں ہووے مکت

وہ طرزِ فکر اہلِ پنجاب کو راس نہیں آسکتی جس میں دریا کی سی روانی اور طغیانی نہ ہو۔ اسی جوگی کا وہ محاورہ کہتے ہیں جو اُن کے پھٹے ہوئے کانوں کو پھر سے صحیح و سالم کرنے کو تیار نہ ہو جبکہ یہ پھٹے ہوئے کان اُن کے دل میں بسنے والی ہیر (محبوبہ) کے حصول میں اُن کے لئے ممد و معاون ثابت نہ ہوں۔ (بحوالہ ہیر از وارث شاہ) انہوں نے آج تک نہ کسی کے جبر کے سامنے سر جھکایا ہے اور نہ آئندہ سرِ تسلیم خم کریں گے۔ "جیونا مڑک دے نال چار دن گھٹ جیونا" ان کا نصب العین اور آدرش ہے۔

پنجاب میں بسنے والوں کی زندہ دلی جنم سے شروع ہوتی ہے اور تادمِ آخر قائم رہتی ہے۔ اور اس دوران میں ہی الفاظ اُن کے کانوں میں گونجتے رہتے ہیں:

"جب تو نے جنم لیا تھا تو تیرے اردگرد موجود لوگوں کے لبوں پر ہنسی تھی جبکہ تو رو رہا تھا۔ اب تو ایسے کارہائے نمایاں انجام دے کر مرتے وقت تیرے چہرے پر ہنسی اور مسکراہٹ کی بہار ہو اور اہلِ دنیا تیری مفارقت پہ گریہ وزاری کریں"

جو شخص ہنستا ہنساتا دنیا سے رخصت ہو وہ عام انسانی معیار سے بلند تر آدمی ہوتا ہے۔ کوئی شخص اُس وقت تک خنداں و فرحاں جا ہی نہیں سکتا جب تک اُسے رہنے کو اچھا گھر، کمانے کو اچھی روٹی اور گھر میں ایک شوخ و شنگ بیوی

www.taemeernews.com

موجود نہ ہو۔ چنانچہ وھنا بھگت ایک صوفی سنت نے اہل پنجاب کے اس وصف کی طرف اپنے شبد میں اشارہ کیا ہے:

وھنا بھگت نے خدا سے صاف صاف کہا ہے کہ دودھیل گائے اور دیگر اشیائے ضروریہ فراہم کر، صرف اسی صورت میں ہم تیری ریاضت میں مصروف رہ سکتے ہیں۔ بصورت دیگر اپنی مالا واپس لے لے۔ ہم بھگتی نہیں کرسکتے (''میں بازا یا محبت سے اٹھالو پان دان اپنا'')

سرزمین پنجاب کے ساکنان موت پر قہقہہ زن ہوسکتے ہیں، یہی اُن کا قابل ذکر وصف ہے۔ جو لوگ موت کی پرواہ نہیں کرتے، اُن کی ہنسی خوشی میں کون مخل ہوسکتا ہے۔

پنجابی کردار کی عظیم ترین خوبی یہ ہے کہ یہاں لوک گیت بے حد مقبول ہیں۔ بچوں کی لوریاں اور شادی کے موقع پر گائے جانے والے گیت "گھوڑیاں" ان لوک گیتوں کا حصہ ہیں۔ شہید بھگت سنگھ اور اُن کے رفقاء کے کارناموں پر مشتمل "وار ان" بھی یہاں لوگ عقیدت کے ساتھ گاتے ہیں۔ اسی نہج پر بابا دیپ سنگھ شہید، مرزا صاحبان، اور جرنیل شیام سنگھ اٹاری کی یاد "وار دں" کے روپ میں تازہ کی جاتی ہے۔ جو قوم تلواروں پر رقص کرسکتی ہو اُن کی زندہ دلی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اُن کے ہونٹوں پر تو یہی گیت مچلتا رہتا ہے:

"ہنس لے، کھیڈ لے، موج منا لے۔ زندگی دے بھروسے اک دن اُڈ جانا"

کسی قوم یا قبیلے کا جس نوع کا تمدن ہوگا، اُسی طرح کا اُس کا ادبی ورثہ ہوگا۔ چنانچہ ساری دُنیا میں بسنے والے اہل پنجاب کا طنز و مزاح یکساں نوعیت کا ہے۔

پنجاب میں تخلیق کی جانے والی ادبی تحریریں ویدوں کی تخلیق سے تا ایں روز اس امر کی شاہد عادل ہیں کہ آدمی محض حباب برآب ہی نہیں بھگوان کا روپ بھی ہے۔ بھگوان کا روپ بھگوان چاہے نہ ہو لیکن اس میں ایک شگفتہ پھول کی سی خوشبو ضرور ہوتی اور پنجابی سپوت اکثر آپ کو ایک شگفتہ پھول کی مانند ہی نظر آئیں گے۔

پنجاب کی سرزمین پر ہر دور میں ایسے زندہ دل لوگوں کی کمی محسوس نہیں کی گئی جو خود بے شک عمر بھر نشانۂ عتاب و عذاب رہے ہوں لیکن دوسروں کو کھل کر ہنسنے کی ترغیب دیتے رہے ہیں۔ "مُتھرا" اور "جلھن جٹ" ایسے ہی سہاپڑمش تھے جو ہنستے ہنساتے امر ہو گئے۔

پنجاب میں مزاح کے فروغ کے لئے بے شمار مواقع ملتے رہے ہیں۔ شادی، میلے، چھٹّہ (افتتاح) اور سگائی وغیرہ کی تقریبات ایسے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ جہاں ہر شخص کو قہقہے لگانے کا موقع ملتا ہے۔ دیہات میں "میراثی" ایسی تقریبات میں دی جانے والی خیرات پر گزر بسر کرتے رہے ہیں۔ نقال اور سوانگی مزاح کے میدان میں عوام کے غم دور کرنے کا سبب بنتے رہے ہیں۔

جدید پنجابی مزاح کا آغاز چرن سنگھ شہید سے ہوا۔ اُس نے اپنی کہانیوں، ناولوں، مضامین، نظموں اور مقالات کے ذریعے مزاح پیش کیا۔ اُس نے اپنے مزاح کے طلسم سے متاثر کر کے بے شمار لوگوں کو پنجابی زبان کا مطالعہ

www.taemeernews.com

کرنے پر مجبور کیا۔ اُس کی دو تصنیفات "بادشاہیاں" اور "ہسدے ہنجھو" اور چند کتابچے اُس دور کے مزاح کے عمدہ نمونے ہیں۔

چرن سنگھ شہید کا مزاح بیشتر رسومات اور جہالت کا مذاق اڑانے تک محدود ہے سادھوؤں اور سنتوں کے کتھا کرنے کے انداز سے متعلق تخلیقات اگرچہ موجودہ دور میں زیادہ اہمیت کی حامل نہیں لیکن اُس زمانے میں یہ بیحد مقبول تھیں۔

چرن سنگھ نے تین اسٹاک کیرکٹروں "سُتھرا" "بابا دریا ما" اور "مائی گنگو" کی تخلیق کی ہے۔ جو اپنے وقت میں بے حد مقبول رہے، لوگ آج تک اُن کا ذکر کرتے ہیں۔

چرن سنگھ کے بعد پنجابی ادب میں نئی طرز کے مزاح کی بنیاد پڑی۔ عصرِ حاضر میں پنجابی کے مزاح نگاروں میں پرنسپل کنھیالال کپور، ایشر سنگھ ایشر (بھاٹیا) ہرندر سنگھ روپ، ڈاکٹر گنام سنگھ تیر، جرنیل سنگھ عرشی، صوبہ سنگھ ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد، شمشیر سنگھ سرد نا۔ بے۔ ایل نندہ، انت سنگھ کابلی، پیارا سنگھ داتا، ایس ایس امول۔ کے ایس گرگ۔ شیر جنگ جانگلی، دلجیت سنگھ بھاٹیہ، نخت سنگھ کومل، جگدیش پرشاد کوشک، گردیو سنگھ مان، سنت اندر سنگھ چکر ورتی، گیان کور اور بلبیر سنگھ سوہی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

عمر کے اعتبار سے اور تخلیقاتِ شعری کی ضخامت کے لحاظ سے ایشر سنگھ بھاٹیا نے خاصا نام پیدا کیا ہے۔ حاضرین اُس کی نظم سُننے سے پیشتر اُن کا حلیہ دیکھ کر ہنسنا شروع کر دیتے تھے۔ بھاٹیا کی ہر نظم میں "نھو پھیلو" "لمو پنجو" اور ایرا غیرا کی تکرار اس درجہ ہے کہ داد دینے کی بجائے بعض اوقات اُس پر رحم آنے لگتا ہے۔"

پیارا سنگھ داتا نے اس موضوع پر ڈھیروں تخلیقات پیش کی ہیں لیکن اُس کے ہاں ظرافت کی بجائے سنجیدگی کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ اکثر اُن کا مرکزی خیال آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن بایں ہمہ عوام ان کی تحریریں دلچسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں [illegible] زبانوں سے مزاحیہ تخلیقات کا پنجابی میں ترجمہ کیا ہے۔ وہ ایک معروف مزاحیہ رسالہ "نواں ساہت" کے ذریعے پنجابی مزاحیہ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔

پرنسپل کنھیالال کپور در حقیقت اُردو کے ادیب تھے۔ لیکن تقسیمِ ملک کے بعد اُنہوں نے پنجابی اور ہندی میں بھی قلمی خدمت کا آغاز کیا۔ پنجابی میں آپ اکثر ریڈیو کے لئے لکھتے رہے۔ مزاح نگاری کی تکنیک سے جس قدر کپور صاحب واقف تھے اتنا شاید کوئی اور نہ ہو۔

شمشیر سنگھ سرد نا نے پنجابی صحافت میں مزاح کو مروّج کیا۔ اُن کی زیرِ ادارت چھپنے والا رسالہ "جیون پریتی" طنز و مزاح پر مبنی تخلیقات باقاعدہ طبع کرتا رہا ہے۔ وہ کچھ عرصہ تک ریڈیو اسٹیشن کے ڈائرکٹر بھی رہے۔ اِس لئے ان کی تحریریں ڈراما ئی اور ریڈیائی اوصاف نمایاں ہیں۔ ان دنوں وہ انگریزی اخبار "پنجاب میل" کے مدیر ہیں۔ یہ اخبار ہفتہ وار مزاح کے کالم پیش کرتا ہے۔

صوبہ سنگھ اور جرنیل سنگھ عرشی پنجابی ادب میں گرنام سنگھ تیر کی وساطت سے آئے۔ صوبہ سنگھ کا تعلق ضلع امرتسر

www.taemeernews.com

سے تھا۔ ایم۔ اے ریاضی پاس کرنے کے بعد فوج میں نوکری کرلی۔ بعد ازاں آئی۔ این۔ اے کے روپ میں اسیر ہوئی۔ جاپان کی قید میں رہا۔ پھر رہا ہوا تو جنرل سنگھ کے پی۔ اے مقرر ہوئے۔ بے شمار تکلیفوں کا سامنا کیا لیکن ہمیشہ اُن پر ہنستے رہے۔

گرنام سنگھ تیر نے صوبہ سنگھ کو جنرل موہن سنگھ سے حاصل کیا اور انھیں اپنے اخبار "پنجابی تیر کا" کا مدیر مقرر کیا۔ صوبہ سنگھ نے اپنی اولین مزاحیہ تخلیقات اسی اخبار کے ذریعے پیش کیں۔ کچھ عرصے کے بعد صوبہ سنگھ محکمۂ تعلقاتِ عامہ پنجاب میں شمشیر سنگھ سرون کی جگہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ کے پی۔ آر۔ او مقرر ہوئے۔ صوبہ سنگھ مزاحیہ ادب کی گرانقدر خدمات بجالاتے ہوئے فوت ہوئے لیکن اُن کی تخلیقات نے انھیں امر بنادیا۔

صوبہ سنگھ کی مزاحیہ تخلیقات پر مشتمل اُن کا مجموعہ "اگ تے پانی" طبع ہوا جو بے حد مقبول ہوا اور جملہ اہلِ نظر تنقید نگار اُس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے۔ ریڈیو کے لئے اُنہوں نے بے شمار نظمیں اور مضامین تخلیق کئے۔ جو بے حد پسند کئے گئے۔ نظموں کا ایک مجموعہ ہیر صوبہ سنگھ، اور چند مجموعہ ہائے مضامین اُن کے چھپ چکے ہیں۔ جن کا ادب میں منفرد مقام ہے۔

ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر کا جنم ۳۰ جون ۱۹۲۰ء کو موضع کوٹ سکیا ریاست فرید کوٹ میں ہوا۔ اُن کے والد سردار گردیال سنگھ سدھو براڑ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ تعلیم ڈبل ایم اے، پی ایچ ڈی۔ ایل ایل بی۔ ایم۔ ڈی۔ ڈی۔ پی ایچ ڈی ہے۔ انگریزی، ہندی اردو اور پنجابی میں لکھتے ہیں۔ ایک مقام پر اُنہوں نے ذکر کیا ہے کہ روزی انگریزی میں لکھ کر پیدا کرتا ہوں اور اپنے ارمانوں کے اظہار کے لئے پنجابی تخلیقی ادب کا سہارا لیتا ہوں۔"

پنجابی طنز و مزاح کے میدان میں ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر کی تخلیقات بہت سراہی گئی ہیں۔ ان کی دو درجن کے لگ بھگ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ ریڈیو اور فلم کیلئے بہت کچھ لکھا ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں تیر کی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کو تنقیدِ ادب کے معیار پر جانچ کر بلراج ساہنی سرگباشی نے السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا میں رائے ظاہر کی تھی کہ جہاں تک تیر کے لطیف طنز و مزاح کے معیار کا تعلق ہے، وہ ڈاکٹر اسٹیفن لی۔ کاک سے بھی بازی لے گیا ہے۔"

ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر کی مشہور کتابوں میں سے "سہنی دُنیا" "آدھی رات دیاں باتاں"۔ "دِن چڑھ ندے دی لالی" "گھنجلاں" "ٹھٹھیاں پیڑاں" "سینوں مقبول بچار" "چھو منتر" "عقل جاڑھ"، "نویکلیاں مدّاں"، "آرٹسٹ بولیا"۔ "اندرلی آگ" "گرُدھنی" "دیلاں ہریاں" اور "ویلے سر سکدا سی" وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ افسانہ، مضمون، نظم، ناول یا ناٹک جس صنف میں اُس نے قلم تھاما اس میں مزاح اور ظرافت اس طرح آ گیا جیسے چینی میں گھی نفوذ کر جاتا ہے۔

ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر کی تخلیقات پر اُس کی اپنی زندگی بے حد اثر انداز ہے۔ اُس نے بے شمار پاپڑ بیلے۔ ان گنت لوگ دیکھے۔ بہت سے واقعات نظر سے گزرے۔ جو کچھ لکھا اُس میں گہرائی ہے۔ اور ہر تخلیق ایکس رے کا حکم رکھتی ہے۔

گرنام سنگھ تیر ریلوے میں ڈپٹی چیف ٹریفک کنٹرولر کے عہدے پر فائز رہا۔ "ڈیک سپرنٹنڈنٹ" سے لے کر سنتوشی گنج مین تک ایسے کرداروں کے ساتھ اُس کا رابطہ رہا۔ جس کردار کے ساتھ واسطہ پڑا اُسی کا خاکہ اپنی تحریروں میں پیش کرتا رہا۔ وہ ریلوے فٹ بال ٹیم کا تین سال تک کپتان رہا اور اس طرح کھیلوں کی دنیا میں بھی اس نے اپنا نام حاصل کیا۔

www.taemeernews.com

کچھ عرصے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا پریس سکریٹری رہا۔ جیل دیکھی۔ قیدی دیکھے، انگریز افسران دیکھے یونی نسٹ حکومت دیکھی، دیگر سیاسی پارٹیوں کا مطالعہ کیا۔ مخالفوں کے خیالات اور چالوں کی ٹوہ لی اور سیاسی لوگوں کی منافقت اور فریب کاری کی نسبت ایسا طنزیہ تخلیقات پیش کیں کہ دھوم مچ گئی۔

تیرمیان صحافت میں کودا۔ بارہ برس تک ٹائمز آف انڈیا۔ سٹیٹسمن ــــ ہندستان ٹائمز، ٹریبیون۔ بمبئے کرانیکل، انڈین ایکسپریس۔ سنڈے سٹینڈرڈ اور پی۔ٹی۔آئی کے ہمراہ کام کیا۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی کو جانچا پرکھا۔ اپنے مشاہدات کو صفحۂ قرطاس پہ منتقل کردیا۔ پنجابی صوبہ کے حصول کی جدوجہد میں اُس نے شرومنی اکالی دل کا ساتھ دیا۔ گزشتہ چند سال سے وہ سکھ سیاست میں نئے نقوش ابھار رہا ہے آنند پور صاحب ریزولیوشن کی تکمیل کی ناطر گرنام سنگھ تیر نے اکالی مورچہ کا آغاز کردیا۔ آل انڈیا گردوارہ ایکٹ کا مسودہ تیار کیا اور سکھ پرسنل لاز کے لئے قوم کو ترغیب دی

گرنام سنگھ تیر کی تحریر میں وہ لطافت ہے کہ تمام دکھ پڑھ لینے کے بعد ہنسی آتی ہے اور بے ساختہ اُس کا قلم چومنے کو جی چاہتا ہے۔

پنجابی ناٹک ماؤ لاگ یعنی یک کردار ناٹک لکھنے کو تیر نے مروج کیا۔ اُن کے بعض ناٹک اور ماؤ ناگ دودھ بھارتی کے علاوہ ماسکو ریڈیو سے بھی نشر ہو چکے ہیں۔

اِن دنوں گرنام سنگھ تیر سپریم کورٹ آف انڈیا اور پنجاب ہریانہ ہائی کورٹ کے سربرآوردہ وکلا میں سے ہے وہ قانونی بحث مباحثہ میں بھی بعض اوقات طنز سے کام لیتے ہیں۔

ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر کی میں جدید اظہارِ خیال اور اسلوب نمایاں ہوتا ہے جدید نظام میں انگریزی الفاظ کا استعمال محض ظرافت پیش کرنے کے لئے کیا جاتا ہے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اُن کی مزاحیہ نظمیں بے حد مقبول ہوئیں۔

گرنام سنگھ تیر مختلف چیزوں سے ظرافت پیدا کرتا ہے۔ اُس کے کرداروں کی کوئی نہ کوئی کل تیڑھی ہوتی ہے اُس کے کرداروں کی اقسام اس قدر مختلف النوع ہیں کہ بآسانی ڈکشنری آف ہیومرکیریکٹرز مرتب کی جاسکتی ہے۔

گرنام سنگھ تیر کا ایک تقریر ملی پیر "رنگ برنگے پاتراں دی بھال دی" حکومت ہند کے شعبۂ صحافت اور آکاش وانی کو اتنی پسند آئی کہ ۳۰ سے زائد ہندوستانی زبانوں میں کیا گیا۔ اُس کے کردار "چاچا چنڈی گڑھیا" کا ہر ہفتے پچاس لاکھ لوگ بے حد تجسس کے ساتھ انتظار کرتے اور مطالعہ کرتے ہیں "اجیت" جالندھر کے علاوہ یو۔کے، کینیڈا، سنگاپور، اور ملائیشیا کے اخبارات چاچا چنڈی گڑھیا فیچر کو اپنے ہاں چھاپتے ہیں۔

ڈاکٹر تیر کی کہانیوں اور مضامین کا ترجمہ ہندوستان کی جملہ زبانوں میں چھپ چکا ہے۔ اور ہر زبان کے ناشر اُس کی مزاحیہ تخلیقات پر مشتمل کتابوں کی اشاعت کے لئے مطالبہ کر رہے ہیں۔

بعض لوگوں کی تحریروں میں ظرافت ہوتی ہے۔ بعض دیگر کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور بعض انسانوں کی گفتگو ظرافت آمیز ہوتی ہے۔ گرنام سنگھ تیر کو قدرت کی طرف سے یہ تینوں صفات ودیعت ہوئی ہیں۔

www.taemeernews.com

لیکن قسمت نے کبھی اُس کا ساتھ نہ دیا۔ غالباً اسی امر کے پیشِ نظر پرنسپل کنھیالال کپور نے تیر کی نسبت تحریر کیا تھا: تھا اس بار ڈی پر قسمت مہربان تھی۔ لیکن وہ قسمت سے ناراض تھا۔ تیر پر تقدیر نامہربان رہی، لیکن وہ تقدیر پر شاکر رہا یعنی مصائب کے چنگل میں گرفتار بھی ظرافت کے گل کھلاتا رہا۔

اکیلے گرنام سنگھ تیر کی تخلیقات کو کسی بھی ہندوستانی زبان کی جملہ مزاحیہ تخلیقات کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ مزید براں یہ امر طے ہے کہ لطیف اور متاثر کن نظریے سے جانچنے پر تیر کا پلڑا اوپر بھی بھاری رہے گا۔ اسی لئے پرنسپل دلیپ سنگھ بھوپال نے تیر کو مزاح نگاری کا "وزیراعظم" اور گربچن سنگھ براڑ نے "شاہنشاہ" کہا ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں اُس نے جو تخلیقات پیش کی ہیں، علی الخصوص فیلر کو میں سٹیڈیا ہے: "ویسے سر سکدا سی کتھے ٹھہریے؟!" "گل بوڑ ڈوچ رہے"۔ "اک کڑی دا نو لٹیر"۔ "سوہرا ڈچ" وغیرہ کو دُنیا کی کسی زبان کے مزاحیہ ادب کے برابر کہا جا سکتا ہے۔ پرنسپل کنھیالال کپور نے تیر کے مزاح کو سونے کی ایسی ڈلی سے تشبیہ دی ہے، جسے جس ملک میں چاہو اسمگل کر لو۔ کپور صاحب رحمۃ اللہ علیہ "تیر" کو محض تیر نہیں بلکہ ترکش کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

ان دنوں گرنام سنگھ تیر پنجابی زبان انگریزی مزاح کی ایک کتاب بعنوان "رسٹک وزڈم آف دی ورلڈ" (RUSTIC WISDOM OF THE WORLD) کی تخلیق میں مصروف ہے۔

ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر ایک مصنف ہونے کے علاوہ اعلیٰ درجے کا مقرر بھی ہے۔ اُس کے متعلق عام رائے یہ ہے کہ وہ گھنٹوں تقریر کرتا ہے اجتماع میں موجود سامعین میں سے کوئی کہیں اور جا نہیں سکتا۔ کیوں کہ تقریر کے دوران وہ عام طور پر چست مزاحیہ فقرے کستا رہتا ہے۔

کوئی درباروں کی نسبت سے تو یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ جس کوئی دربار کی نظامت کے فرائض تیر کے سپرد ہوں وہ کوئی دربار "رہ راس ویلے" (شام) سے لے کر "آسا دی وار" (صبح) کے اختتام پذیر ہونے تک جاری رہتا ہے۔ محال ہے کوئی سامع وہاں سے اُٹھ کر جائے!

ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر نے بہت سے پنجابی مزاح نگاروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ علی الخصوص صوبہ سنگھ، شمشیر سنگھ سرؔدھ، جرنیل سنگھ عرشی، دلیپ سنگھ بھوپال، کرنم سنگھ مستانہ، سوندر سنگھ بھاگووالیہ شیر جنگ جانگلی، گردیو سنگھ مان، کوتک نرنجن شرما سیکھا، خطرہ سنگھ، کرتار سنگھ سنتوش، رام لال نابھوی، بھرپور سنگھ گریوال، گردیپ سنگھ سیدیو، راجندر ناتھ بجلی، اور گربچن سنگھ براڑ وغیرہ کو اُنہوں نے خصوصی ترغیب دی ہے۔

عرشی نے تیر صاحب سے ترغیب اور تاثر پا کر پنجابی مزاحیہ تخلیقات کے دو مجموعے طبع کئے۔ ایک نثری مجموعہ بعنوان "بڈ بیتیاں" (آپ بیتی) اور دوسرا منظوم ظرافت نگاری کا۔ عرشی صاحب نے لدھیانہ سے ہفت روزہ اخبار "للکار" جاری کیا۔ جو "پنجابی پتر کا" کی پابند طنزیہ مزاحیہ تخلیقات پر مشتمل ہوتا تھا۔ بے شمار لوگوں نے "للکار" کو اپنے پاس محفوظ رکھا ہے۔ عرشی صاحب کی وفات سے تیر صاحب اور صوبہ سنگھ کو بہت صدمہ ہوا۔ اگر زندگی وفا کرتی تو عرشی پنجابی مزاح و طنز کو چار چاند

www.taemeernews.com

لگادیتا۔ عرشی کی تصنیف "ہڈ بیتیاں" کا دیباچہ ۱۹۷۸-۱۹۷۹ء میں تیر نے لکھا۔ جس سے کتاب میں شامل طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات کی گہرائی اور گیرائی کی نشان دہی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر تیر نے مشہور طنز و مزاح نگار رنجن شرما سیکھا، کرتار سنگھ سنوتش اور دیگر متعدد ادباء کی کتابوں کے دیباچے تحریر کئے۔ جن میں طنز و مزاح کی لطافت کو اُجاگر کیا۔

اِن میں سے اکثر کا تذکرہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ گردیو سنگھ مان ایک کوی ہے، اگرچہ وہ اپنی کویتاؤں میں مزاح کی آمیزش نہیں کرتا، لیکن اکثر کوی درباروں کے انعقاد پر اس کا طنز بہت خوب ہوتا ہے۔ تیر نے مان کی بے حد حوصلہ افزائی کی ہے اور اُسے مزید بہتر تخلیقی کام کے لئے ترغیب دی ہے۔

جانگلی طنزیہ مضامین کی تخلیق کرتا ہے: بھلی نظم، براڑ ٹوٹکے، خطرہ سنگھ سیاسی فاکے اور شمشیر سنگھ سرو ج ہر اس چیز پر طبع آزمائی کرتا ہے جو اس کے پیشِ نظر ہو۔

ڈاکٹر سادھو سنگھ ہمدرد بنیادی طور پر اخبار نویس ہے لیکن پنجاب میں اردو کی ساکھ کم ہو جانے پر پنجابی میں لکھنے لگے۔ ہنوز اُن کا انداز نکھار اردو والا ہے۔ پنجابی میں اُنہوں نے عدیم المثال ماڈرن غزلوں کی تخلیق کی ہے۔ جو بہت مقبول ہوئی ہیں، ہمدرد مزاحیہ غزلوں کا "سرپنچ" ہے۔ اِن مصنفین کے علاوہ چند اور لکھنے والے ہیں جو مزاح نگار تو نہیں ہیں لیکن ان کی تحریروں میں مزاح اس طرح موجود ہے جیسے کیکر کے درخت میں گوند۔ اِن میں سے نانک سنگھ نادلیٹ، بھائی ویر سنگھ، ایس۔ ایس۔ امول، بلونت گارگی، آئی، سی۔ ندہ۔ گربیال سنگھ کھوسلہ، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، کرتار سنگھ دگل، سنت سنگھ سیکھوں، جسونت سنگھ کنول، کلونت سنگھ ورک، کپور سنگھ گھمن، ڈاکٹر سرجیت سنگھ سیٹھی اور بھگونت سنگھ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان کا مزاح یوں ہوتا ہے جیسے کھانے کے ساتھ چٹنی ہو۔ ان سب میں گارگی خصوصی مقام کا حامل ہے۔ اس کی تصنیف "نم دے پتے" اعلیٰ مزاح کے قریب پہنچتی ہے۔

بہت سے دیگر مصنفین معمولی طنزیہ چیزیں تو پیش کرتے ہیں لیکن مزاح اُن کے ہاں کم تر ہے۔ مزاح نگار وہی ہو سکتا ہے جو اپنی کھلی خود اُڑا سکتا ہو۔ جو دوسروں کی ہنسی اڑاتا ہے وہ طنز نگار ہوتا ہے، مزاح نگار نہیں۔

پنجابی ادب اس امر پر نازاں ہے کہ ہندوستانی زبانوں میں سے عمدہ ترین تخلیقات طنزیہ و مزاحیہ صنف میں اس میں موجود ہیں۔ پنجابی ادب لگ بھگ اردو طنز و مزاح کے برابر کا ہو گیا ہے اور اس کا زیادہ تر کریڈٹ ڈاکٹر گرنام سنگھ تیر کو حاصل ہے۔

ناشر
زندہ دلانِ حیدرآباد

چنانچہ

قیمت ۱۲ روپے

نامور مزاح نگار
مسیح انجم
کے
مزاحیہ مضامین کا مجموعہ

www.taemeernews.com

این۔وی۔گوپالا شاستری
اور ایس۔نارائیشور راؤ

انگریزی سے ترجمہ
ڈاکٹر یوسف کمال

تلگو مزاح (نثر)

مسٹر گوپالا شاستری حکومت آندھرا پردیش میں جسمانی طور پر معذور افراد کی کارپوریشن کے ڈائرکٹر ہیں تلگو زبان و ادب پر ان کی نگاہ گہری ہے۔ ان کے معاون مضمون نگار نارائیشور راؤ ریاستی محکمۂ اطلاعات میں ملازم ہیں۔ اور تلگو میں ان کی مختلف نوعیت کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں ــ ادارہ]

——— "جنوبی ہند کی ۵ زبانوں یعنی تلنگی، کنڑی، تامل، ملیالم اور سنسکرت میں تلگو سب سے زیادہ مشکل اور سب سے زیادہ مہذب زبان ہے۔ اس میں خیالات اور افکار کے اظہار کی بے پناہ قوت ہے۔ جو ایک خاص صاف چمک، روانی اور وقار کے ساتھ اس زبان میں نظر آتی ہے" ــ ڈاکٹر کیری (۱۸۱۲ء)

——— "چند ہی زبانیں ایسی ہیں جو اپنی ساخت اور مخصوص اسلوب اظہار کے ساتھ اتنی باوقار اور خوشنما آہنگ ہیں جیسی کہ تلگو زبان" ــ ڈاکٹر کیمبل (۱۸۱۶ء)

——— "کچھ علم نہیں، کچھ قوت برداشت اور کچھ مزاح کے ساتھ زندگی ایک حیرت ناک تجربہ بن جاتی" ــ سامرسٹ ماہم

تلگو ادب میں مزاح ایک اہم صنف ہے جو کبھی کبھی فلسفیانہ قسم کی لفاظی میں بھی بدلتا جاتا ہے۔ ہمارے بزرگ، نورسالوں میں "ہاستیارسا" کو بھی ہر ممکن طور پر شامل کرتے تھے جن میں سریکارا، کردنا، روودرا، ویرا، بھیانکا، بل بھاتسا، سانتا اور

www.taemeernews.com

اوبھتا بھی شامل ہیں۔ سامرسٹ ماہم نے ایک بار کہا تھا کہ رد یہ انسان کی چھٹی حس ہے جس کے بغیر حواس خمسہ سے لذت حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ایک تلگو شاعر نے بھی یہ محسوس کیا کہ حسِ مزاح خود ایک چھٹی حس ہے جس کے بغیر ادبی تحریریں کامیابی کی ضمانت سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں۔

قدیم زمانے میں پرمانا دیا سکھ کچھ شاگردوں نے کچھ ایسی مزاح سے بھرپور زندگی گذاری تھی کہ آج بھی ان کی حکایتیں عوام اور خواص دونوں میں یاد کی جاتی ہیں۔ پھر تنالی رام کرشنا کے مشہور واقعات اور حکایتیں ہیں جو آپ کو ہنستے ہنستے مار ڈالتی ہیں۔ جنوب میں تنالی رام کرشنا کی حیثیت تقریباً ایسی ہی ہے جیسے شمال میں بیربل کی۔ گذری ہوئی نسل کے ہنگامہ خیز مزاح کاروں میں کنڈوکوری، گرازادا، پنوگنتی، چلاکا مارتی، نکاپ تی، بھامڑی پتی اور متی مانیکم خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کنڈوکوری نے سماج کے حساس مسائل پر لکھ کر زندگی کے نہایت گنہ ے پہلوؤں کا خوب مذاق اڑایا ہے جس میں خاص طور پر بے ایمانی رشوت ستانی اور دغابازی شامل رہے ہیں۔ اس نے بچپن کی شادی کی روایت اور نوکر شاہی کی زیادتیوں کو بھی اپنی مزاح نگاری کا موضوع بنایا اور بعد کو وہ جنوب کا بڑا مصلح بن کر ابھرا۔ ویرسالنگم بھی مزاح نگار اور طنز نگار تھا جس نے بڑی کامیابی کے ساتھ اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا اور سماج کی برائیوں کے خلاف زندگی بھر جہاد کیا۔

تلگو ادب کی اور زبردست بلند شخصیت جاوی گرازادا ہے جس نے تلگو زبان کی ہر صنفِ سخن میں رہنمائی کی۔ نثر، نظم، ڈرامہ اور خود مزاح نگاری میں اس نے تلگو کو نئے نئے افق سے روشناس کرایا۔ "کنیا سلکم" Kanya sulkam گرازادا کا سب سے اہم کارنامہ ہے جس میں اس نے طنز میں بھگو کر اپنے قلم سے معاشرے میں سرایت اس برائی کی جڑ کاٹی ہے جس میں لڑکیوں کو شادیوں کے لئے خریدا جاتا تھا۔ وسا کا پٹم کی مقامی بولی میں لکھا گیا یہ ڈرامہ آج بھی تلگو ادب میں معاشرہ کے ایک شاہکار طنز کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ ویسے تو اس نے کئی کردار تخلیق کئے۔ لیکن "گری رام" اس کا ایک ایسا کردار ہے جس کے پاس ہر مسئلہ کا حل ہے، اور ہر حل خود مسائل سے بوجھل۔ یہ کردار گرازادا کا سب سے دلچسپ اور سب سے جٹ بھرا کردار ہے۔ گری رام تلگو ادب کا سب سے زیادہ مقبول اور تفریحی کردار ہے۔ دروغ گو، شیخی باز، چلل خور، مجہول، نیم حکیم، ابن الوقت، مسخرہ اور دل پھینک، وہ ایک معمولی آدمی ہے۔ نکما، کمزور اور بے صلاحیت اسے ہر قدم پر زندہ رہنے کے لئے کاوش سے کام لینا پڑتا تھا۔ زندگی کی ضرورتوں کے لئے خود کو بیچتا ہوا۔ تلگو قاری اور ناظر کے لئے یہ ڈرامائی کردار ایک زندہ حقیقت بن گیا تھا۔ اپاراؤ کا یونانی کامیڈین اڑسٹوفینس کے ساتھ نام لیا جاسکتا ہے جو سماجی موضوعات پر ڈرامے لکھا کرتا تھا۔ اڑسٹوفینس نے "لیسناٹی" لکھا (نساس کی عورت) جس میں لافانی یونانی عورت کے کردار پر طنز کیا گیا ہے۔ اپاراؤ نے "کنیا سلکم" کے ذریعے دولہا کی فروخت پر طنز کیا ہے۔ مشہور نقاد ڈاکٹر رام ریڈی کے الفاظ میں "کنیا سلکم" معاشرتی طنز کا ایک شاہکار ہے۔ جس میں انسانیت کی جگمگاتی تصویر زندگی کے سارے اچھے برے اور بھونڈے اور خوبصورت تضادات کے ساتھ نمایاں ہے۔

ایک طویل زمانے تک لکشمی نرسمہاراؤ کا ایک ڈرامہ "کانتا بھرنم" آندھرا والوں کے ذہنوں کو مسخر کیا ہوا تھا۔ اس

www.taemeernews.com

کے ساتھ ساتھ منگا ساستری کے "سماجی" ڈرامے بھی غیر معمولی مقبولیت کے حامل ہیں۔ یہ ڈرامے تمسخر آمیز، طنزیہ، اصلاحی اور تادیبی نوعیت کے ہیں جو آج بھی مقبول ہیں۔ موفٹ، ایڈیسن اور اسٹیل سے متاثر ہوکر ساستری نے یہ شاہکار تخلیق کیے تھے۔ منگا ان طنزیہ اور مزاحیہ واقعات کے تانے بانے بہرحال تلگو معاشرے کی جڑوں میں پیوست ہیں۔ اس طرح وانی داس اور پرتاشیٹی بھی مزاح میں اسی اسلوب کے قابل ذکر ادیب ہیں۔

"کپسا پڑنا" ویدم وینکٹا رایا ساستری بھی ضلع نیلور کا ایک ایسا مزاح نگار ہے جس کے ڈرامے "پرتاپ رُدریم" نے ایک نسل کو متاثر کیا ہے۔ سری ساستری کے اس ڈرامے کے مرکزی کردار "پیری گاڑو" میں بادشاہ کا ایک ایسا احمق نما مصاحب پیش کیا گیا ہے جس کی انتقالی صلاحیتیں صفر کے برابر ہیں۔ چنانچہ تلگو معاشرے میں ناکام خسران کا اب معروف استعارہ یہی "پیری گاڑو" ہوگیا ہے۔

چلکا مارتی نے بھی اپنی طنزیہ اور مزاحیہ تحریروں سے آندھرا کے اولین ناول نگاروں اور ڈرامہ نگاروں میں منفرد مقام حاصل کرلیا ہے۔ اپنی ناول "گنیش" میں اس نے ایک دیہاتی کے کردار کو شہر کے ماحول میں بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ چلکا مارتی اپنے لطیف مزاح کے لئے بھی بڑی شہرت رکھتے ہیں چنا پنوان کی ناول "پیڑا کھانم" میں ایک کردار دوسرے سے سوال کرتا ہے کہ "جناب یہ روڈ کہاں جاتی ہے" تو اسے جواب ملتا ہے "جہاں تک مجھے معلوم ہے یہ راستہ کبھی کہیں نہیں گیا"

بھمڑی پتی کامیشور راؤ نے بیشمار انشائیے اور ڈرامے لکھے۔ اپنے مزاحیہ مضامین اور ڈراموں میں اہل آندھرا کے آپسی حسد، بخل، کم ظرفی، تنگ نظری اور دوسری معاشرتی برائیوں کو اپنے منفرد اسلوب میں پیش کیا ہے۔ اس نے فرانسیسی ادیب مولیر کے انداز میں ڈرامے لکھے۔ مُنی مانیکم کو کنبہ اور خاندان کی زندگی کے عام واقعات سے مزاح پیدا کرنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اس نے ایک ایسا کردار "کانتم" پیش کیا ہے جو کہانی کار کا شریک حیات بھی ہے۔ اس کی اکثر و بیشتر کہانیاں اور ناول متوسط طبقے کی زندگی کے اطراف گھومتی رہتی ہیں۔ واقعاتی مزاح کا ایک دلچسپ کردار "کونگی" بابی راجو جیسے مصنف کی تخلیق کا مرہون ہے جو اس صدی کے چوتھے دہے کے شہرت یافتہ ناول نگار ہیں اور ایک رسالہ "میزان" بھی نکالتے رہے۔ کردار تخلیق کرنے کی اس مہم میں لاپاڑی وینکٹ رمنا نے بھی اپنا حق ادا کیا جو آج کل تلگو فلموں سے وابستہ ہو گئے ہیں۔ لاپاڑی کے مشہور کرداروں میں "باڑوگو" "رنڈو جلاسیتا" "سنی گنا چیسو نامبا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان کی کہانیوں میں سماج کی نابرابریوں کی بڑی دلچسپ، دردناک اور پرمزاح تصویریں ملتی ہیں جو انسانی ذہن کو قریب سے دیکھنے کا موقع بھی فراہم کرتی ہیں۔ ان کا ایک ڈرامہ "راجکیہ بھیٹلا پنچادم ستی" آج کی سیاست پر بہت تیکھا تلخ اور ترش طنزیہ شاہکار ہے۔ ان کے مزاح میں خود کی غلطیوں کو ہنسنے کے ساتھ ساتھ، زندگی کے آلام کا سامنا کرنے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔

تلگو مزاح صرف ادب ہی نہیں بلکہ دیہی گیتوں اور قبائلی نغموں (جن کو گونا ڈو کہتے ہیں) میں بھی سرایت کیا ہوا ہے۔ اس کی بہترین مثالیں ہزاروں سال سے ہمارے لسانی ورثہ کے طور پر کٹھ پتلی تماشوں میں تمسخر اڑانے کرداروں کی صورت میں ہمارے درمیان جلوہ گر ہے۔ تلگو تہذیب کا ایک خاصہ "تیراکتھا" بھی ہے جس کے تمسخر اڑانے کردار آج بھی مقبول ہیں۔ رائلسیما کے علاقے میں اس کو "تانڈانا تکا" کہتے ہیں۔

www.taemeernews.com

تلگو دنیا کا پہلا کارٹون نگار تال سئی راماراؤ ہے جو بہرام پور کے ایک سنجیدہ وکیل تھے۔ اس عظیم تلگو مدیر یعنی جانکالی سری راما مورتی کو لوگ نہیں بھول سکتے۔ جس نے ۴۰ ویں دہے میں اپنے رسالے کو تمام کے لئے وقف کر دیا تھا۔

باپو ایک ہمہ جہتی شخصیت کا مالک فن کار ہے۔ وہ بیک وقت کارٹون نگار آرٹسٹ اور فلم کا ہدایت کار بھی ہے۔ اس نے تلگو کارٹون کو نئی جہت عطا کی ہے۔ اس نے تلگو صحافت کا ڈھانچہ بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس کی مقبولیت اور اثر انگیزی کی ایک عام مثال یہ ہے کہ یونیورسٹی اور کالج کی چھیل چھبیلی لڑکیوں کو آج کل "باپو بُما" Bapu Bomma کے نام سے بیان کیا جانے لگا ہے۔

پورنم بیرانم شرما، گوپاپاڑی مارو تی راؤ، آدی وشنو، سری ہری اور ایم وی ال چند ایسے مقبول کالم نگار ہیں جن کے طنز اور مزاح سے رسالوں میں لوگ آئے دن محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔

وینکٹ سوریہ نارائن کا کرشنا پتریکا میں کالم "وڈاگالو" آندھرا پتریکا میں "آشا ماشی" اور آنند وانی میں "کاپو کانی" کوئی چالیس سال تک لکھے جانے والے مزاحیہ کالم تھے جن کا اپنا ایک مخصوص معیار ہمیشہ برقرار رہا تھا۔ اس طرح سوریہ نارائن ـــــ خوب لکھنے والا ایک معیاری کالم نگار تھا۔ اسی طرح وامن راؤ کا کالم "کالا شے یم" آندھرا پربھا میں اور نارائن مورتی کا کالم "پان سپاری" بھی چوتھے اور پانچویں دہے کے بہت مقبول کالم تھے۔

تلگو ریڈیو اور فلموں میں بھی مزاح نے ایک مقام پیدا کیا ہے۔ جن ادیبوں اور مصنفوں نے ان میدانوں میں اپنی صلاحیتوں کو بامعنی بنایا ہے۔ ان میں آل انڈیا ریڈیو وجئے واڑہ کے پریاگ اور نندوری سبارا ؤ خاص طور پر ریڈیو مزاح میں مقبول ہو چکے ہیں جبکہ کستوری سیوارا ؤ، جوگارا ؤ، رمنگی، رمنا ریڈی، بالا کرشنا، راج بابو وغیرہ نے کامیڈی فلموں کے ذریعے مزاح کی خدمت کی ہے۔

پنچاپور رلوم، یرم شیٹی سائی، نرسا راجو، پرساد راؤ وغیرہ نے تلگو فلموں میں اپنی تحریروں سے مزاح کا ایک خوش پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔

اس طرح تلگو ادب میں مزاح کا مقام نہ بہت ہی طاقتور ہے اور نہ ہی کمزور۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ تلگو میں ناول کا بازار بہت گرم ہے۔ تلگو ناولیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں جبکہ مزاح کی کوئی مارکیٹ نہیں۔ حالانکہ بدیسی ملکوں کے مزاح نگار خوب روپیہ پیسہ کماتے ہیں۔ بدھا کی سرزمین اور سنجیدہ چہروں کے درمیان مزاح کو محض ثانوی درجہ دیا گیا ہے۔ توقع کی جانی چاہیئے کہ ۲۰۰۰ء تک ہم لوگ اس قدر صحت مند ہو جائیں گے کہ مزاح ہماری زندگی اور تحریروں میں اپنا مستحق مقام پیدا کر لے گا!

--

خواجہ عبدالغفور مرحوم
کے
مضامین کا مجموعہ

سمن زار

قیمت
۸/ روپیہ

www.taemeernews.com

ڈاکٹر کے۔ بھکتہ وتسل راؤ (حیدرآباد)

تلگو کے نثری ادب میں مزاح

(ڈاکٹر بھکتہ وتسل راؤ کی مادری زبان تلگو ہے لیکن اردو میں مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں۔
محکمۂ تعلیمات سے وابستہ ہیں ــــ ا)

مزاح ہنسی کا دوسرا نام ہے۔ ہنسی پیدا کرنا ایک کیفیت ہے۔ ایک مظاہرہ ہے۔ ایک طرزِ بیان ہے۔ ایک اندازِ فکر بھی ہے۔ ایک اعلیٰ فن ہے۔ زندگی کی تلخیوں پر مزاح کے ذریعہ قابو پا سکتے ہیں۔ نکتہ چینی پر ہنسی آ جائے تو وہ طنزیہ منظر ہے۔ اور طنز کا مغز زیادہ ہو جائے تو طعن میں تبدیل ہو سکتا ہے۔

تلگو ادب میں وسیع پیمانے پر مزاح نگاری کے جوہر دکھائے گئے ہیں۔ ہر زمانے میں ادیبوں نے بھرپور کوشش کی ہے چاہے پر بندھ یوگم ہو یا تو یوگم ہو۔ الفاظ کے ردّ و بدل سے، کہاوتوں کو یکجا کر کے کہانی کے پلاٹ میں نامعقولیت لا کر، واقعات کو توڑ مروڑ کے اور نظم و نثر میں جاذبیت پیدا کر کے تلگو ادب کے احاطہ میں مزاح نگاری کی افزائش کی گئی ہے۔ مزاحیہ مضامین کی شکل میں، ڈراموں اور کالموں کی صورت میں لطف کی ژالہ باری کی گئی ہے۔

بیسویں صدی کے تلگو ادب میں دیریشی نگم پنتلو صف اول میں آتے ہیں۔ انھوں نے سماج کی خامیوں کو پرہاسنم (خاص تصنیف) میں پیش کیا۔ سناتن دھرم کا ذکر ہے۔ انسان کی طبیعت کا چرچہ ہے۔ ادبی روایت پر طنز بھی ہے۔ چلکاری یکشمی نرسم نے سناتن دھرم کی خامیوں کو عوام کے سامنے رکھا ہے۔ وہ برہمن سماج کے پیرو تھے۔ "گنتی" ان کی مزاحیہ تصنیف ہے جس میں تین پیڑھیوں کی خامیاں پیش ہیں۔ جلد بازی کے اثرات اور غلط کام کرنے والوں کا ذکر ہے۔ پیسہ بٹورنے والوں پر طعنہ بھی ہے۔ مثلاً پروہت مذہبی کام کا حاوضہ لینے والے، لاش اٹھانے والے، اس طرح کے کئی کردار "گنتی" میں موجود ہیں۔ ویدک پیشہ کو ٹھیک طور سے نہ اپنانے والوں کو مذاق کا شکار بنایا گیا ہے۔ پانوگنٹی یکشمی نرسمہاراؤ نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ سپکٹیٹر کے مماثل "ساکشی" لکھ ڈالا۔ "سارنگ دھرا نامکو" کنھا برنم کنیہ دکریم میں اُس زمانے کی کئی خرابیوں کو اُنھوں نے پیش کیا تھا شائستہ مزاح ہے۔

www.taemeernews.com

گرجاڈا وینکٹ اپاراؤ کی تصنیف "کنیہ شلکم" کو تلگو ادب میں خاص مقام حاصل ہے۔ اس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ روس میں اس پر تحقیق بھی کی گئی ہے۔ اس کے پڑھنے سے رگ رگ میں ہنسی دوڑ جاتی ہے وہ قاعدے باغی نظر آتے ہیں۔ اس ڈرامہ کا نصب العین سماج سدھار تھا۔ گریشم اس کا خاص کردار ہے جس کے مکالموں میں انگریزی ادب کی جھلکیاں ہیں تو تلگو سماج کی خرابیاں بھی۔ کمسنی میں بیاہ کرنا، جہیز، دھرم کے نام پر دھوکہ بازی، پیسہ، لالچ کا ذکر ہے اس ڈرامہ میں۔ ہر ایک صفت کے لئے الگ الگ کردار ہیں۔ گریشم اپنے آپ کو زیادہ عقلمند ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کام میں بے وقوفی کی جھلک ہے۔ "کنیہ شلکم" فلم بھی تلگو میں بنائی گئی ہے۔ اس میں شری ین۔ ٹی۔ راما راؤ، ساوتری، سی۔ ایس۔ آر، راجہ بابو نے اداکاری کی ہے۔ فلم اگر دیکھیں تو ہنسی کے سمندر میں غوطے لگاتے رہ جائیں گے۔

سری پادا کا مشہور راؤ کی کتاب کرتہ اوڈو (نیا داماد) میں عام فہم مزاح ہے۔ ویدم وینکٹ رایہ شاستری کی کتاب "پرتاپ رودریم" میں پاکیزہ مزاح نگاری ہے۔ شری پادا سبرامنیم کی تصنیف یاد جیوم ہوشیاری میں نفیس مزاح ہے۔ شوہر اور بیوی کا مکالمہ دیکھئے،

میاں :۔ "کہاں تک آیا ہے پکوان"

بیوی :۔ "کھانا اتارنا ہے"

میاں :۔ "ابھی تک وہیں ہو"

بیوی :۔ "بولنا بھول گئی چاول ناپ کر لاؤ"

میاں :۔ "ابھی چاول نہیں ڈالے کیا"

بیوی :۔ "پانی گرم ہونے پہ ڈالوں گی"

میاں :۔ "اتار رہی ہوں کہی تھی نا"

"لعنت ہو تم پر"

بیوی :۔ "اس طرح جانے سے کیا ہوگا مانجنے والی تالاب گئی ہے۔ جاکر برتن لانے کہو"

میاں :۔ "پانی تک گرم نہ ہوا"

بیوی :۔ "برتن نہیں تو میں کیا کروں"

میاں :۔ "چولھے میں آنچ ہے یا نہیں"

بیوی :۔ "ابھی تو چولھے کو ٹھیک کر رہی ہوں" "گیلی لکڑیاں ہیں بشیشہ بھر تیل ہے"

میاں :۔ "کچھ بھی نہیں تو کیوں پکانے چلی"

بیوی :۔ "باسی کھانا میں نہیں کھاتی اس لئے پکا رہی ہوں۔ صبر کر دی"

"بچہ پاٹی نرسمہا شاستری کی تصنیف بارسٹر پارو تسیم سے ہر تلگو بولنے والا واقف ہے۔ ایک سناتن برہمن لندن جاکر

www.taemeernews.com

باراٹ لاکرتا ہے بکاتی دشواریاں سہہ لیتا ہے۔ اس کی ہر حرکت مزاح کا منظر ہے۔ مدراس میں اس کی آمد، جہاز میں داخل ہونا، نئی جگہ مصیبتوں میں پھنس جانا وغیرہ تمثیلی مزاحیہ انداز میں پیش ہیں۔ وہ پیدائشی ہندی نہیں تھا لیکن ماحول نے اسے ہندی بنا دیا تھا۔ تلگو ادب کا جوہر ہے بارسڑ پاروتیسم۔ اس کا ترجمہ اردو زبان میں اگر ہو جائے تو ایک دلچسپ کارنامہ ثابت ہوگا۔ بھمڑی پاٹی کامیشور راؤ کو مزاح کا برہما کہہ سکتے ہیں۔ حب الوطنی، سماج سدھار، اور تہذیب کا صحیح مفہوم ان کے مزاحیہ مضامین کے توسط سے پیش ہوا ہے۔ ملادی وینکٹ کرشنا شرما نے سیاست میں دھوکہ دینے والوں کو اپنی کہانیوں میں طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ مُنی مانکیم نرسہواں راؤ موجودہ دور کے تلگو ادب میں مزاح نگار اعظم کہلاتے ہیں۔ "کانتم" ہی مُنی مانکیم ہے۔ کانتم ہر گھر کی عورت ہے۔ روزمرہ کی کیفیت ہے۔ اس کا شوہر ہر زمانہ کا فرد ہے۔ روزمرہ کے مشکلات کو سہہ لینے کی کیفیت ہے کانتم میں۔ رسومات کی ادائیگی میں مالی مشکلات سے دوچار ہو بھی تو خوشی کا اظہار کرتی ہے۔ ساڑی، ترکاریاں، ساڑیاں، رسمات، زیورات مزاحیہ نگاری کے مرکز ہیں۔ لالچ کے ذکر میں مغلوں اور کراس ورڈس کا شامل ہونا دیکھا جا سکتا ہے۔ کانتم اور اس کے شوہر کے چند مکالمے پیش ہیں۔

کانتم:- یہ کیا شرارت ہے پسند آئے تو دو اور نوالے کھا لینا لیکن گال کو دہی نہ لگانا۔

کانتم کا شوہر کانتم سے یوں مخاطب ہے ــــ!

"تمہاری بہن ایک بندرنی۔ تم اور ایک بندرنی۔ دونوں میں دُم غائب ہے مگر" کانتم فوراً جواب دیتی ہے:

تمہاری بہنوں میں وہ بھی موجود ہے۔

چنتا دیکھشیلو کی ہاسیہ کتھاؤں میں سیلس مزاحیہ نگاری موجود ہے۔ ڈی۔ وی۔ نرسہ راجو نے انتروانی میں مذاق کو ایک خاص انداز میں پیش کیا ہے۔ بھالوستی منڈوری وٹھل، آدی وشنو، پارتھ سارتھی، ونکٹ رمنہ، یرم سٹی سائی، کوٹہ سرمہ، کوٹہ مبارا نامی ادیبوں نے تلگو زبان میں مزاحیہ مضامین پیش کئے ہیں۔

تلگو جریدوں میں آئے دن نت نئے انداز میں مذاق، لطف، اور مزاح سے بھرپور کہانیاں، ناول، ناولٹ، افسانے فیچر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ آندھرا جیوتی ویکلی تو ہر سال خاص نمبر نکالتا ہے۔ ہر ہفتہ "چو" کا صفحہ بھی پیش کرتا ہے۔ ایناڈو اخبار میں، جو تلگو کا روزنامہ ہے ہر ہفتہ آدی وشنو کا ایک کالم رہتا ہے۔ اس کالم میں طنزیہ مضمون شائع ہوتا ہے۔ وجیہ نامی تلگو ماہنامہ میں چٹکلے، حکایات، مزاحیہ خاکے شائع ہو رہے ہیں۔ "سواتی" "وجیوتی" تلگو ماہناموں میں مزاحیہ ناول افسانے اور مضامین شائع ہوتے ہیں۔ تالوری ناگیشور راؤ کے خاکے کسی ایک موضوع پر طنزیہ طرز پر "لیوا" میں چھپتے ہیں۔ اندھیرے کے بعد اُجالا، رات کے بعد دن، اسی طرح کٹھن کے بعد سہل، رنج اور غم کے بعد خوشی کی آمد مزدری ہے۔ ان تمام احساسات کا نچوڑ ہے ادب میں ملتا ہے۔ سہل و عام زبان میں مزاحیہ انداز میں کٹھنائیوں کو پیش کرنے سے سنجیدہ ادب کے پرستاروں کو راحت ملتی ہے۔ تلگو کے مزاحیہ ادب میں ہی عناصر ملتے ہیں جس کی وجہ سے تلگو میں اس صنف کو وقار حاصل ہے۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر عزیز تمنائی (مدراس)

تامل (نثر) میں طنز و مزاح

انسانی زندگی میں کئی ایسے پہلو ہیں جن کا سلیقہ سے بیان کرنا لطف اندوزی کا باعث ہوتا ہے اور روزمرہ کے واقعات میں کوئی نہ کوئی صورت ایسی نکل آتی ہے جو خوش مذاقی کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے۔ واقعہ اور بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں۔ صعوبت حالات کی شدید نامعقولیت میں لغویت اور تضحیک کے پہلو ڈھونڈ لینا اور انھیں شاد تفریح بنا لینا ایک ظریف کار کا کام ہے۔

تامل کا کلاسیکی اور جدید ادب نے طنز و مزاح کے کئی اہل قلم کو جنم دیا ہے جن کے قلم سے ایسے پھول جھڑے ہیں جن کی تازگی اور رعنائی ہمیشہ باقی رہے گی۔ تول کاپیئر (Tol Kappiar) جو اس زبان کے صرف و نحو کا مؤلف ہے، اس صنف کا پیش رو مانا جاتا ہے جس کی نسلوں نے انھیں کی تقلید کی ہے۔

اس عظیم ادیب نے انسانی جذبات کو آٹھ عنوانات میں تقسیم کیا ہے۔ خندہ، گریہ، عجز، حیرت/مرعوبیت، خوف، نفر/تحقیر، غصہ اور انبساط۔ مؤخرالذکر کی چار شاخیں بنائی ہیں۔ طنز، ناپختگی، نادانی/لاعلمی، حماقت۔

اس کلاسیکی صف بندی کے تحت تول کاپیئر نے ان چاروں عنوانات کو ظرافت کا سرچشمہ بتایا ہے۔ لیکن بہتر ہوگا اگر ہم انھیں اس صنف کے الگ الگ رجحانات تصور کریں۔

دور سابقہ میں طنز محض ایک رجحان تھا لیکن موجودہ ماحول نے اسے ایک انفرادی حیثیت عطا کی ہے جو دیگر اصناف کی زینت بڑھاتی ہے لیکن خود کسی صنف سے تعرض نہیں۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ تول کاپیئر کی نشان ظرافت کے باقی اسالیب ادب میں اپنا مقام بنانے میں طنز کے قریب نہ آسکے۔

انیسویں صدی کے اواخر میں جدید تامل ادب میں مزاح نگاری تکمیل شدہ صورت میں نمودار ہوئی۔ ایک نقاد نے اسے "سکل طریقے" کا نام دیا ہے۔ حالانکہ یہ ایک تدریجی ارتقائی عمل تھا، جس کی ذمہ داری مزاح نگار کی نہ تھی۔ نثر نویسی کا وجود خود بڑی دیر میں ہوا، یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں لیکن مزاح کو دوسری اصناف پر اس طرح سے فوقیت حاصل ہے کہ تامل کی پہلی طویل نثر کی تخلیق پرمارتھ گرو کتھئے (PARAMARTA GURU KATHAI) (پرمارتھ گرو کی داستان) ہے اور یہ مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے لیکن مزاحیہ تخلیقات کی

www.taemeernews.com

پرانی کسوٹی پر اس کو پرکھا نہیں جا سکتا۔

جدید ادب نے قدیم ادب کی کوتاہیوں کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور مزاح نگاری میں ایک نئے رجحان کو فروغ دیا ہے۔ اس صنف کی گذشتہ پچاس سالہ تخلیقات پر ایک طائرانہ نگاہ اس نقطۂ نظر کو واضح کر سکے گی۔

افسانہ نگار پُدمنے پٹن نے اپنے ایک مقالہ میں لکھا ہے کہ "مزاح ایک پیدائشی اور فطری احساس ہے۔ کسی کو جبری طور پر ہنسنے یا مسکرانے کی ترغیب دلانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی فوٹو گرافر کسی کی تصویر لیتے وقت اس شخص کو مسکرانے کے لئے کہے۔"

یہ بیان ادب میں مزاح کے سلسلے میں جدید طریقۂ کار کا عکاس ہے۔ بالجبر ہنسی یا تبسم کو ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ آج کے مزاح نگار کا نصب العین ہے۔ "دل کے تاروں کو چھیڑو۔ خود بخود ہنسی آجائے گی۔"

افسانہ : جہاں تک افسانوں کا تعلق ہے، تیسری دہائی کی تخلیقات سے چھٹی دہائی کی پیش کشوں تک پہونچتے پہونچتے نمایاں فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ معاشرتی آگہی ہر افسانے میں جاری و ساری ہے۔ یہ کہانیاں طنز و مزاح کے بل پر قائم ہیں۔ پُدمنے پٹن (Padmanai Pillan) نے مزاح اور افادیت کا امتزاج کر کے نہایت متاثر کن بنایا ہے۔

اپنے افسانے "خدا اور کنڈسوامی" (God and Kandaswami) میں پُدمنے پٹن نے کہانی کے ہیرو کنڈسوامی کو ایک سو روپے کا نوٹ ہاتھ میں لئے ـــــ شہر کی بس میں سوار ہوتے ہوئے دکھایا ہے۔ کنڈکٹر اسے اگلے اسٹاپ پر اتر جانے کو کہتا ہے کیونکہ اس کے پاس ایک سو روپے کی ریزگاری موجود نہیں۔ یہاں سے کنڈسوامی کئی بسیں بدلتا ہے، ایک اسٹاپ پر سوار ہوتے ہوئے اور اگلے اسٹاپ پر اترتے ہوئے۔ آخر کار سو روپے کا سالم نوٹ سنبھالے ہوئے وہ منزلِ مقصود پہونچ جاتا ہے۔ حالانکہ سارا سفر بس میں طے ہوتا ہے۔

ایک اور موضوع ہے جس پر پُدمنے پٹن نے بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ شہری زندگی اور شہریوں کے تاریک اور گھناؤنے پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان کہانیوں میں اس کی ظرافت قارئین میں سماجی آگہی کو بیدار کرنے کے لئے تازیانے کا کام دیتی ہے۔

کے راج نرائن (K. RAJ NARAIN) نے اپنی کہانیوں کو دیہاتی کی سگندھ عطا کی ہے۔ ان کہانیوں میں وہی مٹھاس ہے جو رام ناڈ ضلع کی کالی دیہاتی میں ہے جو اس کی کہانیوں کا پس منظر ہے۔ اس کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ ٹال کا ماہر افسانہ نگار ہے جس کی کہانیاں سراسر مزاحیہ ہیں۔ اس کی ایک کہانی میں رام ناڈ کے چند لوگ مدراس آتے ہیں۔ سمندر انہوں نے کبھی نہیں دیکھا۔ ساحل پر نظر پڑتے ہی وہ حیران رہ جاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے۔ "یقیناً یہاں زوردار بارش ہوئی ہوگی۔"

ایک اور افسانہ "مال کھیتی کے کسان" میں ہیرو ایک کنجوس آدمی ہے۔ اس کے لڑکے بال ترشوانے کے بعد سیلون سے واپس آتے ہیں۔ باپ پوچھتا ہے۔ "کتنے پیسے دیئے؟"

"ایک روپیہ اور پچاس پیسے"

"سر منڈوانے کی اُجرت؟"

"پچیس پیسے۔"

www.taemeernews.com

"فوراً لوٹو۔ اپنے سر منڈوالو اور سو روپے واپس لے آؤ"

ناول: عہد جدید کا کلاسیکی نام ہے "کلف"۔ آج کے ناول جدید انسانی زندگی کے تاریک تر پہلوؤں کو اُجاگر کرتے ہیں۔ سیاسی شعبدہ بازی اور دفتر شاہی کی بربریت کو ناول نگاروں نے اپنا ہدف بنایا ہے۔ اندرا پارتھ سارتھی (Indira Partha Sarathy) کی یہ مسلمہ حیثیت ہے کہ انہوں نے ناول کی بنیاد مزاح پر رکھی ہے اور یہ ان کا اپنا تکنیک ہے۔ یہ امیروں کی کمزوریوں کو بے نقاب کرتے ہیں اور غریبوں کی بے بسی کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

ان کے ناول سوتنتر بھولی کے چند جملے ملاحظہ ہوں:

"دیکھئے۔ یہ ہے ہماری حکومت! یہ ہمارا گاندھی کے بیان کردہ تین بندروں کی تعلیمات پر بڑی تندہی سے عمل پیرا ہے۔ اپنی آنکھیں برائیوں سے موند رکھو۔ اپنے کان برائیوں سے بند رکھو اور اپنا منہ کسی حال میں کھلنے نہ دو۔ یقیناً ہمارے رہنما ہمارا گاندھی کے حقیقی پیرو ہیں۔"

اس قسم کی مثالیں موجودہ ناولوں میں بے شمار پائی جاتی ہیں۔ طنز و مزاح کے اہل قلم سماجی برائیوں اور کوتاہیوں کو بے نقاب کرنے میں پیش پیش ہیں۔

انشائیے: ۱۹۳۵ء سے کئی علاقائی تحریکوں نے طنز و مزاح کو تشہیر کے لئے اپنایا۔ ارگز انا دورے جیسے انشاپردازوں، کلکی جیسے ناول نویسوں اور تنکن جیسے آزاد قلم کاروں نے مزاح کو اپنے مضامین میں سمو دیا۔

اریگنر (مؤخر) انّا (ARIGNAR ANNA) نے جو تامل خواص و عوام میں "بڑے بھائی" کے نام سے پکارے جاتے تھے، اپنی تحریروں کی بدولت اچھے مزاح نگار مانے جاتے ہیں۔ دراوڑ ناڈو (DRAVIDANADU) اور کنچی (KANCHI) کے میئر کی حیثیت سے انّا نے تامل ناڈو کے قدیم توہمات کا سائنسی ترقیوں کے مقابلے میں مذاق اڑایا۔ "مہاتما گاندھی یا ڈاکٹر امبیڈکر جیسے عظیم قائدین چھوت چھات کو مٹانے میں افسوس ناک حد تک ناکام رہے۔ حجام اور دھوبی "اونچی ذات والوں کے مکانوں میں داخل ہونے نہیں دیئے گئے۔ چنانچہ اونچی ذات کا آدمی خود کی حجامت بنانے یا بال ترشوانے کے بعد غسل کرتا ہے۔ کیونکہ حجام ایک اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ سائنس کا شکر ہے کہ اس نے شیونگ بلیڈ جیسے میں اور صابن پندرہ پیسے میں ایجاد کیا ہے۔"

یہ تھی انّا کی تحریر "دراوڈ ناڈو" ۱۷ فروری ۱۹۶۲ء کی اشاعت میں۔ مزاح کی بارود نے انّا کے قلم کو بندوق بنا دیا ہے۔:

ہفتہ وار رسالہ کلکی کے معروف مدیر کی حیثیت سے کلکی (آمر کرشنا مورتی) اپنے سیاسی اور سماجی تیز و نشتر کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے بے شمار مجموعوں میں "کمریم کنڈرم" (KUMARIUM KUNDRAMUM) ایک شاہکار مانا جاتا ہے۔ کلکی نے ہماری اقتصادی حالت کو مشہور تامل مزاحیہ کردار تنالی رامن (TENALI RAMAN) کے گھوڑے سے تشبیہ دی ہے۔ ہندوستان کی تشویشناک حد تک بڑھتی ہوئی آبادی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ہماری قومی صنعت زچگی ہے۔

تنکن نے اپنے قلم کو نشتر میں بدل دیا ہے۔ اس کا قلم چبھتا بھی ہے سوزن کاری بھی کرتا ہے اور نشتر زنی بھی۔ وہ تامل ناڈو میں چھپنے والے تمام تامل اور انگریزی رسائل میں لکھتا ہے۔ وہ معاشرتی حالات کی نقاشی بڑی چابک دستی سے کرتا ہے۔ موجودہ ہندوستانی

www.taemeernews.com

سماج اس کے نزدیک مقامی تہذیب کی ایک کارپن کاپی ہے جس میں بہت سے اغلاط شامل ہو گئے ہیں۔ وہ اشتراکیت کو بزدلانہ کیمونزم کہتا ہے۔

ڈرامے: دَمّل سَمبندھ مُدَلیار (DAMMAL SAMBANDHA MUDALIAR) بھی تامل ڈرامہ کے بانی سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے دور سے آج تک بھی تامل ڈراما مزاحیہ عناصر پر مبنی ہے۔ سماجی اختلافات کو سرے سے مٹا دینا ان کے ڈراموں کا بنیادی مقصد ہے۔

سبھاپتی دوی بھاشی (SABHA PATHI DOVI BHASHI) کا ایک منظر: (عدالت میں)

جج کورٹ : آپ کی ذات۔

ملزم : مرد ذات۔

جج : عجیب بے وقوف ہو۔ ایسی بھی کوئی ذات ہے؟ اس سے پوچھو کہ وہ برہمن ہے یا شودر ہے، یا کیا ہے؟

ملزم : میں ایک ویش کھتری، شودر برہمن ہوں۔

تامل ڈراما کے ارتقاء میں 'چو' (رام سامی) کا نمایاں حصہ رہا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک طنز نگار ہیں۔ ان کے چبھتے ہوئے فقروں میں بڑی معنویت اور گہرائی ہوتی ہے۔ اپنے ڈرامہ "یہ پیاس کب بجھے گی" میں چو نے ہندو دیومالا کا سہارا لے کر موجودہ جمہوری نظام کی دھجیاں اڑائی ہیں۔

نَلّا تَمبی (NALLA THAMBI) ایک سیاست داں مرنے کے بعد ازروک جاتا ہے۔ وہاں جمہوریہ کا پرچار کرنے کے بعد الیکشن کے حق میں وہاں کے باشندوں کو آمادہ کرا لیتا ہے۔ اپنی فطرت کے عین مطابق وہ مختلف جماعتوں کا ایک مشترکہ محاذ قائم کرتا ہے اور مقابلے کے بعد الیکشن جیت جاتا ہے۔ اس کی کارکردگی سے یم راج کو خوف ہو جاتا ہے اور خود وزیر اعظم بن جاتا ہے اس کی حکومت کا پہلا اقدام یہ ہوتا ہے کہ دیوتاؤں کی خصوصی مراعات کو ختم کرنے کے لئے ایک بل پیش کیا جاتا ہے (نوابوں اور مہاراجاؤں کے ڈاک پرس کے خاتمہ کی مثال پر) یم راج کے سامنے دستخط کے لئے بل پیش ہوتا ہے۔ وہ دستخط ثبت کرنے والے ہی تھے کہ آنکھوں میں دھول پڑ جاتی ہے اور آنکھیں ملنے لگتے ہیں۔ نَلّا تَمبی پوچھتا ہے کہ کیا ہوا۔ یم راج کی وضاحت پر نَلّا تَمبی کہتا ہے کہ آنکھوں میں دھول لئے ہوئے نادیدہ دستخط کر دینا ہی بہتر ہے۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکے گا۔

آج کل بہت سے ڈراما نگار مقامی شہود پر جلوہ گر ہیں۔ حالات کا تقاضا ہے کہ لوگ طنز نگاروں اور مزاح نویسوں کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اسی قسم کے ڈرامے عوام کیلئے باعث کشش بن گئے ہیں۔

یہ رہا تامل نثری ادب کے گذشتہ پچاس سالہ دور کے ادبی منظر کا ایک سرسری جائزہ، جس رجحانات نے جدید ادب کا پرچم بلند کیا ہے، وہ حسب ذیل ہیں۔

سماجی شعور، حقیقت پسندی، زندگی کے معاشرتی اور سیاسی پہلوؤں کی صحت مند تنقید اور انفرادی انتخاب پسندی۔ رسائل ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سینما نے اچھے لکھنے والوں کی پشت پناہی کی ہے۔ آفاق وسیع تر ہو گئے ہیں۔ کثرت بیشتر ترقی کی طرف جادہ پیما

www.taemeernews.com

ہیں۔ طنز و ظرافت کا مستقبل کبھی اس قدر روشن آئندہ نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ ابھی بہت سے شاہکاروں کو معرضِ وجود میں آنا ہے اور بہتیرے ادیبوں کو جنم لینا ہے۔

(میں بے حد ممنون ہوں پروفیسر ڈی ایم عبدالقادر اور پروفیسر عبدالرحمٰن صبا کا جنہوں نے اس مختصر جائزہ کی ترتیب میں میری بھرپور معاونت فرمائی ــــ!)

مزاح پُرسی کے بعد

نامور طنز و مزاح نگار

نریندر لوتھر

کے

مضامین کا ایک اور مجموعہ

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے مقدمہ کے ساتھ

مئی ۱۹۸۵ء میں منظرِ عام پر آرہا ہے

ناشر : زندہ دلانِ حیدرآباد

www.taemeernews.com

کرت بابانی

کرت بابانی سندھی زبان کے سینئر ممتاز ادیب ہیں۔ ۱۰ کتابوں کے مصنف ہیں۔ سوویٹ لینڈ نہرو ایوارڈ ۱۹۶۰ء اور حکومت ہند کے محکمہ تعلیم و ثقافت کا ادبی ایوارڈ ۱۹۸۲ء حاصل کر چکے ہیں۔ کئی ادبی انجمنوں اور اداروں کے صدر رہے ہیں۔ صحافی کی حیثیت سے صداقت ہفتہ وار، نئی دنیا، سندھ ودھارا، اور سندھ سماچار کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔

ادیب، ڈراما نگار، تنقید نگار، مترجم اور افسانہ نگار ہیں۔ لینن کی سوانح حیات اور ملک راج آنند کی ناول 'قلی' کے ترجمے قبولیت عام حاصل کر چکے ہیں۔

اُنہوں نے سوشل ورکر کی حیثیت سے بھی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔

وطن حالیف سندھ (پاکستان) ہے ۳۰ جنوری ۱۹۲۲ تاریخ ولادت ہے ترک وطن کے بعد بمبئی آئے اور اب بمبئی ہی ان کا وطن ہے۔

سندھی نثر میں مزاح کی روایت اور موجودہ صورتحال

مقالہ نگار: کرت بابانی
مترجم: یوسف ناظم

سندھی ادب میں مزاح کی روایت کے بارے میں مجھے کوئی دعویٰ نہیں کرنا ہے اور شاید ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ادب میں بھی صورت حال کچھ اسی قسم کی ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تخلیقی ادب میں دوسرے تمام اسالیب نگارش کے مقابلے میں مزاح نگاری، جدید طرز فکر ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ سندھی ادب اچھے مزاح کے عناصر

مہمان مدیر مسئول یوسف ناظم، کرت بابانی کا خاص طور پر اس لئے ممنون ہے کہ کئی جگہ دست سوال دراز کرنے کے بعد، موصوف ہی نے دستگیری کی اور صرف چند دنوں کی نوٹس پر اپنا مقالہ دے دیا۔ گھر کے چکر بھی نہیں لگوائے۔ ایک ہی ملاقات ہوئی اور جب اکثر نے یہ کہا کہ آپ تو ایک زود لا نظر آتے ہیں تو جواب میں یہ سننا پڑا کہ ان کے احباب انہیں سندھ کے لوگوں کا ہم شکل ٹھہراتے ہیں جن میں ایک لینن بھی ہیں۔

www.taemeernews.com

سے بالکلیہ محروم ہے۔ سندھی نثر موجودہ دور کی پیداوار ہے جس کا میں بعد میں ذکر کروں گا لیکن سندھی شاعری روایت کے اعتبار سے قدیم اور کمیت کے لحاظ سے وسیع ہے۔ سندھی کلاسیکل (کلاسیکل) شاعری کے تین ارباب ثلاثہ شاہ، سچل اور ساچل، کسی بھی معیار سے جانچے جائیں تو عظیم شاعر کہلائیں گے اور ہندوستان کے بڑے شاعروں میں ان کا شمار ہوگا۔ اگرچہ ان تینوں کا کلام دُنیوی۔ سائل سے کم متعلق اور صوفیانہ زیادہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تخلیقات میں سماجی طنزیات کی کہیں کہیں جھلکیاں ضرور ملتی ہیں۔

سندھی زبان میں عصری اور جدید ادب کے دروازے اس وقت کھلے جب ۱۸۵۳ء میں سندھی لپی کے لئے عربی رسم الخط اپنایا گیا۔ اس اساسی تبدیلی نے ادب کے اُفق کو نت نئی روشنیوں سے جگمگا دیا اور ادبی سرگرمیوں کو نشاۃِ ثانیہ سے ہم کنار کیا۔ یہ عجیب اور جاذبِ توجہ اتفاق ہے کہ حالیہ دور کے سندھی ادب کی پہلی نثری تخلیق مزاحیہ تھی۔ مصنف کا نام آج تک معلوم نہیں کیا جاسکا۔ تخلیق کا عنوان "دولت مند اور مفلس شخص کی کہانی" (واڈھے این واہلے جی اکھانی) ہے۔ یہ ایک عنائیہ ہے جس کے ہر لفظ کا پہلا حرف 'واؤ' ہے۔ الفاظ کی بازی گری سے مزاح پیدا کرنے کا یہ بہت ہی عمدہ نمونہ ہے۔

حالیہ دور میں بڑے بڑے ادیب پیدا ہوئے لیکن ان میں ممتاز حیثیت کے مالک مرزا خلیق بیگ تھے جو سندھ میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اور غیر معمولی ادبی صلاحیتوں کے حامل تھے۔ انہوں نے ادب کی تمام اصناف میں اپنی فنکارانہ جوہر دکھائے۔ مرزا خلیق بیگ نہایت غیر روایت پسند اور روشن خیال شخص تھے انہوں نے کٹھ ملاؤں کی قدامت پسندی پر سخت چوٹیں کیں اور لکھا۔

"اگر تقدس کسی کے بدن پر ادنی شال ڈال لینے سے پیدا ہوسکتا ہے تو بکری کے بچے کو بہتر درجہ ملنا چاہیئے اور اگر لمبی داڑھی امامت کی علامت ہے تو ایک بکرے کو اولیت دی جانی چاہیئے۔"

نام نہاد اعلیٰ طبقے کے کھوکھلے پن اور بے جا احساس برتری کی پول انہوں ہی نے کھولی۔ خان بہادر اور رائے صاحب کے خطابات کے لئے کوشش کرنے والوں کے بارے میں انہوں نے کہا۔

"وہ جو خان صاحب اور رائے بہادر کے روپ میں طلوع ہوتے ہیں نہ تو عظیم ہیں نہ دلیر۔ "ستارہ" نہیں" تو ایک لمبی دُم ہے جو آویزہ گوشوں کی علامت ہے۔"

خلیق بیگ نے کوئی نصف درجن مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں جن میں سماجی برائیوں کا کچا چٹھا بیان کیا گیا ہے وہ ایک مصلح کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کے چند ڈراموں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ رنبی اور ٹھوگی (لالچی اور دغاباز) ۲۔ گشٹ کینا کشیٹ (مصیبت کا سفرنامہ) ۳۔ رستی جو جنگ (رشوت کا جنگ) ۴۔ نیم حکیم نیم ملا۔ ان عنوانات ہی سے قاری کو اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان ڈراموں میں کیا کچھ نہیں ہوگا۔ اس صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں یہ طربیئے جب بھی اسٹیج پر پیش کئے گئے دیکھنے والوں کے لئے سامانِ انبساط مہیا ہوگیا۔

www.taemeernews.com

دو اور بڑے ادیبوں بھیرومل مہر چند اور پرمانند میوارام نے گو کہ ان کا اندازِ تحریر علمیت کا رنگ لیئے ہوا تھا۔ کبھی کبھار اپنے قلم سے مزاح کے پھول بھی اُگائے ہیں۔ بھیرومل مہر چند نے دو مختصر ڈرامے لکھے ہیں جن میں مزاحیہ رنگ کی آمیزش ہے۔ ان میں سے ایک ناٹک تو اُن پیری والوں سے متعلق ہے جو خچروں کی طرح کپڑوں کے بڑے بڑے گٹھے سر پر لادے گلی کوچوں میں گھومتے اور سادہ لوح عورتوں کو اپنی چرب زبانی سے موہ لیتے تھے۔ ان کا دوسرا ناٹک جہیز کے ظالمانہ رواج سے متعلق ہے۔

ان کے علاوہ پرمانند نے جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں، مزاحیہ اسلوب نگارش سے اپنی تحریروں کو رنگا رنگ بنایا۔ تم ہنستے رہو اور وہ کانٹے چبھوتا رہے، قسم کی تحریریں، پرمانند کا مخصوص انداز لئے ہوئے تھیں اور یہ انداز تحریر بیحد مقبول ہوا۔ تلخ و تیز سچائیوں کو شوخ و شگفتہ مزاح پاروں میں منتقل کرنے کا فن پرمانند کو خوب آتا تھا۔ ایک سماجی مُصلح اور مجاہد ہونے کے ناتے پر اُن کی تحریروں میں مبلغانہ رنگ سنایاں ہے۔ ان کی تحریریں ان کے میگزین، جوت، میں شائع ہوتی رہیں اور بعد میں "دل بہار" کے نام سے چار جلدوں میں طبع ہوئیں۔

لال چند امر دینومل بھی ایک باکمال ادیب تھے جن کی انشاء پردازی اور قوت بخش اندازِ تحریر نے سندھی ادب کو مالا مال کیا۔ لال چند مکمل طور پر سنجیدہ ادیب تھے لیکن ہر ادیب کی تحریر میں کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں، مزاح کا رنگ جھلک آتا ہے۔ ان کا تخلیق کیا ہوا کردار، تلوک تیمی (سنکی تلوک) بڑا مضحکہ خیز اور قہقہہ آور ہے۔ یہ کردار آج بھی زندہ ہے اور پرمانند کی خوبصورت تحریر کا نقیب بنا ہوا ہے۔ پرمانند نے مختصر مزاحیہ ناٹک بھی لکھے جن میں ۳ ناٹک تو غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔ ۱۔ سینا کیا دینا ۲۔ نقد دھرا (روپیہ قاضی الحاجات) اور ۳۔ عملدار کیا رعیت آزار (ظالم عمّال) اول الذکر دو ناٹک جہیز کے ظالمانہ رواج سے متعلق ہیں جس کی قتل گاہ پر نو بیاہتا دلہنیں اور ضعیف والدین بھینٹ چڑھائے جاتے ہیں تیسرا ناٹک اُس بے رحم دفتر شاہی کے بارے میں ہے جس کا شکار بے بس اور لاچار اہلِ غرض ہیں۔

سندھی ادب کا دوسرا سنہرا دور کشن چند بیوآس اور لیکھ راج عزیز جیسے دو قد آور شاعروں کی آمد سے شروع ہوا۔ ان دونوں شاعروں نے سندھی شاعری کو صوفیانہ شاعری کے صدف سے نکال کر روزمرہ کے دنیوی مسائل اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ وہ اپنے فن کے اُستاد تھے لیکن اُنہوں نے اپنی شاعری میں شاذ ہی مزاح اور ظرافت کو جگہ دی۔ اُن کا سارا ظریفانہ اثاثہ نثر میں ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ سندھی میں مزاح کے لئے نثر کا سانچہ ہی منتخب کیا گیا یہی صورت حال بیوآس اور عزیز کے ساتھ برقرار رہی۔ باوجود اس کے کہ وہ غیر معمولی شاعرانہ صلاحیتوں کے مالک تھے انہوں نے انسانی زندگی کے ظریفانہ پہلو کو نثری شکل میں پیش کیا۔ بیوآس نے ۳ مختصر ناٹک لکھے جن میں "بوڑھے جو پارلو" (ایک بوڑھے کا عقد) بہت مقبول ہوا۔ اس ناٹک کا مرکزی کردار ایک سنکی شخص ہے جس کی ہوس اسے ایک ایسی کم سن لڑکی سے شادی کرنے پر اکساتی ہے جو اس کی بیٹی نہیں پوتی بننے کے قابل ہے۔ اس بوڑھے شخص کی عبرت کے لئے چند نوجوان سازش کر کے اس کی شادی لڑکی کے

www.taemeernews.com

لباس میں ملبوس ایک لڑکے سے کرا دیتے ہیں۔ یہ واقعی دل کو چھو لینے والا طریقہ ہے۔

لیکھ راج عزیز نے تو ایک قدم اور آگے بڑھایا اور مسٹر بھنوں کے نام سے ایک مکمل ڈرامہ لکھا جو سندھی زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا ڈرامہ ہے اس ڈرامے میں اُن رومیو قماش نوجوان لڑکوں کو پیش کیا گیا ہے جو شارعِ عام پر اپنی جواں مردی کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن ان کے لئے ایک بندر بھبکی کافی ہے۔ یہ اُن خلموں پر گہرا طنز ہے جو اس قسم کے درجنوں رومیو پیدا کر رہی ہیں۔

لیکھ راج عزیز کے کچھ مضامین بھی ظریفانہ نثر کی عمدہ مثال ہیں۔ مثال کے طور پر ۱۔ اگر میں کھال کی بجائے چھال رکھتا ۲۔ جاہل جیون اور ۳۔ میری نئی کلاہ۔ عزیز کی زبان علمی زبان ہے کیوں کہ وہ خود فارسی اور عربی کے اسکالر تھے لیکن ان کی عبارت میں کہیں کہیں دیہی رنگ کا بھی نکھار ہے۔

ملک کے بٹوارے سے پہلے کے اس ادبی دور کا تذکرہ نامکمل رہے گا اگر ان دو بڑے ڈرامہ نگاروں کا ذکر نہ کیا جائے جو اس قافلے کے ہم رکاب رہے۔ یہ پروفیسر ام۔لو۔ ملکانی اور جے این ناگرانی ہیں۔ اول الذکر ایک بابی ڈراما نگاری میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے بیسیوں ڈراموں میں سے صرف دو ڈرامے مزاحیہ ہیں۔ ایک، ٹی پارٹی اور دوسرا لیڈیز کلب۔ اپنے ان سندھی ڈراموں کے لئے انہوں نے انگریزی میں نام چُنے۔ پہلا ڈراما، کالج جانے والی اُن لڑکیوں کو پیش کرتا ہے۔ جو متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن سر میں سودا یہ رکھتی ہیں کہ دوسرے سب ہیچ ہیں۔ یہ بھرم زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔ اس ڈرامے کو اسٹیج پر غیر معمولی کامیابی نصیب ہوئی اور اسے بار بار پیش کرنا پڑا۔ لیڈیز کلب، اُن نمائش پسند خواتین کو بے نقاب کرتا ہے جو کلب میں بیٹھ کر اپنی ہی ہم جنسوں کے بارے میں اسکینڈل پھیلاتی اور خوش ہوتی رہتی ہیں۔ عزیز نے اپنے ڈرامے میں ان دہن کی تیز اور ذہین کی کُند خواتین کی خوب خبر لی ہے۔

اس کے برعکس ناگرانی نے مزاح کو مزاح کے لئے محدود رکھا ہے۔ وہ اسٹیرا کا ماہر ہے اور اپنی سلسلہ وار تحریر "گگنو" (چالباز) سے جانا جاتا ہے۔ ناگرانی نے کوئی ایک درجن سوانگ (مختصر نقلیں) لکھے ہیں جن میں ڈاکٹر، سیاسی لیڈر، ایکٹر، ایڈیٹر، فلم پروڈیوسر اور بہتیرے دوسرے کیرکٹر پیش کئے گئے ہیں۔ ڈرامہ نگار کا اصل مقصد ایسے لوگوں کی لالچ، ہوس اور چالاکیوں کا پردہ فاش کرنا ہے جو ان شریف پیشوں کو بدنام کر رہے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ قہقہوں کے ساتھ ہے اُن کے ڈراموں کا مجموعہ "چورنگی" کے نام سے چھپ چکا ہے اور ایک عرصے تک لوگ ان ڈراموں کے دیوانے رہے۔

سینیر لکھنے والوں میں پروفیسر این۔ آر۔ ملکانی کو اس اعتبار سے اولیت حاصل ہے کہ انہوں نے مہاتما گاندھی کی تحریکات اور تعلیمات سے متاثر ہو کر اپنی پروفیسری کی ملازمت کو خیرباد کہا اور سندھ کے دیہاتوں میں جگہ جگہ گھوم کر پچھڑے ہوئے دیہاتیوں کے ساتھ شب و روز گزارے۔ ان کی تحریریں صفحۂ ناچوں کی شکل میں ہیں اور ان میں ظرافت کے گل بوٹے بکھرے ہوئے ہیں۔ پروفیسر ملکانی نے پرسائند کے اسلوب کو اپنایا اور اپنی پُر مغز تحریروں میں مزاح کی آمیزش کے ساتھ حقیقت نگاری کو بھی برقرار رکھا۔

ملک کی تقسیم کے نتیجے میں جہاں پورا ملک متاثر ہوا وہاں سندھی قوم کو زیادہ دُکھ سہنا پڑا۔ ترکِ وطن کا سنتاپ

www.taemeernews.com

ناقابل بیان تھیں. اس دوران سندھی ادیبوں کو بھی کچھ عرصے تک خاموشی اختیار کرنی پڑی. لیکن زندہ رہنے اور مصائب کو ہنسی خوشی برداشت کرنے میں کسی نے کوئی کوتاہی نہیں دکھائی. آنکھ میں آنسو تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی.

پرسرام ضیاؔ نے سندھی قوم کے اس جذبے کی صحیح نمائندگی کی اور اس ہنگامہ خیز دور کے واقعات کو ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ اپنی شاعری میں بیان کیا۔ "سپاہیا جا سکھانا" (ایک سپاہی کے دردانے) اور "سگاریٹائی جا سوٹا" (ایک سگریٹ نوش کے کش) کے قلمی ناموں سے.

ضیاؔ کے ان مزاحیہ اشعار نے مُردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی. یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ضیاؔ سندھی زبان کا پہلا شاعر ہے جس نے سندھی ادب میں سیاسی طنز کی تلوار کو بے نیام کیا۔

پرسرام ضیاؔ کے بعد لکھنے والوں کی جو نئی پود ابھر کر سامنے آئی اُس میں آنند گولانی بہت نمایاں ہے. اُس کے انداز تحریر کی اساس ظرافت ہے اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوع پر لکھتے وقت بھی وہ مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ڈھونڈ نکالتا ہے. اس نے نت نئے موضوعات پر کوئی.. اکہانیاں لکھی ہوں گی. اس کا فن یہ ہے کہ وہ راہ چلتے کسی بھی معمولی واقعے یا سانحے کے کسی کرے میں ہونے والی چھوٹی سی بات کو بنیاد بنا کر انسانی زندگی کے مضحک پہلوؤں پر طنز اور ظرافت کے تیر چلاتا ہے۔ اس کی کہانیوں کے ایک مجموعے کا نام "رانیوں" ہے غالباً اس وجہ سے کہ اِن تمام کہانیوں کے کردار طبقۂ اناث سے ہیں.

آنند، بذاتِ خود متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور ایک آفس اسسٹنٹ کی حیثیت سے ملازم سرکار ہے اس لئے اس نے متوسط طبقے کے افراد کی گھٹیا ذہنیت اور خود ساختہ گھمنڈ، اُونچی ذات کے احساس برتری، چھوٹوں کے ساتھ حقارت آمیز رویے، رشتہ داروں کے آپسی جھگڑے، اور اِدھر اُدھر کے اسکینڈل اور افواہوں کو اپنی ظرافت کا نشانہ بنایا ہے۔

ایک اور نوجوان ادیب جس کی تخلیقات ظرافت کے پھولوں سے لدی ہوئی ہیں داس طالب ہے اس کا اصلی نام گگن بجلانی ہے۔ اس کی ادبی زندگی کا آغاز ریڈیو کے لئے یک بابی ناٹک لکھنے سے ہوا۔ اس کی تحریروں پر جے۔ این۔ ناگرانی کے مزاح کی چھاپ ہے لیکن اس کا مزاح ناگرانی کے مزاح سے نسبتاً زیادہ نکھرا سُتھرا ہے۔ سچویشن کا مزاح اور مزاحیہ کرداروں کی تخلیق اُس کی خصوصیت ہے۔ اُس نے ایک ناول "مداری" بھی لکھی ہے جس میں مداری کے کردار کو ظریفانہ رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔

دہلی کے ایک نوجوان ڈرامہ نگار جیون گرسہانی کا ایک بابی ڈرامہ "نیلام" اس لحاظ سے قابلِ ذکر ہے کہ یہ شائستہ ظرافت کا اچھا نمونہ ہے۔ ایک کنوارا نوجوان، اپنی شادی کے لئے اپنی قیمت مقرر کرتا ہے اور لڑکی کے باپ سے موٹر کار، مکان، ریفریجریٹر اور خدا معلوم کیا کیا طلب کرتا ہے۔ لڑکی کا باپ غضبناک ہو کر اس نوجوان کو اس قیمت کا اہل ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے۔ ناچنا، کودنا، بھاگنا دوڑنا، ان امتحانوں سے عاجز آ کر لڑکا آخر کار اپنے والدین سے کہہ دیتا ہے کہ وہ کوئی فروخت کی جانے والی جنس نہیں ہے۔ اسی موضوع پر داس طالب کا بھی ایک پلے "ایک سیاہ

لے ترجمے میں ضیاؔ کے منتخب اشعار کا حصہ حذف کر دیا گیا ہے۔ معذرت کے ساتھ۔

www.taemeernews.com

نام دلہن" بہت مقبول ہوا ہے۔

ہری کانت جیٹھوانی نے بھی جو ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے کافی مشہور ہے، ظرافت نگاری کے میدان میں بھی قابل لحاظ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے ایک مختصر ناٹک" کوئی اچنبھا ہے" (لیکن کسی کے آنے کی توقع ہے) میں اس موضوع کو ظریفانہ رنگ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ برتا ہے۔ اس ناٹک میں ایک شخص کو جو ایک خوبصورت، مال دار اور ہنرمند بیوی کی تلاش میں کئی لڑکیوں کو ناپسند کر چکا ہے، اس کا چھوٹا بھائی بیوقوف بناتا ہے اور عین وقت پر خود رفوچکر ہو جاتا ہے۔

پوپاٹی ہیرانندانی کی مختصر مزاحیہ کہانی" چوندینڈے ہیرا" (گوندنیاں چھانٹنا) کا مرکزی خیال بھی شادی کے خواہشمند نوجوانوں کی پسند اور انتخاب کا معاملہ ہے اور ہیرانندانی نے ایسے نوجوان کی سرگذشت بیان کی ہے جسے بالآخر ایک بدصورت لڑکی سے عقد کرنا پڑتا ہے۔

پوپاٹی ہیرانندانی، ظرافت کے معاملے میں بلاشبہ اپنے سب ہم عصروں سے آگے ہے۔ وہ نہ صرف مردوں کے گھمنڈ اور کھوکھلے پن کو اپنی ظرافت کا ہدف بناتی ہے بلکہ اپنے ہم جنسوں کو بھی معاف نہیں کرتی اور عورتوں کی مسنون مزاجی اور غیر ضروری نمائش کے جنون پر بھی طنز کرتی ہے۔ "کپڑوں جی کرامت" (لباس کی کرامت) اور" برابری واتھوری برابری" (مساوات مساوات کا شور) اس کی دو مقبول کہانیاں ہیں۔ "لباس کی کرامت" میں اس نے مردوں کے لباس کی تراش خراش کا دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مرد اپنے جسم کی بدوضعگی اور بے ڈھنگے پن کو کس طرح خوبصورت لباس میں چھپاتے ہیں۔ دوسری کہانی میں ہیرانندانی نے عورتوں کی آزادی کی مہم کے مضحک پہلو پیش کئے ہیں۔

سندری اُتم چندانی کی کہانی" اٹھانی کان چوڑا پار" (بیش قیمت جواہرات کا سودا) جسے بعد میں ناٹک کا روپ دیا گیا، اس موضوع پر بہت عمدہ کہانی ہے۔ اس کہانی میں متوسط طبقے کے اُن افراد کو مزاح کا نشانہ بنایا گیا ہے جو اپنے آپ کو اپنی حیثیت سے زیادہ کا بتانے کی کوشش میں اپنی لٹیا ڈبو لیتے ہیں۔

نوجوان ادیب سندر اگنانی نے جو آرٹسٹ بھی ہے، کچھ مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں۔ ان میں سے دو" اشتہاری شادی" اور" نار جو دھاگو" (بل میں بندھا ہوا بیل) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "اشتہاری شادی" میں رشتہ لگانے والے دو سیانی شخص اور ایک اخبار کے ایڈیٹر کے کردار پیش کئے گئے ہیں جو شادی کے لڈو لیتے امیدوار سے تھیلی میں جنت دکھا کر بے تحاشہ رقم حاصل کرتے ہیں۔ یہ قہقہہ بردوش ڈرامہ ہے۔ اس کا دوسرا ڈرامہ سیاست دانوں پر طنز ہے جنھوں نے مہنگائی کا علاج خاندانی منصوبہ بندی تجویز کیا ہے۔

شلو موتی پرکاش کا کثیر الموضوع ڈرامہ" پڑے گیان پڑے پچھیان" (بیرون پردہ اور پس پردہ) اس شمارے میں سب سے اچھا ڈرامہ ہے۔ ایک لڈو لیتا کس طرح روپے کے بل بوتے ایک معزز شخص بنتا ہے، سماج کی اس برائی کو ڈرامہ نگار نے نہایت ہی چابکدستی کے ساتھ ظاہر کیا ہے اور اس کے بعض حصے تو بے پناہ ہیں۔ خالی برتن کتنی آواز دیتا ہے یہی نکتہ

www.taemeernews.com

اس ڈرامے کی جان ہے۔

تازہ اور نوواردان ادب میں لکھیمی کھلانی اور ٹیک چندمت کا ذکر ضروری ہے جنھوں نے ظرافت کے میدان میں اپنی جولانی طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان دونوں میں لکھیمی کھلانی زیادہ ہنرمند ہیں۔ مزاحیہ کہانیوں کے علاوہ اس کے دو ناول شائع ہوئے ہیں جو ظرافت کا بہتر نمونہ ہیں۔ "ہائے میرا دل" اس کا یہ ناول کردار نگاری کے ساتھ ساتھ سچویشن کے مزاح کی کامیاب کوشش ہے۔ یہ کہانی ہوسٹل کے ہنسوڑ اور کھلنڈرے مقیم طالب علموں کے گرد گھومتی ہے۔ ہم عمروں کے علاوہ اپنے اُستادوں کے ساتھ بھی ہلکی پھلکی مذاق کی مختلف شکلیں دیکھنے والوں کے لئے تفریح کا سامان پیدا کرتی ہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ بعض جگہ ناول نگار شائستہ مزاح کی حدود پار کر کے پھکڑپن کے خارزار میں نکل گیا ہے۔ اسی ناول میں ایک ایسے طالب علم کو بھی پیش کیا گیا ہے جو زمانۂ طالب علمی میں ہر معاملے میں پھسڈی تھا لیکن سیاست کے میدان میں شہسوار بنا اور جب وہ منسٹر بنتا ہے تو اپنے ہی کالج میں بحیثیت مہمان خصوصی بُلایا جاتا ہے۔

لکھیمی ناول کا دوسرا مزاحیہ ناول 'امرت امرت' ہے۔ اس ناول میں موجودہ سیاسی صورت حال پر طنز ہے۔ اس ناول کے چند حصے خاصے اچھے ہیں۔

ٹیک چندمت کی ۳ مزاحیہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سے دو مجموعے خاکوں اور اسکٹس پر مشتمل ہیں۔ چند خاکوں میں تفریح کا اچھا سامان ہے۔ اس کی ناول "شادیا۔ جا۔ لاڑدل" (شادی کا طلسم) لطیف مزاح لئے ہوئے ہے۔ اس ناول میں ایک نام نہاد دلیر شخص کی داستان ہے جو شادی کے بعد زن مُرید ہو جاتا ہے اور بیوی کے اشارے پر ناچتا ہے۔

"بھینگا۔ جا۔ رنگا" (مئے نوشی کی بہار) ہری ہما تھانی کے مزاحیہ خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں شک نہیں بعض خاکوں میں مصنف نے مزاح کو سنگاری کے لئے استعمال کیا ہے لیکن جگہ جگہ بے ضرر مزاح کے اچھے نمونے بھی ملتے ہیں۔ "دادا جان کا پلنگ" پُر لطف خاکہ ہے۔

آخر میں دو نوجوان شاعروں کا ذکر کرنا چاہوں گا جنھوں نے اپنی مزاح نگاری کے لئے ڈرامے ہی کو منتخب کیا ہے واسدیو نرمل نے دوسری زبانوں کے ڈرامے سندھی زبان میں منتقل کر کے ایک اچھی ادبی خدمت انجام دی ہے۔ واسدیو نے اب تک خود کوئی اہم طبع زاد تصنیف سندھی ادب کو نہیں دی ہے لیکن کچھ مزاحیہ اسکٹس ضرور لکھے ہیں۔ اس کے مختصر ڈراموں کا ایک مجموعہ "بہرے" جمع ہو گئے ہیں" شائع ہو چکا ہے۔ وہ گھریلو زندگی کے واقعات کو ظریفانہ مکالموں میں پیش کرتا ہے۔

ایک اور شاعر ایم۔ کمال نے کوئی نصف درجن مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں جو اسٹیج پر پیش کئے جا چکے ہیں اور کافی مقبول ہوئے ہیں۔ اُس کے تین مشہور ڈرامے، شفاخانہ، میونسپل کاونسلر اور نیم حکیم ہیں۔

www.taemeernews.com

بشیر عارف (سرینگر کشمیر)

آزادی کے بعد
"کشمیری زبان کے نثری ادب میں طنز و مزاح"
——— ایک تنقیدی جائزہ

مزاح دراصل شکستِ ذات کا ردِ عمل ہے۔ چوں کہ انسان فطرتاً خود پسند اور خود پرست واقع ہوا ہے اس لئے اپنی ہر ناکامی یا محرومی کو چھپانے اور اسے دوسروں پر ظاہر کرنے کے لئے ایک ایسا راستہ اختیار کرتا ہے، جو سامنے والے پر کچھ اس طرح کا تاثر چھوڑتا ہے کہ وہ شکستِ ذات میں مبتلا شخص کی اصل حالت جاننے سے قاصر رہتا ہے۔ مثلاً اگر ایسا شخص کسی بڑے حادثے سے دوچار ہوتا ہے اور وہ حادثہ اس کے دل کو مسوس کر رکھ دیتا ہے تو اپنی اس محرومی کو دوسروں پر آشکارہ ہونے سے بچانے کے لئے وہ شخص اپنی اسی محرومی کا مذاق اڑاتا ہے۔ اور اس محرومی کو اپنے سے کم تر ثابت کرنے کی بنت میں ترکیبیں تراشتا رہتا ہے۔ یہاں مجھے اس بحث میں اُلجھنا نہیں ہے کہ مزاح کی تخلیق کن حالات میں ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم کشمیری زبان میں مزاح نگاری کی بات کریں تو ایسی باتوں کی طرف اشارہ کرنا لازمی بن جاتا ہے۔ کیوں کہ کشمیری قوم نے سالہا سال غلامی کی زندگی گزاری ہے اور کئی طرح کی صعوبتیں جھیلیں۔ اور اپنی محرومیوں اور ناکامیوں پر خود ہی طنز کرتے رہے۔ یہ طنز محاوروں میں آج بھی مستعمل ہے۔

کشمیری زبان میں مزاحیہ ادب کی تخلیق ۱۹۴۷ء کے بعد باقاعدہ طور پر ایک خاص ڈھنگ سے شروع ہوئی۔ جسے ۱۹۴۸ء میں ریڈیو کشمیر سرینگر کے قیام سے ایک نئی سمت عطا ہوئی۔ ریڈیو اسٹیشن کے قیام سے پہلے بھی دیہات اور قصبہ جات میں بانڈپاتھر (مسخروں کی جماعت) یعنی طنز و مزاح کے اوپن ایئر (open air) اسٹیج شو کرائے جاتے تھے لیکن اُن کا معیار اتنا اچھا نہیں تھا کہ وہ تاریخ ادب میں ایک خاص مقام پیدا کرتے۔ پھر بھی انہیں تاریخ سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔
آزادی کے بعد ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا جو مختلف فنکاروں کے لئے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا یہ ایک بہتر ذریعہ بنا اور چند لوگوں نے مستقل طور پر ریڈیو اسٹیشن کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کر لیا۔

کشمیری زبان میں، مَیں مزاح نگاری کے لئے پُشکر بھان کو پہلا باصلاحیت ادیب مانتا ہوں۔ اور یہ بھی کشمیری زبان کے جاننے والوں کو ماننا ہی پڑ رہا ہے کہ اگر مزاحیہ ادب کی تخلیق کشمیری زبان میں ہوئی یا ہو رہی ہے تو اُس کا

www.taemeernews.com

سب سے بڑا محرک ریڈیو کشمیر ہی ہے۔ اور خود پشکر بھان بھی سالہا سال سے ریڈیو سے وابستہ رہے۔

پشکر بھان نے "مچامہ" نام کا سلسلہ وار ڈرامہ بہت سال پہلے شروع کیا اس طربیہ ڈرامہ نے ساری وادی میں دھوم مچادی اور مچامہ ایک مثال کردار بن گیا گو کہ اس سے پہلے بھی چند مزاحیہ ڈرامے اور دوسری تخلیقات لوگوں کے سامنے آئیں، لیکن اُن میں وہ کشش اور جاذبیت نہ تھی۔ جو پشکر بھان کے قلم سے نکلے ہوئے تیر و نشتر لئے طنز و مزاح میں محسوس کی گئی۔ پشکر بھان کے ایک قریبی ساتھی اور راقم الحروف کے شفیق رہبر مرحوم سومناتھ سادھو بھی ۱۹۸۲ء تک ریڈیو سے وابستہ رہے یہ سادھو مرحوم اپنی تخلیقات میں طنز و مزاح کو اس باریکی سے پیش کرتے تھے کہ سننے والا جہاں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جایا کرتا وہیں سوچنے پر بھی مجبور ہوتا تھا۔ اُن کے اظہار کا خاص ذریعہ ریڈیو کشمیر کا مشہور زمانہ فیچر زونہ ڈب رہا۔

اس فیچر کے لکھنے والوں میں پشکر بھان اور سومناتھ سادھو مرحوم کے نام سرفہرست ہیں۔ اس فیچر کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ ۳ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو شروع ہوا اور آج بھی پہلے ہی کی طرح شوق سے سنا جاتا ہے۔ اس فیچر کی تخلیق میں محمد سلطان پنڈت، شریف الدین علی محمد لون، عبدالاحد فرہاد، محمد عبداللہ اور راقم الحروف کے نام بھی گنوائے جا سکتے ہیں۔ اس فیچر کے تین صد اسکاروں کو جن میں پشکر بھان، سادھو مرحوم اور مریم بیگم شامل ہیں۔ سال ۷۴، ۱۹ء میں پدم شری اعزاز سے نوازا گیا۔ اور ۱۹۸۱ء کو اسی فیچر کے لئے پشکر بھان، سومناتھ سادھو مرحوم، مریم بیگم، اوشا ہزرہ، اشوک کاک، شریف الدین اور راقم الحروف کو صادق میموریل اعزاز سے نوازا گیا۔

پشکر بھان جہاں زونہ ڈب پروگرام کے تخلیق کار کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں وہیں انہوں نے سلسلہ وار ڈرامہ مچامہ کی مقبولیت سے بحیثیت مزاح نگار ایک منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔ چوں کہ اس کے اعزاز میں سلسلہ وار ڈرامہ مچامہ کی کتابی صورت میں منظر عام پر آنے کے بعد اُسے ساہتیہ اکادمی اعزاز نصیب ہوا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پشکر بھان ملکی سطح پر کشمیری زبان کے مانے ہوئے مزاح نگاروں میں شمار کئے جا سکتے ہیں اس کے علاوہ پشکر بھان نظم صاحب نام کا فیچر بھی لکھتے رہے جو کافی سراہا گیا ہے۔

ریڈیو کشمیر سرینگر کے دوسرے اہم مزاح نگار محمد سلطان پنڈت ہیں۔ پنڈت صاحب طبعاً ظریف واقع ہوئے ہیں۔ بہت سال پہلے اُنہوں نے ریڈیو سے ایک پروگرام شروع کیا تھا جس کا نام تھا مغل ڈار۔ اس میں جہاں دیہات کے مسائل اور دیگر باتیں ہوتی تھیں، لیکن جس انداز سے اِسے تحریر کیا جاتا تھا۔ وہ سننے والے کو ہنسائے بغیر نہیں رہتا تھا۔ یہ فیچر اب ریڈیو پر جاری نہیں، لیکن لوگ آج بھی محمد سلطان پنڈت کو مغل ڈار کے نام سے جانتے ہیں اور وہ آج بھی مغل ڈار کے نام سے ہی دیہاتی پروگرام میں شریک ہوتے ہیں۔ اِس کے علاوہ محمد سلطان پنڈت ایک سلسلہ وار فیچر بھی لکھتے تھے۔ اس فیچر کا نام تھا کچھ پیٹھ گو کہ یہ فیچر اپنی جگہ مکمل تھا۔ لیکن پھر بھی زونہ ڈب فیچر جیسی مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اور اِس طرح یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔

www.taemeernews.com

کشمیری زبان کے ایک نامور جواں سال ادیب و شاعر، جنھیں میں کشمیری شاعری کا اگر مراد آبادی کہنا بے جا نہیں سمجھتا وہ ہیں عبدالاحد فرہاد۔ فرہاد بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ محمد سلطان پنڈت کی طرح طبعاً ظریف ہیں۔ چوں کہ بہت سال پہلے ریڈیو سے وابستہ ہوئے اور یہاں آنے کے بعد اپنے اندر چھپے اس ظریف فرہاد کو سپرد قرطاس کرتے رہے۔ اور سامعین سے داد تحسین حاصل کرتے رہے اُن کا نام اُن کی تخلیقات کی پہچان بن گیا ہے۔

اوتار کرشن رہبر بھی ریڈیو کشمیر سے وابستہ ہیں۔ بنیادی طور پر محقق، ناقد اور مورخ ہیں۔ چوں کہ مرحوم سوما ناتھ سادھو اور پشکر بھان کے ساتھ صحبتیں رہیں اس لئے ڈرامے اور فیچر لکھنے کا انھیں شوق دامن گیر ہوا۔ کئی کامیاب ڈرامے لکھنے کے باوجود مزاح میں خاص مقام نہ بنا سکے۔ کئی برس پہلے ایک سلسلہ وار جھلکی لکھ رہے تھے۔ جس کا نام تھا۔ ڈیڈی جی ــــ چوں کہ مزاح رہبر صاحب کا شعبہ نہیں، شاید اسی لئے ڈیڈی جی فیچر کو کامیابی کے ساتھ آگے نہیں بڑھا سکے۔ اور نتیجتاً یہ سلسلہ وار فیچر بھی بند کر دیا گیا۔

کشمیری زبان و ادب کی ایک قد آور شخصیت ہیں اختر محی الدین، جنھیں پدم شری اعزاز ملنے کے علاوہ ساہتیہ اکادمی اعزاز بھی عطا کیا گیا ہے۔ اختر صاحب کا خاص شعبہ افسانہ اور ناول ہے۔ لیکن کمال فن کاری سے طنز و مزاح میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ اُن کا اسلوب باقی تمام مزاح نگاروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ وہ لفظوں سے نہیں بلکہ سچویشن سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ سچویشن سے مزاح پیدا کرنا قدرے مشکل فن ہے لیکن اختر صاحب اس میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ ان کا ایک خاکہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ اس خاکے کا عنوان تھا اچکن ــ جس چابکدستی سے اس خاکے کی تخلیق اختر صاحب نے کی ہے وہ قاری کو عش عش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

جیسا کہ میں نے ابتداء میں بیان کیا کہ آزادی سے پہلے بھی مزاحیہ ادب تخلیق ہوتا رہا لیکن وہ بانڈ پاتھر تک ہی محدود تھا۔ یعنی چند مسخرے بے ڈھنگی حرکتوں اور ناچ گانے سے یا چند فقروں سے ناظرین کے لئے سامان طرب مہیا کرتے تھے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ مسائل بدلتے گئے اور مسائل پر ہنسنے کے طور طریقے بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بانڈ پاتھر کی تشکیل نو ہوتی رہی۔ مزاح کی اس صنف کو ایک نیا اسٹائیل اور ایک نئی وضع عطا کرنے کا سہرا محمد سبحان بھگت اور موتی لال کیمو کے سر ہے اب بے ڈھنگی اور بے جا ہنسی مذاق کے بجائے بانڈ پاتھر میں مزاح کے ساتھ طنز کا عنصر بھی واضح طور پر محسوس کیا جانے لگا ہے۔ اس میں دیہات کے معصوم لوگوں کا استحصال، معاشی اقتصادی، سماجی بدحالی۔ اور افلاس جیسی چیزوں کو طربیہ انداز میں پیش کر کے ہنسی میں چھپے آنسو موتیوں کی طرح بکھر جانے کے مناظر پیش ہونے لگے۔ اس کی زبان غیر شائستہ ہوتی تھی۔ لیکن بھگت اور کیمو نے اس صنف کو ایک نیا اسلوب اور انداز بخشا۔ ایک طرف ریڈیو کشمیر سرینگر کی جانب سے مزاحیہ ادب پروان چڑھتا رہا اور دوسری طرف ٹیلیویژن کے ذریعے ۱۹۷۴ء سے مختلف مزاحیہ تخلیقات لوگوں کے سامنے آئیں۔ ٹیلی ویژن پر مزاحیہ پروگراموں کی شروعات فاروق نازکی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ چوں کہ نازکی پہلے ریڈیو سے وابستہ تھے پشکر بھان اور سوم ناتھ سادھو مرحوم کے قریبی

www.taemeernews.com

حلقے میں ہونے کے باعث انہیں مزاحیہ ادب کی پہچان کا چسکہ پڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی ویژن سرینگر پر وہ مزاحیہ پروگرام زیادہ دلچسپی سے پروڈیوس کرتے رہے۔ ٹیلی وژن کے لئے مزاحیہ ادب تخلیق کرنے والوں میں ستار احمد شاہد، غلام نبی خیال، ڈاکٹر سوہن لال کول، بشیر دادا، سجو دسیلانی، فاروق مسعودی، بشیر پڈگامی، مکھن لال صراف وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لیکن پھر بھی ٹیلی ویژن کی کم عمری کے باعث ابھی تک زون ڈب جیسا طنز و مزاح سے بھرپور فیچر کی مثال قائم نہ کر سکا۔ اور اب اس کی توقع رکھنا بھی فضول ہے۔ کیوں کہ اب لوگوں کا مذاق برق رفتاری سے بدل رہا ہے۔

جہاں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسری تنظیمیں مزاحیہ ادب کو فروغ دینے میں اپنا حصہ ادا کر رہی ہیں۔ وہیں ہمیں ریاستی کلچرل اکادمی کا بھی خیال آتا ہے۔ اکادمی علم و ادب کے میدان میں بہت ہی گراں قدر کام کر رہی ہے۔ لیکن مزاحیہ ادب کی حوصلہ افزائی اس طور سے نہیں کی جا رہی ہے، جس کا عہد حاضر تقاضا کر رہا ہے۔ پھر بھی کشمیری زبان میں شائع ہونے والے اکادمی کے رسالے شیراز میں اکاڈکا مزاحیہ تخلیقات منظر عام پر آتی رہی ہیں۔ لیکن وہ تخلیقات ناکافی کیفیہ ہونے کے برابر گردانی جا سکتی ہیں۔

وادیٔ گلپوش کشمیر میں جو دیگر ادیب مزاحیہ ادب تخلیق کرتے ہیں۔ اُن میں رفیق اشبری، غلام نبی بابا، ڈاکٹر محمد زماں آزردہ (آزردہ صاحب نے اپنے انشائیوں کو فکر ہنز ٹکر نام سے کتابی صورت بھی دی ہے۔ محمد شفیع پرتی ظریف احمد، نور محمد لون (اناؤنسر ریڈیو کشمیر سرینگر) اور گلزار حضر تبلی۔

آخر میں یہ کہنا لازمی ہے کہ بہت کچھ ہونے کے باوجود طنز و مزاح کے تخلیق کاروں کی وہ حوصلہ افزائی نہیں کی گئی اور نہ کی جا رہی ہے۔ جو ہونی چاہیئے تھی۔ بس مزاح نگار اپنے گرد و نواح اور خود اپنی محرومیوں کی نقاب کشائی کرتے رہے اور لوگ ہنستے رہے۔ اور "واہ" کرنے کے سوا کچھ نہ دے سکے۔ مزاح سے لطف اندوز ہونا سبھی جانتے ہیں۔ لیکن مزاح کی ہنسی میں پوشیدہ آنسو کسی کی آنکھ سے نہ چھلکے ۔!

پہلے
چھیڑ چھاڑ
پھر
چوڑی کے غلام
اس کے بعد
ٹوٹو میں میں
اسکے بعد
پرویز یداللہ مہدی
کے طنزیہ و مزاحیہ
مضامین کا تازہ ترین مجموعہ
ٹائیں ٹائیں فش ۱۵ روپے
ناشر زندہ دلان حیدرآباد

www.taemeernews.com

حمیداللہ
(بنگلور)

کنڑا مزاح

کنڑا زبان اور اس کے ادب کی دو ہزار سالہ تاریخ کے تانے بانے سینہ بہ سینہ چلنے والی حکایتیں، کتبے اور کتابیں ہیں۔ حکایتوں اور کتابوں میں جا بہ جا طنز و مزاح کے عناصر ملتے ہیں۔ مگر مقام حیرت ہے کہ یاروں نے کتبوں میں بھی ان دلچسپ اجزاء کے لئے گنجائش نکالی۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اہل کرناٹک مزاح پرست اور طنز آشنا ہیں۔

ابتدائی دور کتباتی ادب سے منسوب ہے۔ اب تک تین ایسے کتبے دستیاب ہوئے ہیں جو صرف طنز و مزاح سے متعلق ہیں۔ اس طرز کی عمدہ مثال یہ کتبہ ہے

"یہاں وکرم سانت دفن ہے۔ اس نے اپنی بے مثالی شجاعت سے دشمن پر فتح حاصل کی۔ پھر اس کے گوشت سے اپنے شکم کو سیراب کیا۔ اور بدہضمی کا شکار ہوا۔ جب یہ ایک مستند وید سے رجوع ہوا تو یہ نسخہ تجویز کیا گیا کہ وکرم سانت ہاتھی کا گوشت کھائے تاکہ بدہضمی جاتی رہے ـــــ"

کنڑا کا ابتدائی ادب صرف نظم سے پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے نثری ادب کا جائزہ لینے سے پہلے ظریفانہ شاعری کے بارے میں چند باتیں کہنی اور اس کی چند مثالیں دینی ضروری ہیں۔ راجاؤں کی مدحت اور مذہبی مسائل قدیم نظموں کے موضوعات ہیں۔ پمپا۔ رنّا۔ ہری ہرا۔ کمار ویاس ابتدائی دور کے قدآور شاعر ہیں۔ اس دور میں ایک صنفِ سخن چمپو (طویل نظم) کا رواج عام تھا۔ ان طویل نظموں کو شاعروں نے طنز و مزاح کے استعمال سے بے رس نہ ہونے دیا۔ کہیں کہیں شگفتہ۔ مسجع اور مقفیٰ جملوں میں بھی ان عناصر کو برتا گیا ہے۔ پمپا اپنے مخصوص شیریں لہجے میں یہ حکایت بیان کرتے ہیں کہ راجہ دُریودھن کو رسّی سے باندھ کر پھینکا جاتا ہے۔ کوئی آگے بڑھ کر مدد نہیں کرتا۔ آخر کار دروپدی کے نازک سے دل میں ہمدردی اور رحم کے جذبات بیدار ہوتے ہیں اور اپنے مخصوص نسوانی لہجے میں یہ کہتے ہوئے گرہ کھولتی ہے کہ پتہ نہیں تم نے کل تک کتنے لوگوں کو اپنی گرفت میں رکھا ہوگا۔

www.taemeernews.com

نانا نے اپنی طویل نظم گدا یدھا (جنگ نامہ) میں مزاح کا ایک نیا پہلو نکالا ہے۔ مہابھارت کی جنگ ختم ہوئی۔ سارے کورو مارے گئے۔ ایک دُریودھن باقی تھا۔ وہ بھیم کے غصہ سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ گہرے تالاب کے پانی کو اپنی پناہ گاہ بنالیا۔ آوازے کر سب لوگ تھک گئے مگر وہ پانی سے باہر نہیں آیا۔ جب بھیم نے آواز دی تو پانی ہی میں اس کے بدن سے پسینہ بہنے لگا۔

کنڑا کے قدیم شعری ادب پر سنسکرت اثر انداز تھی۔ اس اکتسابی عمل کے باوجود کنڑا شاعری کی انفرادیت مجروح نہ ہوسکی کیونکہ کنڑا شاعروں کو اپنی زمین اپنے رسم ورواج اپنی تہذیب، اپنا ماحول، اپنے محاورے اور اپنی روایتیں بہت عزیز ہیں۔ اس پس منظر میں کنڑا کی قدیم نظمیں کنڑا کی تاریخ بیان کرتی ہیں۔ ان فلسفیانہ نظموں میں طنز و مزاح کا لطیف امتزاج بھی شامل ہے۔ اس باب میں ہری ہرا کی ایک طنزیہ نظم گرجا گلیان کا یہ ٹکڑا قابل ذکر ہے۔

"شنکر فقیر کے بھیس میں آکر گرجا کی عبادت میں مخل ہوتے ہیں۔ اس کو یوں چھیڑتے ہیں کہ تمہارے شنکر کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اس کو زندگی کے رنگ روپ بھی حاصل نہیں ہیں۔ اس کے جامہ اور بے حس جسم پر سانپ کے زیور ہیں۔ گرجا جواب دیتی ہے کہ بس شنکر کا نام ہی میری سرخروئی کا ضامن ہے۔ وہ خفا ہوکر شنکر پر بھسم پھینکتی ہے۔ پھر شنکر اصلی روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔"

سری نیسولیشور کے وچن روحانی کیفیات اور اصلاحی نقطۂ نظر سے وقیع ہیں۔ رُشد و ہدایت کے سلسلے میں انہوں نے طنز کو ایک موثر حربہ کے طور پر برتا ہے۔ آدمی کے مساویانہ درجات کی تلقین کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اُونچے لوگ کان سے پیدا نہیں ہوتے۔ ایک اور وچن میں سری نیسولیشور نے ذات پات میں امتیاز برتنے والوں کو ایک ایسی نجس عورت کا طعنہ دیا ہے جو صاف اور عطر آمیز پانی سے نہاکر خود کو پوتر سمجھے۔ عام آدمی تک اپنے خیالات اور تاثرات کی ترسیل اور ان کی تفہیم کے لئے سری نیسولیشور طنز کو ضروری سمجھتے تھے۔ اسی لئے انہوں نے ہر اختیاج کی خاطر ایک ہی پانی کہہ کر طبقاتی نظام پر گہری چوٹ کی ہے۔

شریف صاحب شیش نال ایک صوفی منش شاعر گزرے ہیں۔ ان کے کلام میں بھی شوخی اور ظرافت ہے۔ کہتے ہیں۔

۱. میرا شوہر دوسروں کی طرح نہیں ہے۔ اُس نے پیر توڑ کر مجھے اس طرح گھر میں بٹھا دیا ہے کہ میں باہر ہی نہیں جاسکتی۔

۲. میری بیوی دوسروں کی طرح نہیں ہے۔ وہ بے حد خوش مزاج اور عیش پسند ہے۔ مگر مجھے گالیاں دے کر گھر سے بار بار نکال دیتی ہے۔ بھاوج اور نند کی چشمک کو ایک عوامی گیت میں یوں پیش کیا گیا ہے۔

"ہوا کے زور سے جس طرح پودوں میں مرچ کے بیل تھرکتے ہیں۔ بالکل اسی طرح بھابی میرے بھیا کو نچاتی ہیں۔"

www.taemeernews.com

کنڑا کے جدید شاعروں کے درمیان کوئی ایسا مشہور شاعر نہیں ہے، جس نے صرف طنز و مزاح کو اپنایا ہو۔ اس دور کے مشہور شاعر کوئمپو، بیندرے، ہلسنگی چنی لبیّا۔ ڈی۔ این۔ کر کی۔ راج رتنم۔ پو۔ ٹی۔ نرسمہا چار۔ گوپال کرشنا اڈیگا۔ کے لیس۔ نرسمہا سوامی۔ کے۔ ایس نثار احمد۔ چندر شیکھر کمبار۔ چندر شیکھر پاٹل۔ اِنچل اور بی۔ اے۔ سندی کی اکثر نظموں میں طنز کے عناصر ہیں۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ موجودہ صنعتی اور سائنسی دور مزاح کے لئے موزوں نہیں ہے۔

راج رتنم نے ایک گنوار شرابی کے خیالات کو اس طرح منظوم کیا ہے۔

"سیدھی رتن کے لئے خدا ہے۔ سیدھی خانہ عبادت گاہ ہے۔ وہ یہاں بیٹھ کر چاندنے یوں مخاطب ہوتا ہے کہ تیری صورت ٹیڑھی ہے۔ تیری آنکھیں کٹے ہوئے لیمو کی پھانک ہیں۔ تو بے شرم ہے۔ جو ہمیشہ پردہ نشینوں کی تاک میں رہتا ہے۔"

بیندرے کی سماجی اور فکری نظموں میں کہیں کہیں طنز و مزاح کے نشانات ہیں۔ ان کی مقبول ترین نظم "چار تار" کو اس ضمن میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

کوئمپو نے بائیس ہزار دو سو چوراسی مصرعوں پر مشتمل ایک رزمیہ نظم سری رامائن درشن لکھی ہے۔ جس میں کچھ تبدیلیوں کے ساتھ سری رام کی کہانی بیان کی گئی ہے جس اور جنگ و جدل کے مدات میں کوئمپو کا لہجہ شدید طنز آمیز ہو گیا ہے۔

گوپال کرشنا اڈیگا نے اپنی طویل نظم دھرتی کا گیت میں طنز کے ذریعہ لوگوں کو حب الوطنی اور روشن مستقبل کی تعمیر پر اکسایا ہے۔

کے لیس۔ نثار احمد کی دو نظمیں بکریاں عالی جناب اور برقعہ طنز کے باب میں آتی ہیں۔ بکریوں کو علامت بنا کر نثار نے طنزیہ لہجہ میں یہ کہا ہے کہ لوگ اپنی عقل سے نہیں سوچتے۔ برقعہ میں نثار کہتے ہیں کہ قدیم رسموں اور روایتوں کا سلسلہ ٹوٹتا ہی نہیں۔ اس نظم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ شوہر کی خواہش پر دلہن بن سنور کر سیر و تفریح کے لئے تیار ہو جاتی ہے مگر دلہیز پر اچانک اسے یاد آتا ہے کہ اس نے ساس کی اجازت نہیں لی اور جسم پر برقع بھی نہیں ہے۔ حالانکہ یہی دلہن اپنے شوہر کی یہ بات مان چکی ہے کہ قدیم رواج اور پردہ دونوں غیر ضروری ہیں۔

کے۔ لیس۔ نرسمہا سوامی اور چندر شیکھر پاٹل نے سماجی اور سیاسی نظموں میں طنز کو اس طرح برتا ہے جیسے راکھ میں چنگاریاں ہوں ـــــ انوا ہیں ہر دور میں پھیلتی ہیں۔ کنڑ ادب کی یہ حکایت حیرانی اور مزاح کے خوشگوار امتزاج کی حامل ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ الف تک یہ اطلاع پہنچتی ہے کہ 'ب' نے جب قے کی تو اس کے منہ سے کوا نکلا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ "د" نے 'ج' کو یہ بات بتائی تھی۔ الف ہر در پر جاتا ہے۔ ہر جگہ یہی بات سنتا ہے مگر کوئی شاہد نہیں ملتا۔ پھر وہ کسی نہ کسی طرح حضرت 'ب' کے گھر پہنچ جاتا ہے اور وہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ اصل میں 'ب' نے جب قے کی تو اس کے منہ سے کثیر بلغم خارج ہوا اور جس کا رنگ قدرے کالا تھا۔ یہ قدرے کالے رنگ والی بات پھیلتے پھیلتے کوا بن جاتی ہے۔

www.taemeernews.com

قدیم نثر نگاروں میں نیا سینا کو اولیت حاصل ہے۔ انہوں نے اپنی مذہبی کتاب دھرمیتا میں اپنے دلائل کی حمایت میں مقامی محاوروں کے ذریعہ مزاح کو اپنایا ہے۔ اسی طرح دُرگا سہانے پنچ تنتر میں مختلف جانوروں کو علامت بنا کر انسانی اور حیوانی اقدارِ زندگی کا تقابلی مطالعہ کیا ہے اور ایسی دلچسپ حکایتیں بیان کی ہیں کہ بڑی دیر تک ہنسی کا سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔

جدید نثر نگاروں میں مدنا کا نام نہایت ہی اہم اور روشن ہے۔ انہوں نے ویدوں، پرانوں اور اساطیری تصورں میں طنز و مزاح کو تلاش کیا ہے۔ مزاح نگاری کے تعلق سے مدنا کہتے ہیں کہ اصل آرٹ تو یہ ہے کہ صدیوں وقت کے غبار میں چھپے رہنے کے باوجود وہ اپنی آب و تاب نہ کھوئے۔

مدنا کے موضوعات اپنے ماحول اور تجربات سے ماخوذ ہیں۔ ان کی بیوی ان کے قلم کا نشانہ بنتی ہے ایک بار یوں ہوتا ہے کہ ان کے وطن اڑپی میں مسلسل بارش ہوتی ہے۔ سارے کاروبار معطل ہیں۔ گھروں میں بیٹھے بیٹھے لوگ بے زار ہیں۔ ایسے عالم میں بیوی اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ کچھ تو سناؤ تاکہ وقت کٹے۔ شوہر لطیفے سنانا چاہتا ہے مگر بیوی روک دیتی ہے۔ اُسے مزاحیہ داستانیں اور لطیفے بھی پسند نہیں آتے۔ وہ رامائن کی فرمائش کرتی ہے۔ تو شوہر ہنستے ہنستے اس سے کہتا ہے کہ جس حلق سے پانی نہ اترے وہاں سے کس طرح پکوان پوری جائے گی۔

مدنا ایک مشعل راہ ہیں جس سے آگے چل کر کئی چراغ روشن ہوئے۔

کنڑا ناول فنی حیثیت سے نہایت ہی جاندار ہے۔ ساہتیہ اکاڈمی نے ناول ہی پر زیادہ تر انعامات دیئے ہیں۔ شیورام کارنت کا ناول گونگی نانی کے خواب طنز و مزاح کا عمدہ نمونہ ہے۔ گیان پیٹھ ایوارڈ یافتہ اس ناول کی ہیروئن بوڑھی نانی پرانی اشیاء دیکھ کر متعلقہ ادوار کی تاریخ بیان کرتی ہے اور اس وقت اس کا لہجہ بہت ہی شگفتہ، لطیف اور شوخ ہو جاتا ہے۔ شیورام کارنت کے دوسرے ناول مَرلی مَنّی گے اور دیوا دُوتر قبائل اور پہاڑی لوگوں کی کہانیاں بیان کرتے ہیں۔ ان ناولوں میں عورتوں کی زبان سے نہایت ہی پُر لطف باتیں سنائی گئی ہیں۔ دوسرے ناول دشوار کشا۔ اُپ یا دانتا اور مدد دونو مہابھارت بھی اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہیں کہ ان میں کہیں کہیں طنز و مزاح کے اشارے ہیں۔

کہانیوں میں مزاح کو پیشِ نظر رکھنے والوں میں پنجے منکیشور راؤ۔ ماستی وینکٹیش آئینگار۔ اے۔ این۔ بھوتی راؤ۔ اے۔ این۔ کرشنا راؤ اور گورور راماسوامی آئینگار قابلِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے خالص مزاحیہ کہانیاں لکھی ہیں۔ اس گروہ میں گورور راماسوامی آئینگار اپنی شگفتہ بیانی اور مزاح سے صاف پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے دیہاتی ماحول اور روزمرہ کے واقعات کو مزاح کی چاشنی سے پُر لطف بنایا ہے۔ دیہاتی تصویریں اور بارات دونوں ایسی کتابیں ہیں جن کو قبولیت کی سند ملی ہے۔

ڈاکٹر آر۔ شیورام (راشی) پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں اور انہوں نے اپنے اس پیشے کے تجربات کو مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کو مریضوں کی نفسیات میں مزاح نظر آتا ہے۔ "منونندا" ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے۔

www.taemeernews.com

پروفیسر ایس۔ شیش مکری راؤ کہتے ہیں کہ کنڑا کا جدید ادب طنز و مزاح کے لحاظ سے قدرے سست رفتار ہے تاہم اس کی پچھلی روایتوں اور مقبولیت کو برقرار رکھنے کے لئے ین۔ کشوری اور راشی کی کوششیں رائگاں نہ جائیں گی۔

بیچی (بھیم سن راؤ) کے بغیر کنڑا کے جدید مزاحیہ ادب کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ بیچی ظریف انسان تھے۔ انہوں نے دکھ درد کے آنسوؤں میں بھی مزاح کی چمک دیکھی۔ بیچی اپنی صاف گوئی۔ بے باکی اور خوش گفتاری کی وجہ تمام ادبی حلقوں میں مقبول اور معروف تھے۔ انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز اور شاہیر کی آپ بیتیوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ یہ کہتے ہیں کہ یہی کتابیں ان کے لئے تحریک بنیں۔

۱۹۵۰ء میں ان کا پہلا ناول دماس کوٹہ شائع ہوا تھا۔ کنڑا کے مشہور ناول نگار لے۔ ین۔ کرشنا راؤ نے اپنے پیش لفظ میں اس ناول کی خوبیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے بیچی کے روشن مستقبل کی بشارت دی تھی۔

بیچی نے تمّا کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ وہ اسی کردار کے توسط سے بات کرتے ہیں۔ گویا تمّا ان کی روشن ضمیری، خوش فکری اور خردمندی کا ترجمان ہے۔ ایک نقاد نے تمّا کو بیچی کا سہراز کہا ہے۔ ایس۔ بال چندر راؤ نے لکھا ہے کہ بیچی کے نشانیوں اور کہانیوں میں متعدد ایسے فقرے ملتے ہیں جن کو اشعار کی طرح برمحل استعمال کیا جاسکتا ہے۔ چند اقتباسات درج ہیں۔

۱۔ مہینے کی ساری راتیں پورے چاند سے منور نہیں ہوتیں اور نہ سارا مہینہ تیرگی میں غرق رہتا ہے۔ دراصل ان دونوں کا امتزاج ہی زندگی کا حاصل۔

۲۔ مرد کی زبان اگر چھ انچ کی ہو تو عورتوں کی تین انچ والی زبان کے مقابلے میں وہ ہمیشہ کانپ کانپ جائے۔

۳۔ طالب علموں کے لئے یونین عارضی دوا ہے۔ اگر یہ عارضی دوا ان کی غذا بن جائے تو طالب علموں کے مستقبل کا خدا ہی حافظ۔

۴۔ سائنس دانوں اور فنکاروں میں کوئی قابل لحاظ فرق نہیں ہوتا۔ فن کار کا دماغ دل کے اختیار میں ہوتا ہے جبکہ دل اور دماغ دونوں سائنس دانوں کے قبضے میں ہوتے ہیں۔

۵۔ تمّا کا چھوٹا بھائی پوچھتا ہے کہ روز دادا حضرت کیا پڑھتے ہیں۔ کہیں وہ کسی امتحان کی تیاری میں تو مصروف نہیں ہیں! تمّا جواب دیتا ہے کہ وہ اپنے آخری امتحان کے لئے بھگوت گیتا حفظ کر رہے ہیں۔

بیچی کی ایک کہانی بہت مقبول ہے۔ تمّا ایک بار الیکشن میں حصہ لیتا ہے۔ اس کو صرف تین ووٹ ملتے ہیں جن میں خود اس کا ایک ووٹ شامل ہے۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ بقیہ دو وفادار کون ہیں۔ اس کے لئے اپنے تمام ہمدردوں کو چائے پر بلاتا ہے اس جلسے میں دو آدمی اپنے ہاتھ اٹھا کر اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہیں اور تمّا مسکرا کر اپنی دونوں بیویوں سے کہتا ہے کہ بیوی بھی کیا چیز ہوتی ہے۔

ڈاکٹر ٹی۔ کیلاشم نے ۱۵ سے زائد مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں۔ ان کے سارے ڈرامے طنز و مزاح سے شروع ہوکر دکھ درد اور محرومیوں پر ختم ہوتے ہیں۔ سری رنگا اور شیو رام کانت نے بھی مزاحیہ ڈرامے لکھے ہیں لیکن ان کو مقبولیت حاصل نہ ہوسکی۔

www.taemeernews.com

حال ہی میں ایک ڈرامہ مکھیہ منتری لکھا گیا ہے۔ سیاسی موضوع پر لکھے ہوئے اس مزاحیہ ڈرامے میں وہ کردار ہیں جو اپنے وقار اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے سازشوں اور قتل و خون کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں گروہ سازی۔ خود غرضی رشوت خوری اور اقربا نوازی جیسی حرکات کو طنز کے روپ میں ابھارا گیا ہے۔

کنڑا صحافت نے بھی طنز و مزاح کو مقبول بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ سیاسی، معاشرتی اور سماجی مسائل پر ڈٹکر دیسائی سدھا اور کستوری میں ایک عرصہ تک مختصر سی طنزیہ نظمیں لکھتے رہے۔ راشی نے اپنے رسالے کرداونجی کو طنز و مزاح کے لئے مختص کر دیا تھا۔ آج بھی نگوانندا۔ ونودا۔ دکشا دلوونی ہر ماہ طنز و مزاح کی پھلجھڑیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔ پی۔ لنکیش بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ مگر ادھر سال دو سال سے اپنے ہفتہ وار رسالے لنکیش پتریکا میں حالی اور خود غرض سیاست دانوں کے چہروں سے نقاب اتارنے میں مصروف ہیں۔

کنڑا کے مزاحیہ ادب کے تعلق سے ڈاکٹر یم۔ یس۔ سُنکاپور نے اپنی تحقیقی کتاب میں لکھا ہے کہ شعری اور نثری تخلیقات میں طنز و مزاح کی اثر انگیزی اور مقبولیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاعروں اور ادیبوں نے جو موضوعات اور واقعات چُنے ہیں وہ سب حقیقی اور فطری ہیں۔ ان کی تخلیقات پر اُن کے اپنے تابندہ ماحول، تجربات کی صداقت اور خلوص کا بھرپور اثر ہے۔

∞

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مضامین کے مجموعے

تکلف برطرف
۱۴ روپے

بہرحال
۱۰ روپے

آدمی نامہ
۹ روپے

بالآخر
۱۴ روپے

بتوسط شگوفہ حاصل کی جاسکتی ہیں!

www.taemeernews.com

ڈاکٹر سکنیا جوہری (بمبئی)

گجراتی نثر میں طنز و مزاح

سنسکرت ہندوستانی زبانوں کی ماں ہے۔ سنسکرت کے ڈرامائی ادب میں نو رس ہیں۔ اس میں سے ایک رس مزاح ہے۔ مزاح کو ادب میں بہت کم اہمیت دی گئی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مزاح نے شرنگار رس سے جنم لیا ہے۔ ڈرامے میں نثر نگار اور غم کو اہمیت دی گئی ہے۔ انگریزی میں بھی SWEET ARE THE SONGS OF SORROW کہا گیا ہے۔ سنسکرت کے ڈرامائی ادب میں بھی مزاح پایا جاتا ہے لیکن نہ ہی اس کی تعریف کی گئی ہے اور نہ ہی اسے اول درجہ کی اہمیت دی گئی ہے۔

انگریزوں کا کہنا ہے کہ ہندوستانی عوام جی کھول کر ہنس نہیں سکتے۔ یہ بات بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہے اور اگر اہل گجرات کا ذکر کیا جائے تو گجراتی عوام سنجیدہ گمبھیر اور طور و طریق اور تجارت کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ گجراتی اگر ہنسیں گے بھی تو ناپ تول کے۔

تاہم گجراتی ادب میں مزاح زمانہ وسطیٰ اور جدید زمانے میں پیدا ہوا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے مزاح نمک طاقت بخش [illegible] حیات کا درجہ رکھتا ہے۔ آدمی پیدا ہوتا ہے تو پہلے روتا ہے اور پھر ہنسنا سیکھتا ہے ہنسنا آدمی ہی کا حصہ ہے کوئی بھی جاندار اگر ہنس سکتا ہے تو وہ ہے آدمی۔ ہنسنا اور ہنسانا۔ ہنسنا شاید آسان ہے مگر ہنسانا بہت مشکل ہے۔ مزاح کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ خوشی حاصل کرنا انسان کا بنیادی رجحان ہے، اپنشدوں میں کہا گیا ہے کہ خوشی کے کھیل کے حصول کے لئے خدا نے یہ دنیا بنائی ہے۔ اور کھیل سے خوشیاں حاصل ہوتی ہیں اور خوشی کے تجربے کو مزاح کے ذریعہ ظاہر کیا جاسکتا ہے۔ یہ مزاح معصوم بھی ہو سکتا ہے اور طنزیہ اور ناقدانہ بھی۔ مزاح تلوار بھی ہے اور ڈھال بھی ہے ہنسنا رنج و غم سے بچاتا ہے۔ مزاح پیدا کرنے کے لئے ادیب میں غیر جانبداری، دلی راحت اور قدرتی دین ہونی چاہیئے۔ کسی شخص کو نیچا دکھانے کے لئے اگر ادب لکھا گیا ہو تو وہ ادب نچلے درجہ کا ادب ہے۔ اس سے مزاح ضرور پیدا ہوتا ہے مگر خالص ہنسی نہیں ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کو مزاح پسند نہیں ہے زبانی شائستگی ہو نہ کہ ناشائستگی،

www.taemeernews.com

اس خیال کا رکھنا بہت ضروری ہے۔ بیان کی خصوصیت خیال آرائی کی جامعیت ہونا ضروری ہے۔ ہر فن کا مقصد خوشی حاصل کرنا ہے۔ مزاح کا بھی یہی مقصد ہے۔

گجراتی ادب میں ہم چندرا چاریہ سے لے کر دیارام کے عہد وسطیٰ تک (۱۸۱۰ء سے ۱۸۵۲ء) مزاح کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھنے والے شاعر دو ہیں ایک ہے "اکھو" اور دوسرا ہے پریمانند۔ ویسے کوئی بھوجا کے "چابکے" (چابک) ہیں لیکن وہ کافی کھردرے ہیں ان میں صناعی اور حسن نہیں ہے۔ کوئی نرسیے رام عہد وسطیٰ کا مزاح نگار کوی ہے لیکن اس نے سارا مزاح خود اپنے آپ پر ہنس کر پیدا کیا ہے اور یہی اس کی خصوصیت ہے، اکھو اور پریم آنند ان دونوں کی صلاحیتیں جداگانہ ہیں گو یہ دونوں دوکنارے ہیں۔ پریمانند گجراتی کا بہت ہی قابل مزاح نگار ہے۔ وہ کھنڈ کاویہ میں مزاح پیدا کرتا ہے اس کا مزاح بہت صحت مند ہے اور سبھی لوگ اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ اس نے رنج و غم اور مزاح دونوں میں مقام حاصل کیا ہے۔ اکھو عہد وسطیٰ کا سب سے ممتاز طنز نگار ہے۔ سماج میں جو ناہمواری انداز ہے، ظلم ہے، اسے اس نے اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مزاح (HUMOUR) اس کا خاص اسلوب ہے۔ اس کی زبان میں بجلی کوندتی ہے۔ پریمانند کا مزاح بادلوں کی طرح برستا ہے اور جی کو خوش کرتا ہے۔ دونوں کا مزاح پیدا کرنے کا مقصد الگ الگ ہے۔ پریمانند کے لئے مزاح پیدا کرنا ایک مقصد ہے۔ اکھو، مزاح نگاری کو ایک ہتھیار کے روپ سے استعمال کرتا ہے۔ زمانۂ وسطیٰ میں یہی دو شاعر ہوئے جنھوں نے مزاح لکھا۔ ان کے بعد جدید زمانہ تک مزاح ادب میں دکھائی نہیں دیتا۔ جدید ادب کی ابتداء نرمد اور دلپت رام سے ہوئی۔ (۱۸۳۳ء ۱۸۸۶ء ۱۸۲۰ء ۱۸۹۸ء) نرمد میں مزاح نگاری کا بالکل رجحان نہیں ہے دلپت رام شاعری اور ڈرامے میں اچھی قابلیت دکھاتا ہے۔ دلپت رام پہلا شاعر ہے جس نے آزادانہ مزاحیہ شاعری کی ہے۔ اس کے اسلوب میں لوگ شاعری کر سکتے تھے۔ اس کی شاعری نصاب میں شامل تھی۔ ان کی مزاحیہ شاعری، چھوٹے چھوٹے اشعار کی مختصر نظمیں تھیں۔ وہ طرز تحریر مزاحیہ شاعری کے لئے مناسب تھا۔ وہ ہلکا مزاح (LIGHT HUMOUR) لوگوں نے لکھنے کی کوشش بھی کی لیکن دلپت رام کی طرح اس طرز نگارش میں کوئی شہرت حاصل نہیں کر سکا۔ دلپت رام نے بڑی بڑی مزاحیہ نظمیں بھی لکھی ہیں مگر ان میں وہ تکلیف دہ چبھن نہیں ہے جو ان کی شاعری میں صاف ستھرا مزاح ملتا ہے جس سے لوگ خوشی حاصل کرتے ہیں۔

دلپت رام نے "مشیا امیمان" (جھوٹا فخر) نام کا ایک فارس (FORS) لکھ کر مزاح کو بہت آسان بنا دیا ہے فارس میں کسی کا مذاق اڑانا ہی مقصد ہوتا ہے، یہ ایک یا دو بابی ڈراما ہوتا ہے۔ اس میں خراب عادتوں کا فضیحتا اڑایا جاتا ہے۔ اس میں کسی ایک شخص کو ہی نشانہ بنایا جاتا ہے۔

"FORS IS MORE PARTICULARLY CONCERNED WITH CRUDE FOOLING AND BODILY ASSAULT"

فارس میں کردار اور مکالمے یہ دونوں ماحول کی مناسبت سے استعمال ہوتے ہیں۔ اور ماحول بھی مبالغہ آمیز پیدا

www.taemeernews.com

کیا جاتا ہے۔

NICOLL نے فارس کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:۔

THE MAIN CHARACTERISTICS OF FARS..... ARE THE DEPENDENCE IN IT OF CHARACTER AND DIALOGUE UPON MERE SITIVATION THE SITUATION MORE OVER IS OF THE EXAGGERATED AND IMPOSSIBLE KIND DEPENDING UPON THE COARSE: SSET AND RUDEST OF IM-PROBABLE IN CONGRUITIES.

NORWOOD نے فارس کو اس طرح بیان کیا ہے:۔

FARS MAY BE DEFINED AS EXAGGERATED COMEDY ITS PROBLEM IS UNLIKELY AND ABSURD. ITS ACTION LUDICROUS AND ONESIDED ITS MANNER ENTIRELY LAUGHABLE (GREEK COMEDY).

مثلاً اجیمان گجراتی ادب کا پہلا فارس ہے۔ جیورام بھٹ کو منھیا بھیان میں دلپت رام نے مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ بہت سارے ناقابلِ فہم و ادراک حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس طرح سے اسے بے حال کر کے اس کا مذاق اڑا کر ادیب نے اس کردار کے منہ سے نصیحتیں کی ہیں۔ جیورام بھٹ بولنے میں بہت تیز ہے اور وہ طنز کرتا ہے اس میں سے مزاح WIT پیدا ہوتا ہے آخر میں اس ڈرامہ کو المیہ بنا کے فارس کو برباد کر دیا ہے۔ وہ ساری محفل کو ہنساتا ہے لیکن وہ بہت CRUDE ہے۔ ڈرامہ کی نزاکتیں (FINER QUALITIES OF DRAMA) کیا ہوتی ہیں' وہ نول رام منڈیا (۱۸۸۸ء-۱۸۴۳ء) سے اولاً معلوم ہوا۔ اس نے سماج میں مروجہ کم سنی کی شادی جیسی برائیوں پر قلم اٹھایا۔ اس کا نام تھا "بال لگن تبرلسی"۔ اس میں بکری کے بچے کی شادی کی بات کر کے (MOCK-HEROIC) تمثیلی انداز سے اپنا مقصد پیش کیا ہے۔

مولیر (MOLIEUR) کا فارس WESTERN FRENCH DRAMATIST MOCK DOCTOR پر سے "بھٹ کا بھوپالا" لکھا۔ اس فارس میں کافی مزاحیہ ماحول پیدا کیا گیا ہے۔ "بھولا بھٹ کی چالاکی سے پُر ADVENTORE کی وجہ سے وہ یادگار بن گیا ہے۔ گجراتی مزاحیہ ادب کے مثلث (تین کردار) ہیں" جیورام بھٹ"، "بھولا بھٹ" "اللہ بھدم بھدم" نول رام پنڈیا نے طنزیہ نظمیں لکھی ہیں۔ انگریزی کی مدد سے فارس لکھا ہے' لیکن فن طنز نگاری کی قابلیت اس کا مقررن "اوتھاریو ہڑکرا ARABIES سے مماثلت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی میں دو خاص مزاحیہ ادیب گزرے ہیں ایک دلپت رام اور دوسرے نول رام۔ نند شنکر کا پہلا ناول "کرن گھیلو" گجراتی ادب کا پہلا ناول ہے۔ اس میں کسی قدر مزاح ہے اور کاشا والا نے اپنی اندھیر نگری کے "گندھرو سین" میں بھی کہیں کہیں مزاحیہ انداز پیدا کیا ہے۔ اوما شنکر جوشی کا خیال ہے کہ سرسوتی چندر جیسے عظیم ناول میں مزاحیہ انداز نہ ہونے کے برابر ہے۔

www.taemeernews.com

گوورد ھن رام کے بعد منی لال دویوندی (۱۸۵۸ء تا ۱۸۹۸ء) کی تحریروں میں نئے زمانہ کی اصلاح کے تعلق سے طنز ملتا ہے۔ خاص طور پر مشرق و مغرب میں اس طرح کے طنز کی بہترین مثال ہے لیکن اس میں مزاح نہیں ہے۔ اس کا ایک مضمون "نیا ما فی آتم کتھا (وغیرہ وغیرہ کی سرگزشت) خالص مزاحیہ مضمون ہے۔ نول رام کے ادھاریو ہڑکوا کے بعد یہ دوسرا مزاحیہ مضمون ہے۔ ادھاریو ہڑکوا میں ادیب بننے کے شوق پر طنز کیا گیا ہے ہڑکوا یعنی کتے کے کاٹنے سے لاحق ہونے والا مرض جس میں آدمی پاگل سا ہوجاتا ہے، اسی طرح ادیب بننے کا جنون سوار ہوجاتا ہے، جس پر طنز کیا گیا۔ اور وغیرہ وغیرہ کے ذریعہ ایسے لوگوں کا مذاق اڑایا گیا ہے جو یہ نمائش کرتے ہیں کہ وہ بہت بڑے عالم ہیں لیکن در حقیقت وہ کچھ نہیں جانتے۔ مضمون ادھار (گجراتی میں کوئی ڈراؤنا خواب دیکھنا یا حملہ کرنا ــــ) اس مضمون میں لڑکا پاگل ہوکر چلاتا ہے "میں ادھار" میں ادھار، اس پر ایک سو سالہ بڑھیا کہتی ہے کہ وہ خواب دیکھ کے ڈر گیا ہے، آسیب کی طرح اس پر ادھار چڑھ بیٹھا ہے! لیکن انگریزی پڑھے لکھے کہتے ہیں کہ یہ ادھار یعنی ادیب ہوگیا ہے۔

انیسویں صدی کے آخری دو دہلوں میں پارسی ادیبوں نے ناول اور ڈراموں کے ذریعہ مزاح پیدا کر کے گجراتی ادب میں مزاحیہ نگاری کو تر دیج دی ہے۔

پارسی ایران سے آکر گجرات میں بس گئے۔ گجراتی زبان کو اپنایا لیکن چونکہ گجراتی بولنے پر قادر نہیں تھے اس لئے گجراتی کا تلفظ بدل ڈالا۔ ان کی گجراتی میں فارسی، اردو اور انگریزی کا اثر بہت ہے۔ اس نئی گجراتی بولی کو "پارسی گجراتی" کہا جاتا ہے۔ پارسی ادیب سنجیدہ بھی لکھیں تو بھی تلفظ اور عجیب و غریب (CONNOTATION) کی وجہ سے معیاری گجراتی پڑھنے والے کے لئے مزاح پیدا ہوجاتا ہے۔ پارسی لب و لہجہ سے ہٹ کر بھی پارسی ادیب میں قدرتاً مزاحیہ رجحان ہوتا ہے۔ پارسی عام طور سے مزاجاً مزاح پسند اور ہلنسار ہوتے ہیں۔ پارسی ادیبوں کو ادب میں بھی زیادہ تر کامیڈی ہی پسند ہے۔ پیجام (پیجام) نامی ایک ادیب نے اپنی ناول "محبت یا مصیبت" میں یہاں تک لکھا ہے کہ المیہ لکھنے والے پر خدا کی پھٹکار ہو۔ پارسی ادیب کے ڈراموں اور ناولوں میں ان کے مزاج اور مزاح کی پرچھائیں ملتی ہے۔

پارسی ادیبوں نے بوڑھے مردوں کا جوان "پوٹیوں" (لڑکیوں) پہ لٹو ہونا پورے گانوں کی نکر (پنچایت) کرنے والی بھوپی، کھسکا ہوا دماغ (چسکیلی چاکلیٹ) سودیسی نٹ کھٹ اور شریر لڑکیوں وغیرہ پر طنز کیا ہے۔ انہوں نے کردار نگاری کرتے ہوئے ان سے مقابلہ کیا ہے۔ پارسی ادیبوں کو قافیہ پیمائی کا بہت شوق ہے اور اس سے وہ خوب مزاح پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً آدم جی گئے اور گدھا لے آئے۔ (آدم جی بھائی گھوڑا لینے گئے اور گدھا لے آئے) مطلب غلط سودا کیا اور "بوسے میں گال کاٹا (پہلی ہی مرتبہ کڑوا تجربہ)۔

بہت سے پارسی ادیبوں نے مزاح نگاری کی ہے لیکن جہانگیر مرزبان اور اس کا بیٹا "پیجام" (فیروز جہانگیر مرزبان) یہ معروف مزاح نگار ہیں۔ بیسویں صدی کی ابتداء کا مزاح نگار "بھدر و بھلا کا خالق دمن بھائی نیل کنٹھ ہے۔ ۱۸۶۸ء تا

www.taemeernews.com

۱۹۲۸ء ان کا ناول بھدرم بھدر گجراتی ادب کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں لاثانی ہے۔ جو اُنہوں نے ۱۹۱۰ء میں لکھا۔ کاکا کالیکر نے اس بھدرم بھدر کو سماجی اصلاح کے لئے ترشہ کے استعمال کی طرح بتایا ہے۔ "بھدرم بھدر" کے بعد الگ الگ موضوعات پر الگ الگ طریقے سے مزاحیہ کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ لیکن بھدرم بھدر کی سی شہرت کسی کو بھی نصیب نہ ہو سکی۔

انگریزی اثرات کے تحت گجرات میں اصلاح کی تحریک زوروں پر تھی۔ اس وقت زندگی میں قدیم رجحانات کی قدر و قیمت رکھنے والے پرانی تہذیب کے لوگوں پر طنز کرنے کے لئے اس نے "بھدرم بھدر" لکھا DON QUIXOT یا PICK. WICK PAPERS جیسے زبردست مزاحیہ ناول کا اثر اس ناول پر دکھائی دیتا ہے۔ پھر بھی گجراتی کے اس وقت کے سماج کی تنگ نظری اور اس زمانے کے ماحول کی عکاسی کا خیال اسی ادیب کا حصہ ہے جس طرح DON QUIXOT کو سانکو پا ملا تھا، ویسے بھدرم بھدر کو "انیارام" ملتا ہے، لیکن DON QUIXOT نائٹ (KNIGHT) (سردار) ہے اور یہ حسینہ کو پانے کے لئے اینڈو نچرس کرتا ہے۔ بھدرم بھدر کو کوئی حسینہ نہیں ملتی، اس ناول کی کوئی ہیروئن نہیں ہے۔ یہ فرق ملحوظ نظر رکھنا ضروری ہے بھدرم بھدر کے ADVENTURES صرف آریہ دھرم کے پرچار کے لئے اور سدھاروں پر حملہ کرنے کے لئے ہیں نہ کہ حسینہ کا دل جیتنے کے لئے۔ اس میں سنسکرت الفاظ کا استعمال بہت ہوا ہے۔ پرانے خیالات ہی کے لوگوں پر تنقید کی گئی ہے۔ وہ STATION کو انگریزی لفظ ہونے کی وجہ سے سٹیشن نہیں کہتا بلکہ اسے "اگنی رتھ ستھائین سستھل" یعنی آگ کی گاڑی کو رکھنے کی جگہ کہتا ہے۔

ڈاکٹر کاربت کی رائے کے مطابق "مزاحیہ نگاری کے بغیر طنز صرف تنقید بن کے رہ جاتی ہے مزاح کے بغیر طنز صرف جنگلی اور غیر مہذب مذاق بن کر رہ جاتا ہے۔ طنز کا کام آسان نہیں بہت مشکل ہے، اپنے سماج کی برائیوں کو محسوس کر کے نڈر اور بلا خوف ہو کر کسی ایک شخص پر ذاتی الزام لگائے بغیر اپنے طنز کا نشانہ بنانا، اس کام میں عام آدمی کی مدد حاصل کرنا اور اسی انا کو آگے نہ بڑھانا چاہیئے اور نہ ہی اسے مبلغ کا کام انجام دینا چاہیئے۔ یہ سب مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر جانسن کی یہ بات طنز نگار کو ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے":

PROPER SATIRE IS DISTINGUISHED BY THE GENERALITY OF THE REFLECTIONS, FROM A LAMPOON WHICH IS AIMED AT PARTICULAR PERSON (DICTIONARY)

بھدرم بھدر کے ابتدائی حصہ میں مصنف کے طنز کا فن نکھر آیا ہے۔ سماجی اصلاح کی ضرورت برابر فن بن کر ابھری ہے اُنہوں نے بھدرم بھدر کو مرکز بنا کر غیر ضروری سماجی رسوم و رواج اور فرسودہ تنگ نظری پر طنز کیا ہے۔ ان کے قلم میں بڑا زور ہے زن بھال کو قابل مزاحیہ ادیب کی حیثیت سے بھدرم بھدر کا کردار شہرت دینے والا کردار ہے۔ ماحول کے پیدا کرنے میں ان کا مزاح ابھرا تا ہے۔ تاہم بھدرم بھدر کی ساری کتاب دلچسپ نہیں بن پائی ہے۔

www.taemeernews.com

بعد کے حصہ میں رمن بھائی مُصلح بن گئے ہیں اور فن کار اپنے فن کے مقصد سے دور ہوگیا۔ مزاح کا بہاؤ کم ہو جاتا ہے اور بھدرم بھدر کے ذریعہ رمن بھائی نے کسی کا شخصی مذاق اڑایا ہو۔ ایسا بھی ان پر الزام لگایا گیا ہے، پھر بھی بھدرم بھدر گجراتی ادب کی بے مثال طنزیہ کہانی ہے۔ اور اس نے مزاح نگاری کو بلند مقام عطا کیا ہے، بھدرم بھدر کے علاوہ بھی اُنہوں نے "باسیہ مندر" کے نام سے بھی ایک کتاب تصنیف کی ہے۔ اسی کتاب میں اُنہوں نے ۱۲۱ صفحات پر مشتمل مزاح پر ایک مضمون لکھا ہے۔ ان کے اس مضمون میں اُنہوں نے مزاح کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں۔ اس نوع کا تفصیلی اور مدلل مزاح نگاری پر دوسرا مضمون ملنا مشکل ہے۔ اُنہوں نے "رائی کا پربت" نام کی ایک اور کتاب لکھی ہے جس میں سنسکرت کے اسلوب اور طرزِ بیان کو اپنایا گیا ہے۔ رمن بھائی کے بعد "میری کہلا" کے مصنف کنہیالال منشی کا مزاحیہ نگار کی حیثیت سے نام لیا جاسکتا ہے۔ "شامسل شاہ کی شادی" "گوستی دادا کی عزت" وغیرہ کامیاب مزاحیہ کہانیاں لکھنے والے منشی اسی سمت میں آگے کیوں نہ بڑھے اس پر تعجب ہوتا ہے شامل شاہ کی شادی میں پچاس سال کا بوڑھا شامل شاہ کی چھوٹی سی بچی سے شادی کرتا ہے۔ اس کی یادگار مزاحیہ تصویر منشی نے کھینچی ہے، پانچ سال کی لڑکی کے ساتھ پچپن سال کا بوڑھا چپاد جتاتا ہے اور لڑکی کو چھیڑتا ہے تو لڑکی چلا کر کہتی ہے کہ ماں ماں یہ بوڑھا مجھے مارتا ہے اس مختصر کہانی کے ذریعہ انہوں نے بچپن کی شادی کا مذاق اڑایا ہے ابتدا سے آخر تک یہ کہانی منشی کے شاندار فن کو ظاہر کرتی ہے۔

"گوستی دادا کی عزت" میں پرانی روایات کو قائم رکھنے کے رجحان پر طنز ملتا ہے۔ منشی کی ناول میں نہ طنز ہے نہ ہی مزاح۔ طنز نگار کی حیثیت سے منشی کو سمجھنے کے لئے ان کے ڈرامے دیکھے جاسکتے ہیں۔ "برہم چاریہ آشرم" "دو خراب لوگ" میں بھی طنز ملتا ہے۔ "کاکا کی شطرنج" میں بھی مزاح کے ساتھ المناکی ہے اور آزادی کے نام پر من مانی کرنے والی جدید عورت پر طنز ہے۔ "سینہ سمرم" "بادا سیٹھ کی آزادی" جیسے چھوٹے موٹے ڈرامے میں منشی کے طنز کا فن ابھر آیا ہے۔ "واہ رے میں واہ" میں انہوں نے خود اپنا مذاق اڑایا ہے۔

دھن سُکھلال مہتا نے انگریزی مزاح کی بُنیاد پر گجراتی سماج کے لئے موزوں و مزاح لکھا ہے۔ ان کے اسلوب JEROME-K-JEROME کا زبردست اثر ہے۔ "میں سرلا اور دوست" نامی کتاب میں بحیثیت مزاح نگار ان کا تعارف ہوتا ہے۔ اس کتاب میں آدمی کے مزاج اور طبیعت کی خصوصیات اور اس کا انوکھا پن دکھایا گیا ہے۔ "ولاد و یار" اور "دلوڈلہری" جیسی کتابیں ان کے بشاش مزاج کی غماز ہیں۔ دھن سکھ لال کا مزاح برائے مزاح ہے، وہ سماجی اصلاح یا اور کسی مقصد سے مزاح نگاری نہیں کرتے۔ دھن سکھ لال اور جوتیندر ددے دونوں نے ساتھ مل کر کتاب "ہم سب" لکھی جس میں سورت کے لوگوں کی یادگار اور خوبصورت تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ سورت شہر اور سورت کے رہنے والوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں۔ زندگی کے روز بروز کے واقعات پر ان دونوں ادیبوں کی نظر SEARCH LIGHT کی طرح پڑتی ہے۔ جس سے ان کے مزاح میں چار چاند لگ گئے ہیں۔ "ہولی" کا تہوار اور پتنگ کے ابواب اس کتاب میں بے حد خوبصورت ہیں اور انھیں بار بار

www.taemeernews.com

پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ "نام رکھنے کی رسم" نامی باب ہلکے طنز کا بے مثال نمونہ ہے۔ "سچ پوچھو تو آدمی کو شخصیت عطا کرنے والی چیز نام ہی ہے۔ ویاس، کالی داس، نپولین، وغیرہ چند ہی لوگوں نے نام کو شخصیت عطا کی ہے، لیکن عام طور سے آدمی کے نام ہی سے اس کی شخصیت کا خیال آتا ہے۔ فلاں نام کا آدمی فلاں کام نہیں کر سکتا، جیسے مہندر لال نام کا شخص گھر نوکر، رام موہن رائے نام کا مزدور، جگا ملّو، نام کا شخص مالدار، تعلیم یافتہ اور برہمن نہیں ہو سکتا، تیجھو نام کا کلکٹر تو سوچنا بھی مشکل ہے۔ سودا اپنی نام کی گھر کی ملازمہ، اچھی نام کی ادیبہ، جھکو نام کی پنڈت ہو سکتی ہے، یہ قبول کرنا مشکل ہے ایسی بے انتہا اہم چیز نام، کی پسندیدگی کے بارے میں آدمی کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ واقعی بہت عجیب و غریب ہے۔ آدمی اپنا نام خود نہیں رکھ سکا، یہ حالت ناقابل برداشت ہونی چاہیئے، لیکن نہ معلوم کیوں سب جگہ اس صورتِ حال سے اتفاق کر لیا گیا۔ یہاں تک کہ مغرب کے ترقی یافتہ عورت اور مرد، شوہر یا بیوی کو خود پسند کر سکتے ہیں لیکن اپنی پسند کا نام نہیں رکھ سکتے۔ "کامیاب یا ناکام کے باب میں" سسپنس ہے۔ پھر بھی مزاح اس میں اہم ترین جذبہ ہے۔ اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ سماجی مسائل پر تنقید کی گئی ہے، لیکن کسی کو صلاح نہ دے کر سماج کے اہم مسائل پر ہلکے اور سبک انداز میں بحث کی ہے۔ بچوں کا تجسس، جوانوں کے ارمان، بزرگوں کی انا، آدمی کے طور طریق میں پایا جانے والا عجب انداز اور کمزوری، سبھی ہے لیکن مزاح بنیادی طور عنصر اور حقیقت پسندانہ ہے۔ اس مزاح میں چبھن نہیں ہے۔ پرسائی کی طرح صحت مند مزاح ان کی تحریر کی خوبی ہے۔

دھن سکھ لال اور دوسے نے طنز کر کے لوگوں کی اصلاح کا بیڑہ نہیں اٹھایا۔ اپنے مادرِ وطن سورت کی روایات جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہے اس کی ہلکے انداز میں تصویریں کھینچی ہیں۔ "بھدرم بھدر" کے بعد "ہم سب" ہی اہم تادل ہے اور اس کے بعد میت فقیر، جاگیردار، جدورائے کھنڈوری" یا دیگر کے نام آتے ہیں اُنہوں نے عوام کا پسندیدہ مزاح لکھا ہے۔ جو حالات کے بگاڑ یا بناؤ سے ابھر آیا ہے پھر بھی اس مزاح میں کسی قدر گہرائی ہے، ان سب میں "فقیر" کے مزاح کا معیار اچھا ہے۔ مزاح پیدا کرنے والے "سویرو ہاری"، رام نرائن، وشوانا تھ پاٹھک" اور جوتیندر دوے نے سویرو ہاری کے قلمی نام سے بہترین مزاح پیدا کیا ہے۔

"سویرو ہاری" کے مضامین میں مزاح کی طرح طرح کی اقسام، نکیلا انداز اور نفاست پائی جاتی ہے۔ کون سا کام کرتے وقت آدمی سب سے زیادہ بے وقوف لگتا ہے"، "ہندوؤں کی خاص سائنس"، "خراب کرنے کا فن" یہ ان کے طنز کے خوبصورت نمونے ہیں۔ ان کے طنز کے پس منظر میں فکر انگیزی ہے۔ نول رام ترویدی کہتے ہیں "سویرو ہاری ہنسنے کی خاطر ہنسنے پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے طنز میں کھلکھلا کر ہنسنے کا انداز نہیں ہے۔ بلکہ وہ دعوتِ غور و فکر دیتے ہیں۔ "سویرو ہاری" نے سماج، مذہب، ادب، سیاست جیسے موضوعات کی کمزوری پہچان کر اس میں چھپے ہوئے مزاح کو طنز کے ذریعہ اُبھارا ہے۔

DE QUINCEY نے ادب کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے (LITERATURE OF KNOWLEDGE)

www.taemeernews.com

اور LITERATURE OF POWER، سویرد ہاری کے مضامین LITERATURE OF POWER کے تحت آتے ہیں ان مضامین میں مسرت حاصل کرنے کے لئے موضوع نہیں ہے لیکن ادیب کی شخصیت مزاح پیدا کرنے کا باعث ہے۔ سویرد ہاری کے نکیلے طنز کا ایک نمونہ "ہندوؤں کی خاص سائنس" میں ملاحظہ فرمایئے:۔

تھیا سوفٹ کہتے ہیں، جسم میں بجلی ہے لیکن ہندوؤں نے چھوت چھات کی تلاش کی ہے، اس کے بعد بجلی کی تلاش کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس چھوت چھات سے چیزیں جھوٹی ہوجاتی ہیں، کٹورے میں دال رکھو تو دال جھوٹی ہے اسی نے کٹورا جھوٹا ہوا اور کٹورا نیچے رکھا تو زمین جھوٹی ہوئی، ہاتھ میں کٹورا پکڑا تو ہاتھ جھوٹا ہوا لیکن سارا جسم جھوٹا نہیں ہوا۔ آٹے میں پانی کا چھینٹا بھی گرے تو آٹا جھوٹا ہوتا ہے اور آٹے میں دودھ گرے تو آٹا جھوٹا نہیں ہوتا۔ کانچ بجلی کی CONDUCTOR نہیں ہے لیکن کانچ جھوٹی ہوتی ہے۔ مٹی کا برتن جھوٹا ہوتا ہے، اس سے زیادہ کانچ کا برتن جھوٹا ہوتا ہے۔ لکڑی کے دستے والا دال نکالنے کا چمچ دال میں ڈالا تو چمچ بھی جھوٹا ہوتا ہے لیکن چولھے میں جلتی ہوئی لکڑی پر دال گری تو لکڑی جھوٹی نہیں ہوتی۔ یہی بات چھوت چھات کی ہے۔ دھیڑ بھنگی کی چھوئی ہوئی چیز اچھوت ہوتی ہے۔ دھیڑ کو ہندوؤں نے چھو لیا تو ہندو اُشدھ ہوا۔ وہ نہانے ہی پاک ہوتا ہے۔ دھیڑ کے چھوئے ہوئے پیسے لینے ہوں تو پانی کے چھینٹے دینے پڑتے ہیں۔ پانی سے آٹا جھوٹا ہوتا ہے اور پیسے پاک ہوتے ہیں۔ دھیڑ کے چھوئے ہوئے کپڑے دھونے پڑتے ہیں، لیکن اس کوڑے کپڑے پر پانی کے چھینٹے ڈال دیں تو کافی ہے۔ ٹوپی پر پانی کے چھینٹے بھی نہیں ڈال سکتے۔ تو ٹوپی کو مسلمان چھو لے تو وہ پاک ہو جاتی ہے، لیکن تم نہانے کے بعد مسلمان کو نہیں چھو سکتے۔ چھولیں تو نہانے کا اثر ختم ہوجاتا ہے۔ کھانے کے لئے تم کو پھر سے نہانا پڑتا ہے۔ گھی کبھی اچھوت نہیں ہوتا، بجلی کے کام کرنے کے لئے جس طرح کانچ کے ہینڈل والے اوزار سائنسداں استعمال کرتے ہیں، اسی طرح دھیڑ کو چھونے کے لیے گھی کے اوزار بنائیں تو اچھا ہوگا۔

سویرد ہاری کی عجیب و غریب دلیلیں، ان کی باریک بینی اور تیز و طرار بیانات ان کے مضامین کو سب سے اُونچا مقام عطا کرتے ہیں۔ اوما شنکر جوشی نے ان کی مزاح نگاری کے بارے میں لکھا ہے:

"سویرد ہاری مصلح ہے۔ اپنی شخصیت کو پیش کرنا ان کا مقصد نہیں ہے۔ بطور خاص غیر ملکی حکومت پر تنقید کرنے کے لیے اُنہوں نے سویرد ہار (یعنی مرضی کے مطابق سیر کرنا) کیا ہے۔ کتنے ہی مضامین جو اُنہوں نے انگریزی حکومت کے خلاف تنقید کرتے ہوئے لکھے تھے، وہ شاید آج پہلے کی طرح تیز و تند نہ لگیں لیکن آخر میں وہ خود اپنی کمزوری کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عوام کی شخصیت کو طنز کے ذریعہ پیش کرتے ہوئے وہ سب سے زیادہ کھلتے ہیں"۔

رام نرائن پاٹھک نے کہانیوں اور شاعری میں مزاح کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس کا مقصد مزاح کے ذریعہ المناک کیفیتوں کو پیش کرنا بھی ہوتا ہے۔ رسیک لال پاریکھ نے کہا ہے کہ وہ "ہنستے ہوئے فلسفی" ہیں رمن بھائی نیل کنٹھ کے بعد رام نرائن پاٹھک کا نام مزاح نگاری کی دُنیا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یادگار رہے گا۔

مزاح کی دُنیا میں مگن بہاری مہتا، دوجے رائے دیدیہ، جیندر رائے ورما وغیرہ کے نام بھی یاد رہیں گے۔

www.taemeernews.com

گگن وہاری مہتا کے ہلکے پھلکے مضامین میں ROBERT LIND اور STEPHAN LOCOCK کا اثر ہے۔ ان کی کتاب "آسمان کے پھول" ہلکے پھلکے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کا مزاح مہذب اور متین ہے۔

"امی" (امرت) نامی کتاب میں مزاح نگاری کے فوارے اڑتے دکھائی دیتے ہیں ISAC کی پاس ان کا سب سے اچھا مضمون ہے۔

وجے رائے دیدیہ کی کتاب نازک سواری میں گلابی مزاح ہے، اس مضمون میں انہوں نے خود اپنے آپ پر طنز کیا ہے۔ اس کے بعد مزاح نگاری کے بے تاج بادشاہ جوتندر دوے کا نام آتا ہے۔ رمن بھائی نیل کنٹھ اور سویر واری کے بعد گجراتی مزاح میں یہ سب سے بڑا نام ہے۔

"گیتا کی نوڈ پتی" (ڈائری) لکھنے کے بعد جوتندر دوے کا ستارہ آسمانِ ادب پہ جگمگانے لگا۔ "رنگ ترنگ" "پان کے بیڑے"، "اپا تما کا آتم پران" ریتی کی روٹی، ان کی دیگر کتابیں ہیں۔ ان سب مضامین میں مغربی انشائیہ نگاروں جیسے گارڈنر، چسٹرٹن، ، مارک ٹوین، جروم کی سب سے اچھی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان کا مزاح اوسط سے نچلے معیار کا ہے۔ زیادہ تر ادبی اور چھچھورا پن کم کم ہے۔ ان کی الٹی نظر ہر شخص اور ہر شئے کے مزاحیہ پہلو پہ پڑتی ہے۔ جسے وہ شرشاسن (سر کے بل لٹکنا) کے ذریعہ دنیا کو دیکھتے ہیں اور کمزور پہلو ان کا نشانہ بنتے ہیں۔ کوئی بھی موضوع ان کے لئے اچھوتا نہیں ہے۔ ان کی نظر دنیا کی عجیب و غریب حالت کو صحیح طریقے سے گرفت میں لیتی ہے اور ان پر طنز کرنے کے بجائے زیرلب مسکرا دیتے ہیں۔ چٹکلوں، پیروڈی اور طنز سے وہ کام لیتے ہیں MOCK HEROID بھی بہت اچھی طرح سے لکھ سکتے ہیں۔

"شادی کے امیدوار" کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:۔

"روی :۔ مجھے وہ لڑکی کے مشابہہ زیورات نہ ملیں تو میں کیا کروں گا، معلوم ہے؟

—— :۔ نہیں۔ کہو؟

روی :۔ بہت خطرناک کام

—— :۔ کیا میرا خون؟

روی :۔ نہیں، اس سے بھی زیادہ خطرناک۔

—— :۔ لڑکی کا خون؟

روی :۔ نہیں نہیں وہ تو کبھی نہیں۔

—— :۔ تو کیا خودکشی؟

روی :۔ نہیں، اس کی مجھے مشق نہیں۔ اس سے بھی خطرناک۔ اب تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

روی :۔ کیا تم تصور کر سکتے ہو: دنیا نے نہ جانا ہوگا، آدم کو بھی معلوم نہ ہوگا۔۔۔۔

www.taemeernews.com

ہاں قدرت نے بھی نہ چاہا ہوگا، ایسا خطرناک، بہت خطرناک کام کروں گا۔ میں ۔۔۔ آپ ہی کو کہتا ہوں، سُنیئے "میں دوسری لڑکی سے شادی کروں گا مجھے"

جوتیندر دوے نے کہانیاں، ڈرامے، انشائیے وغیرہ بہت کچھ لکھا ہے، لیکن انھیں انشائیے لکھنے میں زیادہ دلچسپی ہے۔ ان کا مزاح اول درجے کا ہے، ان کے مزاح کے پس منظر میں ان کی شخصیت چھپ جاتی ہے۔ پھر بھی فن کے ساتھ اپنی الگ اسٹائل میں لکھے گئے نشانیوں کی وجہ سے آج کے ذہین مزاح نگاروں میں شری دوے اول درجہ رکھتے ہیں۔ آج کے مزاح نگاروں میں کسی کے پاس مزاح نگاری کا سیلاب ہے تو اسلوب بیان نہیں ہے۔ اسلوب بیان ہے تو باریکی نہیں۔ دوے کا نثری اسلوب چشمے کی طرح رواں دواں ہے۔ اس میں خوشبو، معصومیت اور لوچ ہے، وہ اپنی طرز تحریر کی وجہ سے لافانی بنیں گے۔ جوتیندر دوے کے بعد کوئی ایسا شاندار اور موثر ادیب دکھائی نہیں دیتا۔

گاندھی جی کے زمانے میں کاکا کالیلکر تھے، جن کا مزاح "سمرن یاترا" (یعنی یادوں کا سفر) اور "اوتراتی دیوالی" میں دکھائی دیتا ہے۔ اس کا مزاح مہذب ہے اس میں طنز کی چبھن نہیں ہے۔

اما شنکر جوشی بھی کبھار مزاح لکھتے ہیں جس کی مثال ان کی نظم "سمر تندو بھارا" ہے۔ سندرم نے "کویا بھگت کی کڑوی بانی" میں سماجی نابرابری پر طنز کیا ہے۔ جینتی دلال گاندھی جی کے زمانے کا نمدار طنز نگار ہے۔ وہ سیاست دانوں پر طنز کرتے ہیں۔ اُنہوں نے نمائشی اور سیاست کے گندے کھیل کا مذاق اُڑایا ہے۔ ان کے طنز میں کسیلا پن ہے، ان کے دھاردار طنز کو قدیم زمانے کا کوئی طنز نگار نہیں پہنچ سکا۔

لوک رام ترویدی میں مزاح کی فطری دین تھی، وہ مزاح لکھ سکتے تھے مگر اُنہوں نے نہیں لکھا۔ "دھوم کیتو" میں کہیں کہیں ادبی مزاح ملتا ہے۔

گجراتی ادب میں "نٹور لال بوچھ" خبردار اور جوتیندر دوے نے پیروڈیاں لکھی ہیں۔ آج کل دنود بھٹ بھی پیروڈی لکھنے میں شہرت رکھتے ہیں۔

چنی لال نڈیا نے بھی مزاح کو طنز کے ذریعہ اجارا ہے۔ ان کے ہاں ثقافت اور کھردا پن ہے۔ البتہ ان کے انشائیوں میں مزاح کی چاشنی ہے۔ چنو بھائی پٹواے جو فلسوف کے نام سے لکھتے تھے، گزشتہ پچیس سالوں میں مزاح کی روایت کو آگے بڑھایا اور اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ پٹوا نے "پان سُپاری" نامی کتاب لکھی ہے، اس میں اُنہوں نے روزمرہ زندگی کے واقعات پر ہلکے پھلکے انداز سے اظہارِ خیال کیا اور خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔

"گورکھ مچھندر" نامی کتاب میں اس وقت سیاست داں پر طنز ہے گزشتہ پچیس سالوں میں پٹوا کے علاوہ ایک اور نام نکلی ترپاٹھی کا ملتا ہے۔ ان کی کتابیں "سرچراچر" اور "سولھار کی صبح"۔ انشائیوں پر مشتمل ہیں، ان میں طنز حاوی ہے۔ گجراتی اخبار "گجرات سماچار" میں وہ طنزیہ کالم لکھتے ہیں۔ وہ سیاست، تعلیم، مذہب، سماج وغیرہ پر طنز کرتے ہیں، ان کا مقصد سماج کی اصلاح ہے۔

www.taemeernews.com

آخر میں جس چٹکیلے مزاح کا ذکر کرنا ہے، وہ ہے دلوار بھٹ، جس کی ایک کہانی کا ترجمہ اس خصوصی نمبر میں پیش کیا جارہا ہے۔ وہ اپنی بات مختصراً کہتے ہیں جس میں غلش اور طنز ہے۔ وہ ایک روزنامہ "سندیش" میں کالم لکھتے ہیں۔ اُنہوں نے اپنی کتاب "دیتال پچیسی" میں پیروڈی کا ایک بے مثال نمونہ پیش کیا ہے، ان کا اسلوب مختصر اور شیریں ہے۔ مدھوسُدھن پاریکھ بھی گجراتی ادب میں مزاح نگار کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں۔ [1]

---

[1] یہ مضمون میں نے مدھوسدن پاریکھ ہی کے ایک مضمون کی مدد سے تیار کیا ہے۔ مدھوسُدن پاریکھ گجراتی ادب کے پروفیسر ہونے کے علاوہ گہری تنقیدی سوجھ بوجھ رکھتے ہیں، میں اس مضمون کے لئے ان کا شکر گزار ہوں۔

ہم نے شہر میں معیاری اور خوبصورت ہوٹلوں کی ایک تاریخ بنائی ہے

ہر زاویہ درس کی نگرانی میں

کیفے گرولو ○ کیفے گیزیبو

ڈی یم آر ایل چوراہا، نزد سنتوش نگر کالونی — بنجارہ ہلز روڈ، حیدرآباد

شاہ کیفے

ایچ ایم ٹی کالونی، حیدرآباد

○ نفیس ماحول ○ ہر دم تازہ اشیائے خورد و نوش
○ مودب سرویسنگ ○ واجبی قیمتیں
○ صفائی کا خاص خیال

www.taemeernews.com

اعجاز مدنی
(بمبئی)

مراٹھی ادب میں طنز و مزاح

مراٹھی میں ہلکے پھلکے ادب کی روایت کوئی ۷، ۸ سو سال پرانی ہے مگر جسے صحیح معنیٰ میں طنز و مزاح کہتے ہیں اس کا آغاز انیسویں صدی کے آخر میں سری پاد کرشن کولھٹکر سے ہوا۔ سنت رامدام کے یہاں مزاح ہے مگر بہت لطیف اور معمولی۔ جیسے چیونٹی آسمان میں اڑی۔ ان کے ابھنگوں میں جو بھجن کی ایک قسم ہے اور کرتن کے موقعوں پر گائے جاتے ہیں یا پوجا پاٹ کے موقعوں پر پڑھے جاتے ہیں ان میں بھی یہی کیفیت ہے۔ مثلاً شیر کو نصیحت کرنے والی چالاک لومڑی۔ یا ایک بوڑھی ساس کی کہانی جو پنڈھرپور یاترا پر جانا چاہتی ہے جانے سے پہلے بہو کو نصیحت کرتی ہے کہ دہی دودھ کھانا نہیں، گھی استعمال نہیں کرنا، کوئی سادھو بھیک مانگنے آئے تو دینا نہیں کہتا کہ ساسو بائی یاترا کو گئی ہیں۔ خرچ زیادہ نہیں کرنا، وغیرہ وغیرہ کہتی ہے کہ تم فکر نہ کرو ہم بڑے آرام سے رہیں گے۔ تم بھگوان کی یاد میں مگن رہو اور بے فکر جاؤ۔ ساس کو راستہ میں خیال آتا ہے بہو نے بڑے مزے سے رخصت کر دیا ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ وہ گاؤں کی سرحد سے واپس آگئی اور کہنے لگی میرا گھر ہی میرا پنڈھرپور ہے۔ میرا دل کہاں نہیں جو میں اُسے ڈھونڈھنے پنڈھرپور جاؤں۔ ایک اور جگہ دو عورتوں کی گفتگو شعری پیکر میں لکھی ہے۔ پہلی عورت شکایت کرتی ہے کہ میرا شوہر بہت کم سن ہے ہمیشہ لڑکوں میں کھیلتا ہے۔ دوسری عورت جواب دیتی ہے کہ خدا جانے میں نے پچھلے جنم میں کون سے پاپ کئے تھے جو بوڑھا کھوسٹ شوہر ملا۔ جو رات بھر کھانستا رہتا ہے۔ بناؤ سنگھار کئے قریب جاتی ہوں تو پرے ہٹ کہتا ہے۔

قدیم مراٹھی میں شاعری کو فروغ حاصل تھا اور شاعری بھی زیادہ تر مذہبی قسم کی تھی۔ علاوہ ازیں اس پر بھگتی تحریک کا اثر غالب تھا۔ رام داس کی شاعری بھی سراسیمگی پیدا کرنے والی اور عزت نفس کی تلقین کرنے والی شاعری ہے۔ ان سنت شاعروں نے روح کو جلا بخشی مگر ہونٹوں سے مسکراہٹ چھین لی۔ مورو پنت اور کیشو سوت، ایک ناتھ مہاراج، دنیانیشور وغیرہ سب کے سب کافی سنجیدہ اور مخلص قسم کے مذہبی شاعر گزرے ہیں۔

www.taemeernews.com

ان شاعروں کا مقصد دیوی دیوتاؤں کو خوش رکھنا تھا، زندگی کی طرف ہنستے کھیلتے دیکھنے اور حظ اٹھانے والی شرارت آمیز فکر و نظر کا اسی لئے فقدان ہے۔ کولھٹکر نے سب سے پہلے طنز و ظرافت کی ابتداء کی اور اس میڈیم سے سماج سدھار کا کام لیا۔ سماجی مصلحین جن آدرشوں کو سنجیدہ انداز میں سمجھاتے اور لوگ متوجہ نہ ہوتے کولھٹکر نے طنز و مزاح سے کام لے کر اور اپنی خوبصورت زبان کے ذریعہ پورے مہاراشٹرا کے لوگوں کو یکلخت متوجہ اور متاثر کر دیا۔ ان سے پہلے وشنو ساشتری چپلونکر نے انگریزوں کے ظلم و ستم اور استحصال کے خلاف آواز اٹھائی اور انشائیہ نگاری سے کام بھی لیا مگر کوشش بیکار آواز نہ پہونچ سکیں۔ خاموش سمندر میں ہلکا سا ارتعاش ہوا۔ کچھ بلبلے بنے اور پھوٹ گئے۔ لیکن کولھٹکر نے "ساتھی دار" جیسے مضامین لکھ کر طنز و مزاح کے چمن کی آبیاری کی۔ بہترین ڈرامے بھی لکھے کولھٹکر کو ذو معنی الفاظ، تشبیہات اور استعاروں کے استعمال اور مضحکہ خیز سچوئشن پیدا کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کو مراہٹی لوگوں کے تہذیب و تمدن، لباس آداب اطوار، رسوم رواج، عادتیں حرکتیں غرض کہ پورے سماج کا تجرباتی و مشاہداتی علم تھا۔ ان کی زبان سے واقفیت حاصل تھی اس لئے ان کے ڈرامے، مضامین، شخصی خاکے معاً اول کا کام کر گئے۔ ان کی "سدا ماکے پوہے" مراہٹی ادب کی شاہکار تصنیف ہے جس میں بندو نانا اور پانڈو تاتیا سدا آزاد اور خوجی کی طرح زندہ و جاوید رہیں گے۔ ان کرداروں نے وہ دھومیں مچائی ہیں کہ بس مزہ آجاتا ہے۔ ان کے تحریر کردہ مضامین تفل، ہمارے میٹھے کھیل، چوروں کا سمیلن، بوڑھاپے کے فائدے، ادبی کانفرنس کی تیاری، گوالنی سبھی کا تعارف وغیرہ دل کو خوش کر دینے والی اولین تحریریں ہیں۔

ان کے بعد دوسرا بڑا نام گنیش گڈکری کا آتا ہے۔ ان کے بے پایاں تصورات بے مثال مشاہدات مزاحی تشبیہات منتخب شخصیات، زبان پر بے پناہ قدرت، نے انہیں عظیم فن کار بنا دیا۔ ان کے معاصرین میں اچیوت بلونت کولھٹکر بھی کافی مشہور ہوئے، لیکن گڈکری نے سماجی اصلاح کا کام بڑے پیمانے پر کیا اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ طنز و مزاح کے ذریعہ کیا۔ انہوں نے بھی تینو نانا اور باڑک رام جیسے لافانی انسانوی کردار تخلیق کیے۔ جو مراہٹی ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ان کرداروں کی مثال مراہٹی ادب میں ملنی مشکل ہے۔ انہوں نے نابالغ کرداروں کی بھی بھرپور عکاسی کی۔ ان کے تقریباً سب ہی ڈرامے اسٹیج ہو چکے ہیں۔ اور خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ "ایک ہی پیالہ" ان کا مشہور ڈرامہ ہے جو اسراف شراب کے موضوع پر ہے۔ "رسوئی گھر کی چیزیں" اس مضمون میں پکائی جانے والی چیزوں کو زندگی سے ہم آہنگ کر انہوں نے عجیب لطف پیدا کر دیا۔ ان کے فن کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ "شاعر کا کارنامہ" انشائیہ نگاری کی معراج ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون ڈپٹی نذیر احمد کی کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی والا انداز ظرافت ہے۔ اچیوت بلونت کولھٹکر نے "ماجھے تیواری" سماج کے خطوط، جیسے مزے دار مضامین اور ڈرامے لکھے اور دل پرستی، حب الوطنی پر تو انہیں مراہٹی کا آزاد کہا جا سکتا ہے۔

لکشمی بائی تلک کی تحریر کردہ "یادیں" جو ش کی "یادیں" کی یاد دلاتی ہیں۔ خود نوشت داغ عمری میں لکشمی بائی

www.taemeernews.com

تلک اور شکنتلا پر انچیے کا جواب نہیں۔ ان کی کتابیں تمام دنیا کی چھپی سوانح عمریوں کے سامنے بڑے لخرے سے پیش کی جاسکتی ہیں۔

تلک بائی کا سوانحی خاکہ تو طنزیات و مضحکات جیسے موضوع پر نہیں مگر یادوں کے گہوارے نے شخصیتوں اور ماحول نے وہ انداز اور گوشے مہیا کیئے کہ بے اختیار داد نکل پڑتی ہے اور قاری بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وامن راؤ جوشی نے جو "میونسپلٹی" ڈرامہ لکھا، آفس کے عملے پر اور متاثر لوگوں پر وہ وہ فقرے کسے، پھبتی اڑائی اور ضلع جگت کی کہ توبہ ہی بھلی۔

ن۔ پ۔ کلیکر نے ہلکا پھلکا ادب تخلیق کیا جس میں بین خاں جیسا پھکڑ پن نہیں بلکہ ڈاکٹر شفیق الرحمٰن جیسا اثر تبسم مزور ہے۔ ان کی زبان نہایت شگفتہ اور دلچسپ ہے۔ "میری گاڑی چھوٹ گیوں گئی" طنز و مزاح کا شاہکار ہے۔ سودیشی ریل والی بات بلکہ اس سے بھی گئی گذا بہتر۔

اچاریہ پرلھاد کیشو اترے۔ مراہٹی ادب کے سب سے بڑے بلند پایہ طنز و مزاح نگار، شاعر، نقاد، ڈرامہ نویس، فلمی مکالمہ نگار، مہمانی، خطیب، ایکٹر، ڈائریکٹر سب ہی کچھ ہیں۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ جس صنف علم و ادب میں آگئے جھنڈے گاڑ دیئے۔ امبیڈکر کے شابہہ اگر وہ اپنی توند پر پینٹ اوپر چڑھائیں تب بھی پبلک ہنسنے لگتی۔

اترے کا بنیادی موضوع ہی طنز و مزاح تھا۔ وہ زندگی کے ہر زاویہ کو رشید احمد صدیقی کی نظر سے دیکھتے تھے، بخاری کی طرز میں لکھتے تھے، اور اپنے خاص انداز میں پیش کرتے تھے۔ اس قدر مسخر کرنے والا لب و لہجہ میری نظر سے نہیں گزرا جس کے ہر فقرے، ہر بول میں جادو ہوتا تھا۔ جو ہنستے ہنستے رلاتا اور روتے روتے ہنساتا تھا۔ میں نے انہیں دو تین بار تقریر کرتے ہوئے اور خود ان کے لکھے ہوئے ڈرامہ "میں اترے بولتا ہوں" کے ناظرین میں ہنستے بولتے ہوئے دیکھا ہے۔ مہاراشٹرا کے عوام نے انہیں پنڈت نہرو سے زیادہ چاہا اور دلوں سے بڑھ کر عزت دی۔ اور جیتے جی انہیں وہ عزت و شہرت ملی کہ بڑے بڑے منتری ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہتے تھے۔ اور یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ اترے بے پناہ ذہین، نہایت تعلیم یافتہ، بے باک، نڈر، حاضر جواب، لطیفہ گو، اور بات میں بات پیدا کر دینے میں ماہر تھے۔ چوہان سینکٹ مہاراشٹرا کا نعرہ لگا رہے تھے۔ اور بڑی زوردار تقریر کر رہے تھے۔ جلسہ گاہ میں وہ بھی موجود تھے۔ مہاراشٹرا جھالا پاہیجے یعنی کہ مہاراشٹرا میں شامل ہونا ہی چاہیئے جب ان کا نمبر آیا تو فقرہ کسا چوہان جھالا پاہ کے پاہ پر بہت زور دے رہے ہیں اگر ان کے نام سے پاہ نکال دیا جائے تو کیا رہ جاتا ہے۔ وان۔ وان معنی چپکی۔ کنٹم دار چیف منسٹر کو ان کے منہ پر کنڈم دار کہتے نہ چوکتے۔ ان پر بیک وقت دو چار مقدمات چلتے مگر وہ بڑی ذہانت سے حل کرتے تھے اچھے بڑے سب ہی ان کی نشریات کا تبرک قبول کرتے تھے ہاں جو دماغی ہوتے وہ مقدمہ ضرور دائر کرتے اور ان کی مزید بقول بمبئی والوں کے پھجیتا ہوتی۔

"جھنڈو کے پھول" مراہٹی ادب کی واحد شعری تصنیف ہے جس میں اعلیٰ درجہ کی ساتھ تقریر سے اور

www.taemeernews.com

دلاور فگار کے انداز کی معیاری طنز و مزاح والی شاعری ہے۔ کرہے کا پانی تین جلدوں میں چھپی ان کی خود نوشت سوانح عمری ہے جس کا مزاحیہ میں جواب نہیں، اترے خود اپنا مذاق اڑاتے ہیں اور جی کھول کر ہنستے ہیں۔ معاصرین شخصیتوں کی وہ وہ درگت بناتے ہیں کہ دیکھتے ہی بنتی ہے۔ استاد لچسپ انداز بیان مزاحیہ میں شاید ہی کسی کو نصیب ہوا ہو۔ وہ گمنامیاں بھی بے تحاشہ لکھتے ہیں مگر موقع محل کے اعتبار سے وہ بھی سامعین کو بھلی لگتی ہیں۔ بھاؤ پاد یہے منے واسو ناکر نامی جنسیاتی موضوع پر ناول لکھی۔ انہوں نے اس بُری طرح خبر لی۔ معلوم ہوتا ہے لادا پھوٹ پڑا۔ کلیکر اور اترے کے ادب میں وہی فرق ہے جو تبسم اور قہقہہ میں ہے۔ سیاسیات میں حزب مخالف کا حلیہ بیان کرنے میں انہیں قدرت حاصل تھی۔ وہ لفظوں سے ایک ایسا پیکر تراشتے کہ سننے والے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ ان کے طنز کا نشانہ مرارجی بھائی اور چہار اشٹرا کے چھوٹے بڑے سب ہی افسر بنے ہیں۔ ان کی ادارت میں مراٹھا نکلتا تھا لاکھوں میں چھپتا اور ہاتھوں ہاتھ نکل جاتا تھا۔ شادی کی زنجیر (بیڑی) درہم کا کدو، آداب بجالاتا ہوں، میں اترے بولتا ہوں۔ وہ میں نہیں، جہاں بُوا وہاں بایا (جہاں مرد وہاں عورتیں وہ لطف نہیں جو بُوا اور بایا میں ہے) ان کے شاہکار ڈرامے ہیں۔ جال میں پھنسا نارد، بالو کی بھوی، منگنی کی رسم، دلچسپ مضامین ہیں۔ مکے اور گدگدیاں مزاحیہ شاعری پر بھرپور تنقید ہے۔ مگر کلیم الدین احمد کی طرح نہیں جنھیں سب بکواس نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بیٹے لوٹ کر کب آئے گا، دل کا شوک، کون کہاں سے آیا بہترین طنزیہ تخلیق ہیں۔ گوکرن کنچنور ھوڑ کے رشمی ان کے زندہ رہنے والے افسانوی کردار ہیں۔

کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمایئے،

"ظرافت کوئی بچوں کا کھیل نہیں، یہ کوئی جاہل کم عقل آدمی کا کھیل نہیں، جوکر کا کرتب نہیں، کاہل یا بیمار آدمی کی انگڑائی نہیں۔ یہ کوئی غبی اور فلسفی کے دماغ کی پیداوار نہیں۔ مجذوب کی بڑ نہیں، بے تکی لفاظی نہیں۔ ظرافت عظیم انسانوں کا تجربہ اور مشاہدہ، اور بڑے اولوالعزم فاتحین کا ہزاروں لاکھوں پر بلا جنگ فتح حاصل کرنے کی لازوال کوشش ہے"۔ مکے اور گدگدیاں

"اسکاچ لوگوں کا کنجوس پن، ایرلش لوگوں کا اڑیل پن، امریکن لوگوں کا دو غلا پن، اور نیگرو لوگوں کا مورکھ پن یہی سب انگریزی ادب کا طنز و مزاح ہے"

مرڈھے کی شاعری پر تبصرہ "کسی دیوانے آدمی کا آڑی ترچھی لکیریں کھینچنا یہ جدید شاعری ہے۔ چال نہیں، تال نہیں سُر نہیں، الفاظ نہیں بندش نہیں، موضوع نہیں اسلوب نہیں، ہیئت نہیں کیفیت نہیں۔ جذبہ نہیں۔ کوئی مطلب نہیں، آخر کار کچھ نہیں۔ میرے ایک دوست کا کتا بکا ایک صفحہ پڑھا اور اس زور کا چیخ پڑا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا"

پی۔ ڈی۔ جوشی نے مراٹھی طنز و ادب کو ایک نیا موڑ دیا۔ طنز و مزاح کے اچھوتے نمونے انہوں نے تخلیق کیے جوشی نے مڈل کلاس کو جس طرح جس پیمانے پر پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان سے پہلے یا بعد پھر کسی سے نہ ہو سکا۔ ان کے بچکانہ سا پرخلوص انداز، کرداروں کی غیر شعوری حرکتیں، دل موہ لینے والی سچوئیشن، شخص کا کارٹون، غرض کہ ایک ذہین

www.taemeernews.com

داغ کی تخلیق پر داد دیئے بغیر قاری نہیں رہ سکتا۔ چمن راؤ اور گنڈیا بھاؤ اس قدر زندہ و جاوید ہو گئے کہ لوگ انہیں گلی کوچوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹی وی پر آج بھی انہیں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کرداروں کا لاریل ہارڈی کی طرح ایک دوسرے کو جھٹلانا، ذہنی شکوک اور توہمات، بدشگونی، کنجوسی، رسم و رواج پر عالمانہ گرفت اور فاضلانہ تنقید جوشی کے طنز و مزاح کی خصوصیات ہیں ان کے شگفتہ مضامین میں "میرا دوسرے درجہ کا سفر" "سرکاری مہمان" "میرے دفتر پجاری والا" گنڈیا بھاؤ کی بیماری، چمن راؤ کی شرارتیں، بہترین طنز و مزاح کی روشن مثالیں ہیں۔ ان کی تحریریں کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں اور بڑے مزے سے آج بھی پڑھی جاتی ہیں، ان کے کردار عام انسانی ماحول سے لیے گئے اس لئے لوگوں کو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ وہ جوشی کے ادب کو گھر آنگن سمجھتے ہیں۔ گنگا دھر گاڈگل نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا۔ "جوشی کے تخلیق کردار مراٹھی عوام کو خود نوشت تقدیر اور پُر لطف تدبیر کی دعوت عام دیتے ہیں۔ ایک ایسا طرز زندگی جو بکھر کر سنورتا ہو۔"

کامریڈ جی۔ ایم لیمئے جوشی کے ماموں تھے۔ اُنہوں نے بھی مراٹھی طنز و مزاح میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ ان کا انداز تحریر اس وجہ سے اہمیت رکھتا ہے کہ وہ ماحول بناتے چلتے ہیں۔ ماحول خود بولتا ہے زبان خاموش رہتی ہے اور ہیئت کزائی کے عالم میں کردار اور قاری دونوں ہنسنے لگتے ہیں۔ "پنت کھانے کی میز پر" "سیادھری کا سفر" شاعر اور چور، خوبصورت طنز و مزاح کی مثالیں ہیں۔ "بمبئی کے دھندے میں" یہاں کے صنعتی ماحول کو پیش کیا گیا ہے۔ ۵ سال پیش ترکی بمبئی سرکس کے تماشوں کی طرح اچھل کود دکھانے لگتی ہے۔

دتو باندیکر کا مزاحیہ ادب اردگرد کے بکھرے ماحول کی عکاسی کرتا ہے۔ انداز تحریر تیز و نشتر چبھونے والا ہے مگر اس طرح کہ آپریشن کے بعد راحت ہو۔ مرض جاتا رہے اور مریض کو شفا ملے۔

شام راؤ اوک مذاق اڑانے اور ہنسی ٹھٹھول کرنے والے ادیب ہیں۔ "کہاں گیا وہ تیس مار خاں؟" ناممکن مردوں کی پارٹی، نہ آیا تلہ نہ مراشیر، مقبول ترین، عہد ساز تحریریں ہیں جو عوام کے ذہن پر آج بھی اپنا سکہ جمائے ہوئے ہیں۔

بھ۔ ر۔ بھاگوت کا دل آزار جنگل کی ہوا، خاصی دلفریب ہے۔

شکنتلا پرانجپے کا ذکر پہلے بھی آیا ان کا چھوٹا سا مجموعہ ہے پطرس بخاری کی طرح مگر مراٹھی ادب میں خاصا مقبول ان کے لکھے ہوئے انشائیے "ہماری گھوڑا گاڑی" "میری میت کا آخری سفر" کھٹا میٹھا، ادب میں بہترین اضافہ ہیں۔ آج بھی ان کی معنویت کم نہیں ہوئی۔ مراٹھی ادب میں صرف دو طنز و مزاح نگاروں کی سوانح عمریاں مشہور ہیں۔ مراٹھی طنز و مزاح میں جنسیات، سماجیات اور سیاسیات کا پہلو غالب ہے۔ اور عورت چار دیواری کی ملکہ اور حیا کی پتلی ہے، وہ داجبہ تیمم کی طرح جامے سے باہر نہیں ہو سکتی۔ اور جو ہو سکتی ہیں وہ نادلوں اور افسانوں کی زینت بن کر رہ جاتی ہیں۔ طنز و مزاح کے میدان کارزار میں مہارانی لکشمی بائی بن کر نہیں اتر سکتیں۔

پی ایل دیشپانڈے اترے کے بعد سب سے زیادہ مشہور ادیب، ڈرامہ نویس، طنز و مزاح نگار، شاعر، سوانح نگار،

www.taemeernews.com

صحافی، نقاد، ایکٹر، ڈائرکٹر، موسیقار، ہارمونیم بہت اچھی بجاتے ہیں، لطیفہ گو، بذلہ سنج، حاضر جواب، ذہین مشاق تجربہ کار، دُنیا کا سفر کیئے ہوئے مراٹھی اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور، بہترین خطیب اتنے مشہور کہ اگر ساہتیہ سمیلن میں نام کا اعلان کر دو تو ٹکٹ ایک ہفتہ پہلے سولڈ آؤٹ، دیشپانڈے کوئی نہیں بولتا سب لاڈ سے پو۔ل بولتے ہیں۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے نیز مہاراشٹرا کی بے شمار انجمنوں سے انعامات حاصل کر چکے ہیں مگر زبان ظلم کے خلاف بولنے اور زہر اگلنے سے عاجز نہیں۔ یاروں کے یار، غریبوں کے مددگار، چھوٹے چھوٹے کلاکاروں کی ہمت افزائی کرنے والے۔ مراٹھی ادب کے مغل اعظم مگر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کر لیجیے۔ کسی گمنام ادیب یا شاعر کی کوئی چیز پسند آئے تو تعریفی خط بھیجنے میں سب سے اول۔ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لکھا اور اکثر طنز و مزاح نگار نے مسلمانوں کو اورنگ زیب کی پٹھانوں کی سود خوری یا رنڈیوں کی دلالی کی وجہ سے مسلمانوں کے خلاف بھرپور طنز و نفرت کا اظہار کیا۔ مگر پی ایل ایک ایسے ادیب ہیں جنھوں نے دیگر مذاہب والوں کی کبھی دل آزاری نہیں کی۔ اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی کے گریجویٹ ہیں اس لئے اسلامی ماحول سے پوری طرح آشنا تھے نے کے ماحول میں پل بڑھ کر جوان اور بوڑھے ہو گئے مگر جن سنگھی یا مہا سبھائی نہیں۔ حالانکہ انہیں کے معاصرین نا دل بگار بھاؤ سے حد درجہ متعصب ہیں دیشپانڈے کی ہر بات نرالی ہے سمندر کی طرح وشال دل، اور شاہین کی نظر، مطالعہ کا یہ عالم کہ بے بسی نہیں، تکلم کا یہ انداز کہ دل شکنی نہیں، ان کے ڈرامے انہیں کی طرح دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ پی ایل کی طرز نگارش نہایت شگفتہ، شستہ مہذب، اور طنز و مزاح سے بھرپور ہے۔ ان کے ڈرامے بٹائنے والی چال؛ شخص اور عکس، ہوا کے دوش پر بارات، تیرا ورشہ بچھ پاس، تین پیسے کا تماشہ، بہت اہم اور مشہور ہیں ان کے سفرنامے مباحثے، ریویو، غرض کہ پچاسوں کتابیں چھپ چکیں اور مراٹھی عوام سے خراج تحسین وصول کر چکیں بٹانے کی چال، سمجھو سے کی چال کی مشابہہ تیں بے جوڑ، بمبئی کی چال والی زندگی کا اتنا خوبصورت خاکہ خود بمبئی والے نہ پیش کر سکے۔ کہتے ہیں چال میں ہندوستان سانس لیتا ہے وہ فلیٹوں میں کیوں محصور ہو گیا۔ زندگی کٹ گئی، بے ربط ہو گئی۔ ہنسی تبسم ماتھوں ہو گیا۔ انہوں نے مراٹھی سماج کی بھرپور عکاسی کی۔ اور پورے کلچر کی ماہرانہ جراحی ان کے تخلیق کردہ انسانی کرداروں میں انتوبوا، نارائن، ہری نیت لازوال اور ہمیشہ یادگار، رہنے والے کردار ہیں۔ ان کے فن میں موجودہ دور کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا بھی اور عریاں وجنسیت زدہ سوسائٹی کا بھی بہت موثر بیان ہے ایسے موقع پر جس طنز کا انہوں نے اظہار کیا وہ اترے سے بھی نہیں ہو سکا۔ رمیش منتری نے جو خود بھی بڑے طنز و مزاح نگار ہیں پی ایل کے فن اور قلم کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا "پی ایل دیشپانڈے نے خاکے، سفرنامے ڈرامے، رپورتاژ اس انداز کے لکھے کہ مراٹھی ادب میں کوئی ان کا ثانی نہیں ہے۔ جارج برنارڈ شا، اسٹیفن لیوکاک، پلم جی وڈہاؤس جو انگریزی کے نہایت ممتاز ادیب ہیں، ان کے مثل اور کبھی ان سے بھی بہتر ادب کی تخلیق کی ہے انہوں نے مراٹھی قاری کے ذہن و دل پر اپنی شخصیت اور فن کی گہری چھاپ بٹھا دی جو کبھی مٹ نہیں سکتی۔

www.taemeernews.com

ان کی حاضر جوابی کا نمونہ دیکھئے پی ایل ایک مرتبہ ساہتیہ سنگھ کی عمارت میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کچھ دوست ایک خوبصورت لڑکی کو ملانے کے لئے آئے، اور پوچھنے لگے پُو ل آپ نے انہیں پہچانا۔ جواب دیا، نہیں بھائی، تب ایک دوست نے کہا، ارے صاحب یہ داسو آنا مالونکر کی بیٹی جاہدی۔ داماآنا آنکھ کے کمزور تھے اور نہایت مشہور مزاحیہ ایکٹر ان کی بیٹی لتا منگیشکر کی بھابی اور ہردیہ منگیشکر کی بیوی ہے، تب ویشپانڈے نے خوبصورت لڑکی کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ داسو آنا کی نظر بچا کر پیدا ہوگئی۔ ان کے لطیفے، حاضر جوابی کی طرح مشہور ہوئے جنھیں لوگ بڑے مزے لے لے کر حلقے میں بڑے مزے لیکر سناتے ہیں۔ اور محظوظ ہوتے ہیں۔

پول نے عزیز دوست جیونت دلوی کو ایک نجی خط میں لکھا تھا۔۔

"کچھ دن ہوئے میں اور سُنیتا (بیوی) سفر سے واپس لوٹے ہیں۔ گھٹنوں کا درد قدرے کم ہے، ادبی بیماریوں کی طرح گٹھیا کی بیماری ایکبار لگ گئی تو عمر بھر پیچھا نہیں چھوڑتی، آب وہوا میں تبدیلی ہو تو ماہرین موسمیات سے پہلے ہم کو پتہ چل جاتا ہے۔ آسمان ابرآلود ہو تو گھٹنوں پر عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں سب سے زیادہ گھٹاؤں سے گھبراتا ہوں۔ ریڈیو پر اگر سرپیاد نیور یکر سا گانا، بادلوں نے خوب حمد کر دیا بجنے لگے تو میں ریڈیو کا گلا دبا دیتا ہوں۔ یا بہت رعایت کیا تو بٹن گھما دیتا ہوں۔ اب تو بدحواسی کا یہ عالم ہے کہ میں نے کالیداس کی میگھ دُوت، ہاف ریٹ میں نکال دی، تین پیڑھی لوگوں کی عمریں تمام ہوں اتنی بار اُس ابر کا لفظ استعمال کیا گیا۔"

گنگا دھر گاڈگل ماہر اقتصادیات ہیں۔ معاشیات پر مبنی کہانیاں بڑی چابکدستی سے لکھتے ہیں۔ بہترین نقاد ہیں۔ کالج کے پرنسپل ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی تحریروں میں بے پناہ جاذبیت اور حکومت پر بے لاگ تنقید ہوتی ہے۔ ان کی زبان بڑی شُدھ ہوتی ہے۔ ان کی افسانوی سوانح بعنوان "بنڈو" پورے مہاراشٹرا میں کافی مشہور و مقبول ہوئی۔ جس کے ذریعہ اُنہوں نے پورے مہاراشٹرا کے مراٹھی آدمی کا تعارف کرایا۔ بنڈو کے ساون کردار سنہ لتا اور نانو کی شخصیتیں بھی خاصی متاثر کرتی ہیں۔ مراٹھی ادب میں ایک صنف جسے پھر کی اڑانا یعنی بیوقوف بنانا یا مذاق اُڑانا کے ہم معنی سمجھنا چاہیئے اس فن میں گاڈگل کا جواب نہیں۔

رمیش منتری مجتبیٰ حسین اور کرنل محمد خاں کی طرح مشہور ہیں اور بادتاریبی۔ وہ یوسف ناظم کی طرح بے حساب لکھتے ہیں۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ خاکے، سیاسی و سماجی ماحول میں کہیں گل کاریاں، اور کہیں کھینچا تانیاں دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دینے کی مصداق ہوتی ہیں۔ اُنہوں نے فارس اور فینٹیسی دونوں سے کام لیا۔ اور زبان و ادب کی بھرپور خدمت انجام دی۔ ان کی تحریر میں تنوع اور جامعیت ہے۔ بسیاھدری کی چوری، میں پہلے بلی تھا، میرے گھر شیر آتا ہے۔ ایسی بہت سی تخلیقات مسنی خیز اور تحیر آمیز ہیں۔ ان کے سفرنامے ادبی شاہکار ہیں۔ یورپ اور امریکہ کی دل چسپ جھانکیاں جن میں وائٹ ہاؤس سے نائٹ کلب تک اور نیگرو نفرت سے ملوفلم کے مضر اثرات تک، تاریخی مقامات سے بلیک پارک تک اور لندن نیویارک سے بمبئی تک اس طرح سفر دکھایا ہے کہ قاری بھی اپنے آپ کو ہم سفر سمجھنے لگتا ہے۔

www.taemeernews.com

ان کے سفرنامے اردو کے سفرناموں سے بھی بہتر ہیں اس لئے کہ زبان تو پُرلطف ہے ہی اندرونِ سماج کی بھی خاصی تصویر کشی کی گئی ہے۔ جو ہمارے اردو ادیبوں کے بس کی بات نہیں۔ نگارخانوں کی سیر کے لئے رسوا کا دماغ یا کپور کی سی دیدہ رسی چاہیئے وہ آج کے طنزیہ و مزاحیہ ادب اردو میں خال خال کہیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر درگا آج کے طنز و مزاح سے لطف اندوز ہونے کے لئے دو آدمیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایک پڑھ کر سنانے کے لئے اور دوسرا گدگدیاں کرنے کے لئے۔ انہوں نے بڑی حکیمانہ بات کہی ہے "مزاح بصورتی جس طرح آدمی کی آنکھوں میں ہے، ظرافت اس کے کانوں میں گھسی بیٹھی ہے۔ اگر ظرافت پھڑکے تو مزہ آئے، ادیب ارتعاش نہ پیدا کر سکے تو کانوں کا قصور نہیں۔ مراٹھی والوں نے کانوں کو اس قدر غذا فراہم کی ہے کہ کان کان علیما حکیما ہو گئے۔

دسنت بینز نے شہری اور دیہی پس منظر میں کامیاب مزاحیہ ادب پیش کیا۔ ان کے پاس صرف مزاح ہے آوند میری پوری کردہ میں دیہی زندگی کی کامیاب عکاسی کی گئی۔ ان کے مضامین بہت رواں اور پُرلطف ہوتے ہیں۔

بال گاڈگل کا فن پی جی وُڈ ہاؤس سے شابہہ ہے۔ ان کے پاس تبسم اور قہقہے دونوں قسم کے نمونے ہیں۔ "سگریٹ اور بہار کا موسم" بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیئے ہوئے کی طرح تصوراتی شگفتگی لئے ہوئے ہے۔

وی پی کالے نے بہت لکھا، اور ہر قسم کے صنفِ ادب میں طبع آزمائی کی طنز و مزاح سے بھرپور ڈرامے، ناول، افسانے، مضامین لکھے۔ پیشے کے اعتبار سے انجینئر۔ دائم المریض مگر دلوں کو خوش کرنے کا صوفیانہ فرض منصبی ادا کرتے ہیں۔ انہیں اپنی تخلیقات کو عوام کے سامنے زبانی سنانے کا خاص فن آتا ہے۔ ان کے حافظے کی داد دینی پڑے گی سینکڑوں صفحات ذاتی تخلیق کردہ انہیں ازبر یاد ہیں۔ انہوں نے طنز و مزاح میں مکالمہ کا انداز اپنایا ہے جو بہت ہی بریف اور نگینوں کی طرح جڑا ہوتا ہے۔ انہوں نے بے شمار معاشی سماجی تعلیمی اور جنسیاتی مسائل پر کھلا اور بڑی چابکدستی سے حملہ کیا۔ ہنستے ہنستے آدمی اپنی بے بسی پر رو پڑتا ہے۔ نوجوانوں کی بے راہ روی ان کی دلچسپی کا خاص موضوع ہے۔

وی اے بُوا اُبھرتے ہوئے فنکار ہیں۔ ان کے پاس ہر قسم کا دلایتی و دیسی مال ہے، تبسم اور قہقہے دونوں کی آمیزش ہے۔

دیہاتی لوگوں پر طنز یا ان کے طرزِ زندگی سے مزاح پیدا کرنے کا یکہ جس قدر جی ایل ٹھوکل کو حاصل ہے وہ بینز کو بھی نہیں۔ انہوں نے دیہاتی زبان میں طنز و مزاح کے نادر نمونے پیش کیئے۔ مراٹھی ادب اور زبان میں ہمیشہ سے یہ روایت رہی کہ مقامی بولیوں کو ادبی زبان کا درجہ دیا گیا۔ مراٹھی کے ڈراموں، ناولوں، افسانوں، شخصی خاکوں، شاعری، غرض کہ ہر صنفِ ادب میں علاقائی بولی کو مقامی ادیبوں کے ذریعہ خوب فروغ دیا گیا جس طرح تخلص بھرپانی نے بھرپانی اردو کو، یا سلیمان خطیب نے حیدرآبادی اردو کو اپنے فن کا وسیلہ بنایا۔ لیکن مراٹھی ادیبوں نے دہلی اور لکھنؤ کا معیاری اور غیر معیاری کا جھگڑا ہی ختم کر دیا اور بولیوں کو اتنا نکھارا کہ ادبی زبان بنا دیا۔ ہم اردو والوں کو اپنے سوچنے اور نقد و نظر کے زاویے کو بدلنا ہوگا۔ مراٹھی دیہی ادب میں طنز و مزاح کو اعلیٰ ادیبوں نے پروان چڑھایا۔

www.taemeernews.com

جس میں وینکٹیش ماڈگل کرمشنکر پاٹل ڈی ایم میراث دار، آر آر بوراڈے شامل ہیں باجی راؤ پاٹل، اور مراٹھی تماشوں کے گمنام فن کار ٹھوکل کی کتاب کرودی شکر نے راشٹرنگ کے زمانہ میں وہ شیریں باتیں کہ آج تک لوگ انگلیاں چاٹتے ہیں۔ اور ذیابیطس کے مریضوں کو صحت کے لئے استعمال کی دعوت دیتے ہیں۔

جیونت دلوی نے مونچھیں منڈوادوں گا اور "ٹن ٹن پال" لکھ کر بڑا نام کمایا۔ وہ ایک مشہور ڈرامہ نویس، ناول نگار اور افسانہ نگار ہیں۔ مگر طنز و مزاح میں بھی کسی سے پیچھے نہیں۔ وجے تینڈولکر بہت ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں۔ انگریزی اور مراٹھی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ براہمنوں، ہریجنوں اور سیاستدانوں پر طنز ان کا خاص موضوع ہے۔ انہوں نے سماجی اور تعلیمی مسائل پر کامیاب ڈرامے لکھے۔ خاموش عدالت جاری ہے، ذات کا چاہیئے، کملا، گیدھ، بے بی، اڑدھا، کنیادان، وغیرہ تینڈولکر نے طنز کے ذریعے مسائل پر گہرا وار کیا ہے۔ بہت سے مراٹھی اور برہمن لوگ ان کے مخالف ہو گئے مگر پھر بھی ان کے قدرداں ہیں۔ وہ صف اول کے ڈرامہ نگار ہیں، اتنے بہتر کہ ان سے بڑھ کر ہندوستان کی کسی زبان میں کوئی ڈرامہ نگار نہیں۔

شری نورے، شیرواڈکر، ویرکر، انل بردے، پی بی بھاوے، مدھوسودن کالیکر، بال کولھٹکر، وغیرہ بے شمار ڈرامہ نگار ہیں جن کے پاس طنز و مزاح کی حسین قوس و قزح ہے۔

ڈاکٹر درگا لکھتے ہیں کہ طنز و مزاح یا ظرافت کے ذریعہ ہندوستان میں صحیح جمہوریت قائم کی جا سکتی ہے۔ لوگ سے مل بیٹھیں اور ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کریں۔ آپسی بغض و عناد دور ہوگا۔ عصبیت اور تناؤ کا ماحول کم ہوگا۔ فرقہ وارانہ فسادات نیست و نابود ہوں گے۔ ہم آہنگی اور قومی یک جہتی بڑھے گی۔ یہ اُسی وقت ہوگا جب ناظر طریف ادیب کو دوسرے درجہ کا فن کار نہ سمجھے اور انہیں ہر طرح کا بڑھاوا دے۔ پر لطف مجلسیں وہ کام کر سکتی ہیں جو پنچسالہ منصوبہ نہیں کر سکتے۔

بہرحال مراٹھی طنز و ظرافت کا معیار بہت اونچا ہے اور آئے دن اُس میں خوشگوار اضافے ہی ہوتے جا رہے ہیں۔ ۸۰ سالہ ادب اپنے اندر صدیوں کو سمیٹے ہوئے ہے اور مستقبل سے پُر اُمید۔ یہاں ڈھکیل کر آگے بڑھنے کی سازش نہیں۔ اجارہ داری نہیں۔ کھلا میدان ہے ہر فن کار کو دعوت سخن ہے ہر ادیب کو پشت پناہی، عمدہ معاوضہ، غرض کہ جینے کا سہارا۔ کام کا دام، اُوپر سے نیک نام سا

ماہنامہ شگوفہ
کا
منفرد
ڈرامانمبر
صفحات ۳۶۰
قیمت : ۲۵ روپے

www.taemeernews.com

تحریر : پروفیسر ایئیاپانی کر
ترجمہ : یوسف ناظم

ملیالم ادب میں مزاح

کیرالا ساہتیہ اکادمی کی جانب سے حال حال میں ملیالم ادب کی مختلف اصناف سے متعلق مستند اور مکمل تواریخ کی اشاعت کا کام شروع ہوا ہے۔ ملیالم ڈرامہ، افسانہ، اور شاعری سے متعلق کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مختصر کہانی کے موضوع پر ایک کتاب زیر اشاعت ہے۔ ملیالی ادب میں تنقید کے تعلق سے بھی کتاب کی اشاعت کا مسئلہ زیر غور ہے لیکن ان اصناف کے علاوہ دیگر اصناف ادب۔ جیسے کہ خطوط نگاری، اِسے۔ بچے سوانح عری اور ظرافت سے متعلق کتابوں کی اشاعت اگر کبھی ہوئی بھی تو اس میں کافی عرصہ لگے گا کیوں کہ اس بارے میں ابھی سوچا بھی نہیں گیا ہے اور اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ انہیں ذیلی یا ضمنی اصناف سمجھا گیا ہے یا یہ کہ ان اسالیب نگارش میں مسلسل نہیں لکھا گیا اور ان میں اتنا ذخیرہ نہیں ہے کہ ان موضوعات پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی جا سکیں۔

ملیالی زبان کا سب سے بڑا مزاح نگار، جسے میری رائے میں، دنیا کے عظیم مزاح نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے، کنچن نمبیار ہے۔ اٹھارویں صدی کے گزشتہ اور آنے والے وقتوں کے اِس عظیم مزاح نگار نے اسٹیج کے لئے بیسیوں تمثیلی کتھائیں اور فیچر لکھے جنہیں حرکات و سکنات اور نرت کے بھاؤ کے ساتھ اسٹیج پر پیش کیا جاتا رہا۔ کنچن نمبیار کو چاسر اور رابیلیو (Rabelais) دونوں کا ہمزاد کہا جا سکتا ہے اس کی تحریریں معصومانہ چُبھن، گمبھیر سماجی تنقید، گہرا طنز اور طعن کی شدید چوٹ سب کچھ موجود ہے ساتھ ہی ساتھ وہ ایک بڑا شاعر بھی ہے اور قادر الکلامی میں اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔

اُنیسویں صدی میں جب نثری ادب کا ارتقاء ہوا اور ادبی رسائل کو بیسویں صدی کے اوائل میں قبول عام اور استحکام کی سند ملی تو اُس وقت ظرافت کے مختلف نثری سانچے وجود میں آئے اور بیسویں صدی کے دوسرے اور تیسرے حصے میں کرشنا پلّے ایک ظرافت نگار کی حیثیت سے سامنے آئے۔ کرشنا پلّے کے سسر سی وی رامن پلّے جو ایک مایہ ناز

www.taemeernews.com

ناول نگار تھے مزاح نگاری کی بھی استادانہ صلاحیتیں رکھتے تھے۔ ایم۔آر۔ نائر اور سبھائن دونوں نے نثر اور نظم میں ظرافت نگاری کے جوہر دکھائے اور ان دونوں کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے ظرافت نگاری کی وہ صحت حال نہیں رہی۔ یوں کہنا چاہیئے اس میں انحطاط کی کیفیت پیدا ہوگئی لیکن اس کے باوجود ملیالی نثر، نظم، ڈرامہ اور کہانیوں میں کافی بڑا سرمایہ ہے جس میں طنز و مزاح کا عنصر موجود ہے۔

افسانہ نگاروں میں سب سے زیادہ معروف مزاح نگار کرور (KARUR) اور بشیر ہیں۔ کرور نیلکنٹھا پلّے مختصر کہانی نگار تھے لیکن ان کی کہانیوں میں خوش طبعی اور سبک طنز کے دیئے جھلملاتے ہیں۔ ولکم محمد بشیر ناول نگار ہیں مختصر کہانیاں بھی لکھتے ہیں اور انہیں منضبط ظرافت کو برتنے پر قدرت حاصل ہے۔ محمد بشیر کی کہانی "کیلے" میں بتایا گیا ہے اس کہانی کا ایک کردار عبدالقادر کس طرح باتیں بنا کر جمیلہ بی بی کو کیلوں کی بجائے سنترے قبول کرنے پر راضی کرلیتا ہے[1]۔ بشیر نے کئی مزاحیہ کہانیاں لکھی ہیں جن میں ایک داستان گو، متمال مورخ بن کر ایسی داستانیں سناتا ہے جن میں دیہاتیوں اور مضافات میں رہنے والے کرداروں کو مضحکہ خیز انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک کہانی ایتوکلی مونجا۔ر (ETTU KALI MANNOONJA) ہے جس کا ہیرو گاؤں کی ہر عورت کے حمل کو اپنا عمل بیان کرتا ہے۔ اس کی ایک اور کہانی جواری کی بیٹی (NUCHERTHU KATIKARANTE MAKAL) بھی بڑی دلچسپ دیہی کہانی ہے جو بہت ہی جوشیلے انداز میں لکھی گئی ہے۔ محمد بشیر کی مشہور ناول "NTUPPAPPAKORANENORARUMAN" میں بھی ظرافت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

پی سی کٹّی کرشن (تخلص نام اُروب 1905) این۔ڈی۔ محمد، دی۔کے۔ این کہانی لکھنے والوں میں قابلِ ذکر لوگ ہیں جنہوں نے ظرافت کے اچھے نمونے پیش کئے ہیں۔

ملیالی شاعری میں مزاح کے عناصر جلوہ گر ہیں خاص طور پر آزادی کے بعد جب رومانی شاعری کا جادو ٹوٹا تو شاعری کے نئے روپ سامنے آئے اور ان میں سے ایک مزاح گوئی بھی ہے۔ ۱۹۵۰ء کے بعد کے آنے والے شاعروں میں ایداسری گووندن نائر، وی گووندن اور این وی کرشنا نے اپنی شاعری میں طنز اور ظرافت کی خاص طور پر جگہ دی تاکہ گیتوں کی شاعری اور تخیلاتی طرز فکر سے ہٹ کر شاعری میں نئی راہ پیدا ہو۔ پچھلے چند سالوں میں ایپا پانی کر کی سارتی نظموں اور چیتنم (CHETHNAM) کی مضحک شاعری نے یہ ثابت کردیا کہ شاعری میں طنز اور ظرافت کو بھی عوامل کی حیثیت حاصل ہے۔

طربیہ تمثیلوں میں مزاح اور سماجی طنز لازمی طور پر جگہ پاتے رہے ہیں۔ این پی چیلیم نائر۔ جگّٹی این کے اجاری۔

---

[1] غالباً جنوبی ریاستوں میں شادی بیاہ کے معاملات میں کچھ تحفے کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں اور لڑکے والوں کی طرف سے پیش کئے ہوئے کیلے قبول کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لڑکی والوں [illegible] منظور کرلیا۔ یہ بات بطور تیاں پیش کی جارہی ہے۔ (مترجم)

www.taemeernews.com

این این پلّے اور کے ایس کرشنن کے طربیوں میں یہ عناصر وافر مقدار میں ہیں۔

موجودہ دور کے تمثیل نگاروں میں تھکوڈیان، جی سنکرا پلّے۔ کے لی محمد اور نارائنا پانی کر نے اچھے طربیے اور سوانگ لکھے ہیں۔ ان تمثیلوں میں سیاسی طنز جگہ جگہ موجود ہے۔

پچھلے ۲۵ برسوں میں خاص طور پر انشائیہ نگاری (LIGHT ESSAYS) کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ اس میدان میں ایم۔ این۔ گووندن کئی سال سے قدم جمائے ہوئے اور ای وی کرشنا پلّے اور ای۔ ایم۔ کاوور کی روایت کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

پی کے راجادر مابھی معروف مزاحیہ خاکہ نگار ہیں۔ ویلور کرشنن کٹّی، پی سلوائل پلّے۔ سوکمار، کے ایس کرشنن اور آنند کرشنن نے ظرافت کے میدان میں شہرت حاصل کی ہے۔ پی۔ اُدیا بھانو نے بڑی توجہ اور دل جمعی کے ساتھ انشائیے لکھے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

حال حال میں منی کہانیوں کا رواج چل پڑا ہے اور کئی کہانی کار اس وضع کو اختیار کر چکے ہیں۔ یادہ گوئی اور خلاصہ گوئی جھوٹ، ان کہانیوں کے خاص اجزاء ہیں۔ آئیا پانی کر کی مہاراجہ کہانیاں، وی۔ پی سیوا کمار کی منی کہانیاں، اور وی۔ وجین کی تمثیل نظموں اور وی کے۔ این کے سوانگ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ملیالم میں ادبی ظرافت حب روایت قدیم پھل پھول رہی ہے۔ ملیالیوں کے مزاج ہی میں ظرافت ہے۔ نمبیار، براہمن اور موپلا خاندانوں میں ظرافت ان کے خمیر کا ایک جزو ہے۔ اور انگلی ظرافت سے وہ خود بھی محفوظ نہیں ہیں۔

ملیالم میں ظرافت کو سیاسی بازی گروں کے خلاف ایک سپر اور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ظرافت کے بغیر زندگی اور ادب دونوں بے رس اور مُردہ محسوس ہوں گے۔ اس لئے ہم بڑی حد تک اپنے مزاح نگاروں کے احسان مند ہیں جنھوں نے نہ صرف قدیم روایت کو برقرار رکھا ہے بلکہ اپنی تحریروں کے ذریعے ہماری سماجی زندگی کو نہایت خوش اسلوبی اور کامیابی کے ساتھ سرسبز اور شاداب بنایا ہے۔

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ عورتوں میں مزاح نگار بہت کم ہیں اور وہ بھی کیرالا جیسے علاقے میں۔ ☆

تھانیہ اسکول کے ایک مدرس کو پان کھانے اور مزاحیہ ادب پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ ان کا معمول یہ تھا کہ وہ کلاس میں آتے اور لڑکوں کو لمبا چوڑا سبق کاپی میں نقل کرنے کا حکم صادر فرماتے۔ یہ روز کا عمل تھا۔ جماعت کا رجسٹر نکال کر اس میں کتاب کو چھپاتے، پان کھاتے اور ہمہ تن مشغول ہو کر پڑھنے لگتے۔ اگر اچانک ہیڈ ماسٹر کلاس میں آن دھمکے تو انہوں نے پہلے ہی سے ترکیب سوچ رکھی تھی۔ میز کی دراز کھول کر اس میں کتاب رکھ دی جاتی اور کھڑکی سے باہر پچکاری مار کر بچوں سے مخاطب ہوجاتے۔

ایک دن ماسٹر کے گال تھوک سے پھولے ہوئے تھے۔ اور کتاب کے پڑھنے میں غرق تھے اسی وقت ہیڈ ماسٹر بغیر نوٹس کے آن پڑے۔ ماسٹر صاحب نے میز کی دراز کھولی اس میں پچکاری ماری اور کھڑکی کے پاس جاکر کتاب باہر پھینک دی!!

www.taemeernews.com

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد
(پٹنہ)

میتھلی ادب میں
طنز و مزاح

صوبۂ بہار میں "متھلانچل" ایک ایسا مردم خیز علاقہ ہے، جس کی خاک سے تاریخ ساز حکمراں اور عالم پیدا ہوئے ہیں۔ شری چندرا جھا نے پرانوں کی بنیاد پر متھلانچل کی سرحدیں متعین کرتے ہوئے بتایا تھا کہ متھلا وہی علاقہ ہے جس کے پورب میں کوسی اور پچھم میں گنڈک، دکھن میں گنگا اور اتر میں کوہ ہمالہ ہے۔ ڈاکٹر جے کانت مشرا نے متھلا کا رقبہ چھیانوے کوس (تقریباً ۱۹۲ میل) لمبا اور ۶۴ کوس چوڑا مانا ہے۔ جدید ترین تحقیق نگاروں کے مطابق بھاگلپور وغیرہ بھی متھلانچل کا ہی حصہ ہیں۔ حقیقت جو بھی ہو، مگر تاریخ کے ہر دور میں متھلانچل کو ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ اس کے پنڈتوں اور ماہرین نجوم نے آسمان کے وسیع کینوس پر روشن نقطوں کی طرح چمکتے ہوئے ستاروں اور سیاروں کی نقل و حرکت کا حساب کتاب لگایا اور بڑی اہم پیشن گوئیاں کیں، جن کی بنیاد پر جنگیں لڑی گئیں اور انسانی خون بھی بہایا گیا۔ مگر خود "متھلانچل" کے بارے میں یہ تاریخی حقیقت کم دلچسپ نہیں ہے کہ یہ ہمیشہ Land of Peace رہا ہے۔ یہاں کے رہنے والوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر لڑائیوں میں حصہ تو لیا ہے لیکن اس سرزمین نے خود کبھی جنگ کا ذائقہ نہیں چکھا۔ یہ علاقہ بنیادی طور پر نجومیوں، پنڈتوں، سادھوؤں اور رشی منیوں کا وطن رہا ہے۔ اور اس صورت حال کا نتیجہ ادبی سطح پر "دیرگا تھا کال" کی عدم موجودگی کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ اکثر و بیشتر پُرامن رہنے کے سبب یہاں وہ معاشی بدحالیاں اور سماجی ناہمواریاں بھی جڑ نہیں پکڑ سکیں جن پر اعلیٰ طنز کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ قدیم متھلا معاشرے میں ایک عرصے تک مذہب ہی ساری سماجی و سیاسی سرگرمیوں کا مرکز و محور رہا اور مذہب پر طنز کی گنجائش کس قدر کم ہے وہ معلوم ہے۔ اس لئے میتھلی ادب کے ابتدائی سرمائے میں مزاح کی مثالیں تو ملتی ہیں مگر طنز کا رنگ و روپ ابھرتا نہیں دکھائی دیتا۔ نہیں کہیں اپنے عہد کے سماجی رسوم و رواج کا مذاق بھی اڑایا گیا ہے مگر یہ عمومی رنگ نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ متھلا کی مخصوص تہذیبی روایتیں اور سماجی قدریں دوسری ملکی و غیر ملکی قدروں سے متصادم ہوئیں اور اس ٹکراؤ کے سبب بے شمار معاشرتی مسائل پیدا

www.taemeernews.com

ہوئے۔ جدید تیلگو ادب میں اس صورتِ حال کی پر لطف منظر کشی ملتی ہے۔ دورِ حاضر کے قومی مسائل سے بھی تیلگو کے نئے ادیبوں نے چشم پوشی نہیں کی ہے بلکہ آزادی کے فوراً پہلے اور بعد کا ہندوستانی سماج اپنی ساری شہہ زوریوں اور کمزوریوں سمیت نشیب و فراز کے ساتھ ان کے طنز کا نشانہ بنا ہے۔ البتہ یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ بیسویں صدی کے چند قلمکاروں کو چھوڑ کر تیلگو کے کسی بھی ادیب نے خاص طور پر طنز و مزاح کو بطور فن اختیار نہیں کیا ہے۔ اس لئے یہاں ظرافت مختلف اصناف ادب کی رگوں میں خون بن کر تو دوڑی ہے مگر اس کا اپنا کوئی جسم یا شکل و صورت نہیں ہے۔

تیلگو ادب میں طنز و مزاح کی ابتداء جیوتر لیشور سے ہوتی ہے۔ اس سے پہلے نحشیات کے کچھ نمونے ملتے ہیں لیکن ان میں متقلا کے حسن پرست اور عیش کوش معاشرے کی ایسی تصویریں ہیں جنھیں کسی بھی طرح ادب کے زمرے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ جیوتر لیشور بارہویں صدی کا شاعر اور نثر نگار ہے جس کا ناٹک "وھرت ساگم" کافی مشہور ہے۔ ایک ڈانسر کے لئے دو بدمعاشوں میں جھگڑا ہوتا ہے۔ جو منصف اس جھگڑے کا فیصلہ کرنے والا ہے وہ لڑکی کو اپنے پہلو میں بیٹھا لیتا ہے۔ پھر فریقین کی باتیں سننے کے بعد یہ فیصلہ کرتا ہے کہ لڑکی ان دونوں میں سے کسی کی نہیں بلکہ جس کے پہلو میں ہے، اسی کی ہے۔ اس "بندر بانٹ" قسم کے فیصلے میں جو طنز پوشیدہ ہے اس کی شدت کئی صدیاں گزر جانے کے باوجود محسوس کی جاسکتی ہے۔ آج کے مہذب سماج میں بھی یہی ہو رہا ہے اور شاید آئندہ بھی ہوتا رہے۔ جیوتر لیشور کے اس ناٹک میں جس کے گیت تیلگو زبان میں اور نثری حصہ سنسکرت آمیز تیلگو میں ہے، عام انسانی زندگی کی ایسی ہی بہت ساری ناہمواریوں پر طنز کیا گیا ہے۔ اس مصنف کی نثری تصنیف "ورن رتناکر" (VARNA RATNAKAR) گرچہ کوئی اعلیٰ تخلیقی کارنامہ نہیں اور اس میں مزاح کی مثالیں زیادہ ہیں مگر اس زمانے کے عقائد اور رسوم و رواج پر طنز کے بھی کچھ نمونے ملتے ہیں۔ راج دربار میں رہنے والوں کی عجیب و غریب حرکات و سکنات اور وضع قطع، راجاؤں اور مہارانیوں کو خوش کرنے والے مسخروں اور جوکروں کی حرکتیں اور ادائیں یہاں مزہ لے لے کر بیان کی گئی ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کے رشتے طے کرانے والی کٹنی کا بیان نہ صرف بے حد دلچسپ ہے بلکہ اس زمانے کے نظام زندگی پر ایک طنز بھی ہے۔ یہاں مزاح کے زیادہ تر رنگ سراپا نگاری کے پیکر میں ابھرتے ہیں لیکن مجموعی طور پر اس کتاب کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ:

It is not a Creative Writing but it is a dictionary of poetic diction.

گویا طنز اس زمانے میں کیسا تھا، یہ تو پتہ چلتا ہے مگر اس زمانے پر طنز بہت کم ہے۔

جیوتر لیشور کے بعد جو اہم ترین شخصیت ہمیں نظر آتی ہے وہ مشہور شاعر دیاپتی کی ہے۔ اس عظیم شاعر نے نثر میں جو کچھ لکھا ہے وہ سنسکرت زبان میں ہونے کے سبب فی الحال خارج از بحث ہے۔ لیکن اس کی شاعری

www.taemeernews.com

میں مزاح کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ جہاں تک طنز کا سوال ہے وہ تو گہرے سماجی شعور (SOCIAL CONSCIOUSNESS) سے ہی پیدا ہوتا ہے جو اس عہد میں تقریباً ناممکن تھا۔ اس لئے ودیاپتی کے یہاں بھی مزاح کے مقابلے میں طنز کی مثالیں کمیاب ہیں۔ البتہ نچاری (NACHARI) یعنی شیو اور پاروتی کی بات چیت شیو کی سراپا نگاری یا اُن کی مختلف شکلوں اور عادتوں کے بیان میں بھرپور مزاح کی چاشنی موجود ہے۔

بھگوان شیو اور پاروتی کا قصہ اپنے مذہبی تقدس کے باوجود اتنا پُر مذاق ہے کہ اسے پڑھتے ہی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی ہے۔ مگر سولہویں صدی کے کرشن داس نے کچھ زیادہ ہی جرأت کے ساتھ اس قصے کو مزاح کی بنیاد بنایا ہے۔ شیو جی پاروتی کو بیاہ کر لے جانے کے لئے آرہے ہیں۔ پاروتی کی ایک سکھی جو بارات دیکھنے گئی تھی، وہ لوٹ کر سکھیوں کو تیاری ہے کہ دولہا کیسا ہے یہ دلچسپ بیان ملاحظہ ہو[1]

دردیکھہ سکھی آئی، ہیمت جگت جیہی لئے لاہ جمائی
پانچ دردن سر جٹا ایک ہیں سوہے للاٹا سسی پھوٹا
دیپرت لوچن تینی تاہم اک برلے اگنی
بیس برکھ لاکھ چاری، بارہی موری بھوری گوری کماری

(ترجمہ:۔ سکھی دولہا دیکھ کر آئی اور کہہ رہی ہے کہ یہ کیسا داماد ہے! ان لوگوں نے لایا ہے جس کے پانچ چہرے ہیں[2] سر پر جٹائیں ہیں اور ایک سر کے اوپر ٹوٹا ہوا چاند نظر آتا ہے[3] تین آنکھیں ہیں اور تینوں الٹی اور اس میں سے بھی ایک آنکھ سے آگ نکلتی رہتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی عمر چار لاکھ برس ہے جب کہ ہماری بیٹا بڑی بھولی اور کم عمر ہے) اس خالص مذہبی قصے کو عام انسانی زندگی کی ایک تلخ حقیقت یعنی بے جوڑ شادی سے مربوط کرتے ہوئے کرشن داس یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اس بے چاری کے سر پہ جو بوڑھا پتی لاد دیا گیا ہے تو یہ کیسے نبھا ہے گی۔ انہوں نے اور بھی نظموں میں گفتگو اور سراپا نگاری کے دوران مزاح کا رنگ پیدا کیا ہے لیکن ان کی کوئی باضابطہ تصنیف نہیں ہے کچھ منتشر چیزیں ہی ان کی یادگار ہیں۔

کرشن داس کے بعد میتھلی میں کئی قد آور ادبی شخصیتیں ابھرتی ہیں۔ اگرچہ ستر ہویں اور اٹھارہویں صدی میں متعدد اہل کے لوگ بھی زیادہ تر برج بھاشا میں ہی لکھنے لگے تھے پھر بھی گوبند داس اور راجہ مہیں ناتھ ٹھاکر (سولہویں اور سترہویں صدی) اگنی پرشاد سنگھ، اچل، انیرودھ اور کنپتی (اٹھارہویں صدی) نے میتھلی ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ لیکن ان کی کاوشیں مذہبی اور بھکتی کا دیہ تک محدود ہیں۔ طنز و مزاح کی مثالیں ان کے یہاں ناپید ہیں۔ اس کا خاص سبب مذہب سے قربت اور SOCIAL CONSCIOUSNESS کی عدم موجودگی کے علاوہ یہ بھی ہے کہ طنز و مزاح اس عہد کے مصنفین کا مقصود ہرگز نہیں تھا۔ وہ اپنی تحریروں میں گلکاری کے لئے ایک معنی شیئے

---

[1] میتھلی گیت رتناولی پر مبنی ص ۱۲۳-۱۲۴۔ [2] شیو جی کو پنچ مکھ کہا جاتا ہے۔ [3] شیو کے ماتھے پر ایک نشان ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

کی حیثیت سے طنز و مزاح کا استعمال تو ضرور کرتے تھے مگر اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ ویسے بھی اس زمانے میں طنز کسی انقلاب یا سماجی تبدیلی کا ذریعہ نہیں تھا۔ بلکہ جس طرح آج تبدیلی کا عمل سیاست کا رہین منت ہے، اسی طرح دورِ وسطیٰ میں مذہب کا محتاج تھا۔ ایک ہندی زبان کو لیجئے۔ نانک، کبیر اور دوسرے لوگوں نے سماجی اور سیاسی پہلوؤں پر بھی طنز کئے۔ مثلاً ؎

نانک راجے سینگ مکدم کتے

(راجہ عوام کی بوٹیاں نوچ کر کھا رہا ہے اور بچا کھچا مال اس کے مصاحب کتوں کی طرح کھا رہے ہیں) یا ؎

پاون پوجن ہری ملے تو میں پوجوں پہاڑ
یا تے تو چکی بھلی پیس کھائے سنسار

یہاں طنز سے Contradictions کو ابھارنے کا کام لیا گیا ہے اور بلاشبہ یہ طنز کے اچھے نمونے ہیں اس طرح کی مثالیں دوسرے ہندی شاعروں کے یہاں بھی نہیں ملتی ہیں کیوں کہ یہ ان کی منزل اور مقصد نہیں بلکہ تفریح ہے۔

بات طویل ہوگئی ورنہ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ سترہویں تا انیسویں صدی کے متقبلی ادیبوں کے یہاں طنز کی کوئی واضح صورت نہیں ملتی اور مزاح کے رنگ بھی بہت پھیکے ہیں۔ متقبلی لوک گیتوں کی شکل میں جو سرمایہ ہمارے علم میں ہے، اس میں بھی مزاح صرف وہیں ہے جہاں بھانگ اور دھتورے کے استعمال کو لے کر شیو اور پاروتی میں نوک جھونک ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بامقصد اور اصلاحی مزاح نہیں۔ اسی طرح بعض ڈراموں میں پیرو یا مسخرے کا عجیب و غریب لباس، غیر معمولی حرکات یا پُر مذاق گفتگو سے بھی کچھ دیر کے لئے سامعین حسِ مزاح کی تسکین کا سامان ہوتا ہے مگر یہ طنز و مزاح کی ایسی صورتیں نہیں جن کا بطور خاص ذکر کیا جائے۔

متقبلی ادب میں طنز و مزاح کا باضابطہ آغاز بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں ہوا ہے۔ سماجی، سیاسی اور تہذیبی سطح پر رونما ہونے والی نت نئی تبدیلیوں کے جلو میں طنز و مزاح کا جو قافلہ روانہ ہوتا ہے اس میں پروفیسر ہری موہن جھا سالار کارواں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یاتری جی (ہندی کے ناگ ارجن) نے بھی تقریباً اسی زمانے میں لکھنا شروع کیا۔ یہ دوسری بات ہے کہ پروفیسر جھا نے نثر نگاری اور یاتری جی نے شاعری پر زیادہ توجہ دی مگر بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے سماج کے تضادات اور ناہمواریوں کو دونوں ہی نے اپنا موضوع بنایا۔ ہری موہن جھا کا پہلا ناول "کنیادان" ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ظرافت کا سمندر اپنے دامن میں چھپائے ان کی کتابیں دُرگمن (Durgaman)، پرنمیہ دیوتا (Parnamya Devta) رنگ شالا، کھڑکی کاک ترنگ (Khakha Kakak Tarang)، چرچری اور ایکادشی، یکے بعد دیگرے منظر عام پر آئیں۔ ان کتابوں کی دنیا خیالی نہیں حقیقی ہے۔ یہاں مبالغے کی کارفرمائی نہیں بلکہ حقیقی زندگی

www.taemeernews.com

کے وہ تجربات جو مصنف کے حصے میں آئے ہیں، اس کی تحریروں کا جزو بن گئے ہیں۔ عہد حاضر کے متمدن سماج کے نقائص خامیاں اور ناہمواریاں، زندگی کے داخلی تضادات، عدم مساوات، تنگ نظری، ہٹ دھرمی، ڈھونگ، جھوٹی شان و شوکت، خود نمائی، خود غرضی اور توہمات وغیرہ ان کی نثری تحریروں کے خاص موضوعات ہیں۔ یہاں ایک ایسے سماج کی تصویر کشی کی گئی ہے جو روایت کی زنجیروں میں بُری طرح جکڑا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ جب مہاراجہ دربھنگہ شری کامیشور سنگھ یورپ سے پڑھ کر واپس آئے تو ان کا بھی سماجی بائیکاٹ ہوا۔ پروفیسر بھارتی جہالت اور مکر کا فقیر بنے رہنے کے خلاف ہیں۔ ظاہری دکھاوے، بناوٹ اور شیخی کے خلاف بھی ان کے یہاں ایک تیز قسم کا ردِ عمل طنز کی شکل میں ملتا ہے۔ گاؤں کی مصوم فضاء میں سانس لینے والے انسانوں کے جذبات و احساسات کو اُنہوں نے ایک ماہر نفسیات کی طرح دیکھا اور پرکھا ہے۔

"کنیا دان" میں بے جوڑ شادی کا مسئلہ اٹھایا گیا ہے۔ متمدن سماج میں مروج بے ربط شادیوں کو ناول نگار نے اپنی طرافت کی بنیاد بنایا ہے۔ یہاں شوہر اور بیوی کا اختلاف ان کی عمر یا رنگ روپ کے سبب نہیں بلکہ ان کی تعلیم و تربیت کے انداز اور ذہنی تفاوت کے سبب ہے۔ ایک ایم۔ اے۔ پاس لڑکے کی شادی ایسی لڑکی سے ہو جاتی ہے جو اے۔ بی۔ سی بھی نہیں جانتی۔ نائلہ کا ہیرو سی۔ سی۔ بشرا جدید مغربی تہذیب کا پروردہ ہے جب کہ ہیرو ئین بچی دائے قدیم متمدن تہذیب کی نمائندہ ہے۔ ان دونوں کی یکجائی سے جو پُر لطف واقعات پیش آئے ہوں گے ان کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر بھالے ان حالات کی فنکارانہ پیش کش سے ایک طرف تو طنز و مزاح سے بھرپور ماحول تخلیق کر کے ہماری تفریح کا سامان فراہم کیا ہے اور دوسری طرف اس Social Structure پر طنز بھی کیا ہے جو اس طرح کے حالات پیدا کرتا ہے۔ مثال کے لئے صرف ایک پُر لطف بات چیت ملاحظہ ہو۔ شادی کے موقع پر لڑکے سے اس کا نام پوچھنے پر وہ جواب دیتا ہے:

"ہمرا نام چھے سی۔ سی بشرا" —

اس جواب کو سُن کر متمدن کی غیر تعلیم یافتہ عورتیں جو انگریزی حرف "ج" نہیں جانتی ہیں بے ساختہ ہنس پڑتی ہیں کیوں کہ وہ سی سی۔ کو "شیشی" سمجھتی ہیں۔ ایک لڑکی جو جہالت کی چہار دیواری میں قید ہونے کے باوجود خود کو سب سے قابل سمجھتی ہے، طنز بھی کرتی ہے!

"تکھنی تاں بوتل مشرا نگ باپ ہوئتھن"۔

(تب تو بوتل مشران کے باپ ہونگے)؟

"دراگمن" گویا کنیا دان کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں بعض کردار نئے ضرور ہیں مگر کنیا دان کا ہی قصہ یہاں آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔ شادی کے بعد رخصتی کا مسئلہ اس میں پیش کیا گیا ہے۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہیرو سی۔ سی بشرا جب انگوٹھا چھاپ ہیرو ئین "بچی دائے" کی رخصتی پر راضی نہیں ہوتا تو ہیرو ئین کا باپ لال کنکا اسے پڑھانے کے لئے ایک انگریز

www.taemeernews.com

استانی "میم صاحب" کو رکھتا ہے۔ لال کنکا بھتیجا اور بچی دلئے کا چچیرا بھائی جھارکنڈی ناتھ استانی کی دیکھ بھال پر مامور کیا جاتا ہے۔ مگر وہ بھی جاہل مطلق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں کے نمایاں ذہنی تفاوت سے ہر لمحہ ایک مضحکہ خیز صورت حال پیدا ہوتی ہے۔ صرف ایک مثال دیکھئے۔ جب جھارکنڈی لال انگریز استانی کا استقبال کرتا ہے تو وہ اس سے پوچھتی ہیں،

"باتھ کدھر ہے؟"

استانی کی مراد باتھ روم سے ہے مگر جھارکنڈی اسے باتھ نام کا گاؤں سمجھتا ہے اور سر سہلاتے ہوئے کہتا ہے:

—"باتھ ایتم سا نا بہت دور ہے۔ کوس چھو بیک سات ایک سے کم نہیں پڑے گا۔ باتھ میں آپ کا کے رہتا ہے؟"

سچ تو یہ ہے کہ جھارکنڈی کی شکل میں پروفیسر قمبا نے ایک مکمل مزاحیہ کردار ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کے کھانے پینے، چلنے پھرنے اور بات چیت سبھی میں ایک ہلکا سا مزاح ملتا ہے۔ گرچہ اس کے جملے کہیں کہیں فحش بھی ہو جاتے ہیں مگر متھلا معاشرے کے مخصوص پس منظر میں زیادہ برے نہیں لگتے۔

ان دونوں کتابوں کے علاوہ رنگ شالا، کھڑکا کاک ترنگ اور ایکادشی میں بھی طنز و مزاح کے گہرے رنگ موجود ہیں لیکن مجموعی طور پر ان کتابوں میں متھلا کی مخصوص تہذیب اور اس کے مسائل ہی زیر بحث آئے ہیں۔ قومی سطح کے مسائل کا عرفان یہاں نہیں ملتا یہاں بے جوڑ شادی کے موضوع پر لکھے گئے ایک اور ناول "توتریا" کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یاتری جی کا یہ ناول اپنے موضوع کو زیادہ شدت سے پیش کرنے کے باوجود طنز و مزاح کا ایک وسیع سمندر اپنے اندر رکھتا ہے۔ دراصل "بے میل شادی" آزادی سے قبل کے متھلا سماج کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اکثر نوجوان باہر کے شہروں اور ملکوں میں جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے تھے مگر کچھ تو متھلا کی کنواریوں کے بے پناہ حسن اور کچھ رسم و رواج کی بندشوں کے سبب وہ شادی کے لئے واپس متھلا آتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہاں عورتوں کی تعلیم پر پابندی عائد تھی اس لئے اُن لڑکوں کو اپنے ذہنی معیار کے مطابق لڑکیاں نہیں مل پاتی تھیں اور ایک عجیب و غریب صورت حال پیدا ہو جاتی تھی۔ متھلی کے نثر نگاروں نے جن میں ہری موہن جھا اور بدیہ ناتھ مشر یاتری کے علاوہ کئی افسانوی مجموعوں کے مصنف چھاترا نند سنگھ جھا بھی شامل ہیں اس موضوع پر بطور خاص توجہ دی ہے۔ ان لوگوں نے مختلف نثری اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے اپنی تحریروں کو ظرافت کے رنگوں سے دیدہ زیب بنایا ہے۔

متھلی شاعری میں طنز و مزاح کا رنگ روپ نثر نگاری سے کچھ زیادہ ہی نکھرا ہوا ہے۔ شاعروں نے روایتی موضوعات اور متھلانچل کے مخصوص مسائل کے علاوہ عہد حاضر کی تبدیلیوں اور ان کے اسباب و عوامل کو بھی موضوع سخن بنایا ہے۔ دور حاضر میں شاعر اعظم چندا جھا اور لال داس کے نام اس باب میں عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی کتابیں "متھلا بھاشا رامائن" اور "راشٹر بھرشٹ متھلی رامائن" جن میں مذہبی واقعات سے مزاح پیدا کرنے کی کامیاب کوشش ملتی ہیں، اب بھی متھلی میں خاصی مقبول ہیں۔

www.taemeernews.com

مجموعی طور پر مقبلی کے شاعروں نے دورِ حاضر کے اہم قومی مسائل کے تئیں اپنی مکمل بیداری کا ثبوت دیا ہے۔ یہاں مقبلی شاعری کا دائرہ محدود نہیں وسیع ہے اور شاعروں نے جدید تر معاشرتی تبدیلیوں سے آنکھیں نہیں چرائی بلکہ ان کا بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا ہے۔ اُنہوں نے خاص طرز کی تخلیقات بھی پیش کی ہیں اور سنجیدہ تخلیقات کے پیراہن میں بھی ظرافت کے گل بوٹے ٹانکے ہیں۔ اس کے برعکس مقبلی کے کہانی کار اور ناول نگار مذہبی رسوم و رواج اور شادی سے متعلق مسائل سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ حالانکہ پچھلے کچھ برسوں سے ایسے حقیقت نگار بھی مقبلی نثر نگاری کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں جو طنز و ظرافت کی سرحدیں عصرِ حاضر کے جدید ترین مسائل تک وسیع کرنا چاہتے ہیں۔ ناٹک اور ایکانکی میں سنسکرت ناٹکوں میں ملنے والی جوکر کی روایت دہرانے کے علاوہ سماجی ناہمواریوں کی پیش کش پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ بحر مقبلی نثر میں طنز و مزاح ابھی بھی ایک طفل شیر خوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مقبلی شاعری میں البتہ طنز و مزاح کی بلوغت کے آثار نمایاں ہونے لگے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب تک طنز و مزاح کی روایت مقبلی نثر کی بہ نسبت مقبلی شاعری میں زیادہ توانا جاندار اور متنوع رہی ہے۔

تعارف

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (صدر شعبۂ اردو، بی۔این۔کالج (پٹنہ یونیورسٹی) پٹنہ ۴)

نام، اعجاز علی ارشد ۔ والد کا نام، (پروفیسر) محمد علی خاں۔ تاریخ پیدائش۔ یکم جنوری ۱۹۵۴ء
موجودہ ملازمت، صدر شعبۂ اردو بی۔این۔کالج (پٹنہ یونیورسٹی) پٹنہ۔ ۴۔

رہائشی (مستقل) پتہ:۔ فلاور کالج۔ باغ پاتو۔ دیوان محلہ۔ پٹنہ۔ ۸

تعلیمی صلاحیت :۔ بی۔ اے۔ آنرس ۱۹۷۱ء، ایم۔ اے اردو ۱۹۷۳ء، ایم۔ اے۔ فارسی ۱۹۷۵ء فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن
بی۔ ایڈ ۱۹۷۴ء فرسٹ کلاس، پی۔ ایچ۔ ڈی ۱۹۸۱ء موضوع :۔ نذیر احمد بحیثیت ناول نگار۔

تصنیفات و تالیفات :۔ ۱۔ توتیہ النصوح۔ ایک تلخیص ایک تجزیہ۔ (تنقید)۔ ۱۹۷۵ء۔
۲۔ نشاطِ غم (مجموعۂ کلام نازؔ عظیم آبادی) مع مقدمہ و ترتیب ۱۹۷۷ء
۳۔ حرفِ تمنا (ترتیب) ۱۹۷۹ء ۴۔ بہار میں اردو تنقید (تنقید) ۱۹۸۱ء
۵۔ انشائیے (تنقید و تبصرہ) ۱۹۸۱ء ۶۔ مثنوی، مراثی، قصائد (تنقید و تبصرہ) ۱۹۸۱ء
۷۔ ہمارا سنسار (ترجمہ) ۱۹۸۱ء ۸۔ بال جبرئیل، ایک مطالعہ (تنقید) ۱۹۸۲ء
۹۔ کرسی اور کرنسی (طنز و ظرافت) ۱۹۸۲ء

www.taemeernews.com

دیے دیش ٹھاکر
خالد اگاسکر

ہندی نثر میں طنز نگاری

ڈاکٹر دیے دیش ٹھاکر

جنم ــــ ۲۲ر جولائی ۱۹۳۲ء پٹھانی الموڑا، اتر پردیش
ملازمت : ۱۹۵۶ء سے ۱۹۵۹ء تک سڈنیم کالج بمبئی۔ نومبر ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۰ء جون تک ڈھرمیندر سنیہہ جی کالج راج کوٹ۔ جون ۱۹۶۰ء سے رام نارائن رویا کالج بمبئی صدر شعبۂ ہندی۔

بمبئی یونیورسٹی میں پی ایچ۔ڈی کے طلبا کے گائیڈ

تعلیم بی اے ۱۹۵۵ء آگرہ یونیورسٹی۔
پی ایچ ڈی ۱۹۶۱ء ساگر یونیورسٹی۔ ڈی لٹ ۱۹۷۱ء ساگر یونیورسٹی۔

تصانیف : ۱۔ نیرکا ۲۔ استر چھایا تحقیق و تنقید کے ناری چرتر ۴۔ آدھونک ہندی ساہتیہ کی مانیتا وادی بھر سیکائیں ۵۔ ہندی کی پہلی کہانی تنقید: نئی کویتا کے سات آدھیہ ۷۔ ندی کے دیپ کی رچنا پرکرتا۔ ۸۔ ہندی کہانی کا بدلتا سوروپ ۹۔ ساہتیہ کے نئے فاول ۱۰۔ پرم بھنگ ۱۱۔ پریہ شبھم ۱۲۔ کاپی گھر پچھوڑ کا ادبی ساہتیہ : ناول ۱۳۔ دو سہیلیاں (کہانیاں) ۱۵۔ کالج نبندھ اور رچنا ۱۶۔ ہندی نبندھ پردیپ ۱۷۔ داہیا داروی تھکا

پچھلی تین چار دہائیوں میں طنز نگاری نے ہندی ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ جدید ہندی ادب میں مزاح تو موجود تھا البتہ طنز کا وہ روپ نہیں تھا جسے آج ہم اہمیت دیتے ہیں۔ یوں تو طنز کی روایت کافی پرانی ہے ویدوں کے علاوہ ناٹیہ شاشتر بدھ ساہتیہ، تلسی، سورداس کے دور سے لے کر ریتی کال میں بھی طنز نگاری کی روایت چلتی ہے کبیر کے یہاں طنز کی بہترین مثالیں،

لہ ہندی ادب کو چار ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(۱) ویر گاتھا کال ــــ ۹۳۳ء سے ۱۳۱۸ء تک۔ اس دور میں رزمیہ شاعری کی گئی ہے اور راجاؤں مہاراجاؤں اور حکمرانوں کی شجاعت کے قصے بیان کیے گئے ہیں۔

(۲) بھکتی کال ــــ ۱۳۱۸ء سے ۱۷۰۰ء تک تصوفانہ شاعری کا دور

(۳) ریتی کال ــــ ۱۷۰۰ء سے ــــ ۱۸۰۰ء تک، حسن اور عشق کے ساتھ ساتھ عورتوں کی جسمانی خصوصیات پر مشتمل شاعری

(۴) آدھونک کال ۱۸۰۰ء سے .....

(سفحہ ۔ الف)

www.taemeernews.com

مثالیں ملتی ہیں۔ ہرشنکر پرساد ترویدی نے کبیر کا براہ راست حملہ کرنے کا انداز، بغیر کہے ہی سب کچھ کہنے والا طرز اور بالکل سادہ لیکن بے انتہا کاٹ دار لہجے ہی کی بنا پر کبیر کو اپنے دور کا سب سے بڑا صنعت شاعر تسلیم کیا ہے۔

دورِ جدید کے آغاز میں بھی صنف طنز (اگر اسے صنف کہا جائے) نظر انداز نہیں کی گئی ہے۔ بھارتیندو اور ان کی ٹیم نے بڑی ایمانداری کے ساتھ اپنی تخلیق میں طنز کو برتا ہے اور اس کے ذریعے ظلم و زیادتیوں، کمزوریوں اور چاروں طرف پھیلی ہوئی ناانصافیوں کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ درمیانی وقفے میں طنز نگاری کی رفتار دھیمی ہوگئی تھی لیکن آزادی کے بعد پھر تیزی سے ترقی ہوئی ہے۔ اور آج کل ادب کی ساری اصناف میں چاہے وہ کہانی ہو، ناول، ڈرامہ ہو یا شاعری ـــــ ہر صنف میں ایک تیکھاپن اور طنزیہ انداز صاف دکھائی دیتا ہے۔

یہی اور سیدھی بات یہ ہے کہ طنز دورِ جدید کی دین ہے، طنز کمزوریوں، عیبوں، ناانصافیوں، تصنع، بناوٹ ریاکاری اور جھوٹ کے درمیان پنپتا ہے۔ جس سماج میں جتنے نقصان دہ عناصر ہوں گے اس سماج کی نمائندگی کرنے والے ادب میں طنز کا دارا اتنا ہی گہرا، تیکھا، کاٹ دار اور موثر ہوگا۔ ہری شنکر پرساد طنز نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں ـــــ "طنز نہ صرف زندگی کی ترجمانی کرتا ہے بلکہ زندگی کی تنقید بھی کرتا ہے۔ کمزوریوں عیبوں اور برائیوں کا پردہ فاش کرتا ہے۔ طنز نگار زندگی کے ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ زندگی بڑی بے وفا ہے۔ اس میں صرف خوشیاں اور صرف دکھ ہی نہیں ہیں۔ اچھا طنز ہمدردی کا سب سے اچھا نمونہ ہوتا ہے۔" غلام احمد فرقت نے بھی اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا ہے۔ طنز کا مقصد سماج یا سوسائٹی میں پھیلی ہوئی برائیوں، کمزوریوں اور عیبوں کو ہنسی ہنسی میں پیش کرنا ہے۔ البتہ اس کا خیال رہے کہ تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ اس کے برخلاف اے نگل کا کہنا ہے کہ "طنز اس حد تک کڑوا ہو کہ اس میں ہلکے سے مزاح کا شائبہ تک نہ ہو۔ طنز بڑا تیکھا وار کرتا ہے۔ اس میں کوئی اصلاحی رجحان نہیں ہوتا۔ اس میں ہمدردی، نرمی اور محبت کو دخل نہیں ہوتا۔ یہ کبھی کبھار انسان کے جسمانی نقائص پر بے رحمی کے ساتھ وار کرتا ہے۔ یہ انسان کے کردار پر حملہ کرتا ہے۔ یہ کسی کو معاف کیے بغیر اپنے دور کے سارے حالات کی دھجیاں اڑا دیتا ہے۔"

اسی طرح طنز کی قوت لامحدود ہوتی ہے۔ طنز، سماج اور شخص کی کمزوریوں، عیبوں، ناانصافیوں، برائیوں اور بدعتوں پر کس کر حملہ کرتا ہے۔ اور ان پر ہنستا بھی ہے۔ لیکن اس ہنسنے میں ہلکے پن اور خوشی کا احساس نہیں ہوتا اس میں ہمدردی اور کسک بھی ہوتا ہے۔ طنز کا مقصد شخص اور سماج کی اصلاح ہوتا ہے۔ اس میں ادیب کا اخلاقی نقطۂ نظر ہوتا ہے اس میں فرد اور سماج کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے والے اسباب کا صاف صاف اظہار ہوتا ہے۔

www.taemeernews.com

یہ صحیح ہے کہ آزادی کے بعد ہمارے سماج کی ترقی ہوی ہے۔ ہمارے ملک میں تعلیم عام ہوی ہے۔ پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی ہوی ہے۔ وسائل میں اضافہ ہوا ہے۔ لیکن اتنا ہی سب کچھ نہیں ہوا ہے۔ یہ ترقیاں، پیداوار اور وسائل ایک چھوٹے سے طبقے کی مٹھی میں بند ہو گئے ہیں۔ عام آدمی کو جس نے آزادی کی جنگ میں اہم رول انجام دیا تھا، کچھ بھی نہیں ملا۔ اس کی تکلیفیں بڑھی ہیں، اس کی غریبی بڑھی ہے اور ان کے ساتھ ساتھ اس کی بدقسمتی بھی کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست کے کھلاڑی اپنی خودغرضی سے آگے دیکھ نہیں پاتے۔ اسی لیے فرقہ پرستی بڑھ رہی ہے، آپسی جھگڑے بڑھ رہے ہیں، ذخیرہ اندوزی کالا بازاری اور منافع خوری بڑھ رہی ہے۔ کرپشن بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ سارے سماج میں نابرابری، ناانصافی بدعنوانی اور دوسری خرابیاں بڑھ رہی ہیں۔ ایسے حالات طنز نگار کے لیے بڑے زرخیز ثابت ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آزادی کے بعد طنز نگاری کی طرف زیادہ توجہ دی گئی ہے اسی لیے ہندی ادب کو آج کئی تیز و طرار، کامیاب اور طاقت ور طنز نگار میسر آئے ہیں۔ ہندی کی یہ صنف اب کسی کی محتاج نہیں رہ گئی ہے۔ پہلے صرف شاعری ہی میں طنز کا ہلکا سا پرتو (کبیر کے علاوہ) دکھائی دیتا تھا لیکن آج نثر میں طنز نگاروں کی قطار سی لگ گئی ہے۔ آج ہمارے پاس ہری شنکر پرسائی، شرد جوشی، نریندر کوہلی، رویندر تیاگی، شری لال شکل، شنکر پن تابے کر، مہاویر ادھیکاری اور سنسار چندر جیسے اہم نثر نگار ہیں۔ جنہوں نے اپنے مضامین میں سماج کے ہر کمزور پہلو پر وار کیا ہے اور اس کے خلاف سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ ویسے طنز کی ایک اور شکل بھی ہوتی ہے جو احساس کمتری کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے، حاسد، ناکام اور اچھی صحبت سے محروم افراد کے اظہار میں طنز کا یہ بیمار پہلو دکھائی دیتا ہے۔ اس قسم کا طنز سطحی، کمزور اور غیر ادبی ہوتا ہے۔ اعلیٰ قسم کے طنز میں یہ عیب نہیں ہوتے۔ طنز نگار کے تخیل کی اڑان کافی وسیع ہوتی ہے۔ اس لیے شخصی قسم کا طنز کرتے ہوئے بھی وہ اپنے سامنے اپنا ایک نظریہ رکھتا ہے۔ ہری شنکر پرسائی کا طنز اسی لیے اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے طنز کا میدان محدود نہیں ہے۔ ان کے طنز میں سارا ملک اور سارا سماج موجود ہے اور سماج میں جینے والا ہر طبقہ موجود ہے۔ اس کے باوجود سیاست داں، درمیانی طبقے کے لوگ اور خاص طور پر انٹلکچول افراد اکثر طنز کے شکار رہے ہیں۔ ان سب کے سہارے انہوں نے عام آدمی کی تصویر کشی کی ہے۔

پرسائی کی تحریر ۱۹۶۰ء کے آس پاس جوان ہوی ہے۔ سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر سے یہ وہ وقت تھا جب اس ملک کے ایک مخصوص ذہن کے لوگوں میں سائنسی نظریات کی مخالفت، ترقی کی مخالفت اور حالات سے سمجھوتا کرنے کا خیال تیزی سے پروان چڑھ رہا تھا۔ فرقہ پرستانہ ذہن، سرمایہ دارانہ نظام سے تعلق بڑھا کر اپنے فائدے کے لیے اور اپنا قلعہ مضبوط کرنے کے لیے راہ ہموار کر رہے تھے۔ یہ سیاست کبھی مذہب کے نام پر اور کبھی زبان اور کلچر کے نام پر تیار کی جاتی رہی۔ اس وقت پرسائی نے سفید بھائی سادھو، کالم میں تیکھا اور تیز لہجہ اختیار کیا۔ اس کالم میں سچ مچ وہ نئے زمانے کے کبیر نظر آتے ہیں۔ سوم دانت کے "سفید بھائی سادھو" محض کالم نہیں بلکہ راڈار ہے۔ سماج میں رونما ہونے والے واقعات کا ان کے تاریخی اور سماجی

www.taemeernews.com

پس منظر کا، دشمن کے حملوں کو جاننے کا۔" انہوں نے یہ بھی کہا ہے "۔ ہندوستان کی دھرتی پر سنو بھائی سادھو، کالم کی طرح کسی اور کالم نے اتنے بڑے پیمانے پر لوگوں میں شعور پیدا نہیں کیا۔ قلم کا اتنا پر زور انشا اور کمزور پہلوؤں کے ہر گوشے کو روشنی میں لانے کا کارنامہ بھی اس شیخ کبیر ہی کی خصوصیت ہے۔"

پرسائی کو شہرت ملی "رانی ناگ پھنی کی کہانی" سے۔ یہ تخلیق ایک ایسی صورتِ حال کو اجاگر کرتی ہے جو زمیندارانہ نظام کی آئینہ دار ہے۔ قدم قدم پر پرسائی نے اس نظام کی خرابیوں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ اس چھوٹی سی کہانی میں شاید ہی کوئی ایسا پہلو بچا ہو جسے پرسائی نے ننگا نہ کیا ہو۔ اس زمیندارانہ نظام میں عوام کی حیثیت کیڑے مکوڑے کے برابر ہے۔ حیلی طبقے کے سبھی لوگ بھی عام آدمی کی بربادی کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ سماج کی مریضانہ ذہنیت، بیمار دماغ اور ناانصافی کی ساری گندگی کا تجزیہ پرسائی نے کسی ڈاکٹر کی طرح کیا ہے اور پھر اس گندگی کو صاف کرنے کے لیے بڑے پیار سے اس پر نشتر چلایا ہے۔ ان کے دوسرے مضامین سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ جہاں بھی ناانصافی اور ظلم و زیادتی دکھائی دیتی ہے وہ اس کا پردہ فاش کر دیتے ہیں۔ بعض مضامین میں انہوں نے سماجی زندگی کے کمزور پہلوؤں کی عکاسی میں کمال کر دیا ہے۔ مثال کے لیے کلرک کی موت کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں قاری سنجیدگی سے حالات پر سوچنے اور مسئلہ کا حل ڈھونڈنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

پرسائی کی نگاہ سماج اور سیاست کے ہر اس گوشے تک پہنچتی ہے جس سے آج کا آدمی دوچار ہے۔ انھوں نے اپنی ہر تحریر میں ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ پرسائی کسی بھی صورت میں سیاست کو ادب سے الگ کرنے پر تیار نہیں ہیں وہ ہر صورت حال کا ذمہ دار سیاست ہی کو سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قول اور فعل دونوں قسم کی سیاست ہمارے جسم کا حصہ ہے۔

سیاست پر مبنی تحریروں میں پرسائی نے لیڈروں، نوکر شاہی کی بھرشٹاچاریہ ان کی خود غرضی، پاور پالٹکس، مال خیرات شاہی سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانی وغیرہ پر بھرپور طنز کیا ہے۔ اس سلسلے میں "بھجن اور کانگریس بھجن" "پرجاتادی سماج وادی" چاقل سے ہیرے تک، ان کی موت، جیتے ان کے دن پھرے، بھیڑیں اور بھیڑیئے، لٹکا دینے کے بعد، پیٹ کا درد اور دیش کا، رام کی لگائی اور غریب کی لگائی، اور "ٹھٹھرتا ہوا گن تنتر" وغیرہ تحریروں کی فہرست پیش کی جا سکتی ہے۔ ان تحریروں میں انھوں نے یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ آج کے نیتا انتہائی خود غرض، چاپلوس، جھوٹے مکار اور فریبی ہیں۔

ہمارے ملک کی سیاست کو موقع پرست اور دل بدل، سیاست دانوں نے بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ان خود غرض لیڈروں نے اپنے سارے اصول طاق میں رکھ دیئے ہیں۔ سیاست کے ان مردوں پر پرسائی نے گہرا طنز کیا ہے۔ ان کے لیے الفاظ ہیں "یہ مردانگی کے گھر میں بیٹھ جاتے ہیں جو کابینہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شادی اس پارٹی میں ہوئی تھی مگر کابینہ دوسری پارٹی والا بنانے لگا تو اس کی بہو بن گئے۔ سیاست کے ان مردوں نے تو دیشاؤں کو بھی مات کر دیا ہے۔ کسی کسی نے تو گھنٹے بھر میں تین خصم بدل ڈالے" (جس کی چھوڑ بھاگی ہے)

"اس دیش میں ہر طرف اسی قسم کا پاور پالٹکس چل رہا ہے۔ آج لیڈر کی زندگی کا مقصد وزیر بننا ہے۔ وہ اس

www.taemeernews.com

مقصد کو بھی نہیں بھولتا۔ اس نے اس کے لیے ایمان اور دھرم سب کچھ تیاگ دیا ہے۔"

(ایک دکشانت بھاشن)

"یہ نیتا نوجوانوں کو سیاست میں حصہ نہ لینے کی نصیحت کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں ڈر ہے کہ نوجوانوں کے سیاست میں داخل ہونے پر ان کی پول کھل جائے گی اور ان کی خودغرضی اور سازشیں زیادہ عرصے تک چل نہیں سکیں گی۔ ان سیاست دانوں نے ہی انگریزوں کی داڑھ سے بچے ہوئے گوشت کو کھا لیا ہے۔"

(وہ جمہوری ہے نا)

"انگریز دیش کو مشرقی تہذیب کے سلاد کے ساتھ کھاتے تھے۔ دیشی نیتا اسے جمہوریت کے اچار کے ساتھ کھاتے ہیں۔ دن بھر یہ اپنی خودغرضی کا دھندا چلاتے ہیں جس کی بنا پر شام ہوتے ہوتے ان کی جیبیں بھر جاتی ہیں۔ اس تناؤ کو کم کرنے کے لیے انہیں شراب اور چھوکری چاہیے۔

(ایرکنڈیشنڈ آتما)

اور تب ادیب کو احساس ہوتا ہے کہ ہماری جمہوریت ٹھٹھرائے ہوئے ہاتھوں کی ہتھیلی پر ٹکی ہے۔ یہ تحریریں سیاست میں ہونے والی دھاندلی کا پردہ فاش کرتی ہے۔ ان تحریروں میں کہیں بھی مزاح یا ہلکا پن نہیں ہے۔ پرسائی کی تحریروں میں سنجیدگی کے ساتھ ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ہے۔

سیاسی موضوعات کے ساتھ ساتھ پرسائی نے سماج کے کمزور پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں "شنو کی پھسلن، بے ایمان کی پریت، پہلا سفید بال، ہم دے اور بھیڑ سے پھٹنے والے، وہ خاتون ہے نا، بے چارا بھلا آدمی، پگڈنڈیوں کا زمانہ، مولانا کا لڑکا، پادری کی لڑکی، سے کاٹنے والے، نیلے کا صدقہ، ٹارچ بیچنے والے، بھولا رام کا جیو، منو بھیا کی بارات، گرانٹ ابھی تک نہیں آئی وغیرہ تحریریں قابلِ توجہ ہیں۔ یہ تحریریں قاری کو بری طرح جھنجھوڑ دیتی ہیں یا شاید قاری سماج کے ان کمزور پہلوؤں سے بخوبی واقف ہے۔ لیکن ان کمزوریوں یا برائیوں کی جڑیں ہمارے سماج میں کتنی گہرائی تک پہنچی ہیں اس کا اندازہ ان ہی تحریروں کو پڑھنے کے بعد ہوتا ہے۔

اس طرح پرسائی نے کچھ خاکے بھی لکھے ہیں۔ ان شخصی خاکوں میں فن کار نے سماج کے بڑے لوگوں پر طنز کیا ہے ان کے مطابق بڑے لوگوں کی دو طرح کی اولادیں ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو واقعتاً ان کی اولاد ہوتی ہے لیکن کہلاتی نہیں۔ دوسرے وہ جو ان کی اولاد تو نہیں ہوتی البتہ کہلائی ضرور جاتی ہیں۔ یہ کہلائے جانے والی اولاد ان کے جائیداد کی وارث بن جاتی ہے اور جو حقیقتاً اولاد ہوتی ہے وہ کہیں فرش صاف کرتی ہے یا برتن مانجھتی ہے۔ "ہمنے سے کہلانا زیادہ فائدہ مند ہے۔" ہمارے سماج کی اخلاقی گراوٹ کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی۔

پرسائی نے سڑی گلی حقیقتوں سے بھرے ایسے کردار نہیں پیش کیے ہیں بلکہ ایسے کردار بھی پیش کیے ہیں جو ذہنی طور پر

www.taemeernews.com

اذیت میں مبتلا ہیں۔ یہ ذہنی انتشار سارے سماج میں پھیلا ہوا ہے۔ طلبا، پوسٹ آفس، بسوں، سنیما گھروں اور ہر جگہ پر پتھراؤ کرکے، آپس میں مار پیٹ اور گھوسے بازی کرکے اپنے انقلابی ہونے کا اعلان کرتے ہیں اور جب ان کا انقلاب ذخیرہ اندوزوں کے گوداموں کی طرف مڑتا ہے تو ذخیرہ اندوزان انقلابیوں کی بھیڑ میں اپنے کرائے کے غنڈوں کو بھجوا کر پولس پر پتھر برسا دیتے ہیں۔ پولس اور طالب علموں میں ٹھن جاتی ہے اور گودام محفوظ رہ جاتا ہے۔ اس سرمایہ دارانہ نظام کے ایسی کتنی کتنی ہی سازشوں پر پرسائی کی نظر پہنچی ہے۔

اس ملک میں ادیب کو انعام اور مالی مدد اس کی صلاحیتوں پر نہیں بلکہ عمر کے لحاظ سے ملتی ہے۔ پرائیوٹ کالج کو عطیہ دینے والا پرائیویٹ کالج پیا پیا حکم چلاتا ہے۔ اپنے ہوس کی تسکین کے لیے وہ دوسروں کی بیویوں میں خوب صورتی تلاش کرتا ہے اور خود کی بیوی کا اچار بنا کر گھر میں رکھ لیتا ہے۔

پرسائی نے سرکاری مشنری میں پھیلے ہوئے کرپشن پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ چھوٹے دکان داروں کو اپنے سچے حساب کو سچا منوانے کے لیے رشوت دینی پڑتی ہے۔ نوکری کے لیے کیریکٹر سرٹی فکیٹ حاصل کرنے والی لڑکی کو بڑے آدمی سے ایسا سرٹی فکیٹ حاصل کرنے کے لیے اس کے بیڈ روم میں سونا پڑتا ہے۔ ممتحن سے نمبر بڑھوانے کے لیے سرپرست کھلے عام بے شرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ادیب نے دیکھا ہے کہ تعلیمی ادارے بدعنوانی کے مرکز بنے ہوئے ہیں۔ آدمی اپنی ترقی کے لیے اپنے دانت اکھاڑنے کے لیے بھی تیار ہے۔ ادارے کے نام پر چندہ بٹورنے والوں کی ایک الگ جماعت بنی ہوئی ہے۔ مذہب کے نام پر لوٹ کاری پنپ رہی ہے۔ اس لحاظ سے پرسائی کا سارا ادب، سماجی، سیاسی اور شخصی برائیوں کو تار تار کرتا ہے۔ اور اپنے قارئین کو سچ کی نئی سمت دکھاتا ہے۔

ہندی ادب میں پرسائی کے ساتھ ساتھ شرد جوشی بھی طنز نگاروں کی فہرست میں اہم مانے جاتے ہیں۔ شرد جوشی کا طنز کاری تو ضرور ہے لیکن اس میں وہ تیکھا پن اور کڑواہٹ نہیں ہے جو ہم پرسائی کے ہاں دیکھتے ہیں۔ جوشی کا طنز زندگی کا احاطہ ضرور کرتا ہے اور انہوں نے سماج اور زندگی پر بھرپور حملہ بھی کیا ہے لیکن ان کے طنز میں ایک قسم کی نرمی اور شفقت پائی جاتی ہے۔ جس کی بنا پر ان کے ہاں طنز کا اثر دیرپا ثابت نہیں ہوتا حالانکہ پڑھتے وقت ان کا طنز زیادہ موثر ہو جاتا ہے۔ پرانے بیل کی باتیں، بھرپور جانے کی ریت کلا، پلنے ڈلنے کی سوتنتر تا کا سنگھرش، گوشالہ کے پربندھی، سون چریا والے گیت کار، میگھ دوت کی پُستک سمیکشا، اور ناٹک کار وغیرہ تحریریں شرد جوشی کے شہ پاروں میں شمار ہوتی ہیں۔ جوشی نے سماج اور فرد کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ہندی ایکسپریس[1] کی ملازمت ترک کرنے کے بعد انہوں نے "ہمدم ساپتاہک"[2] میں لکھے گئے کالموں کے ذریعہ اپنے سیاسی ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ ترک ملازمت کے بعد ہی انہوں نے بڑی بے جگری سے سرکاری عیوب کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے قلم سے نشتر بھی لگاتے رہے۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کا طنزیہ ادب، ہندی کی دوسری اصناف ادب کا ہم پلہ ہو گیا ہے۔

oo

---

[1] اور [2] ہندی اخبارات کے نام ہیں۔ ن۔ ایف

www.taemeernews.com

بدانتظامی اور سرکاری نظام کے کمزور پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ کئی جگہوں پر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ اس میدان میں پرسائی سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے سماج، ادب، فلم، تعلیم، فن میں ہونے والی بدعنوانیوں پر اپنے مخصوص انداز میں تنقید کی ہے۔

جوشی کی طرح شری لال شکل اور رویندر تیاگی کا طنز بھی ہرا بھرا ہے۔ تیاگی کے طنز میں مزاح کا پہلو جھلکتا دیتا ہے لیکن طنز کے اثر کو کم کر دیتا ہے۔ شری لال شکل نے بھی ایک ہارے ہوئے نیتا کا انٹرویو، بھارتیہ اتہاس کا ایک سو نیا پرشٹھ، یہاں سے وہاں، بے جا رسے ڈاکو، نصیحتیں اور "نیو تا پرانے اور نئے" میں ہندوستانی سماج کی کمزوریوں، طبیعت کے گھٹیاپن اور زندگی کے تاریک پہلوؤں پر قلم اٹھایا ہے۔ اپنے مشہور ناول راگ درباری میں کھوکھلی تہذیب اور بازاری قسم کی سیاست پر طنز کیا ہے۔ جو ہندی ادب میں کافی دنوں تک یاد کیا جائے گا۔ سنسار چند کے طنز میں مزاح کا عنصر غالب ہے۔ جاویرا دھیکاری نے اپنے طنز کے سہارے سماج اور سیاست پر حملہ کیا ہے۔ ان کی زبان بھی شرد جوشی کی طرح نرم اور سیدھی ہے۔ ادھیکاری کا طنز چوٹ نہیں کرتا بلکہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔

ان طنز نگاروں کے علاوہ ہندی ادب میں چند اور قابل ذکر طنز نگار ملتے ہیں جن میں شنکر پن تا ہے کہ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ میری جانکاری کے مطابق شنکر پن تا نے کر پہلے غیر ہندی طنز نگار ہیں۔ طنز نگاری کے لیے زبان پر کس قدر دسترس ہونی چاہیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن پن تا نے گھ نہ صرف زبان پر عبور ہے بلکہ ان کا مشاہدہ بھی گہرا ہے۔ ان کے طنزیہ مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ میں انہیں شہرت ان کی شائع شدہ طنزیہ کہانی "ویا لھیا" ہی سے ملی ہے۔

کمل نریندر کوہلی کو قارئین "رام کتھا" کے مشہور افسانہ نویس کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ لیکن کوہلی نے طنز کے میدان ہی سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ اب تک ان کے طنزیہ مضامین کے نصف درجن مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ نریندر کوہلی نے اپنے موضوعات کا انتخاب اپنے اطراف کی زندگی سے کیا ہے۔ ان کے طنز کی خوبی یہ ہے کہ قاری سوچتا ہی رہ جاتا ہے اور طنز نگار آگے بڑھ جاتا ہے۔ ان کے ایک لال تکون کے مضامین میں مزاح کا پہلو ملتا ہے۔ لیکن یہ ساری تحریریں ہلکی پھلکی ہوگئی ہیں۔ ان کے مضامین میں "سنسکرتی سے بچھڑنے کا روگ"، "کتھا پرانی میزی کی"، "لین سیٹ"، وغیرہ طنز نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ کوہلی کے طنز سے وہی قاری محظوظ ہو سکتا ہے جو ان کی تیزی کو پکڑ سکے۔

کوہلی کے ناول آشرو کا دریا، سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانی اور سیاسی برائیوں پر تیکھے وار کرتا ہے۔ اس ناول میں کوہلی نے اپنی تیکھی چبھتی ہوئی زبان کو ناانصافی اور ظلم و زیادتی کے خلاف بڑے موثر انداز میں اور کامیابی کے ساتھ استعمال کیا ہے کوہلی نے اپنے قلم کا استعمال جھوٹ کے پردوں کو کاٹ کر زندگی کی حقیقتوں کو پیش کرنے کے لیے کیا ہے اور یہی ان کے طنز کا مقصد ہے۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے طنز نگاروں نے سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانی، سیاست میں ہونے والی دھاندلی، ذخیرہ اندوزی، کالا بازاری، تعلیمی اداروں میں ہونے والی سودے بازی، کھوکھلی ہوتی ہوئی تہذیب، قول و عمل کے تضاد، مذہب کے نام پر پھیلائی جانے والی فرقہ پرستی، ذہنی افتشار، اخلاقی گراوٹ، خود غرضی، بے شرمی، کمینگی اور ریاکاری جیسے سماجی عیوب کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنے قلم سے نشتر بھی لگائے۔ مختصر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی کا طنزیہ ادب، ہندی کی دوسری اصناف ادب کے ہم پلہ ہو گیا ہے۔

www.taemeernews.com

رتی لال شاہین (بمبئی)
ہندی سے ترجمہ: صبیحہ فرزانہ

طنز کی شوگر کوٹڈ گولی، ہندی نقاد کے گلے نہیں اُترتی

ہندی میں طنز و مزاح ایک متنازع صنف ہے، بلکہ یوں کہا جائے کہ ہندی کے نقاد اسے ایک "صنف" ماننے سے ایک مدت سے گریز کر رہے ہیں، تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ بہت پہلے بال مکند گپتو نے "شیو شمبھو کے چٹھے" لکھے تھے۔ ہندی طنز کی ایک انوکھی مثال اسے کہا جاسکتا ہے، لیکن ہندی ادیبوں نے ہمیشہ کی طرح طنز اور مزاح کو ادب کے نورسوں میں سے ایک رس مان کر ان مضامین کو طنز و مزاح کے مزہ دار چٹخارے کہہ دیا۔ آج بکثرت مخالفتوں کے باوجود بھی طنز ایک قابل اور مضبوط صنف کے طور پر سینہ تان کر اسی طرح کھڑی ہے جیسے کالے بادلوں سے نکلتا سورج۔

طنز کا اصل مقصد معاشرہ کی برائیوں پر حملہ کرنا ہے۔ مگر یہ حملہ تخریبی نہیں بلکہ تعمیری ہونا چاہیئے، جس سے معاشرہ کو ایک نئی سمت ملے۔ کچھ لوگ طنز نگار کو جھاڑو والا سمجھتے ہیں جس کا کام صرف گندگی دور کرنا ہوتا ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ طنز ایک طرح کی شوگر کوٹڈ گولی ہے جو ہمارے جسم کو بیماریوں سے بچاتی ہے اور تندرست بنانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ طنز نگار کا کام آئینہ دکھانا ہوتا ہے۔ یہ تو آئینہ دیکھنے والے پر منحصر ہے کہ وہ چاہے تو آئینہ توڑنے کے بعد سنور بن جائے یا نائی۔

طنز کا اصل مقصد حالانکہ بھرپور وار کرنا ہوتا ہے مگر صرف وار کرنا اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ جو لوگ احساس کمتری کے تحت طنز لکھتے ہیں اُن کے طنز میں بدلہ کا احساس چھپا ہو سکتا ہے۔ ایسے طنز کا کنوس وسیع نہیں ہو سکتا۔ ایسے طنز کو صحت مند طنز بھی نہیں کہا جا سکتا۔ غنیمت ہے کہ ہندی میں ایسا طنز "نہیں" کے برابر ہے۔ وسیع ماحول لئے کر اندرونی ہمدردی ہی سے پیدا شدہ طنز ہی صحیح طنز ہے۔ اس میں مزاح بھی ہوگا۔ مگر وہ مزاح بھدا نہیں ہوگا۔ اسے پڑھ کر ہم ہنس لیں گے مگر کچھ ہی لمحوں بعد یہ احساس ہوگا کہ ہم اپنے آپ پر ہی ہنس رہے ہیں۔ ہندی میں طنز نے زندگی کے سبھی میدانوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔

www.taemeernews.com

طنز ایک جارحانہ رُجحان ہے مگر یہ رجحان جب تخت لفظ ہو جاتا ہے تو کتنا تیز اور اثر انگیز بنتا ہے۔ یہ لکھنے والے کے ڈھنگ اور موضوع کے انتخاب پر منحصر ہوتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ آج یعنی پچھلے دس سال سے لکھے جانے والی "طنزیہ تحریریں سیاست کے اِرد گرد ہی گھومتی رہی ہیں۔ یہ بات بھی سچ مانی جا سکتی ہے کیوں کہ آج کی زندگی میں سیاست کسی ناجائز قابض کی طرح قبضہ کرتی جا رہی ہے مگر سیاست اور سرکار کو اپنے حملہ کا لگاتار موضوع بنانے کی وجہ سے طنز نگاری میں ایک ہی طرح کے انداز نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے، اِدھر طنز نگاری میں بھی بکھراؤ اور ٹکراؤ بڑھتا جا رہا ہے۔

طنز نگاروں میں دو قسم کے طنز نگار ہیں۔ بعض نے تو پوری طرح اپنے آپ کو طنز کی صنف میں ہی معروف کر لیا ہے۔ چند کہانی کار بھی طنز میں ڈوبے ہوئے ہیں اور چند شاعر بھی اپنی شاعری میں یہ حربہ استعمال کرتے ہیں۔ طنز نگاروں کو تین پیڑھیوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلی پیڑھی میں ہری شنکر پرسائی کیشو چندر ما، شری لال شکل، شرد جوشی، رویندر ناتھ تیاگی، رام نارائن اپادھیائے، بدیع الزماں، لطیف گھونگھی، برسانے لال چترویدی اور رادھا کشن ہیں۔ طنز نگاری کی صنف میں بہت زیادہ لکھنے والوں میں بی۔ پی۔ سریواستو ہیں۔ جنھوں نے ۱۹۵۵ء سے ہی اس صنف کی شروعات کی تھی۔ ہندی میں طنز و مزاح زیادہ تر اُردو سے ترجمہ ہو کر آئے ہیں۔ جن میں شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، سلمیٰ صدیقی یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین وغیرہ مشہور ہیں۔ طنز نگاری میں ہندی بھاشا کا ثانی نہیں ملتا۔

دوسری پیڑھی میں شنکر ہن نا بنے کر، لکشمی کانت ویشنو، نرہندری کوہلی، اشوک شکل، مہاویر ادھیکاری، کے۔ پی سکسینہ، منوہر شام جوشی، روشن لال سری والا، اجا تشترو وغیرہ ہیں۔

تیسری پیڑھی کی فہرست مشکوک ہے۔ اس میں سبودھ کمار سریواستو، شری کانت چودھری، پریم جنمی جے، رویندر کالیہ، رتی لال شاہین، گیان چترویدی، سُریش کانت، یگیہ شرما، پربھو جوشی وغیرہ ہیں۔

آزادی کے بعد عام زندگی میں لگاتار بکھراؤ ہوتا رہا ہے۔ یہ بکھراؤ لمحہ لمحہ بڑھتا ہی رہا۔ اگر کسی کی نظر انتخاب اس جانب گئی ہے تو وہ ہیں جناب ہری شنکر پرسائی۔ ان کی طنز نگاری، فطری ہوتی ہے۔ جیسے کوئی برف کا ٹکڑا ہو اور منہ میں رکھتے ہی معلوم ہو کہ وہ راکھ لگا آگ کا ٹکڑا ہے اور زبان جل اٹھی ہے، یہ بات میں ہری شنکر پرسائی کی ستر فیصد تک کی طنز نگاری کے بارے میں کہہ رہا ہوں، اِن دنوں وہ ہندی ہفتہ وار "کرنٹ" میں طنزیہ کالم لکھ رہے ہیں۔ وہ بالکل سیاسی حال چال اور واردا توں کو اپنا موضوع بناتے ہیں، اور ان کی زبان اتنی ترش ہو گئی ہے کہ طنز کو پڑھنے کی جو چاہ ہوتی ہے، وہ جیسے مر جاتی ہے۔ جناب پرسائی نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر لکھا ہے۔ پتہ نہیں ان کی نظر ایک حد میں کیوں محصور ہو گئی ہے۔

جناب پرسائی کے بعد شرد جوشی کی طنز نگاری، فطری طور پر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ ان کی طنز نگاری میں جو عام باتیں آتی ہیں، وہ دلوں کو گدگداتی ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتی ہیں۔ چاہے اسے کوئی مانے یا نہ مانے، مگر وہ

www.taemeernews.com

جناب پرسائی کی نسل سے آگے کے معلوم ہوتے ہیں۔

کے۔ پی۔ سکسینہ کی طنز نگاری میں مزاح زیادہ ہوتا ہے۔ لکھنوی نفاست و لطافت سے بھرے اردو انداز میں وہ پنچ پرسائی کی طرح فلم سے لے کر چلم اور گھر سے لے کر فقیروں کے در تک سبھی کو اپنے وار سے لہولہان کرتے چلتے ہیں۔ رویندر ناتھ تیاگی کے لکھنے کا ڈھنگ گھریلو جیسا ہے۔ کسی خاص عنوان کو لے کر شروع کرتے ہیں۔ اور کیلے کے پتوں کی طرح بات میں بات نکالتے جاتے ہیں۔ بہاؤ ایسا ہوتا ہے کہ آگے وہ کیا کہنے والے ہیں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ان کا میدان کافی وسیع ہے اور نظر تیز ہے۔

رویندر کوہلی، شری لال شکل، سنتوش کھرے، اشوک شکل، پریم جنمیجے وغیرہ طنز نگاروں کی ایک لمبی فہرست ہے جو ادھر کچھ نئے نام بڑی تیزی سے آواز اور انداز کو لے کر آگے آئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کے بارے میں کہنا ضروری ہے۔ دیوراج دنیش، حالانکہ نیا نام نہیں ہے۔ مگر ان کی طنز نگاری روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے دائرے میں مزیدار طریقہ سے شامل کرتی ہے۔ سنجکتا کا ڈھول میں پول والا انداز اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ شری کانت چودھری کی طنز نگاری چھوٹے تیروں کا کام کرتی ہے اور تلملاہٹ بڑھاتی ہے۔ مگر اجات شترو کی طنز نگاری میں جو ارضیت ملتی ہے وہ اپنی الگ خاصیت رکھتی ہے۔ اور دل کو مسل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ ہم کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور میٹھی کسک پیدا کرتی ہے۔ اور جب آدمی جھنجھنا بن جائے اور ادب کو بکری چرنے لگے تو اجات شترو کی طرح طنز نگاری کی چاشنی دے سکتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ خاموش ہیں۔

"تال بے تال" اور پیٹھے ٹھالے کالموں نے کئی طنز نگار پیدا کئے ہیں۔ جہاں طنز کی دھار نہیں تھی، وہاں سے بھی طنز و مزاح کے بھرتے پھوٹ چلے یگ شرما، پرکاش پرویت، لکشمی کانت ویشنو پربھو جوشی، رتی لال شاہین، راجندر سوریہ بالا، سدھا اروڑا، کشادیاس، کماری امدوجین، سروجنی پرتم وغیرہ ایک بہت بڑی ناموں کی زنجیر ہے جو اچھے طنز کی تخلیق کر رہی ہے۔ مگر یہ سب بکھرے بکھرے ہیں۔ عنوان آپس میں ٹکراتے رہتے ہیں۔ کوئی ادیبوں پر طنز کرتا ہے تو کوئی صنف نازک پر جبکہ کوئی صرف اڈیٹر اور ہندی ادب کی اصناف پر۔

باریک پکڑ اور نظر کے پھیلاؤ کی کمی سے وہ ستارے جگمگ کر رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو ان کی مزاح نگاری جان لے لیتی ہے۔ کبھی کبھی جوش جیسے مرگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ رادھا کرشن، شنکر پراتاپ کر، اجات شترو، شرد جوشی، رویندر ناتھ تیاگی۔ جیسے طنز نگاروں کی تخلیقات کو پڑھنے کے بعد ہونٹوں والی سچائی کی پہچان اور اچانک ہی "آہ" اور "واہ" کی "ہاں" میں سر ہلانے والی ہلواٹے کی ابھی قابل نہیں ہوئی ہے۔ مگر آگے امید باندھنا ہے۔ کچھ نام چھوٹ بھی گئے ہیں مگر جن سے پاروں کی بات کی جانے والی تھی، وہ نہیں چھوٹے!!

□□

www.taemeernews.com

شرد جوشی
ترجمہ: خالد اگاسکر

جھڑتا نیم بڑھتا تھیم

شرد جوشی کی تخلیقات

کہانیوں کے مجموعے

۱. کڈوآنی گوڈ ۲. گن کار ۳. کھرے سانگا پے پہنچے ۴. تلاوا تلے چاندنے ۵. بنڈ ۶. پاڑنا ۷. دیگنے جگ ۸. جاڈ گا پنچا کتا. ۹. درشا ۱۰. اسناد ۱۱. آلے اُنھ ۱۲. اُدھوستہ دشو ۱۳. سوپن بھوی ۱۴. کاجوا ۱۵. آٹھوی ۱۶. بڈکھا ۱۷. شراون ۱۸. کھانا ترے آ ش

ناول :۔ ۱. سنگھرش (ترجمہ) ۲. بلی چے پھول ۳. دود و سیہ (حصہ اول و دوم)

ڈرامے :۔ بنڈ دنا لوآنی گلابی ہتی ، بنڈ دنا نک کرتسو ، وڈیا نچا چوکوں ، پانچ نابکا ، جیو تسانا آنی جیوتی چمٹی تے چھٹلا بنڈ۔

سفرنامے :۔ ۱. گوپرا نچے پردیشاتے ۲. سات سمندرا پلی کڈے ۳. ممبئی آنی ممبئی کر۔

بچوں کا ادب :۔ ۱. بکھوچی روج بنشی ۲. دھاڈسی چندو ۳. آہی آپلے تھور پرش ۴. شہانی مسلے

تنقید :۔ ۱. کھڈک آنی پانی ۲. ساہتیا چے سناوند ۳. کھاڈ لکرا نچے تین ناٹکے ۴. پانیا درچی اکشرے ۵. آج کال چے ساہتیک۔

معاشیات :۔ ارتھک پرش آنی ارتھ دیہوار ۲. کمپن آنی سماج (ترجمہ) ۳. ریزو بنک (ترجمہ)

مزاح :۔ بھرکیا ۲. بانبا چے کلنگڑ آنی ٹلی چا سوئیٹر

گھر کے سامنے اور خاص طور پر اپنے ہی آنگن میں پیڑ لگا ہو تو ہمیشہ جذباتی ہونے کا موقع ملتا ہے۔ پیڑ کی طرف دیکھا اور وہیں لگے ہاتھوں جذباتی ہو لیئے۔ پھوٹی کوڑی خرچ کیئے بغیر دل شرابور ہو جاتا ہے۔ دُکھ سُکھ میں بڑے کام کی چیز ہے۔ آپ چاہیں تو اس کے تنے سے لپٹ کر رو سکتے ہیں اور چاہیں تو اس کے پتے دیکھ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ احساس کے میدان میں کسی قسم کی خدمت ہو پیڑ حاضر ہے۔ جو لوگ اپنے آنگن میں پیڑ کھڑا کر لیتے ہیں اس معاملے میں بڑے مزے میں رہتے ہیں۔

ممکن ہے آدمی آدمی سے یا دوسرے الفاظ میں عورت سے ایڈجسٹ ADJUST نہ کر سکے البتہ آدمی پیڑ کے ساتھ اور پیڑ آدمی کے ساتھ آسانی سے ایڈجسٹ کر لیتا ہے۔ پیڑ اگر پھل دینے والا ہو تو اس ایڈجسٹمنٹ میں نسبتاً زیادہ آسانی ہوتی ہے۔ آدمی بھی اگر پھل دینے والا ہو تو وہاں بھی ایڈجسٹمنٹ میں زیادہ آسانی رہتی ہے۔ عورت اپنی ساری یادیں اور جذبات

www.taemeernews.com

گھر کے پرانے طاق میں رکھ کر پھل دینے والے شخص کے ساتھ کانچ کس کر چل دیتی ہے۔ صرف جذباتی لوگ ہی بے ثمر کے ساتھ ایڈجسٹ کرتے ہیں۔ وہ تو بے ثمر پیڑ کے ساتھ بھی ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ پیڑ بھی ایڈجسٹ کر لیتا ہے۔ جیسے جھڑتے لگے نیم کے پتے، بڑھنے لگی اداسی من کی" (پتا نہیں کس کا مصرعہ ہے۔ نہ جانے کب پڑھا تھا۔ یوں بھی ہم نام بتا کر اس کا پرچار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ ہماری ادبی اِشرے ٹے جی ہے کہ حوالہ دو اور نام غائب کر دو) ہوا یوں کہ جب نیم کے پتے جھڑنے لگے تو ہمارے من کی اداسی بڑھنے لگی یا یوں کہ ادھر نیم کے پتے جھڑنے لگے اُدھر من کی اُداسی بڑھنے لگی۔ دونوں حرکتیں ساتھ ساتھ متوازی شروع ہوئیں۔ یا الٹا ہوا۔ جب مالک مکان کے دل کی اداسی بڑھنے لگی تو آنگن کے نیم نے سوچا چلو اسی وقت کچھ سوکھی پتیاں جھڑا دو۔ ادب کے مطالعے سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ پیڑ پودے اور تمام کائنات ہمیشہ بیٹھی شاعر کا موڈ بھانپتی رہتی ہے۔ شاعر کا جیسا موڈ ہو اسی کائنات ویسا ہی کرتی ہے۔ شاعر کا من اداس ہوا تو نیم کے پتے جھڑنے شروع ہو جاتے ہیں اور موڈ اچھا ہوا تو اس وقت سوکھے پتوں کا جھڑنا رک جاتا ہے اور نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں۔ کہاوت ہے (یا ہو سکتی ہے) "جس درجے کا شاعر اس درجے کے پیڑ پودے" یا یوں کہ "جیسا بولے کوی رام۔ ویسا چاٹے نیم آم" یا یوں کہ "جب شاعر ہنسے، تب پانی برسے" یا یوں کہ "شاعر ہوا ڈھل مل، تو چپ ہوئی بلبل"

گھر کا پیڑ ہو، باپ نے لگایا ہو تو جذباتی ہونے کا حق وراثتی ہو جاتا ہے۔ پیڑ کے ساتھ آپ کی ساری شخصیت کے کنڈیشنڈ CONDITIONED ہو جانے کا ڈر رہتا ہے۔ جو لوگ سائے دار پیڑ کے حوالے سے خود کو بڑا ورڈس ورتھ یا رابندر ناتھ سمجھتے ہیں، آگے چل کر گنوار آدمی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ تو ہندی ادب ہے جہاں سب چلتا ہے۔ یہاں گنوار شخص بھی پیڑ پتوں کا ذکر کر کے ڈھولک باجے پر سُر نکال دھندا چلا لیتا ہے۔ ادبی شخص کے طور طریقے اور دلچسپیاں بکری کی طرح ہوتی ہیں۔ جہاں جو بھی ہرا بھرا دکھائی دیا پیار سے چر لیا نہ ملا تو منہ مار لیا۔

جب شاعر کا پیڑ سوکھتا ہے تو اسے بھی دکھ ہوتا ہے۔ ادب میں نیچر کا خربوزہ کی طرح رنگ بدلتا ہے شاعر بھی قاری کے 'نیچر کا خربوزہ دیکھ کر ویسا ہی رنگ بدلتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی جو گھریلو قسم کے شاعر ہیں وہ گھر کی کھڑکی سے باہر جھانک کر پیڑ کی ڈالی، چاند بادل یا گائے بیل کا نظارہ دیکھ اپنے من کی بات کہتے ہیں اور موقع بہ موقع پیڑ سے لٹک کر کہانی اور فن کے آسمان میں جھولنے لگتے ہیں۔ ایسی شاعری کے ہوتے پر پیڑ کے ساتھ ادب اور ادب کے ساتھ پیڑ پنپتا ہے۔ اتفاقاً اس پیڑ پر کوئی پرندہ گھونسلہ بنا لے اور مادہ اپنے چوچلے شروع کر دیں تو پھر کہانی کا مضمون باندھنے میں سہولت رہتی ہے۔ ناولوں کی عورتیں اکیلی بیٹھیں اپنے گھر سے اس گھونسلے کا موازنہ کرتی ہیں۔ بابو دفتر چلا جاتا ہے قسمت کا ٹائپ رائٹر بجانے اور عورت بچوں کو کیڑے مکوڑوں کا چگا چگاتی مادہ کو دیکھ کر اپنے پھولے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگتی ہے۔ ادب میں ایسے مناظر باکس آفس پر ہٹ ثابت ہوئے ہیں۔ یہ سب پیڑ کا کمال ہے۔ ذہن کے ننگے پن کو ڈھانکنے کے لئے پیڑ کے پتے بڑے کام آئے ہیں۔ جب کچھ سمجھ میں نہیں آیا، قاری کو پیڑ سے باندھ دیا اور خود اوپر چڑھ کر ڈالیاں ہلانے لگے۔ لے بیٹا، کائنات چاٹ کر۔ خدا کی بنائی ہوئی ہے سستی ملتی ہے۔

پھر بھی مجھے آنگن میں کھڑے پیڑ کی بات کرنے والے شاعر بڑے اچھے لگتے ہیں۔ جو ہے اسی کی بات کرتے ہیں۔ اپنی عقل اور

www.taemeernews.com

صلاحیت کی حدوں سے واقف ہیں۔ آمام کسی پر پڑے پڑے تار توڑ لانے کا دعویٰ نہیں کرتے۔ کائنات کے نام پر ادب میں بڑا فراڈ چلتا ہے۔ کائنات ایک مخصوص نظریۂ شاعری میں بڑی معاون رہی ہے۔ اس ہری سیاست کو عام قاری سمجھ نہیں پاتا۔ جب بھی مسائل حقیقت بن کر گلا پکڑتے ہیں شاعر چپکے سے درختوں کے جھرمٹ میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے۔ جب مصیبت ٹل گئی۔ دھیرے سے نکلا اور جو جیتا اس کی بے بے کار کرنے لگا۔ گل مہر، ڈھاک، املتاس، پیپل، برگد، آم، نیم کا اچھا خاصا جنگل ہے۔ جو غیر جانبداری کے موسم میں سر چھپانے کے کام آتا ہے۔ غیر جانبدارانہ سیاست کے راز سے سب واقف ہیں لیکن شاعر سے کوئی شکایت نہیں رکھتے روز اول سے اُسے کائنات پر حق حاصل ہے۔ جذبات کے اظہار کے لئے وہ جہاں چاہے قلانچیں بھر سکتا ہے۔ اس نے کالی داس سے گرو منتر حاصل کیا ہے "کرم کے عیب ڈھونڈنے سے بہتر ہے کائنات کی بات کرو۔ کیریر بے داغ رہتا ہے۔ ورائٹی بنی رہتی ہے" کائنات پل پل لباس تبدیل کرتی ہے۔ شاعر کی گرگٹ نما صلاحیت نت نئے رنگ بدلتی ہے۔ اپنا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اور جب کرم کے خلاف دیش کی جنتا میں بے چینی کی کونپلیں مخالف پارٹی کو ملے بھاری ووٹوں کی طرح پنپنے لگیں تب کرم کی درباری اکادمی سے انعام یافتہ فطرت پسند شاعر کو سہولت ہے کہ وہ مخالف کے سُروں میں اپنا ایک سُر ملا کر بدلتی تاریخ کا دی۔ آئی۔ پی۔ لسٹ میں اپنا نام لکھوا دے۔

پیڑ سے کئی فائدے ہیں۔ وہ چلچلاتی دھوپ میں پناہ دیتا ہے۔ پیڑ بڑی کار آمد چیز ہے۔ اس کے گھنے پتے ماضی کی کئی شرمندگیوں کو ڈھکتے ہیں۔ جھاڑیاں کئی گھپلوں کا مرکز رہی ہیں۔ ادب میں بھی کم گھپلے نہیں ہوئے ہیں۔ کوئی چاہے تو شاعری اور کائنات یا کائنات اور سیاست پر الگ الگ تھیسس نہ لکھ کر ایک ہی مقالے میں ساری تحقیق کر سکتا ہے۔ کتاب پڑھنے لائق ہوگی۔ البتہ پی۔ ایچ ڈی۔ نہیں ملے گی۔ کیوں کہ یونیورسٹی کے آنگن میں بھی نظریۂ شاعری کا ایک پُرانا پیڑ لگا ہوا ہے۔ ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ جب اپنی کھڑکی سے جھانکتے ہیں تب وہ پیڑ انھیں دکھائی دیتا ہے۔ اس کی ہوا کا جھونکا انا کی انا کو طمئین کر دیتا ہے۔ وہ انکار کی زمین پر نئی بغاوت کے حامی نہیں ہیں۔ وہ شاعر کو اس کی ظاہری قدروں سے تسلیم کرتے ہیں وہ محض جذباتیت کے محافظ ہیں کہاوت ہے (یا ہو سکتا ہے) ایک طرف کائنات، دوسری طرف پالٹکس" یا "پیڑ اور اصل" مخالف اور اصل" یا "دیکھو ہم شاعروں کی ریت کھائیں پالٹکس انگلیں گیت" یا یوں کہ مخالفوں میں کمی، خوش اکادمی یا یوں کہ "لکھو صرف کائنات کی بات" چھپو کرسی میں ہاتھوں ہاتھ یا چھپو کرسی میں شان کے ساتھ۔"

ٹھوس گہرائیوں میں نہ جاؤ۔ صرف دکھائی دینے والی جھڑتی حقیقتوں ہی کو چنو۔ تب بھی آنگن میں لگا پیڑ بڑا مددگار ہے جب چاہیں غصہ کم کرنے یا آنکھیں نم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ پردیش گئے سیّاں جب گھر چٹھی لکھتے ہیں تو آنگن میں لگے پیڑ کی خیریت بھی پوچھتے ہیں۔ "مادھو کی ماں، اس مرتبہ تو آم کو بہت بور آئے ہوں گے۔ وہاں ہوتا تو سونگھتا، کافی آم دے گا اپنا پیڑ" کیا کہنے۔ چٹھی پڑھ کر سنانا قابل پوسٹ مین اس دکھ بھرے موقع کے ساتھ سارے معاملے کو فوراً بھانپ لیتا ہے اور جاتے ہوئے دھیرے سے کہتا ہے ــــ مادھو کی ماں، اس مرتبہ تو مادھو کے باپو گھر نہیں آ رہے ہیں۔ اگر آم میں بور آئیں تو ہمیں یاد کر لینا اور مادھو کی ماں شرم سے منہ موڑ، آنگن کے آم کی طرف منہ پھیر کھڑی ہو جاتی ہے۔ پوسٹ مین ایک مسرت بخش کینڈڈ کو رسیلی نظروں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

www.taemeernews.com

دوسرا موقع نانورام شاستری کی بیٹی شکن کی بدائی ہے۔ گھونگٹ میں منہ چھپا روتے دھونے کا سلسلہ جاری ہے۔ جاتے ہوئے وہ آنگن میں لگے پیڑ کی جانب دیکھتی ہے۔ اسی کی چھاؤں میں کھیل کود کر بڑی ہوئی۔ ملوا پنڈت کے چھوکرے نے اسی پیڑ کے نیچے پہلی مرتبہ کلائی پکڑی تھی۔ وہ دل ہی دل میں پیڑ کو پرنام کر کے کہتی ہے ـــ اے پیڑ مہاراج، اپنے اسکینڈل کی پٹاری تیرے ہی ڈال پر لٹکا کر جا رہی ہوں اس کو ایکسپوزمت کرنا مہاراج، اپنی بٹیا کی لاج رکھنا کہ اسی وقت عورتیں کوس میں روتی ہیں ـــ "اری ان پیڑ پودوں کو تیرے سوا کون پانی دے گا ری بٹیا" اور بٹیا پیڑ دیوتا کو پرنام کر ڈولی کی جانب بڑھ جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں ایک دیہی منظر سما جاتا ہے۔

ایسے کئی مواقعے ہوتے ہیں۔ آنگن میں لگے پیڑ کے اطراف کئی باتیں ہیں۔ جن میں ادیب اور شاعر اپنی پوری صلاحیت کا استعمال کر کے کھپ سکتے ہیں اور کھپ چکے ہیں۔ کہاوت ہے (یا ہو سکتی ہے) "پیڑ کے انگوں اور شاعری کے رنگوں میں کمی نہیں آتی"۔ یا یوں کہ "جیسا تانیم ویسا تھیم" یا "نیم پھلے یا آم، شاعر کے لئے کام ہے" یا یوں کہ "پتا کھڑکے قلم پیڑ کے"۔

اگر آپ جذباتی ہیں، عالم ہیں اور آنگن میں لگے پیڑ پر اعتماد رکھتے ہیں تو ان کہاوتوں کو بھی سچ مانیئے چاہے آپ نے سُنی ہوں یا نہ سُنی ہوں کیوں کہ کہاوت ہے "ہاتھی پر جیسے مہاوت، بھاشا میں ویسے کہاوت"۔ ورنہ آپ حقیقت سے بھٹک جائیں گے!

■■

مراٹھی کے نامور مزاح نگار ریشم غنتری کو گھومنے پھرنے اور مشہور طنز و مزاح نگاروں سے ملنے ملانے کا بہت شوق ہے، انہوں نے ہندوستانی طنز و مزاح اور طنز و مزاح نگاروں کا جائزہ لیا ہے۔ کچھ اشارے قابلِ غور ہیں بنگال کے مشہور ترین ناول نگار بمل مترسے وہ ملے اور دریافت کیا کہ بنگالی طنز و مزاح کا کیا حال ہے۔ بمل مترنے جواب دیا "زندگی دکھوں سے بھری ہوئی ہے۔ بنگالی لوگوں کا یہی ادبی عقیدہ ہے۔ پھر بھارا کلاسیکل اور موجودہ ادب حزن و یاس کی تصویر ہیں طنز و مزاح کی بنگالی ادب میں بہت کم گنجائش ہے۔ تامل ادب کی حالت صرف آٹے میں نمک کی سی ہے۔ تامل زبان کے کئی ڈرامہ نگار جو طنز نگار بھی ہیں، خاصے مشہور ہیں۔ ہندی طنز و مزاح مراٹھی سے بہت پیچھے ہے، ہری شنکر پرسائی بہت مقبول و معروف ہیں مگر ادب میں ان کا ذکر کم ہوا ہے گجراتی کے سب سے اہم مزاح نگار جیتندر وڈے ہیں۔ جن کا گجراتی ادب میں کوئی ثانی نہیں۔ پنجابی ادب پر خشونت سنگھ نے تبصرہ کرتے ہوئے کہا سکھوں اور پنجابیوں نے صرف ملک کو تو کیا ساری دنیا کو لطیفوں کا موضوع بنا دیا مگر ادب کا یہ حال ہے کہ ہندی کی چھوٹی بہن لگتی ہے۔ اردو کے کسی اچھے سے مزاحیہ جی نہیں بلکہ "زندہ دلانِ حیدرآباد" سے مل لیتے طبیعت خوش ہو جاتی۔ واقعی شگوفہ نے ادھ بچ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ خود مراٹھی کے بارے میں کہتے ہیں۔ مراٹھی ادیبوں نے طنز و مزاح کو ہر زاویہ سے سنوارا اور صف اوّل کا ادب پیش کیا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، جس کا جی چاہے دیکھ لے پرکھ لے۔

اعجاز مدنی

www.taemeernews.com

رتی لال شاہین
ہندی سے ترجمہ : صبیحہ فرزانہ

شکایت مجھے بھی ہے...

نہیں سہتا ، آپ کو نہیں ہوگی۔ ایک نہیں کئی ہوں گی ، شکایتیں ہیں۔ آدمی پیدا نہیں ہوا کہ شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے کہ پلگ لائی نہیں کہ کمٹل پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ تو شکایتیں ہیں۔ کچھ ذاتی ، کچھ پرائیوٹ ہوں گی تو کچھ سب کی ہوں گی۔

کسی کے پاس شکایتوں کا ڈھیر ہوگا تو کسی کے پاس پہاڑ۔ کسی کے بارے میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ گویا آدمی ہیں یا شکایتوں کا ڈبہ۔ ان کی بات جانے دیجئے ، کیوں نہ ہم اپنی بات کریں۔ شکایت مجھے بھی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ شکایت مجھے بھی ہے۔ آپ کہیں گے زکام مجھے بھی ہے۔ ہاں ! شکایت بھی ایک زکام ہے مگر میری شکایت نہ پرائیوٹ ہے اور نہ سب کی۔ یہ دونوں کے بیچ کی ہے۔ اور بیچ کا معاملہ ہمیشہ خراب ہوتا ہے۔ جیسے کہ دو ملکوں کی سرحدیں۔

اور شکایت مجھے بھی ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کے پاس بھی کئی طرح کی شکایتیں ہوں ! ۔ شکایتوں کی دنیا سے آپ کی جیب تک بھی پھٹ گئی ہوگی۔ کچھ کی زندگی بھی چیتھڑے چیتھڑے ہوگی۔ لیکن وہ کورٹ کا معاملہ ہوگا۔ وکیل کا چکر ہوگا ، یا ڈاکٹر کا نسخہ ہوگا جسے خریدتے خریدتے آپ مگن چگر ہو گئے ہوں گے یا پھر آپ کی بیوی کا وقت پر نہ سیا گیا چیتھڑا ہوگا۔ اور وقت کے گال کو سہلاتے سہلاتے آپ بھی لال لال ہو گئے ہوں گے۔

لیکن میری اپنی شکایتیں دو طرح کی ہیں۔ میں جس محلے میں رہتا ہوں ، کئی سرکاری نل ہیں۔ کبھی کبھی جب گھر کے نل چھوٹے بچوں کی طرح سو ، سو کرنے لگتے ہیں۔ (اور یہ سال میں صرف ۶۵ دن نہیں ہوتا باقی ۳۰۰ دن تک بلدیہ کی

www.taemeernews.com

مہربانی سے یہ میوزک سنائی دیتی ہے) تو ہمیں بھی گھر کے نل کو چھوڑ کر سرکاری نل پر دوڑنا پڑتا ہے۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ جہاں کوئی چیز سرکاری ہوئی کہ وہ اپنی الگ خصوصیت اپنا لیتی ہے۔ جیسے کہ بنکوں کے قومیائے جانے کے بعد بنکوں کی خدمات بہت تیز رفتاری سے ہونے لگی ہیں۔ تو میرے اپنے مکان کے نزدیک کا سرکاری نل بھی پورے معنی میں سرکاری ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اس کو دیکھنے کیلئے کوئی فیس نہیں ہے۔ ویسے یہ دیکھنے کے لائق چیزوں میں سے ہے۔

ایک روز علی الصبح، جب کہ چڑیاں چہچہاتی ہیں، اور رات کا اندھیرا صبح کے سورج کو سلام کرکے، رخصت ہونے کیلئے بے چین ہوتا ہے، اس وقت اپنی بالٹی لے کر ہم بھی اپنے اس سرکاری نل پر جا پہنچے۔ لیکن ہم نے اسے اپنا سمجھا ہی نہیں ہو گئی۔ جیسے کسی ہنس بول کر باتیں کرنے والی الھڑ لڑکی کو محبوبہ مان لیا۔ اور اپنے جذبات کو بغیر کسی بھید بھاؤ کے جیسے کے تیسے بتادیا۔ کچھ ویسی ہی غلطی ہم سے ہوگئی جو کہ ہم اس نل پر جا پہنچے۔ وہاں بھی قطار تھی۔ سات لوگ ہم سے آگے کھڑے تھے، ایک صاحب پڑوس کی بلڈنگ کے محمد صاحب اپنا ہنڈا لگائے ہوئے تھے۔ ویسے اس نل پر پوری رفتار سے پانی آتا ہے۔ گھڑا ابھی بھرنا ہی چاہتا تھا کہ ایک صاحب بڑا سا لوٹا لئے آپہنچے۔ ہنڈا ہٹانا پڑا۔ پھر لگا تھا کہ ایک دوسرے صاحب اپنے گول ہنڈیا نما منہ میں مسواک چباتے آپہنچے۔ ان کے وہاں پہنچنے سے ہمیں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن پہنچتے ہی وہ چیخے۔ "پہلے ہم داتون کریں گے، پھر یہ ہنڈا بھرے گا۔"

"ہنڈا تھوڑا باقی ہے، بھر جانے دیجئے" محمد صاحب نے ہنڈے سے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا۔ ان کے بولنے سے پہلے ہی ہنڈا وہاں سے ہٹ گیا۔ اس کے بعد داتون کرنے والوں اور کھنکارنے والوں کی ایک الگ قطار بنتی چلی گئی جو ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ صبح ۷½ بجے تک یہ قطار ختم نہیں ہوئی۔ تو ہمیں لگا کہ یہ ساڑھے ساتی چلتی رہے گی۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ساڑھے ساتی نل پر روز کی ہے۔ اور اس نل کے لگنے کے بعد سے اس کے ستارے گردش میں ہیں۔ اور چونکہ اس نل پر ہم تو کبھی پانی بھرنے نہیں آتے اسلئے ہمارا نمبر تو کبھی نہیں آسکتا۔ چاہے سب ہی ستارے سورج کے ایک طرف ہو جائیں یا دوسری جانب اور بڑے بے آبرو ہوکر ہم اپنا سا منہ اور غیروں کی سی بالٹی لے کر لوٹ آئے۔ نہ لوٹتے تو کر بھی کیا لیتے۔ قطار کے ختم ہوتے ہی نل کے پاس والے مکان کے صاحب لمبی نال والی بندوق کی طرح اپنے گھر سے ربر کا پائپ لے کر پل پڑے۔ "اب ہمارا پائپ لگے گا: پتہ چلا نل ان کے بغل میں ہے۔ سرکاری ہے تو کیا ہوا۔ آزادی کی طرح بغل کے نل سے پائپ کے ذریعہ پانی بھرنے کا ان کا پیدائشی حق ہے۔

اس مقابلے میں ہم ڈگمگانے لگے۔ بالٹی خالی ہی سہی، اس کی جان صحیح سلامت تھی۔ یہی اُس دن کا حاصل تھا۔ تب ہمیں لگا کہ یہ سرکاری نل بھی اپنے آپ میں ایک قطب مینار ہے۔ اس پر بھی کچھ لکھا جانا چاہیئے۔ نہ لکھا تو آپ کہتے کہ ہمیں خبر ہی نہ ہوئی۔ پھر آپ کو بھی شکایت ہوتی۔

لیکن میری دوسری شکایت، اُس سے بھی عجیب ہے۔ اور جس طرح لوگوں کی مالی حالت کا پتہ، ان کے بنیے سے لگتا ہے، اسی طرح انصاف اور نظام کا صحیح اندازہ اس شکایت سے ہوتا ہے، آپ کہیں گے یہ بھی کوئی شکایت ہے۔ شکایت دکھی شکایت کرنے کا کوئی طریقہ ہے یہ ——؟ نا۔ بور نہ ہوئے۔ آپ کو بور کرکے ہم شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتے، مجھے

www.taemeernews.com

بھی شکایت ہے۔ اور یہ شکایت میں سے نکلی ذیلی شکایت ہے۔ جیسے بات میں سے بات پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کیلئے کسی فیملی پلاننگ کا انتظام ابھی تک نہیں ہوا ہے۔ اور جب بات کرنے والی دو عورتیں ہوں تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ اصل بات کیا تھی اور جو بات چل رہی ہے اس کی ابتدا کیا ہے۔ اور کس سے اس کا تعلق ہے۔

تو یہ بھی ذیلی شکایت ہے۔ ہو سکتا ہے آپ مالک ہوں گے۔ تو اپنے نوکروں کی عادتوں سے پریشان ہوں گے۔ ایڈیٹر ہوں گے تو رد چھپنے والے ادیبوں سے پریشان ہوں گے۔ اگر آپ ملازم ہوں گے تو اپنے باس کے حکم اور بات بات پر ڈانٹ سے پریشان ہوں گے۔ مالک مکان ہوں گے تو کرایہ داروں کے نخروں سے جی اُبال ہوا ہوگا۔ تب پتہ چلا ہوگا کہ نخرے صرف بیویاں ہی نہیں کرتیں۔ مگر کیا کریں، جہاں دھوپ ہوتی ہے اس کے آس پاس چھاؤں بھی ہوتی ہے۔ جیسا کہ جہاں طوطا ہوتا ہے اس کے آس پاس گوبر بھی ہوتا ہے۔

اب یہی دیکھئے۔ میرے پڑوسی نے تین گائیں کیا پالی ہیں، میرا دروازہ چراگاہ اور گوبر دان بنا ہوا ہے۔ شکایت کرو تو پڑوسی چلا کر کہتا ہے کہ سڑک کسی کے باپ کی نہیں ہے۔ میونسپلٹی کی ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ اگر یہ ہمارے باپ کی ہوتی تو بھی کیا اس کی بری حالت ہو جانے سے رہ جاتی ہے۔ تب بھی کہتا کہ کیا ہم نے صفائی کرانے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔

چلتر شکایتیں بہت ہوتی ہیں۔ جیسے کہ دفتروں میں چلتر آفیسر بہت ہوتے ہیں۔ جیسے وٹامن دوائی کی قسمیں، اور تو اور اس محلہ میں کسی کی موت کو چھوڑ کر ہر جشن پر لاؤڈ اسپیکر بجنا اور ریکارڈ ڈانس کرنا ایک معمولی بات ہے۔ صبح ۶ بجے سے لے کر رات کے بارہ بجے تک شور و غل نہ ہو تو یہ جھوٹ لگتا ہے کہ کسی کا جشن منایا جا رہا ہے اور یہ تو ایک معمولی شکایت ہے جو نہ سمجھنے کی ہے اور نہ سمجھانے کی۔ اس نظر سے پڑوسی کا روٹھنا اور محبوبہ کا روٹھنا، ایک جیسا ہوتا ہے۔

لیکن پھر ہم وہیں چلتے ہیں، اسی شکایتی گلی میں بطرز میسنر۔ ؎ جہاں پہ بار بار دل بھر آتا ہے ۔ جہاں کی خاصیت ہے کہ صبح ہوتی ہے تو سورج بعد میں نکلتا ہے اور لوگ چھرّے اور کوئلے لے کر پہلے نکل آتے ہیں۔ پاڑے اور بچڑے پھر کٹنا شروع ہو جاتے ہیں۔ کٹتے رہیں۔ ان سے ہمیں کیا لینا ہے۔ آدمی کو ایک نہ ایک دن مرنا ہوتا ہے اور جانور کو ایک نہ ایک دن کٹنا ہوتا ہے۔ فرق یہی ہے کہ ہم صبح کی سیر کو نہیں نکلیں گے اور سڑکوں پر لگی دوکانوں سے اُڑنے والے فون کے چھینٹوں سے بچ کر رہیں گے۔ سڑکوں پر نکل کر بچنے کے لئے ہی تو فلیٹ نما مکان اور ان میں کال بیل کا انتظام چلا تھا۔ جب یہ دوکان والے بھی میونسپلٹی کو 150 روپے روز کے حساب سے کرایہ دیتے ہیں اور جس کی کوئی رسید نہیں ہوتی، تو ہم بھی کیا کر سکتے ہیں۔ ہم تو ایسی کوشش میں ہیں کہ ہم بھی میونسپلٹی میں ہی نوکری کرنے لگ جائیں۔ آپ کہیں گے یہ بھی کوئی شکایت ہے۔ ہاں یہ بھی ایک شکایت ہے۔ آخر ایک جان اور اس جان کے پیچھے سو آزار۔ تو کس کس آزار کو پھوڑتا، جھڑاتا پھرے گا یہ آدمی۔

— —

www.taemeernews.com

آئیپا پانی کر (کیرالا اسٹیٹ)

آئیپا پانی کر ملیالم زبان کے معروف اور بلند پایہ شاعر اور تنقید نگار ساہتیہ اکادمی کے دو ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ شاعری کا بھی اور تنقید کا بھی۔

۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئے۔ انڈیانا (یو ایس اے) میں ڈاکٹریٹ کی تکمیل کی۔ تقریباً آدھی دنیا گھوم چکے ہیں۔ روس، رومانیہ، یوگوسلاویہ، امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جاپان ہو آئے ہیں (باقی بیدار) اس وقت کیرالا یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں بحیثیت پروفیسر کارگزار ہیں۔

تحریر: آئیپا پانی کر
ترجمہ: یوسف ناظم

مہاراجا اور مینڈک

مہاراجا کو شاہانہ ناشتے سے فارغ ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ مہاراجا کے بائیں ہاتھ کی پشت پر گزشتہ شب ایک آبلہ ابھر آیا تھا اور مہاراجہ اپنے انگوٹھے کے ناخن سے اس کی بیخ کنی میں مشغول تھے۔

یہی وہ وقت تھا جب ایک مینڈک جو ایک ستون کے آخری سرے پر بیٹھا تھا، اُچک کر مہاراجہ کے سر پر رکھے ہوئے تاج پر آ رہا۔

بڑے غور و فکر کے بعد کہ اس واقعے کو نظر انداز کر دیا جائے یا اس سلسلے میں کوئی قدم اُٹھایا جائے مہاراجہ ایک نتیجے پر پہنچے۔

کوئی حاضر ہے؟

محل کا ایک چوب دار جس کے پاؤں میں بجتی ہوئی زنجیریں تھیں، چاندی کے ایک مرصع نیزے کے ساتھ نمودار ہوا۔

عالی جاہ!! چوب دار نے عرض کیا۔

مہاراجہ نے اپنے ہاتھ پر اُبھرے ہوئے آبلے کے ساتھ اپنی مصروفیت جاری رکھتے ہوئے حکم دیا۔

وزیر سے حاضر ہونے کے لئے کہو۔

چوب دار نے پاؤں کی زنجیروں کو کھڑکھڑایا۔ نیزے کو ہلایا اور عرض کیا عالی جاہ!!

جیسے ہی چوب دار رخصت ہوا۔ وزیر نے حاضری دی اور عرض کیا

عالی جاہ! حکم کیجئے۔

www.taemeernews.com

مہاراجہ نے آملے کو انگوٹھے کے ناخن سے کُریدتے ہوئے فرمایا

" وزیراعلیٰ. ہم بہت دیر سے محسوس کر رہے ہیں کہ کوئی مینڈک اپنے حدود سے تجاوز کر کے ہمارے تاج پر آ بیٹھا ہے. ہماری خواہش ہے کہ آپ کمانڈر ان چیف کے نام فوری احکام جاری کریں کہ اس سے پہلے کہ یہ مینڈک ہمارے سر میں داخل ہو جائے، ایک فوج اس کی سرکوبی کے لئے بھیجی جائے۔"

" عالی جاہ کا حکم سر آنکھوں پر". وزیر نے عرض کیا۔

وزیر موصوف کے رخصت ہوتے ہی کمانڈر ان چیف اپنی جمعیت کے ساتھ آموجود ہوا۔ فوج نے اس مہم میں جدید ترین اسلحہ نیزے، بھالے اور لاٹھیاں استعمال کیں. مہاراجہ کا تخت اور اس پر بیٹھا ہوا مینڈک اور تاج میں چھپا مہاراجہ کا سر سر دیکھتے دیکھتے ختم ہو گئے۔

مہاراجہ کا سر گردن سے علیحدہ ہو گیا لیکن اس کے باوجود مہاراجہ نے صاف صاف لفظوں میں کہا

دیکھا! جب کوئی مینڈک، مہاراجہ کے ساتھ گستاخی کرتا ہے اُس کا یہی حشر ہوتا ہے۔

(علوم سے انگریزی اور انگریزی سے اُردو)

ایک شخص سوگوار قبرستان سے ہوا اچانک
اس کی نظر ایک قبر پہ پڑی جس کے کتبے پر
تحریر تھا
"ایمان دار کسٹم انسپکٹر"....
اس شخص نے یہ عبارت تین چار
مرتبہ پڑھی پھر بڑبڑانے لگا.
"حیرت ہے ایک قبر میں دو آدمی کس
طرح دفن کر دیئے گئے!"

www.taemeernews.com

مراٹھی: گنگادھر گاڈگل
ترجمہ: خالد اگاسکر

میں ٹیلی فون کرتا ہوں

میں سبح کی چائے پی چکا تھا اور سگریٹ پیتے ہوئے انسانی زندگی پر غور کر رہا تھا اس غور و خوض کی بنا پر میں اس نتیجے پر پہنچا کر روزانہ داڑھی بنانا سماجی جانور کے لئے خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا عذاب ہے کہ اسی وقت سگریٹ ختم ہوگئی۔ یہ سوچ کر کہ انسانی زندگی سے متعلق فی الحال اسی حد تک غور و خوض کافی ہے میں داڑھی بنانے کے لیے اٹھ گیا۔

اسی وقت خیال آیا کہ اپنے دوست کو اہم کام کے سلسلے میں ایک ٹیلی فون کرنا ہے۔ اسی لیے جلدی جلدی پلٹ کر سیلون کے نزدیک چلا گیا۔ ریسور اٹھایا، کان پر لگایا اور پٹک دیا۔ آپ جان گئے ہوں گے۔ ٹیلی فون ڈیڈ تھا۔ پھر میں نے اس کی "کھٹکھٹیاں" کھٹکھٹائیں۔ ساری مشین اٹھا کر ہلائی۔ دوبارہ اسی امید میں ریسور اٹھا کر کان سے لگایا۔ پھر خاموشی۔ کھٹ کھٹ، پٹ پٹ کچھ بھی نہیں۔ بے آواز خاموشی ——— پاڈگاؤنکر وغیرہ شاعروں کی شاعری میں ہوئی ہے اس طرح کی:۔

"ستیاناس" میں نے بے ساختہ کہا۔ یقینی طور پر یہ فقرہ شاعری کے لیے نہیں بلکہ زندگی کے لئے تھا۔

پھر اپنے پڑوسی پاٹل کے ہاں جا کر فون کرنے کے ارادے سے تیزی سے دروازہ کھولا۔ اور دروازے ہی میں ان سے میرا ٹکراؤ ہوا۔ کیوں کہ وہ خود ہی فون کرنے کے لیے میرے گھر آ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ ہنستے ہوئے بولے "ایک ارجنٹ کال کرنی تھی اور ہمارا فون بند ہے اس لیے سوچا، تمہارے ہاں سے ....؟"

پتا نہیں مجھے کیوں غصہ آگیا اور میں نے کہا۔ "پاٹل، تمہاری طرح یوزلیس USELESS پڑوسی دنیا میں کسی کو بھی نہیں ملا ہوگا۔ میرا فون بگڑتا ہے عام طور پر اسی وقت تمہارا فون بھی خراب ہو جاتا ہے۔

لیکن پاٹل کے چہرے پر مجرم ہونے کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں تھا۔ ہنس کر کہنے لگے: "تو تمہارا بھی بگڑ گیا ہے۔ اب کیا کریں؟"

ہم دونوں سوچ میں پڑ گئے۔ اسی درمیان پاٹل بولے۔

"ہم راجیہ ادھیکش کے ہاں سے فون کریں گے۔"

میں نے انکار میں گردن ہلادی۔ نہیں، انھوں نے کل ہی ہمارے ہاں سے کمپلینٹ کی ہے۔"

www.taemeernews.com

پھر ہم پانی کے کنارے کھڑے بگلوں کی طرح سوچتے رہے۔

یکایک مجھے یاد آیا۔ "چلیے، ہم دسنت راؤ کرنک کے ہاں سے فون کریں۔ ان کا فون کبھی نہیں بگڑتا۔

پاٹل نے گردن ہلائی۔ "آخر دسنت راؤ کا فون کیوں نہیں بگڑتا؟"

"اُن کا کیسے بگڑے گا۔ وہ کام گار نیتا ہیں نا؟" میں نے دل کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

پاٹل نے گردن ہلادی۔

صاحب، ان کام گار نیتاؤں کے بڑے مزے ہیں۔ ان کا فون کبھی نہیں بگڑتا۔ انھیں نہ ہوائی جہاز کے اور نہ ہی ریلوے کے ٹکٹ حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور نہ ہی ٹیکسی والے ان کی بے عزتی کرتے ہیں۔ . . . . . غصّہ کی رَو میں بولتے ہوئے میں سیڑھیوں پر چڑھ گیا اور دسنت راؤ کی گھنٹی بجائی۔

توقع کے مطابق دسنت راؤ کا فون کام کر رہا تھا! اس لیئے میں نے ان سے کہا۔ تم کام گار نیتاؤں کے بڑے مزے ہیں۔ تمہارا فون کبھی نہیں بگڑتا۔

دسنت راؤ بے چارے سیدھے سادے آدمی ہیں کہنے لگے "نہیں صاحب، میرا فون بھی بگڑتا ہے"

ظاہر ہے میں نے ان پر بالکل اعتبار نہیں کیا اور شکایت درج کرانے کے لیئے ۱۹۸ نمبر گھمایا۔ وہ انگیج بلا۔ پھر تقریباً آدھے گھنٹے تک وہ انگیج ہی رہا۔ ہوسکتا ہے بمبئی کی آدھی آبادی کے فون بگڑ گئے ہوں (جو عام طور پر ہمیشہ ہی بگڑے ہوتے ہیں) اور اسی وقت وہ بھی شکایت درج کرا رہے ہوں!

شکایت کر نہیں سکتے ایسی شکایت درج کرانے کا کہیں انتظام ہے یا نہیں۔ یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ مجھے اس بات کا تجربہ تھا کہ جب جب میرا فون ڈیڈ ہوا ہے اور باہر سے کسی نے فون کیا ہے تو میرا فون چلنے لگا ہے۔ اسی لیئے میں نے کرنک کے ہاں سے اپنے گھر فون کیا۔ ترکیب کارگر ہوئی۔ میں دوڑا دوڑا گھر لوٹا اور اپنے دوست کو فون کیا۔ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ نمبر فوراً مل گیا۔ میرے دوست نے فون اُٹھایا۔

میں نے کہا "ہیلو ——"

"ہیلو"

"میں گاڈ گل بول رہا ہوں؟"

"ہیلو ——"

"ارے ہیلو ہیلو کیا کرتے ہو؟ میرا کام یوں ہے..."

"ہیلو"

"مائے گاڈ! میں گاڈ گل بول رہا ہوں، سُن رہے ہو؟"

میں اتنی زور سے چلایا کہ بیوی دوڑتی ہوئی باہر آئی۔

"ہیلو ——" اس کے ساتھ ہی دوست کے فون رکھنے کی آواز۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ میری آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ ٹیلی فون خراب ہوجانے کے مختلف اقسام میں سے ایک قسم —— اس حالت میں ٹیلی فون کرنا گویا سرکاری آفیسر سے خط و کتابت کرنا ہے۔ نہ ہی وہ اپنا خط دیکھتا ہے اور نہ ہی پڑھتا ہے اسے جو کچھ تقاضہ کرنا ہوتا ہے کرتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ آپ کو تا تون ۳۲ الف کے تحت پانچ سو روپے فلاں تاریخ تک بھرنے ہیں۔ دوسری صورت میں آپ کی جائداد نیلام کر کے رقم وصول کرلی جائے گی۔

www.taemeernews.com

آپ لکھتے ہیں کہ یہ رقم آپ پر واجب الادا نہیں ہے بلکہ سرکاری محکمہ ہی سے آپ کو بارہ سو روپے لینے ہیں۔

اس کا جواب ملتا ہے کہ قانون ۳۲ الف کے تحت آپ کو فلاں تاریخ تک پانچسو روپے جمع کرنے تھے آپ نے ابھی تک ادا نہیں کیے اس لیئے آپ ہی بتائیے آپ کی جائداد کیوں نہ نیلام کردی جائے۔

آپ، پھر دل پر جبر کر کے لکھتے ہیں کہ اس رقم کی ادائیگی کی آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

پھر جواب ملتا ہے کہ ۳۲ الف کے تحت آپ کی جانب سے رقم ادا نہ کیے جانے کی بنا پر آپ کی جائداد کی نیلامی کے سلسلے میں مزید کارروائی کی جارہی ہے۔

نتیجے میں گھبرا کر آپ پانچ سو روپے بھر دیتے ہیں اور پھر سترہ سو روپے وصول کرنے کے لیئے عریضہ داخل کر دیتے ہیں۔

اس عریضے کا اور اس کے تعلق سے کی گئی شکایت ناموں کا پھر کوئی جواب نہیں ملتا۔

میرے سرکاری آفیسر نہ ہونے کی بناء پر میں اپنے دوست سے اس طرح ایک طرفہ بات چیت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیئے اب آفس ہی سے فون کرنے کا ارادہ کر کے میں داڑھی بنانے چلا گیا۔

اسی وقت بھائی کا فون بجا۔ بیوی فون اٹھانے لگی اس توقع پر کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد چہرے پر صابن لگی حالت میں باہر آیا اور فون اٹھا لیا۔

میں نے کہا "ہیلو"

فون میں سے نہایت مدھم آواز آرہی تھی۔ ایسے معلوم ہورہا تھا کہ کسی شخص کو دیوار میں چنا جارہا ہو آخری اینٹ لگائی جاچکی تھی اور دیوار ہی میں سے ایک آواز رحم کی بھیک مانگ رہی ہو۔

میں نے اس بدنصیب شخص کو پہچاننے کی کافی کوشش کی۔ وہ زور سے بولے اس لیئے پہلے میں نے ہلکی آواز میں پھر زوردار آواز میں بات کی۔ اس کے باوجود آواز اتنی ہی مدھم رہی۔ یہ سمجھ کر کہ میری آواز اس شخص تک نہیں پہنچ رہی ہے میں زور سے چیخا "زور سے بولیئے"

اسی وقت باورچی خانے میں ہانڈی کے تیزی سے گرنے کی آواز آئی اور پھر بیوی جھٹکے سے باہر آکر بولی "تم اس طرح چلایا مت کرو بابا، میرے ہاتھوں سے چاول کی ہانڈی گر پڑی نا"

لیجئے، یعنی غلطی میری ہی تھی۔ میں نے غصے سے فون اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ کچھ دیر بعد وہ زور زور سے چیخنے لگی اور پھر ریسور پٹک کر چلی گئی۔

چہرے کے سوکھے ہوئے صابن کو گیلا کر کے میں نے داڑھی بنانی شروع کردی۔ کہ اسی وقت ٹیلی فون پھر بجنے لگا۔ میں پھر پیر پٹختے ہوئے باہر آیا اور فون کان سے لگا لیا۔

"کون چھو؟" ایک گجراتی نے موٹی آواز میں دھمکایا۔

"دس از . . . ." میں نے غصہ پر قابو پاتے ہوئے اپنا نمبر بتایا۔

"کون چھو؟ منگن؟" گجراتی نے مجھے پھر دھمکایا۔ دوسرا کیا بول رہا ہے یہ سننا بھی ٹیلی فون پر ہونے والی آمدورفت کا ایک حصہ ہے لیکن دوسروں کی طرح اُسے بھی یہ تسلیم نہیں تھا۔

"منگن نہیں، تمارا باپ" یہ کہتے ہوئے میں نے ٹیلی فون پٹک دیا اور دوبارہ چہرے پر صابن کا جھاگ بنانا شروع کیا۔

www.taemeernews.com

لیکن داڑھی ختم ہونے تک میں لارنس اینڈ ٹوبرو، ایسٹیک انرجی اور جوہو ہوٹل کو کیے گئے فون لے چکا تھا۔

اس کے بعد پھر ایک مرتبہ اپنے دوست کو فون کرنے کی کوشش کی۔ اس کے فون کی گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ مجھے شک گزرا کہ میرا دوست اپنے بال بچوں سمیت کسی دوسری جگہ تو نہیں چلا گیا۔ اس کے یکایک اس طرح گھر چھوڑنے کی وجہ میری سمجھ میں نہ آسکی۔

اسی وقت لگاوٹ کے لہجے میں کسی نے کہا۔ "ہیلو ڈارلنگ"۔

اس پیاری آواز کو میں جواب دینے ہی جارہا تھا کہ ٹیلی فون پر تیسرا ڈارلنگ بولنے لگا۔ اور میں کان لگا کر ان کی بات چیت سنتا رہا۔ ادیبوں کے پاس ایسی حرکتیں کرنے کا لائسنس وغیرہ ہوتا ہے۔ ہے نا؟

اسی وقت بیوی بولی "ٹیلی فون کان سے لگا کر اس طرح چپ چاپ کیوں بیٹھے ہو؟"

مجبور ہوکر میں نے فون رکھ دیا اور نہانے کے لیے چلا گیا۔

آفس میں پہنچتے ہی میں نے فون اٹھایا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا یعنی آپریٹر میری طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ میں نے چار مرتبہ فون کھٹکھٹایا تب کہیں جاکر آپریٹر خوش ہوئی اور پوچھا۔

"یس سر؟"

میں نے اپنے دوست کا نمبر دیتے ہوئے کام کی اہمیت جتادی اور اپنے کام میں لگ گیا۔

گھنٹہ بھر بعد پھر دوست کو فون کرنے کا خیال آیا۔ میں نے فون اٹھایا اور پوچھا۔

"میں نے جو نمبر دیا تھا اس کا کیا ہوا؟"

"کونسا نمبر؟" اسی درمیان دوسری آپریٹر بورڈ پر بیٹھ چکی تھی۔ میں نے اُسے ساری تفصیل سمجھاتے ہوئے کام کی اہمیت بھی جتادی۔

اس نے فوراً لائن دینے کا وعدہ کیا لیکن آدھے گھنٹے تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ اسی درمیان مجھے باتھ روم جانے کی ضرورت پیدا ہوگئی تھی۔ لیکن میرے جاتے ہی آپریٹر نمبر حاصل کرلے گی اپنے اس پرانے تجربے کی بناء پر میں جگہ سے ہل بھی نہ سکا۔ صرف آپریٹر کو نہایت خوش دلی سے یاددہانی کرائی۔ نمبر مسلسل انگیجڈ مل رہا تھا۔ یہ کہہ کر پھر اپنی کوشش جاری رکھنے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد پھر آدھے گھنٹے تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ اسی بیچ میرے پیٹ میں مروڑ ہونے لگی تھی اور حالات قابو سے باہر ہوگئے تھے۔

خوش قسمتی سے اسی وقت آپریٹر نے گھنٹی کے ذریعے اشارہ دیا اور میں نے بے چینی سے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

"یور نمبر سر" آپریٹر بولی اور اس نے لائن دے دی۔ لیکن یہ سکنڈ بھر کی دیر دوسری آپریٹر سے برداشت نہ ہوسکی اور وہ دوسری کالس لینے میں مصروف ہوگئی۔ نتیجے میں میں پھر پانچ منٹ تک لٹکا رہا۔ آخر اس نے میری کال لی اور پوچھا۔ ہو

www.taemeernews.com

"ہُوم ڈو، یو وانٹ، پلیز؟" (WHOM DO YOU WANT, PLEASE)

مَیں نے اپنے دوست کا نام بتایا.

"جسٹ اَ مومنٹ پلیز (JUST A MOMENT PLEASE) ڈ لائن از بزی. ہولڈ آن پلیز" اس نے میٹھی آواز میں فرمایا.

پھر پانچ منٹ تک کوئی واقعہ نہیں ہوا اور پھر یکایک انگیجڈ کی گھنٹی بجنے لگی. مَیں نے فون نیچے پٹک دیا اور دوڑتا ہوا باتھ روم میں چلا گیا.

وہاں سے لوٹ کر مَیں نے پھر اپنی آپریٹر کو دوست کا نمبر دیا.

اس نے مجھے وہ نمبر ایک بج کر دس منٹ پر دیا. اس وقت میرا دوست لنچ کے لئے باہر گیا تھا. اس لیئے مَیں بھی لنچ کے لیئے باہر چلا گیا.

لوٹنے پر . . . . جانے دیجئے. آخر پانچ بجے تک مجھے اپنے دوست کا نمبر مل نہ سکا. اس لیئے مَیں گاڑی لے کر سیدھے دوست کے آفس پہنچ گیا.

مجھے دیکھتے ہی اس کی سیکریٹری نے فوراً مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی.

مَیں اندر گیا تو دیکھا کہ میرا دوست ٹیلی فون سے کان چپکائے بیٹھا ہے. وہ بولا.

"یس ــــ یس، گیومی گاڈ گل پلیز". ظاہر ہے ہمارے آفس سے گاڈ گل کے باہر جانے کی اطلاع اُسے مل ہوگی.

اس نے غصّہ سے فون پٹک دیا اور بولا "ستیاناس"

پھر اس کی نظریں میری طرف اُٹھیں اور وہ یکایک اُٹھ کر چلایا.

"بائے جو ــــ تھینک گاڈ، یو کیم. صبح سے تمہیں فون کرنے کی کوشش کر رہا ہوں."

آگے بڑھ کر قریب قریب اس نے مجھے لپٹا لیا. کچھ دیر اِدھر اُدھر کی گپ شپ کے بعد ہم کام کے تعلق سے گفتگو کرنے لگے.

اسی وقت میز کا فون چلّا اٹھا. اس نے اٹھایا. کچھ دیر بات چیت ہوتی رہی اور پھر یکایک جسم میں جن بھوت داخل ہونے جیسی کیفیت میں دوڑ بھاگ کرنے لگا. ضرورت کے کاغذات بریف کیس میں ٹھونس کر باہر جاتے ہوئے بولا "سوز! مجھے اب جانا ہی چاہیئے. بے حد ارجنٹ کام ہے لیکن تمہارا کام مَیں نے ہاتھوں میں لے لیا ہے اس میں . . . . . لیکن تم ایسا کرو رات میں گھر پر فون کرو، یعنی اطمینان سے بات چیت کروں گا تم سے؟"

وہ جلدی جلدی نکل گیا

اور مَیں میز پر ہاتھ پٹکتے ہوئے بولا "ستیاناس"

○○

www.taemeernews.com

ولنود بھٹ
گجراتی سے ترجمہ:۔ ڈاکٹر سکنیا جوہری

اگر شانتی لال مل جائے

آپ اگر ۲۷ نمبر کے بس اسٹاپ پر کھڑے ہوں تو آپ کی بغل میں ایک صاحب پان چباتے ہوئے دکھائی دیں گے. آپ اس کے سامنے دیکھیں گے تو وہ آپ سے دوستانہ انداز میں پوچھے گا۔ "۲۷ نمبر گئی؟" آپ کو نہیں میں جواب دینا پڑے گا کیوں کہ آتی ہوئی تو آپ اس میں چلے گئے ہوتے. اور اس سوال کا جواب دینے سے بچ گئے ہوتے.

"آپ اخبار میں کالم لکھتے ہیں نا؟" یہ سن کر آپ متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ دُنیا کس قدر چھوٹی ہے.

"یوں تو صاحب ہم نے بھی بہت لکھا ہے". وہ کہتا ہے اور آپ کا تعجب دگنا ہو جاتا ہے.

اب اس شانتی لال کو جب بھی آپ بس اسٹاپ پہ دیکھتے ہیں، آپ خوشی محسوس کرتے ہیں ــــ جوڑوں کے درد کے بیمار سے اسی بیماری کا دوسرا مریض ملنے پر جو خوشی محسوس کرتے ویسی ہی خوشی اب آپ کو شانتی لال کو بس اسٹاپ پر دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے.

آج شانتی لال بس اسٹاپ پر نہیں دکھائی دیا، آپ کو یاد آیا کہ کل بھی تو وہ دکھائی نہیں دیا تھا. آپ کے دل میں اس کے بارے میں کوئی غلط خیال پیدا ہوتا ہے، صرف ایک ہی لمحہ کے لئے.

آپ اپنے آفس میں قدم رکھتے ہی چونک اُٹھتے ہیں، شانتی لال آپ کے سامنے والی کرسی پر بیٹھے پان چبا رہے ہیں.

"ارے شانتی لال آپ؟" آپ متعجب ہو کر پوچھتے ہیں۔"

"آپ سے تھوڑا کام تھا" شانتی لال نے کہا.

فرمائیے! آپ ہمہ تن گوش ہو کر سُنتے ہیں۔ وہ بغیر کچھ کہے پان چباتے رہتے ہیں اور آپ ذرا بے چینی محسوس کرتے ہیں. پھر آپ کے کان کے پاس منہ لا کر آہستہ سے پوچھتے ہیں.

"کیا بجا ہے؟"

www.taemeernews.com

"پونے گیارہ"۔ آپ جواب دیتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ یہ شخص کیا صرف وقت معلوم کرنے کے لئے اس قدر دور آیا ہے!

"دوست، مجھے ایک ہزار روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ میرے لئے زہر پینے کا وقت آگیا ہے" زہر کیا اس قدر مہنگا ہوگیا ہے۔ آپ سوچتے ہیں۔ پھر آپ شانتی لال کی طرف دیکھتے ہیں۔ وہ آپ کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ آپ کا دل موم ہو رہا ہے، یہی تو آپ کی کمزوری ہے۔ ویسے تو آپ کے پاس بھی اس وقت اتنے روپے تو ہیں نہیں، آپ کی اسکوٹر کا سودا تو آج کل میں ہی طے ہونے والا ہے۔ اسی میں سے آپ نے شانتی لال کو دینے کا فیصلہ کیا ہے، لیکن اپنا یہ فیصلہ کس انداز میں شانتی لال کو سنائیں، آپ اسی فکر میں ہیں۔ شانتی لال آپ کے جواب کے انتظار میں آپ کی طرف متوجہ ہے۔

"ابھی تو میرے پاس گنجائش نہیں ہے . . . . . دو تین دن کے بعد ملے گا اور اگر ممکن ہوا تو دوں گا" آپ نے جواب دیا۔

"تو میں منگل کے روز حاضر ہوں گا"۔ . . . کہہ کے شانتی لال رخصت ہوتے ہیں۔ اور منگل کے روز آپ کے دفتر پہنچنے سے پہلے ہی شانتی لال آپ کے منتظر بیٹھے ہیں۔ دھا سکوٹر کا سودا تو اب تک طے ہی نہ ہو سکا، یہ جواب فوراً اسے دیکھ کر آپ کے ذہن میں آجاتا ہے۔ آپ کرسی پر بیٹھیں اس قدر بھی صبر نہ کرتے ہوئے شانتی لال پوچھتے ہیں۔ کیوں جناب کچھ انتظام ہوا؟"۔

نہیں، نہیں ہو سکا۔ آپ مایوس کن آواز میں کہتے ہیں۔

"ارے یوں تھوڑی چلے گا بھلے آدمی، آپ کے بھروسے پر تو میں نے اپنے قرض خواہ کو آج کا وعدہ کیا ہے۔ اور اگر آپ کر جائیں تو کیسے چلے گا۔ کچھ بھی کرو ۔۔۔ مجھے تو دو دن میں پیسے چاہئیں، کیا سمجھے؟ میں جمعرات کو پھر آجاؤں گا کہہ کر وہ چلے جاتے ہیں۔

جمعرات کو شانتی لال آپ سے آگے ہی آپ کے دفتر کا زینہ چڑھ رہا ہے۔ آپ اس کے پیچھے ہیں، پل بھر کے لئے آپ کے جی میں واپس لوٹ جانے کا خیال پیدا ہوتا ہے لیکن آپ ویسا نہیں کرتے۔

"کیوں بات کچھ بنی" وہ پوچھتے ہیں اور آپ سر پیٹ لیتے ہیں۔

"یہ نہیں چلے گا، ہاں، نہیں تو پانچ پندرہ کم کر کے ہی بات ختم کرو"

"شانتی لال میرے پاس سچ مچ ہی پیسے نہیں ہیں" آپ عاجزی سے کہتے ہیں۔

"دیکھو دو دن کی مہلت دیتا ہوں"

"اور سینچر کو" آپ کچھ کہیں اس سے قبل ہی شانتی لال چلانے لگتے ہیں۔

"آج میں آپ کی ایک نہیں سنوں گا، مجھے تو پیسے چاہئیں، کیا سمجھے، پیسا"

آپ کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے آپ کے ساتھی سمجھتے ہیں کہ شانتی لال قرض خواہ ہے۔ اور آپ اسے پیسے کے لئے چکر کٹوا رہے ہیں۔ آج تو خود آپ کو بھی اس بارے میں شبہ پیدا ہوگیا ہے۔

"بھئی سوچ کیا رہے ہو"

www.taemeernews.com

"اتنی بڑی رقم ایک ساتھ کہاں سے لاؤں، یہی بات سوچ رہا ہوں"۔ . . .

"یہ آپ کا مسئلہ ہے، میرا نہیں" پھر وہ تھوڑی نرمی سے کہتے ہیں.

"ابھی اگر پوری رقم نہ دے سکو تو ساڑھے سات سو ہی دے دو ـــ اس وقت تو اتنی میں چلا لوں گا، اور کیا منگل کو پھر آجاؤں گا"

منگل کا دن بھی جلدی سے آگیا۔ آپ کی نظروں میں مجبوری کے جذبات دیکھ کر شانتی لال کہتا ہے "یہ تو میں پہلے سے ہی جانتا تھا کہ آپ مجھ سے مفت میں چکر کٹوائیں گے، اچھا دیکھئے آپ کی اور میری دونوں ہی کی بات رہنے دیجئے، آپ پانچسو ہی دے دیجئے تو میری جان چھوٹے . . ." لیکن پانچ سو روپے . . . "

"اچھا تین سو ہی دے دیجئے۔ اتنی مہربانی تو دوسرا کوئی نہیں کرے گا، ہاں" ـــ اب مہربانی فرما کر دھکے مت کھلایئے شانتی لال زینہ اتر کر چلے جاتے ہیں.

جمعرات کو شانتی لال آپ کے سامنے کرتے کی آستینیں چڑھاتے ہوئے بیٹھے ہیں، آپ اس سے نظر تک نہیں ملا سکتے اور وہ شروع ہو جاتے ہیں "آپ کے وعدوں سے میں تنگ آگیا ہوں؛ لیکن آج میں طے کر کے آیا ہوں کہ بنا پیسے لیئے آج میں یہاں سے ہٹوں گا ہی نہیں"

"لیکن میرے پاس تین سو روپے تو ہونے چاہیں؟" آپ منہ بناتے ہیں.

"تو کتنے دیں گے فوراً کہہ دو، میری بھی تو سمجھ میں آجائے . . . . جلدی کرو، میرے پاس وقت نہیں ہے"

آپ اس سے نظریں ملانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں "دو سو دینا بس، اب تو خوش؟"

لیکن اب تو ایک ہی وعدہ کرنا، تو اب کب آؤں"

"آپ کو کس روز آسانی رہتی ہے" آپ دبی آواز میں پوچھتے ہیں.

"سنیچر . . . . "

"اچھا تو ہر سنیچر کو آنا" آپ مذاق کر بیٹھتے ہیں. شانتی لال آپ کا مذاق تو سمجھ ہی گئے ہیں پھر بھی ناسمجھی کا لبادہ اوڑھے کہتے ہیں "اچھا تو میں پھر سنیچر کے روز آجاؤں گا"

اب آپ کو بھی مذاق سوجھتا ہے اور سنیچر کا وعدہ بھی آپ پورا نہیں کرتے تو شانتی لال منہ بنا کر کہتے ہیں "آدمی تو بہت دیکھے لیکن آپ جیسے بدمعاش سے تو خدا بچائے. دیکھو میں صاف صاف کہتا ہوں، مجھے اس قسم کی بدمعاشی سخت ناپسند ہے، آج شام کو دو سو اور اگر دو سو بھی نہ ہو سکے تو سو ہی دے دو تو جان چھوٹے، شام کو ساڑھے پانچ بجے پھر حاضر ہوں گا"

اب ہمیں شانتی لال کو چڑانے میں ایک طرح کا لطف آرہا ہے. شانتی لال کو غصہ دلانے کے لئے آپ ایک لفافہ میں دس روپے کا نوٹ رکھ کر آپ لفافہ بند کر دیتے ہیں اور اوپر لکھتے ہیں "شانتی لال کے لیئے"

www.taemeernews.com

شانتی لال وقت کے بہت پابند ہیں، ساڑھے پانچ سے قبل ہی وہ آپ کے دفتر میں حاضر ہو گئے ہیں آپ اسی وقت وہ لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں۔

"میں نے کہا تھا اتنا ہی ہے نا" وہ پوچھتے ہیں۔

"مجھے جو کچھ دینا تھا وہ اس میں رکھ دیا ہے، مجھے وہ واپس بھی نہیں لینا ہے۔" آپ آہستہ سے کہتے ہیں آپ کے سامنے شانتی لال نے لفافہ کھولا تو اس میں دس روپے کی نوٹ دیکھ کر بلا جھجک آپ کے سامنے ہی لفافہ پھاڑ دیتے ہیں اور اس سے پہلے دس کی نوٹ اپنی جیب میں رکھ لیتے ہیں۔

"آپ نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے"۔ . . . یہ کہہ کر پیر پٹکتے ہوئے وہ آپ کی آفس کا زینہ اُتر جاتے ہیں۔

اب آپ شانتی لال کو ۲۷ نمبر کے بس اسٹاپ پر نہیں دیکھتے ہاں اسے دو نمبر کے بس اسٹاپ پہ "دو نمبر کی بس گئی"؟ ایسا کسی کو دوستانہ انداز سے پوچھتے سُنا تھا، آپ کو دیکھتے ہی انہوں نے منہ پھیر لیا تھا، دراصل اس وقت آپ کو بھی وہی فکر لاحق تھی کہ کہیں اس نے آپ کو دیکھ تو نہیں لیا!

چشمے کا نمبر

ایک ڈاکٹر کو کسی خاتون نے شکایتی مراسلہ بھیجا۔ مراسلے کے مندرجات یہ تھے:۔

"نہ جانے آپ نے میرے شوہر کو کیا کھلا دیا ہے کہ اس کا مزاج ہی بدل گیا۔ آپ کے علاج سے پہلے وہ مطمئن اور اچھا شوہر تھا۔ وہ مجھے دنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار کرتا تھا۔ کسی اور کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ ہر وقت گھر کی آرائش اور میرے سلیقے کی داد دیتا تھا۔ اب تو اس کے انداز ہی انوکھے ہیں۔ وہ میری صورت میں ہزار عیب نکالتا ہے۔ ڈرائنگ روم کو چاہے میں کتنی محنت سے سجاؤں اُسے کوئی سجاوٹ، کوئی تصویر پسند نہیں آتی۔ مجھے شبہ ہے کہ وہ دوسری عورتوں میں بھی دلچسپی لینے لگا ہے۔ پلیز! ڈاکٹر صاحب بتائیے آپ نے اُسے کیا دیا ہے؟"

اس خط کے جواب میں ڈاکٹر نے لکھا:۔ "آپ بلاوجہ بگڑ رہی ہیں میں نے آپ کے شوہر نامدار کو کوئی دوا نہیں دی۔ صرف اس کے چشمے کا نمبر درست کر دیا ہے۔ اب وہ ہر شے کو اس کی اصلی صورت میں دیکھ سکتا ہے۔"

www.taemeernews.com

لگن بہاری لال مہتہ
گجراتی
مناظر عاشق ہرگانوی
اردو

بلاعنوان

تعارف مترجم :

نام: مناظر عاشق ہرگانوی

تعلیم، ایم اے۔

لکھنے کا شغل، ۱۹۶۲ء سے

شائع شدہ کتابیں : ۱۔ امتزاج ۲۔ آنچ ۳۔ میوۂ تلخ ۴۔ کلام نرم و نازک ۵۔ اردو کی کہانی شعراء کی زبانی ۶۔ صدرنگ آنچل ۷۔ حرف سخن ۸۔ ترسیل ۹۔ ارتقاء ۱۰۔ نئے شاہکار افسانے ۱۱۔ منتخب غزلیں ۱۲۔ اغوا ۱۳۔ کھیل ہی کھیل میں ۱۴۔ گدھ کے پنجے ۱۵۔ جنگل کا ڈاکو ۱۶۔ ملانا بالغ ۱۷۔ مظہر امام۔ ایک تعارف ۱۸۔ خدنگ جستہ ۱۹۔ فن تنقید اور تنقیدی مضامین

زیر طبع کتابیں : جمیل مظہری احوال و فن ۲۔ ناگزیر ۳۔ جلترنگ ۴۔ شناخت ۵۔ آزاد غزل کا فن۔

ہندی میں شائع شدہ ایک کہانی پر ساہتیہ سیوا سنگھ میرٹھ (یوپی) نے ۱۹۷۱ء میں "ساہتیہ وشارد" (علامہ) کا خطاب۔

ملازمت، آل انڈیا ریڈیو (پٹنہ) سے نو ماہ منسلک رہا۔

مارکھم کالج ہزاری باغ (بہار) میں تین سال صدر شعبۂ اردو رہا۔ ۱۹۸۱ء سے مارواڑی کالج بھاگلپور (بہار) میں درس و تدریس کا کام کر رہا ہوں۔ ملک کے کئی رسائل سے وابستہ رہا۔ ان دنوں ماہنامہ کوہسار بھاگلپور، ماہنامہ گلبن احمد آباد اور ہفتہ وار "ہمدرد" آسنسول کو ایڈٹ کر رہا ہوں۔ ویسے ماہنامہ خوشبو دہلی، ماہنامہ اسباق "پونہ ماہنامہ "مفہوم" بہلنا پور اور دو ایک رسالے کی مشاورت میں شامل ہوں۔ اردو میں صنف آزاد غزل کے تن مردہ میں جان ڈالنے اور اسے پروان چڑھانے میں خاص عمل دخل ہے!

★

ریلوے بکنگ آفس جا کر میں نے کہا "سون گڑھ کے دو ٹکٹ فرسٹ کلاس کے دیں گے؟"

چھوٹی سی کھڑکی سے آنکھیں نکال کر اونچی آواز میں کلرک نے سوال کیا "سون گڑھ؟ کون سا سون گڑھ؟ تین

www.taemeernews.com

سون گڑھ ہیں جن میں دو اسٹیشن ہیں۔"

میں، ٹکٹ تو اسٹیشن کا ہی لینا ہے۔

کلرک، لیکن دو میں سے کس کا؟

میں: پہلا سون گڑھ کہاں ہے میں نہیں جانتا۔ دوسرے کا ٹکٹ دے دیجئے (وہ) یہ ملک میں ہے

کلرک: ہمارے قصبے میں ملک جیسا کہیں کچھ ہے ہی نہیں۔

میں، اب وہ گجرات کا حصہ ہے۔ مگر پہلے الگ اسٹیٹ تھا۔ اس کے وزیر اعلیٰ.....

کلرک، (مجھے ٹوکتے ہوئے) یہ سب تفصیل یہاں بے کار ہے۔ مجھے یہاں ملک کی تاریخ یا جغرافیہ سیکھنے کے لیے نہیں بٹھایا گیا ہے۔

میں: ایک شہری کے ناتے دوسرے شہری کو ملک کی عوامی حقیقت سے متعارف کرانا فرض بھی ہے۔ جمہوری عوام کہلانے کے لیے یہ ضروری ہے۔ اس درمیان میرے پیچھے ٹکٹ لینے والوں کی لمبی لائن لگ چکی تھی۔ کئی پریشان ہو رہے تھے، کئی بے چین تھے اور کچھ کو مزا آ رہا تھا کہ دونوں کے بیچ خوب ٹھنی ہے۔

کلرک: میری معلومات بڑھانے کی تکلیف آپ گوارا نہ کریں۔ آپ کو جانا کہاں ہے یہ صاف صاف بتائیں۔

میں، تیسری بار۔ نہیں دوسری بار کہہ رہا ہوں کہ جو سون گڑھ ملک میں ہے اس کے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ چاہئیں۔

کلرک: دوسرا ٹکٹ کس کے لیے؟

میں: (ہاتھ پیچھے گھما کر) اس سے آپ کو کیا لینا دینا ہے؟ میری نگرانی کرنے کا آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا۔

کلرک: جناب میں نے اسی لیے پوچھا کہ اکثر لوگ دو ٹکٹ لے کر ان میں سے ایک بلیک مارکیٹ میں فروخت کر دیتے ہیں۔ مجھے کیا لینا دینا ہے۔ آپ جس کے ساتھ چاہیں جائیں۔ ریلوے کسی پر پابندی تھوڑے ہی لگا سکتی ہے۔

میں: تو میں اعلان کر رہا ہوں کہ دوسرا ٹکٹ مجھے اپنی بیوی کیلئے چاہیے۔ عورت نصف حصہ نہیں جسم ہوتی ہے۔ پھر بھی سفر کی طور طریق کی وجہ سے اس کا بھی پورا ٹکٹ لینا پڑتا ہے۔ اس بارے میں میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ پورے پینتالیس سال پہلے ہماری شادی احمد آباد میں ہوئی تھی۔ بڑی سادگی سے ہوئی تھی.....

کلرک: آپ کی شادی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ٹکٹ کی بات کیجئے

میں، اگر آپ کو دو سون گڑھ کا فرق نہیں معلوم ہے تو مجھے نقشہ دیجئے میں ڈھونڈ دیتا ہوں۔

کلرک: ریلوے کا نقشہ مسافروں کے لیے نہیں ہے۔ وہ ایسے مہم ہوتا ہے کہ ریلوے کا کلرک بھی بیس سال نوکری کرنے کے بعد ہی اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں: تو ٹائم ٹیبل دیجئے، میں دیکھ کر بتاتا ہوں۔

کلرک: ٹائم ٹیبل یہاں نہیں بیچا جاتا۔ پرچا گیٹ کے آفس میں پتہ لگائیے یا سرکاری پبلشنگ دوکان میں جا کر خریدیئے۔

میں: گورنمنٹ پبلشنگ آفس سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ ٹائم ٹیبل چھاپنا اب بند کر دیا گیا ہے اور پرانے ٹائم ٹیبل بھی واپس لیے جا رہے ہیں۔

کلرک: اس کی وجہ ہے کہ پہلی اپریل سے ٹائم ٹیبل کا طریقہ بند ہو رہا ہے۔ اب ٹائم ٹیبل نہ شائع ہوں گے اور نہ کسی کو ملیں گے۔

www.taemeernews.com

یہ سنتے ہی میرے آس پاس اور پیچھے کھڑے لوگوں میں کھلبلی مچ گئی: "کیوں؟ اس طرح کیسے چلے گا؟ لوگوں کو گاڑیوں کے آنے جانے کے وقت کا پتہ کیسے چلے گا؟"

میں جو اب تک دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہو رہا تھا، اب اس بھیڑ کا لیڈر بن گیا۔ میں نے پوچھنا جاری رکھا: "لیکن اس کی وجہ؟ عوام کو کتنی پریشانی ہوگی پہلے سے جو پریشانی ہے، وہی کیا کم ہے؟"

پیچھے سے کئی لوگ بول اٹھے "ہیئر، ہیئر!"

کلرک: ٹائم ٹیبل کا صرف بیجا ہوتا تھا۔ عام لوگوں کے لیے تو اسے پڑھنا اور سمجھنا دشوار ہے۔ اسے سمجھانے کے لیے "گائیڈ" بنوانے کی بات بھی اس بار سوچی گئی تھی۔ اس دشواری کے سبب لوگ غلط سلط سمجھ بیٹھتے ہیں اور الزام ریلوے کو دیتے ہیں۔ پھر ٹرین ذرا کہیں لیٹ ہوگئی تو غل غپاڑہ کرتے ہیں۔ الٹی سیدھی باتیں کرتے ہیں اور پٹری پر جمع ہو جاتے ہیں۔ دوسری آتی جاتی گاڑیوں کا آنا جانا روک دیتے ہیں۔ ڈبوں پر پتھر پھینکتے ہیں۔ انجن کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ڈرائیوروں اور گارڈ وغیرہ کو مارتے ہیں۔ سگنل اور سگنل آفس جلا ڈالتے ہیں۔ اسٹیشن کے چائے کے اسٹالوں سے مفت چائے پی ڈالتے ہیں۔ یہ سب گڑبڑ روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ گاڑیوں کے آنے جانے کا مقررہ وقت آخر تک پوشیدہ رکھا جائے۔

میں نے زور دار مخالفت کی "یہ تو سراسر ظلم ہے۔ یہ دوا تو مرض سے بھی بری ہے۔ لاکھوں مسافروں کو پریشانی میں ڈالنا کہاں تک مناسب ہے؟ ہمیں سپریم کورٹ جانا پڑے گا۔"

بھیڑ سے کئی نے تالی بجائی۔ کئی نے "شرم! شرم!" کے نعرے لگائے۔ کلرک ناراض ہو کر چلایا۔ "خاموش رہیے! یہ کوئی چوپاٹی یا شیواجی پارک نہیں ہے۔" اور مجھے دھمکایا "ذرا سنبھل کر بولیے۔ ریلوے سرکاری محکمہ ہے کسی بھی سرکاری محکمے کے خلاف بولنا، وطن سے غداری ہے۔ موقع پرستوں نے ملک کو گرانے کی جو سازش چلا رکھی ہے۔ اس میں آپ شریک ہوں گے تو پچھتائیں گے ....."

میں: حد ہو گئی۔ یہ تو! ملک اور سرکار، ریاست اور اس کے محکمے، ماں وطن اور کیبنٹ، یہ الگ الگ چیزیں ہیں۔ کسی محکمہ کی تنقید کرنا یا اس کی غلطی بتانا کوئی گناہ نہیں ہے۔ ابھی ہم نے تاناشاہی نہیں اپنائی ہے۔ یہ سن کر آس پاس کے لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔

کلرک بڑبڑا کر: میں سیاسی بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ وہ میرا کام بھی نہیں ہے۔ مجھے تو بس اتنا کہنا ہے کہ ٹائم ٹیبل کا سہارا لے کر مسافر تیاری کر لیتے ہیں۔ اگر اس کا علاج نہیں کیا گیا تو حالت اور بھی بگڑ جائے گی۔ شاید ٹرینوں کا آنا جانا بھی بند کرنا پڑے۔

میں: لیکن ٹرینوں کو وقت کا پابند بنانا صحیح علاج نہیں ہے؟ میں نے سنا ہے کہ جاپان میں کوئی ٹرین دو تین منٹ بھی لیٹ ہو جاتی ہے تو ڈرائیور کو جواب دہ ہونا پڑتا ہے اور اگر ٹرین پندرہ منٹ سے زیادہ لیٹ

www.taemeernews.com

ہو جائے تو کیا یہ بھی مسافروں کو لوٹا دیا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی اگر ایسا اصول ہو تو بیشتر لوگ مفت ہی میں سفر کر سکیں گے۔ اس سے ریلوے کا بجٹ بھی گڑبڑا جائے۔ لوگوں کو کتنا فائدہ ہوگا۔

میرے از خود پیدا مقلدوں میں خوب کھلکھلاہٹ ہوئی۔

کلرک: (غصے میں) جاپان اور ہمارے یہاں کی حالت میں بہت فرق ہے۔ جاپان سرمایہ دار ہے، امریکہ کا نوآبادیاتی اور فوجی اڈہ ہے۔ ہم اشتراکی ہیں۔ سوویت روس کی مدد سے کر ہم خود کفیل بننے والے ہیں۔

میں: یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ حالانکہ جاپان کی معاشی ترقی کا انحصار اپنے وطن سے محبت ہے، ایڈمنسٹریشن ہے۔ اشتراکیت، معاشی نظم چاہتا ہے۔ کاہلی نہیں۔ پھر میں نے ریلوے کے کارکنوں کی نظم کارکردگی اور کاہلی پر لمبا چکر جھاڑا۔ دم آخر میں یہ طرہ چھوڑا:۔

میں: میں نے تو سنا ہے۔ راجستھان میں بہت سی گاڑیاں اتنی دھیمی چلتی ہیں کہ اکثر مسافر چلتی گاڑی سے اتر کر لائن کے کنارے چلتی ہوئی گائے یا بھینس کا دودھ دوہ لیتے ہیں اور ڈبے میں واپس جا بیٹھتے ہیں۔ لوگوں نے قہقہے لگائے اور تالیاں بجائیں۔

کلرک تھا تو سانولا، پھر بھی لال ہو گیا۔ بولا "ایسی گپیں تو اخبار والے سرکار کی ہنسی اڑانے کے لیے ہمیں طرف سے چھاپ دیتے ہیں۔ ریلوے بورڈ کو ان پر ہتک عزت کا کیس کرنا ہی چاہیے۔ ریلوے کا مذاق سرکار کا مذاق ہے

میں: آپ کو برا لگا ہو تو معافی چاہتا ہوں۔ تو کیا اب نام ٹیبل پر چھپے گا ہی نہیں؟

کلرک: نہیں۔ اگر نام ٹیبل ہوا اور لوگ اسے پڑھ کر سمجھ بھی لیں تو کہیں گے کہ مقررہ وقت پر گاڑی فلاں اسٹیشن سے چھوٹتی ہی چاہیے۔ اٹلی میں مسولینی نے ایسی اصلاح کر دی تھی کہ گاڑیاں مقررہ وقت پر آتی جاتی تھیں مگر فاشزم ہمارے لیے ناقابل ترک ہے اس لیے ریلوے کے وزیر نے فیصلہ کیا کہ لوگوں میں جھوٹی امید پیدا کر کے اسے پورا نہ کر سکنے سے بہتر ہے کہ جھوٹی امید دلائی ہی نہ جائے۔

میں: تو پھر لوگوں کو کیسے پتہ چلے گا کہ فلاں گاڑی آئے گی یا جائے گی؟

کلرک: ریلوے پر لوگوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔ اگر یہ بھروسہ نہ رکھیں گے تو کس پر رکھیں گے؟ کسٹم والوں پر؟ انکم ٹیکس والوں پر؟ انکم ٹیکس نہ دینے والوں پر؟ ایر لائینس پر؟ سنڈیکیٹ پر؟ اس ملک کے لوگوں کو ریلوے پر پورا بھروسہ ہے کہ وہ دیر سے ہی سہی، ایک شہر سے دوسرے شہر پہنچا۔ ضرور دے گی۔

میں: (بیچ میں) دھماکہ نہ ہو جائے تو؟

کلرک: (ناخوش ہو کر) حادثہ تو زندگی اور دنیا کی علامت ہے۔ ابھی آپ یہاں کھڑے ہیں، مگر اس کا کیا بھروسہ ہے کہ یہ عمارت ٹوٹ کر آپ کے اوپر نہیں آگرے گی!

www.taemeernews.com

کیا دوسرے ملکوں میں ریل کے حادثے نہیں ہوتے؟ موٹریں نہیں ٹکراتیں؟ وزیر یکایک برخواست نہیں کر دیے جاتے؟ جب تک زندگی ہے حادثے ناگزیر ہیں۔ اتنے حادثوں کے باوجود کروڑوں لوگ سفر کرتے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ریلوے پر عوام کو بھروسہ ہے

میں: (اعتراض کرتے ہوئے): فرض کیجیے میں نے سون گڑھ کے دو ٹکٹ لے لیے اور گاڑی نہیں چھوٹی تو؟

کلرک: اب سے مسافر ہی ریلوے کی مدد کر کے اسے کارآمد بنائیں گے۔ آپ ٹکٹ لے لیں گے تو اور لوگ بھی لیں گے اور جب خوب لوگ اکٹھے ہو جائیں گے تو پھر ٹرین چل دے گی۔

میں: اگر نہ اکٹھے ہوئے تو؟

کلرک: تو ٹرین کا وقت بدل جائے گا۔ تھوڑی دیر سے چلے گی مسافر وقت پر آجائیں گے تو پہلے چل دے گی۔ مسافر وقت پر آجائیں گے تو پہلے چل دے گی۔ اس کا مطلب ہے کہ اب مسافروں کو چانس لینا ہوگا۔

کلرک: (فلسفیانہ انداز میں) زندگی بھی تو چانس ہی ہے۔ جب ہوائی جہاز سے اڑتے ہیں تو صحیح سلامت پہنچ جانے کی گارنٹی ہوتی ہے؟ بینک میں آپ کا "ڈپازٹ محفوظ ہے" اس کا آپ کو سو فیصدی بھروسہ ہے؟ موت کل آپ کو نہیں اٹھا لے جائے گی، یہ آپ کیسے جانتے ہیں؟ اس لیے جیسے سماج یقین پر چلتا ہے ویسے ہی ٹرین بھی چلے گی۔

میں: ٹب ٹائم ٹیبل کی جگہ کیا چیز ہوگی؟

کلرک: کچھ نہیں! ریلوے آفس میں اس کا حساب رہے گا۔ مگر عوام پر وہ ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ میں نے ادب کر کہا۔ "اچھا" آج تو سون گڑھ کے دو ٹکٹ دے دیجیے۔ اس نے پھر سوال کیا" یہ سون گڑھ کہاں ہے پہلے یہ تو بتایئے؟"

○○

ایک عورت اپنی بیٹی کے ساتھ ایک گنجے آدمی کے سر پہ ٹہل رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی سے کہنے لگی۔ "جب میں تمہاری عمر کی تھی تو یہاں صرف نٹ پائے ہوا کرتا تھا۔ اب یہ میدان ہے"۔

فلم میں ہیروئن ایک نیک دل ساس کا رول ادا کر رہی تھی۔ ہال میں بیٹھی ہوئی ایک لڑکی نے فلم دیکھتے ہوئے ساتھ والی سہیلی سے کہا۔ "کاش مجھے بھی ایسی ساس ملے"۔

"میری ماں بالکل ایسی ہے" پیچھے سے ایک مردانہ آواز سنائی دی ——!

○

www.taemeernews.com

بیچی / حمید الماس

(کنڑ افسانہ سے)

ڈارون کا فلسفہ

اماں۔ اماں ....
کیا ہے تمّا ؟
کیا ہمارا تعلق بندر کی نسل سے ہے ؟
یہ تمہیں کس نے بتایا ؟
آج مدرسہ میں ہمارے استاد نے یہ بات بتائی تھی۔
کیا یہ سچ ہے اماں!
تم اپنے ابّا ہی سے پوچھو!
کیوں۔ ابّا سے کیوں پوچھوں۔
اس لئے کہ میرے میکے میں تو کوئی بندر نہ تھا۔

۲ ۔ گوتم بدھ

بابا ... بابا
کیا ہے تمّا
شاید آپ نے کل رات بدھ کا ناٹک دیکھا ہے۔
ہاں ... مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔
بابا۔ بدھ نے ہر چیز تیاگ دی تھی۔
ہاں بیٹے۔
جیوی بچے۔ راج پاٹ ... گویا سب کچھ انہوں نے تیاگ دیا تھا۔
ہاں ... ہاں ... تمّا۔
بابا۔ آج میں نے سبھی انعام کے سارے تمغے لوٹا دیئے۔

۳ ۔ جان کی خیر

صبح کی اولین ساعتوں میں تمّا اپنے گاؤں میں داخل ہو رہا تھا۔ ایک شناسائی نے اس سے پوچھا صبح صبح تم کہاں سے لوٹ رہے ہو۔
تمّا نے کہا وہ روزانہ منہ اندھیرے دو تین میل دوڑتا ہے۔
اچھا ... تم بچپن میں بہت کاہل تھے۔ اب کس قدر بدل گئے ہو۔ یہ چستی اور چالاکی، آدمی کو سنوارتی اور بناتی ہے روزانہ دو تین میل کی دوڑ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔
دوڑنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تمّا نے نہایت ہی سادگی سے کہا۔ بس یہ سوچیئے کہ بیوی تعاقب میں ہے اور جان کی خیر نہیں۔ بس یہی تصور ہے جو مجھے موٹر سے بھی زیادہ تیز رفتار بنا دیتا ہے

۴ ۔ کرناٹک کے شیر

بابا
کیا ہے بیٹے۔

www.taemeernews.com

کرناٹک میں شیروں نے بہت دھاندلی مچائی ہے۔
ہاں تمّا۔ اخباروں میں روز کوئی نہ کوئی ایسی خبر آتی ہے۔
لیکن ... بابا۔ آپ نے یہ بھی پڑھا ہوگا کہ ایک لڑکے نے صرف لکڑی سے شیر کو ہلاک کر دیا۔ تب تو وہ نہایت ہی دلیر ہوگا۔
رہنے دیجئے بابا۔ اصل میں کرناٹک کے شیر ہی اس قدر کمزور ہیں کہ صرف لاٹھی سے مر جاتے ہیں۔

۵ ۔ مدرسہ

الزام ثابت ہوا تو عدالت نے ایک چور کو تین سال کی قید مشقت کی سزا دی۔ پولیس والے اُسے زنجیروں میں جکڑ کر کھینچتے گھسیٹتے لے جا رہے تھے اور وہ چور چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ تمّا نے اس روتے ہوئے شخص کو راستہ میں دیکھا تو پولیس سے پوچھا کہ یہ اسے کہاں لے جا رہے ہو؟
جیل
تمّا نے یہ بات سنی تو معصومیت سے کہا کہ جیل جانے کے لئے رونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ اسے مدرسے کو لے جایا جا رہا ہے۔

۶ ۔ احتیاط

ایک نوجوان سیاسی رہنما اپنی دلنشیں اور پُرجوش تقریر کی بنا پر بہت مشہور تھا۔ جلسوں میں یگانگت کا کچھ ایسا ماحول پیدا کرتا کہ سارے لوگ اس کے گرویدہ ہو جاتے۔ کسانوں کے ہاں جاتا تو خود کو کسان ظاہر کرتا مزدوروں کی بزم میں مزدور بن جاتا اور اہلکاروں میں فخر سے اپنے آپ کو اہلکار کہتا۔
ایک دن تمّا نے اس نوجوان کو بلایا۔
کہاں تمّا؟
بیواؤں کے سماج میں
اچھا میں وہاں ضرور آؤں گا اور سب کو میری تقریر پسند آئے گی۔
لیکن حضور۔ احتیاط سے بولیے۔ کہیں خوشِ عطیات میں خود کو وہاں بیواؤں میں شامل نہ کر لینا۔

۷ ۔ ذرا جلدی میں ہوں

صبح صبح تمّا پیدل جا رہا تھا۔ آدھے میل کی مسافت طے ہوئی تھی کہ اس کے بازو ایک جانی پہچانی اور ایک نامانوس دیکھی ہوئی بس آکر رک گئی۔ ڈرائیور جانا پہچانا تھا۔ اس نے تمّا کو اپنی بس میں سفر کرنے کی دعوت دی۔
تمّا نے نفی میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ میں اپنی منزل تک پیدل ہی جاؤں گا۔
کیوں؟ ڈرائیور نے پوچھا۔
مجھے آج ہی اس گاؤں میں پہنچنا ہے۔ دراصل میں جلدی میں ہوں۔ تمّا نے جواب دیا۔

۸ ۔ تمّا کی بیوی

تمّا اور اس کی بیوی دونوں ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئے اور پھر ایسا ہوا کہ تمّا کی بیوی بھٹک کر جنگل میں داخل ہوئی مگر تمّا ہراساں نہ ہوا حالانکہ ایک ہمسفر نے بتایا کہ اس جنگل میں ایک زبردست شیر ہے۔
مجھے اس کا علم ہے۔ تمّا نے اطمینان سے اس کا جواب دیا۔
مگر۔
اب وہ شیر مر جائے گا۔ ساعتِ جشن قریب

www.taemeernews.com

ہے یار د. تمّا نے کہا۔

۹ ۔ گائے نہیں...

دیکھو تمّا یہ جوار ہے. ماں نے کہا۔

ہاں اماں. میں جانتا ہوں کہ جوار کو دھوپ کی ضرورت ہے اور ہم کو جوار کی ضرورت ہے۔

تم یہیں بیٹھ کر نگرانی کرتے رہنا کہیں صحن میں گائے آکر جوار نہ کھالے. ماں نے اس سے تاکیداً کہا کچھ دیر بعد وہ لوٹی تو آدھی جوار غائب تھی

تم کہاں تھے تمّا۔ گائے نے تو جوار کا صفایا کردیا۔

نہیں ماں وہ گائے نہیں تھی۔

پھر۔

ماں اس جوار کو تو بیل نے کھایا. یہ تمّا کا جواب تھا۔

۱۰ ۔ کیا یہ سچ ہے

پردیسی ۔ یہاں ریلوے اسٹیشن کہاں ہے جناب.

تمّا ۔ شاید وہیں ہو جہاں ریل رکے.

۱۱ ۔ تیاری

پڑوس کے راؤ صاحب کی بیوی، تمّا کے گھر آئیں اور کہنے لگیں کہ آج ان کی بیٹی نے محفلِ موسیقی سجائی ہے. میں دعوت دینے آئی ہوں کہ آپ لوگ آکر اس کا گانا سنیں۔

اس دعوت سے خوش ہوکر تمّا کی بیوی تیار ہونے کے لئے اپنے کمرے میں گئی. آدھا گھنٹہ گزرا مگر وہ واپس نہیں ہوئی. راؤ صاحب کی بیوی بے قرار تھیں. تمّا سے ان کی یہ حالت نہ دیکھی گئی تو چیخ کر اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ جلدی آؤ یہ بچاری بہت بے قرار ہیں۔

اندر سے آواز آئی. ہوگیا. بس ابھی آئی۔

تمّا نے دہاڑتے ہوئے کہا، حد ہوگئی. ایک ذرا سا کان میں روئی ٹھونسنے کے لئے دو گھنٹے چاہئیں کیا؟

۱۲ ۔ حفاظت

تمّا اپنے جیب میں ایک سجاوٹی بھر کم قفل رکھے ہوئے بازار سے گزر رہا تھا تو ایک شناسائی نے اس سے پوچھا تمّا یہ کیا چیز تمہارے جیب میں ہے۔

یہ ہمارے مکان کا قفل ہے.

تم اسے اپنے جیب میں رکھ کر کیوں پھر رہے ہو.

اس لئے کہ ہمارے گاؤں میں قفل توڑنے والوں کا خطرناک گروہ آیا ہوا ہے. تمّا نے کہا۔

۱۳ ۔ شرابی تمّا

ویسے تمّا شراب نوشی کا قائل نہ تھا مگر ایک بار اس کو پینا ہی پڑا اور وہ کچھ زیادہ ہی پی گیا۔

دوستوں نے کہا. چلو تمّا اب گھر چلیں. اِدھر تمہارے جوتے ہیں.

ٹھیک ہے. جوتے تو ہیں مگر پاؤں کہاں ہیں۔

یہ جوتا ہے اس میں تمہارا بایاں پاؤں داخل کرو۔

یار د میرا دایاں پاؤں کہاں ہے. تمّا نے پوچھا۔

۱۴ ۔ استاد کا خوف

تمّا بیمار ہوا. بیماری نے طوالت پکڑی. وہ اس طویل بیماری سے بے حد کمزور اور زرد ہوگیا تھا. سب لوگ بیزار ہوگئے تھے. ایک دن وہ مسلسل بیہوش رہا تو لوگوں نے اس بے حس کو موت سمجھا اور اسے چار کندھوں پر اٹھا کر قبرستان لے جارہے تھے. راستے میں تمّا کا مدرسہ بھی تھا. استادوں نے تمّا کا جنازہ دیکھا تو آخری دیدار کیلئے وہ مدرسے سے نکلے. تمّا نے اپنے استادوں کو دیکھا تو چھلانگ لگائی اور یہ کہتے ہوئے بھاگا کہ حضرت. یاروں نے مجھے غلط راستہ پر لگایا۔

www.taemeernews.com

ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ

ترجم : منصور احمد منصور

محمد زماں آزردہ

۱۹۴۵ء میں پیدا ہوئے۔ بی ایڈ، اردو سے ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے بعد گزشتہ ۱۳ سال سے شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی میں کارگزار ہیں۔ ان کے تحت دو طالب علم پی ایچ ڈی کر چکے ہیں۔ تصانیف حسب ذیل ہیں: مرزا سلامت علی دبیر، غبار خیال، شیریں کے خطوط، اور وہ ٹاپ کر گئی، نکری ہنرمنکر (کشمیری انشائے)، وطن کی محبت، اور، غبار کارواں دگدستہ زیر اشاعت۔

محمد زماں آزردہ کشمیر کی مختلف لسانی و ثقافتی انجمنوں سے وابستہ ہیں۔

سٹی بس میں سوار ہو جانا

سٹی بس میں آپ بھی اور ہم بھی سوار ہوئے ہوں گے۔ گاؤں سے جو شہر آتے ہیں وہ بھی اس میں سوار ہوئے ہوں گے۔ یہ بات ہر ایک کو ماننی پڑے گی کہ لوگوں کو اپنی ٹانگوں سے زیادہ سٹی بس پر ہی اعتماد ہے اس لئے یہ بس اسٹاپ پر گھنٹوں انتظار کرتے ہیں۔ یہ بس کا کتنا ہی رونا روئیں لیکن پھر بھی اسی کے بل پر پروگرام بناتے ہیں۔ ارے کیوں نہ بنائیں۔ چند پیسے خرچ کر کے انسان ایک محلہ سے دوسرے محلے اور ایک جانب سے دوسری جانب پہنچ

www.taemeernews.com

جاتے ہیں۔

یہ بس بے شمار لوگوں کو ایک ساتھ لیجا کر پبلک ٹرانسپورٹ بچاتی ہے اور قومی معیشت پر اچھا اثر ڈالتی ہے۔ ان لوگوں کو اپنے اندر سمیٹ کر سڑکوں پر لوگوں کے اژدھام کو کم کر کے یہ قوم کو ڈسپلن (DISCIPLINE) کا سبق دیتی ہے۔ لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جہاں کہیں کھلی جگہ دیکھتے ہیں وہاں ڈھیلے ڈھالے ہو جانا چاہتے ہیں۔ سڑکوں پر جو کافی جگہ گھیرتے ہیں بس میں ایک دوسرے کے بازو میں ایڈجسٹ کر کے بیمار مرغ کی طرح اپنے آپ میں سمٹ جاتے ہیں اور اس طرح ایک دوسرے کے بہت قریب رہ کر اتفاق اور سوشلزم کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اسی لئے سٹی بس کی حیثیت کسی لیڈر سے کچھ کم نہیں۔

ٹیکسی (TAXI) یا آٹو رکشا کے مقابلے میں سٹی بس سستی ہے۔ غریب لوگ زیادہ کرایہ کہاں دے سکتے ہیں اگر خرچ کرنے کی طاقت بھی ہو پھر بھی سٹی بس غنیمت ہے کیوں کہ اس میں آدمی چشم آدم سے بھی محفوظ رہتا ہے اور جیب بھی ہلکی نہیں ہو جاتی۔ رہی جلدی! ہمارے معاشرے میں وہ کسی کو نہیں۔ اگر ہے بھی تو وہ سٹی بس جیسی جلدی ہے۔

سٹی بس میں سوار ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ آدمی کو راہ میں ملنے والوں سے نجات مل جاتی ہے اور اگر دفتر بند ہونے کا وقت ہو تو پھر اسے ہر ایک سے لمبی اور تفصیلی ملاقات کرنی پڑتی ہے۔ بس میں یہ پریشانی نہیں۔ یہاں بھی لوگوں سے اس کی ملاقاتیں ہو جاتی ہیں۔ ان سے مختلف موضوعات پر تبادلۂ خیال کرنا پڑتا ہے لیکن اس سے وقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لئے کہ بس انسان کی ٹانگیں نہیں جسے بات کرنے سے ہی بریک لگے۔

آج کا انسان سائنس دانوں کی مہربانی سے طبعاً تساہل پسند بن گیا ہے۔ یہ پیالے تک ہلکے اور پتلے تلاش کرتا ہے تاکہ ہونٹوں کو زیادہ ہلانا نہ پڑے۔ ورزش کرنے کی تو بات ہی نہیں۔ سٹی بس میں سوار ہونے سے اس کی جوں توں ورزش بھی ہو جاتی ہے۔ وہ یوں کہ اکثر اسے چھلانگ لگانی پڑتی ہے اور پھر کھڑا رہنا بھی معمولی بات نہیں۔ یہ تو ایک باقاعدہ فوجی پریڈ ہے کبھی ایک پیر پہ بوجھ ڈالتا ہے تو کبھی دوسرے پیر پہ۔ کبھی ایک ہاتھ سے راڈ تھامے کھڑا رہتا ہے اور کبھی دوسرے ہاتھ سے۔ جب گاڑی رک جائے یا اسٹارٹ ہو جائے تو یہ کبھی آگے اور کبھی پیچھے کو ہچکولے کھاتا ہے۔ اس طرح سٹی بس میں سوار ہونے والوں کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے۔ یہ بھی کوئی معمولی اور ذرا سی ورزش نہیں۔ جو کہیں بیچ سڑک میں سوار ہوتے ہیں انھیں اس کا زیادہ ہی فائدہ ملتا ہے۔ ان کی آنکھیں بھی ورزش کرتی ہیں کیوں کہ یہ ایک ہی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہتے ہیں۔ کبوتر باز اور ایسی جگہوں کو سوار ہونے والوں کی نگاہیں یکساں تیز ہونی چاہئیں تاکہ یہ دور سے ہی گاڑی کی پلیٹ نمبر پڑھ سکیں جیسے کبوتر باز دور سے ہی اپنے کبوتر کو پہچانتا ہے۔ اس ورزش سے انسان دھیرے دھیرے ہپناٹسٹ بھی بننے لگتا ہے۔ جونہی انھیں یہ دکھائی دیتا ہے کہ ان کی محبوب بس آگئی یہ شیر کی طرح خود کو دوڑنے اور جھپٹنے کے لئے تیار رکھتے ہیں۔ یہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے کہ کس طرح یہ ایک خاص زاویہ بنا کر بس سے ایک خاص فاصلے پر رک کر جھپٹتے ہوئے ورزش کرتے ہیں۔ ورزش کے اس عمل

www.taemeernews.com

میں بوڑھوں کی تصویریں سامنے آتی ہے جیسے کیمرہ مین انہی پر فوکس کر کے زوم ان (ZOOM IN) کر رہا ہو، کہ بس کا اسکرین دور ہونے لگتا ہے اور یہ سڑک کے اس پار آگے کو جھکے ہوئے، ایک پیر اوپر اٹھائے اور مٹھیاں کسے ہوئے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے یہ بھاگنے کو بھی تیار ہوں اور بے حس و حرکت کھڑے بھی ہوں۔

بس میں سوار ہو جانا اس پہلو سے بھی رحمت ہے کہ اس سے یہ تجربہ ہو جاتا ہے کہ زندگی کی رفتار کتنی ہے اور وہ کس قدر سست رفتار ہے۔ عام لوگوں کے ساتھ سفر کر کے اسے ان کے ساتھ ہمدردی بھی ہو جاتی ہے۔ جب بیماروں اور عمر رسیدہ لوگوں کو دیکھتا ہے تو اسے انسانی کمزوریوں کا پتہ بھی چلتا ہے۔ تنہا سفر کرنے یعنی موٹر دوڑ میں وہ مزا کہاں جو اس اجتماعی سفر میں ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ انسان دوسروں کے ساتھ زیادہ دیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے تو وہ مشترکہ خاندان، گھر وغیرہ کو کچھ مدت گزرنے کے بعد جُدا جُدا دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن سٹی بس کا سفر کس مدت کا ہی ہوتا ہے۔ اور پھر یہاں ساتھی اور ہمراہی ہر اسٹاپ پہ بدلتے رہتے ہیں۔ کوئی ایک آدمی تھوڑے ہی ساتھ رہ جاتا ہے۔ لہٰذا یوریت کا سوال ہی نہیں۔ ہر ایک چاہتا ہے کہ لوگ اس کی باتوں پر کان دھریں۔ اسے دھیان سے سُنیں۔ بھئی عام خام لوگوں کو کہاں بار بار اسٹیج ملتا ہے سٹی بس سبھوں کو ایک مستقل پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے لیڈروں کو بعض اوقات اپنی تقریر لوگوں سے سنوانے کے لئے انھیں کسی ایک جگہ اکٹھا کرنا پڑتا ہے اشتہار دینے پڑتے ہیں۔ سٹی بس میں یہ مسئلہ ہی نہیں۔ اسٹیج پر اگر کوئی ایسی ویسی بات کہے جسے لوگ پسند نہ کریں تو وہ اُٹھ کر چلے جا سکتے ہیں لیکن چلتی بس سے وہ باہر چھلانگ نہیں مار سکتے۔ غرض قانونی سبق، مذہبی درس، اخلاقی وعظ وغیرہ جو کچھ بھی سُننا یا سُنانا ہو سٹی بس اس کے لئے موزوں جگہ ہے۔

کچھ ایسے تجربے بھی ضرور ہوتے ہیں جن کا دہرانا آدمی پسند نہیں کرتا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں دھکم پیل زیادہ ہوتی ہے۔ اگرچہ سواریوں کی تعداد بھی اس کے لئے شخصی ہے لیکن اس بات پر غور کرنے کی فرصت کہاں۔ سواریوں کو یہ جلدی ہے کہ اپنی منزل پر جا پہنچیں۔ کنڈیکٹر کو پیسے بٹورنے کی جلدی ہے اور بے چارے ڈرائیور کو ٹھیک طرح سے کھانا کھانے کی مہلت بھی نہیں ملتی وہ اپنی ذات کو بھول جاتا ہے۔ سواریوں کو کیا گنے۔ اس دھکم پیل میں بعض اوقات انسان روندھا جاتا ہے اور پھر یہ اس کی قسمت ہے کہ اس پر جس کا پیر پڑا وہ کس قدر موٹا اور بھاری ہے۔ جب بس کی اچانک بریک لگ جائے یا جب بس اسٹارٹ ہو جائے تو کھڑے رہنے والے بس کی رفتار سے زیادہ ہی تیز رفتاری سے آگے پیچھے ہلتے جھلتے ہیں۔ مان لیجئے یہ بغیر رسّی کے ٹگ آف وار (TUG OF WAR) ہے! اگر انسان مضبوطی سے کسی راڈ کو پکڑے ہوئے ہو تو بھی یہ پینڈولم کی طرح حرکت میں رہتے ہوئے وقت کے گلیلیو، (GALLO) کے لئے سامان تفکر پیش کرتا ہے۔

سٹی بس میں سوار ہونا اور اس سے اترنا ایک فن ہے جو ہر کس و ناکس کو نہیں آتا۔ جب تک انسان یہ فن سیکھتا ہے زمانے کے تھپیڑوں سے اس کی جان ہلکان ہو چکی ہوتی ہے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں صحت اور

www.taemeernews.com

عمر کے لحاظ سے الگ الگ بس کا انتظام کرواتا۔ جس طرح فلموں میں بعض اوقات چھوٹوں اور بڑوں کے لئے الگ الگ تھیٹر بنتی ہیں۔ اسی طرح بسوں پر بورڈ لگواتا کہ "صرف بڑے ہی سوار ہو سکتے ہیں"، "صرف سولہ برس کی عمر تک کے لوگوں کے لئے"۔ "صرف ان کے لئے جنھیں ایک بار سی پاور ہو" وغیرہ۔ لیکن ڈرائیور اور کلینر اس سے مستثنیٰ ہوتے۔ مگر اس میں بھی خطرہ یہ ہے کہ تمام بوڑھے جوانوں کی بس پر جھپٹ پڑیں گے۔ وہ پیروں سے کچل کیوں نہ جائیں لیکن حلق سے یہ آرتا کرتا معلوم ہوگا کہ لوگ انھیں بوڑھا سمجھیں۔ سیدھی سی بات ہے جو فیشن ہونا نہ مانیں وہ نوجوانوں والی بس میں سوار ہونا کیسے چھوڑ دیں۔

جب کسی درمیانی اسٹاپ پر بس رکنے لگتی ہے تو لوگ اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ بس پر لوگوں کی اس یلغار سے بعض اوقات لوگ ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے ہیں کبھی میاں بس سے اتر کر نیچے بیوی کے اترنے کا انتظار کرتا ہے۔ اور جب بس چل پڑتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ بیوی بس میں سوار ہوتے وقت ہی اس سے بچھڑ کر وہیں سڑک پر رہ گئی تھی۔

بس میں بھیڑ بھاڑ اکثر انسان کا حلیہ ہی بگاڑ کر رکھ دیتی ہے۔ اگر انسان زیادہ ہی نفاست پسند ہو تو وہ بس سے اتر کر الٹے پاؤں واپس بس میں سوار ہونا پسند کرے گا کیوں کہ وہ چلنے پھرنے اور منہ دکھانے کے قابل ہی نہیں رہا ہوتا ہے۔ پالش تو وہی اکثر کپڑوں کا پریس بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ بوٹ کو تو رومال وغیرہ سے صاف کر سکتا ہے لیکن پریس کو جیب یا بیگ میں ساتھ نہیں رکھ سکتا اور وہ بھی گرم۔ اس طرح سے زیادہ زحمت طوائفوں کو اٹھانا پڑتی ہے۔ ادھر کبھی ڈیزل کی کمی ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں بس میں سوار ہوتے وقت کچھ تو زخمی ہو جاتے ہیں اور بعضوں کی جیبیں اُلٹ پُلٹ جاتی ہیں اور کچھ تو جیب کترے اُلٹ پُلٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اگر ڈرائیور حساس ہو تو وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جائے کہ وہ بس ہسپتال لے جائے یا پولیس تھانے۔! □□

○

ایک صاحب اپنے نو تعمیر شدہ مکان میں گئے۔ اور کمرے میں داخل ہوتے ہی عیب نکالنے شروع کر دیئے: "کمرے میں رنگ کیسا تھرڈ کلاس ہوا ہے۔ یہ کھڑکیوں پر جالے کیوں لگائے گئے ہیں اور یہ سامنے کس اُلو کی تصویر لگی ہے؟"

بیوی بولی: "باقی باتوں کو جانے دیجئے مگر جس تصویر کی بات آپ کر رہے ہیں وہ تصویر نہیں آئینہ ہے۔"

○

www.taemeernews.com

ترجمہ: مناظر عاشق ہرگانوی

شری پورن سرما
راجستھانی

"ضرورت ہے مصنفوں کی"

رائٹرس میکر لمیٹیڈ میں کچھ عارضی عہدے خالی ہیں۔
ادارہ ان عہدوں کے لئے مقررہ فارم پر درخواست طلب کرتا ہے۔
مقررہ فارم ۱۲ روپے کی نقد رقم بھیج کر درج ذیل پتے سے منگوائے جاسکتے ہیں:۔
شری چتورانند جی مہاراج، ڈائرکٹر، رائٹرس میکر لمیٹیڈ، آنندی لال شومیکر کی بغل میں، بھارت۔

ان عہدوں پر بحالی سے پہلے امیدواروں کو ایک سال کی ٹریننگ واجب الادا ہوگی۔ ٹریننگ کی مدت میں مصنفوں کو اسٹائپنڈ کے طور پر مہینہ میں تین ہفتے کھانا ان ہی کے خرچ پر ملے گا۔ ایک ہفتہ بھوکوں مرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ شاذ و نادر کافی، سگریٹ، افیم، ایل۔ایس۔ڈی کی گولیاں اسپیشل ڈائٹ کے طور پر ادارے کی طرف سے دی جائیں گی۔ مہینہ میں ایک ہفتہ بھوکوں رہنے کی ٹریننگ دی جائے گی۔ تاکہ اگر آپ ڈی لائسنگ کرنے لگیں، اور تخلیقات کہیں بھی نہ چھپیں تو بھوکوں مرنے کی مشق قبل سے رہے۔ ساتھ ہی اگر آپ بڑے مصنف بن جائیں تو آپ کو گردش کے دن" لکھنے کا ذاتی تجربہ رہے۔ یہ ہمارے ادارے کی دور بین نگاہی ہے۔

ٹریننگ کی مدت میں ہر ایک امیدوار کو ہر ماہ پانچ پانچ تخلیقات متعلقہ آفس میں جمع کرنی ہوں گی۔ جن پر سبھی طرح کا حق ڈائرکٹر، رائٹرس میکر لمیٹیڈ بھارت کا رہے گا۔ موصولہ تمام تخلیقات ادارے کے افسروں کے نام سے مختلف اخبار و رسائل میں اشاعت کے لئے بھیجی جائیں گی۔ اگر کسی مصنف سے موصولہ پانچ تخلیقات میں سے تین تخلیق شائع نہ ہوسکیں تو مذکورہ مصنف کو تین تین ماہ کی پیشگی نوٹس دیکر ادارے سے نکال دیا جائے گا۔ ساتھ ہی، اسپیشل ڈائٹ کے طور پر دی جانے والی سہولتوں سے بھی محروم کر دیا جائے گا۔

ہر ایک امیدوار کو ادارے کے اندر "مقررہ" پوشاک میں جانا ہوگا۔ پوشاک میں پیچھے سے پھٹا ہوا میلا پینٹ چار جیبوں اور سولڈر لگا گندہ شرٹ (کسی بھی رنگ میں) اور ٹوٹی چپل شامل ہیں۔ امیدوار اپنی پوشاک چھ ماہ قبل نہ

www.taemeernews.com

دھونے پر مجبور ہوگا۔ داڑھی اور سر کے بال ادارے میں رہتے ہوئے کبھی نہ کٹوا سکے گا۔ اُمید وار دو ماہ میں ایک بار کسی بھی دن نہا سکتا ہے۔

کسی لیڈر، وزیر یا معروف شخصیت سے انٹرویو لینے کے لئے جاتے وقت مصنف کو اپنی پوشاک پہننا ضروری ہے تاکہ مصنف کے امیج کو کسی طرح کا خطرہ پیدا نہ ہو۔ یہی اس کا شناختی کارڈ بھی ہوگا۔

امید وار مصنفوں کو اپنا تخلص ہمارے یہاں کی فہرست سے منتخب کرنا ہوگا۔ تخلص کے چند نمونے یہ ہیں:۔ اداس، نراش، پیاسا، دیوانہ، مستانہ، دکھی، گھنڈی، ہلٹر، کلہڑ، صراحی، لوٹا، گھنٹی، گلاس، مٹکا، مشکی، مرحوم، دغاباز، بکواس، مطلبی، کروڑھی، اپادھی، جھگڑا، جھنجھٹی، ڈھول، ڈنلی، جوگی، ڈھونگی، بھوگی، ڈنٹھل، کنڈل، ردّی، گندی، گیدڑ، ہاتھی، گھوڑا، گدھا وغیرہ وغیرہ۔

اُن ہی امید واروں کو لیا جائے گا جو ماں باپ کی نظروں میں کپوت ہوں، بیوی سے جھگڑتے رہے ہوں یا طلاق شدہ ہوں، طرح طرح کا نشہ کرنے کے عادی ہوں، کبابی ہوں، شرابی ہوں، دُبلے پتلے اور دھنسی ہوئی آنکھوں والے ہوں۔ ہر ایک اُمید وار کو ڈاکٹر کا یہ سرٹیفکیٹ دینا ہوگا کہ وہ ہمیشہ غیر صحت مند رہتا ہے۔

درخواست دینے کی آخری تاریخ کوئی نہیں ہے۔ جس درخواست پر مصنف کے والد یا گارجین کے دستخط نہیں ہوں گے۔ وہ قبول نہیں کی جائے گی!

●○

www.taemeernews.com

ٹامل : کُل کی
ترجمہ : عزیز قیسانی

بلیوں کی ہڑتال

پروفیسر کُل کی مصنف "لہر کی آواز" (تامل) اردو داں طبقہ کے لئے نئے نہیں۔ انہوں نے ہر صنف ادب پر قلم اٹھایا ہے۔

وہ ایک کثیر الاشاعت ہفتہ وار "کل کی" کے مدیر رہے۔ اُنہوں نے اپنے جریدہ کے لئے جو کچھ بھی لکھا وہ کلاسکی حیثیت اختیار کر گیا۔ زیر نظر مضمون "کُرِی یم کُنرُم" سے لیا گیا ہے۔ یہ ان کے مضامین کے کئی مجموعوں میں سے ایک ہے جسے چدمبرم نے یکجا کیا ہے۔ اس مجموعے میں شامل کردہ مضامین ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۴ء جنوری تک لکھے گئے تھے۔ تقریباً تیس سال گزرنے کے باوجود ان کی اہمیت اور افادیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ "بلیوں کی ہڑتال" اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ (مترجم)

"دنیا بھر کی پیاری بلیو! اُٹھو! جاگو! اے جفاکشو! اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے، اپنی بھلائی کے لیے اکٹھے ہو جاؤ۔

"حلف اٹھاؤ کہ جب تک ہماری مانگیں پوری نہ ہوں گی، ہم چوہوں کا شکار نہ کریں گے! اگر ہمارے درمیان سیاہ بھیڑیں ہیں، غدار ہیں، خود غرض ہیں، تو ان کا خاتمہ کرتے ہوئے آگے بڑھو! اگر معاملہ حد سے تجاوز کر جائے تو بھوک ہڑتال کرنے کے لیے تیار رہو!"

مندرجہ بالا انتہا پسندانہ پمفلٹ بڑے زور و شور سے بٹنے لگا!

"ہڑتال کریں یا نہ کریں" اس سوال پر بلیوں کے درمیان کافی پُرجوش بحث چھڑ چکی تھی چند میانہ رو بلیوں نے کہا، ہڑتال ٹھیک نہیں۔ اس میں سراسر اپنا ہی نقصان ہے۔ مگر اِن بلیوں کی پوزیشن بڑی نازک ہو چلی تھی۔ ان بلیوں کو انتہا پسندوں نے مار بھگایا اور ان بھاگے ہوؤں کو چوہوں کے بلوں میں پناہ لینی پڑی۔

آخر کار، اس سوال پر کہ ہڑتال کریں یا نہ کریں، ووٹ لئے گئے۔ چوں کہ بلیوں کے درمیان اکثریت مزدور طبقے کی تھی فیصلہ ہڑتال کرنے کے حق میں ہوا۔ جن بلیوں نے ہڑتال کے خلاف اپنے ووٹ ڈالے تھے، انھیں راتوں رات روپوش

www.taemeernews.com

ہو جانا پڑا۔ چنانچہ جب تاریخی حیثیت سے یادگار ہڑتال شروع ہوئی تو بلّیوں کے درمیان، کالی بھیڑوں کا وجود ختم ہو چکا تھا۔ پوری یک جہتی سے سفید بلّیوں نے، کالی بلّیوں نے، پیلی بلّیوں نے، دھاری دار بلّیوں نے ہڑتال کر دی۔

بلّیوں کی ہڑتال کیا شروع ہوئی، چوہوں کے درمیان ایک ہل چل مچ گئی۔ چوہوں کو یہ غم کھانے لگا کہ "بلّیوں نے ہڑتال جو کی ہے، اس سے ہمارا کیا حال ہوگا!"

صورت حال یہ تھی کہ بلّیاں چوہوں کو کھا کر انہیں سیدھے سورگ لوک پہنچا دیتی تھیں۔ اگر بلّیاں چوہے کھانا بند کر دیں تو چوہوں کی بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کیسے حل ہوگا۔ ان کی آبادی بڑی سرعت سے بڑھ جائے گی۔ اس اضافہ شدہ آبادی کو غذا کہاں سے میسّر ہوگی؟ کیا یہ مسئلہ بڑا کٹھن نہیں تھا؟ چوہوں کی برادری بہم چاری بننے کا رواج معدوم تھا۔ نفش کشی کا تصور ان کے لئے اجنبی تھا، اور نہ ہی انہیں علم تھا کہ نس بندی سے آبادی بڑھنے کا سدّباب ہو سکتا ہے۔

اس نازک صورتِ حال پر غور و خوض کرنے کی خاطر چوہوں نے اپنی ایک عالمی کانفرنس بلائی۔ گاؤں کے چوہے، شہر کے چوہے، مزدور چوہے، سرمایہ دار چوہے، تمام طبقے ایک جھنڈے تلے جمع ہوئے۔ ہال میں تل دھرنے کے لئے جگہ باقی نہ رہی۔ رہبران قوم اسٹیج پر آ کر دھواں دھار تقریریں کرنے لگے۔ اور اس قدر ہیجان انگیز انداز میں کہ چوہوں کا خون کھولنا شروع ہو گیا۔ چند چوہے یہ بھی بھول بیٹھے کہ ان کے بدن کا کون سا حصّہ سر ہے اور کون سا حصّہ دُم۔ چند جوش بھرے چوہے سر کے بل کھڑے ہو گئے اور چند دُم کے بل۔ آخر میں یہ متفقہ فیصلہ کیا گیا کہ بلّیوں کی ہڑتال کا خاتمہ کر کے رہیں گے۔

یہ فیصلہ کیا ہوا، اب تک اَن دیکھے اور اَن سُنے چند مناظر وقوع پذیر ہونے لگے۔ ہر چوہے نے ایک ایک مضبوط ٹولیاں بنا بنا کر تنہا ملنے والی بلّیوں کا گھیراؤ کیا گیا۔ "کام پر جاؤ ورنہ سر پھوڑ دیا جائے گا!" چوہوں نے دھمکی دی۔ چند چوہوں نے اس دھمکی کو عملی جامہ بھی پہنایا۔ مگر ان چوہوں سے بلّیوں کے ضبط اور ثابت قدمی کو کوئی دھکا پہنچایا نہ جا سکا۔ بلّیوں نے بیان جاری کیا، "اپنی جانیں کھو دیں گے مگر جب تک ہماری مانگیں پوری نہ ہوں گی، ہم کام پر نہ جائیں گے۔"

دوسری بار چوہوں کی کانفرنس بلائی گئی۔ مگر پچھلی کانفرنس والا جوش، وہ عالی ہمتی، وہ خروش اب کی بار مفقود تھا۔ میانہ رو اور من پسند چوہوں کی تقریریں دھیان سے سنی گئیں۔ آخر میں یہ طے پایا کہ ہڑتالی بلّیوں سے سمجھوتے کی بات چیت چلائی جائے۔ اس بات چیت کے لئے دو مندوب، مسٹر سپرد چوہے اور شریمان جے کر چوہے، چنے گئے۔ سمجھوتے کی بات چیت ایک بار ٹوٹی پھر دوسری بار اختتام کو پہنچی۔ سمجھوتے کی اکثر شرطیں بلّیوں کے حق میں تھیں۔ مندرجہ ذیل شرائط منظور کی گئیں۔

۱۔ جب کوئی بلّی شکار کی غرض سے کسی چوہے کا پیچھا کرے، تو موخر الذکر کے دوڑنے کی رفتار ساڑھے تین میل فی گھنٹہ سے بڑھنے نہ پائے ۲۔ چوہے کے بل اس طرح تعمیر کئے جائیں کہ اُن کی گہرائی ڈیڑھ قدم اور چوڑائی پونا قدم سے کسی صورت بڑھنے نہ پائے۔

۳۔ جب معمر اور بزرگ بلّیاں مالا جپتی ہوئیں بھگوان کا نام جپ رہی ہوں تو چوہے کے بچّے ان بلّیوں کو دیکھ کر نہ ہنسیں اور نہ ہی ان کا مذاق اڑائیں۔ ۴۔ چوہوں کی یہ خبیث عادت ہے کہ سورج طلوع ہوتے ہی اپنی اپنی بلوں میں پناہ لیتے ہیں۔ اس عادت کو فوراً ترک کر دیں۔

www.taemeernews.com

۵ شہروں میں لوگ راشن کی دکانوں سے چاول خرید کر کھاتے ہیں. چوہے بھی اس چاول کو کھا لیتے ہیں. اور جب بلیاں ان چوہوں کو چٹ کر جاتی ہیں تو یہ چوہے بلیوں کے پیٹوں میں بڑی تکلیف دیتے ہیں.

چوہوں کو چاہیئے کہ ان چاولوں کا کھانا بند کر دیں. انھیں چاہیئے کہ حیاتین اے، بی، سی، ڈی بھری ہوئی غذائیں دودھ دہی، انڈے، مکھن، بسکٹ، مقوی سبزیاں اور ترکاریاں کھائیں.

طرفین کی جانب سے ان شرائط پر جب دستخط ہو گئے تو بلیوں نے اپنی ہڑتال واپس لے لی.

واہ! کیسی بلیاں اور کیسی بلیوں کی ہڑتال! چوہے اور بلیوں کو لاٹھی سے پیٹا! ایسے شگوک چند تاریوں کے ذہن میں پیدا ہو سکتے ہیں. مگر میں پوچھتا ہوں کہ ان کے ذہن میں ایسے شگوک کیوں جنم لیتے ہیں. کیا بلیوں کی ہڑتال سے بھی زیادہ عجیب واقعات رونما نہیں ہو رہے ہیں؟ تاریوں سے گزارش ہے کہ ان پر ذرا دھیان دیں.

مثلاً پولیس کے سپاہیوں کی ہڑتال پر غور فرمائیں. کیا کبھی اس سے بھی زیادہ انوکھی بات کہیں آپ نے سنی ہے! کیا کبھی سپنوں میں بھی ہم نے سوچا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے؟ جب کبھی مزدور، جفاکش، غریب جنتا، جیل کے باسی ہڑتالیں کرتے تو انہیں قابو میں لانے کے لئے اور ان کی ٹولیوں کو توڑنے کی خاطر پولیس اور ان کی ٹکڑیاں استعمال کی جاتی تھیں. اگر ہڑتالی چھیڑو کریں تو پولیس ان پر گولیاں برساتی تھی. اب یہی پولیس کے سپاہی ہڑتالی بن بیٹھے ہیں. انہیں کون مجبور کریں کہ وہ کام پر لوٹ جائیں. اگر یہ پولیس بھوک ہڑتال کر بیٹھیں تو آپ کے پاس اس کا کیا حل ہے؟

گزشتہ ماہ آپ نے یہ خبر سنی ہوگی کہ عمارت کی راج دھانی دلی میں پولیس نے بھوک ہڑتال کر دی. دلی والوں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دوسرے مقامات کی پولیس نے بھی "بجلی ہڑتال" کر دی. مدراس کی سلجھی ہوئی پولیس نے بھی اپنی بساط بھر کوشش کر ڈالی یعنی سپاہی اپنی تنخواہ لینے سے انکار کر گئے اور مدراس کی سرکار نے حیران کن جلدی دکھائی اور ان کی تنخواہیں اُودچی کر دیں.

کیا مسئلہ ختم ہو گیا؟ کیا یہ مسئلہ کچھ اور گمبھیر نہیں بن جائے گا؟

پولیس کی ہڑتال عام ہڑتالوں سے الگ ہے. یہ بات ذہن میں رہے کہ ان ہڑتالوں کا اثر چوروں کے سماج پر پڑے گا.

رات میں ڈاکہ ڈالنے والوں کی روزی خصوصاً خطرے میں پڑ جائے گی. عام طور پر لوگ زیادہ چوکنے نہیں رہتے انھیں یقین ہوتا ہے کہ پولیس دیکھ بھال کرے گی. اپنے گھروں میں اشیاء اور مال کی حفاظت کے سلسلے میں لوگ بڑے لاپرواہ رہ جاتے ہیں. جب لوگوں کو پتہ چلے گا کہ پولیس ہڑتال کر رہی ہے تو اپنی چیزوں کی حفاظت آپ کرنے لگیں گے. ہر چیز محفوظ جگہ رکھدی جائے گی. پھر صرف دن دہاڑے ڈاکہ ڈالنے والوں کی روزی ہی چل سکے گی. رات کے سادھو چور اپنی اپنی دکانیں بڑھا دیں گے.

اسی وجہ سے پولیس کی ہڑتال چوروں کو بہت فکرمند اور مغموم بنا دے گی اور یہ بالکل فطری ردِ عمل ہوگا.

ہڑتالوں کے ان تماشوں میں اگر کوئی منظر اس سے بھی عجیب تر ہے تو وہ ہے استادوں کی ہڑتال!

کل تک ہم نے طلبا کی ہڑتالوں کی خبریں سنی تھیں. یکایک طلبا کے دلوں میں وطن کی محبت موج زن ہو جاتی اور وہ تمام اپنی اپنی جماعتیں چھوڑ کر سڑکوں پر جمع ہو جاتے. محبت سے خالی اساتذہ ان لڑکوں کو روکا کرتے، ٹوکا کرتے،

www.taemeernews.com

اور انھیں سمجھا بجھا کر کلاسوں کو لوٹا دیتے۔

یہ سب ہم نے سنا ہے، دیکھا ہے۔

"استاد بھی ہڑتال کرنے اور گلی کوچوں کی خاک چھاننے لگے"۔ یہ خبر ہم نے پہلی بار سنی۔ یہ تماشہ بمبئی میں ہوا۔ عنقریب مدراس میں بھی ہونے والا ہے۔ افواہیں گرم ہیں۔

سنا ہے کہ اساتذہ اور پولیس کے سپاہی اپنے اپنے مسائل کے حل ڈھونڈنے کی خاطر بڑے پیمانے پہ ہڑتالیں کرنے والے ہیں۔ یہ منصوبے سنجیدگی سے زیر غور ہیں۔

اگر اساتذہ اور پولیس ہڑتالیں کرنے لگے، تو زندگی کے دوسرے شعبوں سے متعلق لوگوں کا کیا کہنا۔

ڈاک گھر کے کرمچاریوں نے ہڑتال کی نوٹس دی ہے۔۔ گاؤں کے کرمچاری ہڑتالوں کے بعد بھوک ہڑتال کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔

اور پھر فیکٹریوں کے مزدور، ہوٹل کے نوکر، چھاپہ خانہ کے ملازم۔ سب کے سب ہڑتال کا پروگرام بنا رہے ہیں بہانوں کی دریافت جاری ہے!!

○

ایک جوان لڑکی اور لڑکا چرچ میں آئے اور پادری سے شادی کی رسم ادا کرنے کی درخواست کی مگر چونکہ لڑکا نشے کی حالت میں تھا اس لئے پادری نے انکار کر دیا اور کہا۔ "آج نہیں کل آجانا"۔

دوسرے روز جب وہ جوڑا آیا تو نوجوان پھر پیے ہوئے تھا۔ پادری نے انھیں دوسرے روز آنے کہہ دیا۔ تیسرے روز بھی جب نوجوان نشے کے عالم میں آیا تو پادری نے لڑکی سے کہا: "تم اپنے ساتھی کو منع نہیں کرسکتیں کہ شراب پی کر گرجے میں نہ آیا کرے"

"نہیں فادر" لڑکی بولی۔ جب وہ نشے میں نہیں ہوتا تو مجھ سے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیتا ہے"

○

www.taemeernews.com

تلگو : راوی کونڈل راؤ
مترجم : مسیح انجم

بے تکی حرکتیں، حماقتیں

دنیا میں بھانت بھانت کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ بھانت بھانت کے لوگوں میں طرح طرح کی عادتیں اور کمزوریاں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ ہاتھ ہلائے بغیر بات نہیں کر سکتے۔ بعض لوگ بات کرتے ہیں تو سر ہلنے لگتا ہے۔ بعض لوگ باتیں کرتے وقت آنکھیں مٹکانے لگتے ہیں۔ بعض کی گاڑی تو بغیر تکیۂ کلام کے آگے بڑھتی ہی نہیں جب تک کہ وہ "جو ہے" "میرا مطلب ہے" "یعنی کہ" "ہاں تو" "اچھا تو" "آل رائٹ" "یو نو (YOU KNOW)" "یو سی (YOU SEE)" وغیرہ وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا نہ لیں۔ چنانچہ ہر شخص ایک تکیۂ کلام کا محتاج ہوتا ہے۔

تکیۂ کلام کو کثرت سے استعمال کرنا گویا دوسروں کو مذاق کا موضوع فراہم کرنا ہے۔ اگر مدرس کا کوئی تکیۂ کلام ہو تو یہ جان لیجئے کہ اُس نے اپنے لئے ایک ستم ایجاد کر لیا ہے۔ یوں اگر دیکھا جائے تو مدرس کے لئے تکیۂ کلام کی قطعی ضرورت نہیں بلکہ اس کا کوئی عیب یا کمزوری ہی اس کو ستانے کے لئے کافی ہے یہ عیب اس کے اصلی نام کو گمنامی کے غار میں پہنچا کر ایک نئے نام کی ایجاد کرے گا۔ جس کے نتیجہ میں تیز و طرار اور شریر طالب علم اپنے اُستاد کو اس نئے نام سے ہی پکارنے لگ جائیں گے۔ اگر کوئی تیز چلتا ہو تو "طوفان میل" آہستہ چلتا ہو تو "کچھوا" سر جھکا کر چلتا ہو تو "بھیڑ" سر اُٹھا کر چلتا ہو تو "مغرور" نرم مزاج کا ہو تو "بھولے شاہ" تیز مزاج کا ہو تو "نادر شاہ" ــــ غرض ایسے کئی القاب سے بیچارے اُستادوں کو نوازا جائے گا۔ اس موقع پر ایک اُستاد یاد آتے ہیں جن سے صرف اتنا گناہ سرزد ہوا تھا کہ وہ سر شام بازار میں پکوڑی کھاتے دکھائی دیئے تھے۔ چنانچہ پکوڑی کے شوق نے انھیں "پکوڑی مل" بنا دیا۔ اس سلسلے میں ہمارے تلگو کے ماسٹر صاحب بھی یاد آجاتے ہیں جن کو سائلنس (SILENCE) کہے بغیر قرار آتا ہی نہیں تھا چاہے جماعت میں کتنی ہی خاموشی کیوں نہ ہو! جس کا نتیجہ یہ بنکلا وہ "سائلنس (SILENCE)" ہی کہلائے جاتے رہے۔ چنانچہ ایسی ہی مضحکہ خیز حرکتوں اور تکیۂ کلام سے اساتذہ اپنے لئے ستم ایجاد کر لیتے ہیں۔ بیچارے اساتذہ ہی کیوں؟ ہر وہ شخص مذاق کا موضوع بن جاتا ہے جو اس قسم کے بیجا تکیۂ کلام اور مضحکہ خیز حرکتوں میں مبتلا رہتا ہے۔

www.taemeernews.com

میرے ایک دوست ہیں جو دوران گفتگو ہر جملے کے آخر میں "کیا فرماتے ہیں؟" کہنے کے عادی ہیں۔ میں اپنے تئیں "کیا عرض کروں حضور" کہنے کی سکت نہ پاکر "آپ ٹھیک ہی فرماتے ہیں" کہہ دیا کرتا ہوں۔ چھٹکارا پانے کے لئے ایسا کہنا ضروری ہوجاتا ہے ورنہ وہ مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ ایک اور دوست ہیں۔ وہ جب بات کرتے ہیں تو ہر جملے کے اختتام پر "ہوں" کہنا میرا فرض ہوجاتا ہے۔ اگر میں "ہوں" نہ کہوں تو وہ ٹوک دیں گے کہ "ہوں کہو"۔ رک جاؤں تو ٹہوکا دیں گے۔ پوچھیں گے۔ میں اس اندیشے سے "ہوں" کہنے لگ جاتا ہوں کہ دیر ہونے پر کہیں وہ ہاتھ چلانہ بیٹھیں۔

ان کی گفتگو کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے:

کل سینما کو جاتے وقت اوں بولو راستے میں اوں بولو اس لڑکی کو دیکھتے ہو اوں بولو

. . . ." ان کے "اوں بولو" سے تنگ آکر ایک بار یہاں تک کہہ دیا کہ "مرجاؤں گا لیکن اوں نہیں کہوں گا۔ تمہاری مرضی آگے بولو یا بات کو ختم کردو" لیکن اس کو کیا کیجئے کہ میں پھر ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔ اور پھر سے گفتگو کا آغاز ہوجاتا ہے اور پھر مجھے "اوں" کہنا ہی پڑتا ہے۔

ایک لفظ کو بار بار استعمال کرنے سے عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوتی ہے اور ہنسی آتی ہے۔ یہ عجیب و غریب کیفیت پھر ایک بار حد سے تجاوز کر جائے تو طبیعت مکدر ہوجاتی ہے۔ ایک لفظ کو ضرورت کی حد تک ہی استعمال کریں تو ہنسی آتی ہے۔ لیکن بسا اوقات حد سے تجاوز کر جانے پر اکتاہٹ پیدا ہوجاتی ہے اور ہنسی کے بجائے رونا آتا ہے۔ سینماؤں سے ڈھل کر آنے والے الفاظ جیسے 'یا ہو' 'قربان جاؤں' 'ذرا ہٹ کے' وغیرہ پر یہی اصول کارفرما ہوتا ہے۔ اعتدال سے تجاوز کر جائیں تو ظاہر ہے یہی ہوگا۔

بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی تکیہ کلام تو نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود وہ چند عجیب و غریب حرکتوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ بعض کی یہ عادت ہوتی ہے کہ بات کرتے وقت وہ اپنی بھنوؤں کو اچھی خاصی کسرت کراتے ہیں۔ اوپر، نیچے۔ نیچے، اوپر۔ بعض اپنی آنکھوں کے پٹ "پٹا پٹ" کھولتے بند کرتے رہتے ہیں۔ بعض اپنی مونچھوں پر تاؤ پہ تاؤ دیئے جاتے ہیں۔ بعض "چق، چق" کی آوازیں نکالتے ہیں۔ بعض اپنے ہونٹ ٹیڑھے کر کے کرنے لگتے ہیں۔ بعض مونچھ والے اپنی مونچھوں کو منہ میں دباتے ہیں۔ بعض اپنے اچھے خاصے چہرے کو کئی زاویوں سے ٹیڑھا کر کے بگاڑ لیتے ہیں۔ بہر حال ہر شخص ایسی کوئی نہ کوئی عجیب و غریب حرکت میں مبتلا رہتا ہے۔ چونکہ اس قسم کی حرکت حد سے تجاوز کر کے مضحکہ خیزی کو جنم دیتی ہے، اس لئے دیکھنے والوں کو بڑا برا لگتا ہے۔ بعض لوگ بات کرتے وقت گھڑی گھڑی اپنی عینک کو ٹھیک کرتے رہتے ہیں۔ ان کو اس بات کا بھی خیال نہیں رہتا کہ آیا ان کی ناک پر عینک ہے بھی یا نہیں! بعض لوگوں کو اپنے بال درست کرتے رہنے کی عادت ہوتی ہے۔ گھڑی گھڑی ان کا ہاتھ بالوں کی طرف ہی جاتا رہتا ہے۔ بعض لوگوں کو اپنے شیو کی بڑی فکر رہتی ہے۔ وہ ہر وقت اپنے چہرے پر داڑھی کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو دانتوں سے ناخن کترنے کی عادت ہوتی ہے۔ بعض لوگ اپنے کالر کو درست کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان کے شرٹ کو کالر نہ ہو تو مخاطب کے کالر کو درست کریں گے۔

www.taemeernews.com

اگر کالر نہ ہو تو دامن ہی سہی۔ اس عمل میں ایک فائدہ یہ ہے کہ کالر یا دامن کے ہاتھ میں آجانے کے بعد مخاطب بچ کر بھاگ نہیں سکتا۔ پوری گفتگو سُننا ہی پڑتی ہے۔ دوسرے کے کالر کو درست کرتے رہنے میں یہی ایک سہولت ہے کہ گفتگو کا سلسلہ آخر تک قائم رہتا ہے۔

عورتیں جب باتیں کرنے بیٹھ جاتی ہیں تو وہ بھی سامنے بیٹھی ہوئی عورت کی چوٹی یا بالوں کو درست کرتی رہتی ہیں یا پھر چوڑیوں سے کھیلنے لگتی ہیں۔ بعض عورتوں کے منہ سے اپنی یا دوسری کی گھڑی کو اِدھر اُدھر گھمائے بغیر بات ہی نہیں نکلتی۔ بعض عورتوں کے منہ سے اس وقت تک پھول نہیں جھڑتے جب تک وہ اپنی انگوٹھی کو نہیں گھماتیں۔ اگر انگلی میں انگوٹھی نہ ہو تو آپ ان کی باتوں کو ترس جائیں گے۔

ہنسی بھی ایک لطیف فن ہے۔ لیکن یہاں بھی قباحتیں دکھائی دیتی ہیں۔ آپ کتنا ہی پھڑک دار لطیفہ سُنائیے بعض لوگ ہنستے ہی نہیں۔ محفل کے سارے لوگ ہنس رہے ہوں اور ایک شخص چہرے پر سنجیدگی طاری کئے بیٹھا رہے تو یہ منظر بڑا ہی مضحکہ خیز رہے گا۔ اُس شخص کی سنجیدگی کی حماقت پر دوسروں کو ہنسی آجائے گی۔ چنانچہ یہ واضح ہو جاتا ہے ہنسی کے موقع پر نہ ہنسنے کے عمل میں بھی مضحکہ خیزی کی پرچھائیاں پوشیدہ ہیں۔ بعض لوگ اپنے ہونٹوں کو اِدھر اُدھر منہ دبائے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ منہ بند کئے اندر ہی اندر الٹی ہنسی ہنستے ہیں "تہ، تہ، تہ"۔ کچھ لوگ ہا، ہا، ہا کہتے ہوئے زوردار قہقہہ لگاتے ہیں۔ کچھ لوگ کھانستے ہوئے ہنستے ہیں تو کچھ لوگ ہنستے ہوئے کھانستے ہیں۔ بعض لوگ ہنستے ہیں تو ہچکیاں گراتے ہیں۔ کچھ لوگ جب ہنستے ہیں تو پتھروں کے لڑھکنے کی سی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

بعض لوگ ہنستے ہوئے بات کرتے ہیں تو بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ بعض لوگ ہر معاملے میں ہنستے ہوئے بات کرتے ہیں۔ یہ بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ مثال کے طور پر "کل آپ آئے تھے؟ (ہنسی)۔ میں نہیں تھا (ہنسی)۔ ہماری خالہ کے لڑکے کی طبیعت خراب تھی (ہنسی)، دیکھنے گیا تھا (ہنسی)

کچھ لوگ ہنسی کی زیریں لہر کے تحت بات کرتے ہوئے جملوں کا ایک بے ربط سلسلہ جوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً "یہ ہمارا سالا ہے (ہنسی) آئیلو میں ملازمت کرتا ہے" (ہنسی) "اب ان کے والد وہاں نہیں رہے" (ہنسی)

ہنسنے کے معاملے میں بعض لوگوں کی انفرادیت ہوتی ہے۔ فلم دیکھتے وقت کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ سارے ناظرین ایک خاص موقع پر ہنس دیتے ہیں۔ لیکن ایک اور صاحب ایک اور موقع پر غیر متوقع طور پر ہنسنے لگ جاتے ہیں۔ تب ان کے قریب بیٹھے ہوئے ناظرین ان کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنے لگ جاتے ہیں کہ "یہ تو بے تکی ہنسی ہنس رہا ہے"! تب اس ناظر کی ہنسی پر دوسروں کو ہنسی آجاتی ہے۔ اس کی مضحکہ خیز ہنسی دوسروں کے لئے ہنسی کا سامان فراہم کرتی ہے۔

ہاں تو بعض لوگ سب ہنستے وقت ہنسی میں شامل نہیں ہوتے۔ تھوڑے سے وقفہ کے بعد زوردار قہقہہ لگاتے ہیں۔ دراصل ہنسی کا مطلب ہے، خوشی، خوش دلی اور مسرت۔ اس خوشی کو ایک محدود دائرۂ عمل میں حاصل کریں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن حد سے تجاوز کر جانے میں وہ خوشی اور مسرت مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس مضحکہ خیزی کو دیکھنے سے دوسروں کو ہنسی آجاتی ہے۔

www.taemeernews.com

ہنسی کی بات کو چھوڑیئے۔ ذرا غم کی طرف آیئے۔ بعض لوگ جب روتے ہیں تو ان کے چہرے مضحکہ خیز دکھائی دیتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں اس میں ایسی کوئی قباحت نہیں۔ لیکن ڈراموں اور سینماؤں میں یہ چیز بڑی کھلتی ہے۔ جب رونی صورت نظر آتی ہے تو اس کی مضحکہ خیزی کو دیکھ کر ہنسی آجاتی ہے۔ اس سے سارے منظر کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔ اگر سوئے اتفاق سے ہیرو، ہیروئن ہوں تو یہ بات اور بھی کھل جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ کسی فلم میں ہیروئن کے رونے کا منظر ہو تو اُس فلم کا ڈائریکٹر اس ہیروئن کو بڑے مزے سے رلائے گا۔ یہی اصول ڈرامہ پر بھی صادق آتا ہے۔ چوں کہ ڈراموں اور فلموں کے "کلوزاپ" میں خدشہ نہیں رہتا اس لئے اس میں کوئی خطرہ نہیں۔

عادتوں کے تذکرہ کے ساتھ ساتھ حرکات و سکنات کا ذہن میں آنا نہایت ضروری ہے۔ بات کرتے وقت ہاتھوں کا ہلانا ایک فطری تقاضہ ہے۔ لیکن جب وہ حد اعتدال سے تجاوز کر جاتا ہے تو بدسلیقگی کا الزام آنا یقینی ہے۔ اگر اس کے برعکس ہو، تب بھی بڑا بُرا لگتا ہے۔ کیوں کہ جب کوئی شخص بغیر ہاتھ اور سر ہلائے بات کرتا ہے تو یہ بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ چال کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ کسی کی چال ایک خاص انداز کی ہوتی ہے تو کسی کی چال ایک اور انداز کی۔ کچھ لوگ چھوٹے چھوٹے نپے تُلے قدم ڈالتے ہوئے چلتے ہیں تو کچھ لوگ باضابطہ سڑک کی پیمائش کرتے ہیں۔ بعض لوگ آڑی ٹیڑھی "سنپولے کی چال" چلتے ہیں۔ بعض لوگ جب کھڑے رہتے ہیں صرف ایک پیر کا سہارا لیتے ہیں۔ گویا ایک جانب کن کھا رہے ہوں۔ مرد کا اِس طرح کھڑا رہنا کوئی - صائقہ کی بات نہیں۔ البتہ عورتوں کے اس طرح کھڑے رہنے میں بڑی قباحتیں ہیں۔ کیوں کہ عورتیں "ہنس" کی تعریف میں آتی ہیں۔

یہ مت سمجھیئے کہ نشست و برخواست میں قباحتیں نہیں ہوتیں۔ کرسی پر بیٹھنے کی بہ نسبت نیچے بیٹھنے میں تھوڑی سی احتیاط ملحوظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ عورتیں ایک الگ طریقے سے بیٹھیں گی۔ اور مرد ایک الگ طریقے سے۔ ذکور کا اناث کے طریقے پر اور اناث کا ذکور کے طریقہ پر بیٹھنا بڑی عجیب و غریب سچویشن پیدا کرتا ہے۔

اب جبکہ فطری تقاضوں کے عین مطابق ہاتھ ہلانے کی بات آہی گئی ہے تو یہ بھی بتادوں کہ ہاتھ کے زیادہ ہلانے اور پھیلانے میں بے شمار خطرات اور اندیشے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ فرض کیجئے کہ چار آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ مچھلیوں کے ذکر پر بیچ میں بیٹھا ہوا آدمی "بہار کے نالوں میں آج بھی مچھلیاں ملتی ہیں"۔ کہتا ہوا اگر دایاں اور بایاں ہاتھ زوردار جھٹکے کے ساتھ دونوں جانب پھیلائے تو سیدھے جانب والے کا جبڑا ٹوٹ جانے اور بائیں جانب والے کی ناک زخمی ہونے کا پورا پورا احتمال رہتا ہے۔ ریل کے ایک سفر میں ایک مسافر اپنے دوست کو ایک فلمی کہانی کی تفصیلات بتا رہا تھا کہانی کے ایک خاص موڑ پر اس نے "ہیرو نے ولین کو یوں مارا" کہتے ہوئے اپنے ہاتھ کو بڑے زور سے حرکت دی۔ جس کے نتیجہ میں دوست کی عینک ٹوٹ گئی اور آنکھ زخمی ہو گئی۔

ٹیلی فون پر بات کرتے وقت بعض لوگ باتوں کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے حرکات و سکنات بھی کرتے رہتے ہیں یہ منظر دیکھنے والوں کو ہنسی آہی جاتی ہے۔ اب آپ ہی بتایئے کہ جب سامنے کوئی موجود نہ ہو تو ایکشن کی کیا ضرورت ہے۔

www.taemeernews.com

ایک افسر اعلیٰ کے فون کرنے پر ماتحت کا لپک کر ریسیور اُٹھانا اور فوراً کھڑے ہو کر اٹینشن کی حالت میں گڈ مارننگ کہنا اچنبھے میں ڈالتا ہے۔ اسی طرح کوئی افسر اعلیٰ اپنے ماتحت سے فون پر بات کرتے وقت اپنی عہدیداریت کا رعب جمانے کے لئے کرسی سے ٹیکہ لے اور دونوں پاؤں میز پر پھیلائے تو یہ بھی ایک عجوبہ معلوم ہوتا ہے۔ ایک شخص فون پر اپنے گھر کی کسی تقریب کا ذکر کرتے ہوئے لڈوؤں کی تیاری کے بارے میں کچھ سمجھا رہا تھا۔ فون کے دوسری طرف بات کرنے والے نے پوچھا "لڈو کس سائز کے چاہئیں؟" تب اُس شخص نے اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ "اس سائز کے چاہیئں" یہ سُن کر اُس آدمی کا ہنسی سے جو حال ہوا ہوگا، اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ اِدھر اِس شخص کی حرکتوں کو دیکھنے والے بھی ہنس پڑے ہوں گے۔

ہم میں بعض لوگ ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو کسی موضوع پر سوچتے وقت عالم بے خیالی میں میز پر اُنگلیوں سے طبلہ بجانے لگ جاتے ہیں۔ خوشی کے عالم میں بھی طبلہ بجانے کا یہی عمل جاری رہتا ہے۔ میں نے ایسے صاحب کو بھی دیکھا ہے جو بات کرتے وقت اسی طرح خواہ مخواہ طبلہ بجاتے ہی رہتے ہیں۔ میز نہ ہو تو بھی طبلہ بجانے کا عمل ہوا میں بھی جاری رہتا ہے۔ بعض لوگوں میں میز پر گھونسہ مار کر بات کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر بہت زور سے گھونسہ مارنے پر ہاتھ یا میز کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو یا نہ ہو، آس پاس والوں کو ضرر پہنچنے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اسی لئے بزرگ فرما گئے ہیں:

ہر معاملہ میں اعتدال مزدی ہے!

بولنے والی مشین

نیویارک کی ایک دعوت میں ایک خاتون نے مشہور موجد ایڈیسن کو کئی قسم کے سوالات سے پریشان کرنا شروع کیا، دس منٹ تک وہ یہی رٹ لگاتی رہی "میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ میں اتنے بڑے آدمی سے مل رہی ہوں" پھر وہ ایڈیسن سے کہنے لگی۔ "یہ بتاؤ، کیا یہ سچ ہے کہ بولنے والی مشین سب سے پہلے حوا نے بنائی تھی۔؟"

ایڈیسن نے جواب دیا "نہیں محترمہ، بولنے والی سب سے پہلی مشین حضرت آدم کی پسلی سے بنائی گئی تھی۔ میں نے جو بولنے والی مشین بنائی ہے، وہ ایسی ہے کہ اسے بند بھی کیا جا سکتا ہے"

www.taemeernews.com

پنجابی : ڈاکٹر گورنام سنگھ تیر
ترجمہ : راز سنتوکھ سری

(گرنام سنگھ تیر کوٹ سکھیا ضلع فرید کوٹ میں پیدا ہوئے بچپن ہی میں ان کو اپنی آغوش عاطفت میں لے لیا تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں آزادی کی تحریک سے وابستہ ہوئے اور جیل کی صعوبتیں جھیلیں اس زمانے میں پنجابی میں مزاحیہ شعر کہنے لگے۔ اور خاصی شہرت حاصل کرلی۔ اور پھر مزاحیہ نثر کی طرف توجہ دی ماہنامہ "جیون پریت" اور ہفت روزنامہ "اجیت" میں ان کے مستقل مزاحیہ فیچر شائع ہوتے رہے ہیں۔
اخباروں کے لئے فکاہی کالم بھی لکھتے رہے ہیں۔ گرنام سنگھ تیر کانگریس سے ۱۹۵۹ء تک تعلق رہا۔ وہ فٹ بال کے بہترین کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ صحافت سے بھی ان کا عرصہ تک تعلق رہا۔ محکمہ ریلوے میں بھی اعلیٰ عہدہ پر فائز رہ چکے ہیں ۱۹۶۶ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی۔ اور اب سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ایک کامیاب ترین ایڈوکیٹ ہیں۔ سیاست سے بھی ان کا لگاؤ قائم ہے۔ تقریباً ۱۲ کتابوں کے مصنف ہیں جن کے مجموعے تین شعری مجموعے ہیں۔ پنجابی مزاحیہ نثر نگاروں میں بھی انھیں خاص اہمیت حاصل ہے۔)

اعزاز دانش ور کا

اصحاب از قسم دانش ور بے شمار ناقابل برداشت ناگفتہ بہ دکھ جھیل سکتے ہیں۔ تنگ دستی، فاقہ مستی، دائمی فیض، کم تنخواہ کے ہاتھوں بے حرمتی، معاشرہ کی زیادتی، بیوی کے کوسنے اور نقادانِ فن کی سخت ترین تنقید بھی بخندہ پیشانی قبول کرسکتے ہیں۔ دانش ور پھٹے حالوں ہو، اس کے تن پر کپڑا نہ ہو، رہنے کے لئے مکان نہ ہو اور کھانے کے لئے بھی کچھ نہ ہو تو یہ قلندر آسا اسباب اس کے تخلیقِ ادب و فن کے لئے بے حد معاون ثابت ہوتے ہیں۔ پیٹ درد سے لے کر خارش تک جو امراض لاحق ہوں یہ حضرات انھیں تخیل کو مہمیز کرنے والے سمجھتے ہیں۔ دیگر ان گنت دکھوں کو بھی یہ لوگ ادبی مداوا سمجھ کر سہہ لیتے ہیں لیکن اگر کوئی بات ان کے لئے ناقابلِ برداشت اور از قبیلِ "قہرِ خدا" ہے تو وہ ہے کسی دانش ور کی عزت افزائی۔
اعزاز پانے والا دانشور کاہے کو کہتا ہی قریبی رشتہ دار یا جگری دوست ہو، وہ اس سانحہ کو کسی حالت میں بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔
اگر آپ نے چند کلاکاروں کی بنائی ہوئی تصویروں میں سے ایک کلاکار کی تصویر کو پسند کرلیا ہے اور آپ کی کمیٹی نے اُسے اعزاز بخشنے کا فیصلہ کرلیا ہے، تو اس کمیٹی اور اس کلاکار سے بڑا دشمن دانش ور فن کار کے نزدیک کوئی اور نہیں ہوسکتا، وہ کوئٹہ کے بھونچال میں برباد شدہ لوگوں کی مانند چیخ اُٹھے گا:۔
"ابے اُلّو کے پٹھو! یہ کیا غضب ڈھایا!! اُلٹے سیدھے خطوط کھینچنے والے ایک اول جلول نام نہاد کلاکار کی بے ڈھب

www.taemeernews.com

اور بھدی کاپر رکھ گئے؟ تم اُن بچوں سے ملتے جلتے ہو جو ہیروں کو نظر انداز کر کے کوڑیوں اور سنگریزوں کو پسند کر لیتے ہیں۔"

سنگیت سبھا کی انتخاب کمیٹی نے کسی مغنّی کی عزت افزائی کرنے کی بھول کر لی ہے۔ تو یہ لوگ اس بھول کا مزا چکھے بغیر نہیں رہ سکتے انھیں ضرور بُرا بھلا کہا جائے گا، اور جملہ مغنّی جو اس اعزاز کی گاڑی میں سوار ہونے سے رہ گئے ہیں، وہ اپنی موسیقی کی صلاحیتوں کو بھول کر کہیں گے:

جیسے گدھے وہ خود تھے ویسا گدھا انھوں نے تلاش کر لیا ہے۔ اس گویّے سے تو بھوکے گیدڑ بہتر راگ الاپ لیتے ہیں۔ گیدڑوں کی بات بھی چھوڑیئے، کسی گاؤں کے بھونکنے والے کتوں کی آواز میں بھی اس گویّے کے سنگیت سے ترنم زیادہ ہوتا ہے۔ ایک مخصوص لے ہوتی ہے، کشش ہوتی ہے اور موسیقی ہوتی ہے۔"

اگر کسی ساہتیہ اکادمی یا ساہتیہ منڈل سے کسی ادیب کی عزت افزائی کا گناہ سرزد ہو گیا ہے تو وہ بھی بچ کر کہاں جائیں گے۔ انہیں فن موسیقی و رقص کے نقادوں کی جانب سے بپا کردہ تنقیص سے بھی زیادہ سختی کا سامنا کرنا پڑیگا۔

چندی گڑھ کے ایک ادیب کی کتاب کو ایک اور ریاست کی سرکار نے اعزاز بخشنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس حکومت کے متعلقہ شعبہ کے ڈائرکٹر کو جو "پیغاماتِ سعید" ملے ہیں ان کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"جو کتاب آپ نے ایوارڈ کے لئے انتخاب کی ہے وہ ایک ٹوتھ پیسٹ سے مشابہ ہے۔ آپ ٹیوب کو بچپلی طرف سے جتنا جی چاہے دبایئے، اس میں سے آپ کی توقع کے خلاف نکلے گا کچھ بھی نہیں۔"

"یہ ایک خوفناک فیصلہ ہے۔ جیسے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ ادیب بھی پسند نہیں کر سکتا!"

"بہتری بکواس سُننے اور پڑھنے کا موقع ملا ہے، لیکن بکواسیات کا جو مجموعہ آپ نے انعام کے لئے چُنا ہے وہ آپ کو ہی مبارک باد!"

نہ تو یہ کوتا ہے، نہ گیت (نثر) یہ تو نِراگند (خلاظت) ہے جو آپ نے انعام سے نوازنے کے لئے چُن لیا ہے!"

"معلوم نہیں آپ کے صوبہ میں کسی شخص میں ادبی سوجھ بوجھ ہے بھی یا نہیں، لیکن جو کتاب آپ نے اعزاز کے لئے منتخب کی ہے اس سے ثابت ہو گیا ہے کہ آپ کے صوبہ کی حکومت اور عوام کی عقل لطیف کا دیوالیہ پٹ چکا ہے!"

"یہ کتاب کسی معزز گھرانے میں رکھے جانے کے قابل نہیں۔ اس کتاب کا جو نام تجویز کیا گیا ہے وہ سراسر غلط ہے۔ اس کے لئے موزوں نام "کنجر خانہ" (خاشی کا اڈہ) ہے۔"

"کیا کوئی اور ادیب باقی نہیں رہا تھا جو آپ نے ازل ترین ادیب کی تصنیف کا انتخاب برائے ایوارڈ کیا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری روپیوں کا اس سے زیادہ غیر موزوں اور غیر ذمہ دارانہ استعمال اور کیا ہو سکتا ہے؟!"

"آپ سے لاکھوں فرد گذاشتیں سرزد ہو جائیں تو قابلِ معافی نہیں، لیکن جو بھول آپ نے چندی گڑھ کے ادیب کی کتاب کو انعام سے نوازنے کے لئے کی ہے، اُسے تاریخِ وقت کبھی معاف نہیں کرے گی۔"

"اس کتاب کو انعام دینے سے پہلے آپ کی ریاست میں صدارتی حکومت کا نفاذ کر دیا جانا چاہیئے تھا۔ کیوں کہ جو حکومت بُرے بھلے ادیب میں تمیز نہیں کر سکتی، اسے بیک بینی و دوگوشی ایوانِ اقتدار سے نکال باہر کرنا چاہیئے۔"

"جب اخلاق باختہ، آلو کا پٹھا ناخندہ کی دُم بکواسیات کا خالق ادیب تھا اسی گھٹیا معیار کی کتاب اُس نے تخلیق کر ڈالی جو بالکل فطری اَمر ہے بقول یکے "جیسی چیل ویسے بچے"! اور اب اس کتاب کو اعزاز سے نوازنے والوں کی نسبت کیا کہا جائے؟"

www.taemeernews.com

جو حضرات مذکورہ بالا ادیب کی کتاب کے متعلق عزت افزائی کرنے والی حکومت کو متذکرۃ الصدر قسم کے خطوط لکھ رہے تھے، وہ دوسری جانب مختلف ادبی انجمنوں سے اس کتاب کے خلاف ریزولیوشن پاس کروانے کی جدوجہد کر رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ ہی متعلقہ ادیب کو مبارک باد کی چٹھیاں لکھ رہے تھے۔ وہ ادیب اگرچہ بڑا "دانشور" تھا، لیکن اتنا بڑا "گناہ" کرنے کے بعد اس پر روشن ہو چکا تھا کہ اس دنیائے دنی میں اس کے مخلص دوست کتنے ہیں!

مبارکباد پہنچانے والے جملہ احباب کو اس نے ایک مشترکہ مکتوب تحریر کیا جس میں درج تھا:

"میرے دوستو! اس دنیا میں کوئی کسی کا دوست نہیں!"

اس دانش ور کے اعزاز کی دُکھ بھری کہانی سننے اور پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اور جو کچھ مجھ سے ممکن ہو اگر گزروں گا لیکن اپنی کسی کتاب کے لئے کبھی کسی حکومت یا انجمن سے اعزاز طلبی کی سعی نہیں کروں گا!

ادیب، فن کار یا کسی دانش ور نے جس روز اپنے فن کے لئے اعزاز قبول کر لیا، اُسی دن اس کے فن اور احباب کا خاتمہ یقینی اور حتمی ہے!!

O

ایک نوجوان امریکی خاتون کے خلاف کسی اسٹور سے کچھ اشیاء چرانے کے الزام میں سماعت ہو رہی تھی۔ اس کے وکیل نے اُسے ہدایت کی کہ جب میں میز پر ہاتھ ماروں تو تم رونا شروع کر دینا۔ بحث کے دوران وکیل کا ہاتھ غلطی سے میز پر لگ گیا تو خاتون نے رونا شروع کر دیا۔ جج بہت حیران ہوا اور اس سے پوچھا "خاتون تم کیوں رو رہی ہو؟ کیا ہوا؟"

اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "جناب میرے وکیل نے مجھ سے کہا تھا کہ جب میں میز پر ہاتھ ماروں تو رونا شروع کر دینا۔ ابھی ابھی انھوں نے میز پر ہاتھ مارا۔ اس لیے رو رہی ہوں۔"

اس پر عدالت میں زور زور سے قہقہے بلند ہونے لگے لیکن ملزمہ کا وکیل بھی بڑا ہوشیار اور حاضر جواب تھا۔ اُس نے جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "می لارڈ! دیکھیے کتنی سادہ اور معصوم خاتون ہے۔ بھلا ایسی بھولی بھالی عورت چوری کر سکتی ہے؟"

عدالت نے خاتون کو رہا کر دیا۔

O

www.taemeernews.com

مترجم: مناظر عاشق ہرگانوی
بنگلہ: نارائن گنگوپادھیائے

"ہیلو مجھے مار"

یہ ہنگامہ خیزی سویرے آٹھ بجے سے شروع ہوجاتی ہے۔ اور رات آٹھ بجے تک جاری رہتی ہے۔ ربندر ناتھ جیسے شانتی اور اہنسا کے پجاری کو بھی لکھنا پڑا تھا۔ "شرافت جب حد پار کرلیتی ہے تب قتل بھی پاپ نہیں ہوتا"۔

میں شاعر اعظم کی طرح شانت اور غیر تشدد پسند نہیں ہوں۔

میری بس ایک ہی خواہش ہوتی ہے کہ ٹیلیفون اٹھا کر پٹک دوں۔ لیکن کلکتہ جیسے شہر میں آج کل ٹیلیفون پانا کتنا مشکل کام ہے۔ یہ جاننے والے ہی جانتے ہیں۔ نتیجتاً دانت سے دانت پیس کر رہ جانا پڑتا ہے۔

صبح سویرے کاغذ قلم لے کر کسی کہانی کے پلاٹ پر غور و فکر کرنے بیٹھتا ہوں اور قلم چلانے کے لئے اٹھاتا ہی ہوں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی جھنجھنا اٹھتی ہے۔ ریسیور اٹھا کر کہتا ہوں "ہلو"

ادھر سے پوچھا جاتا ہے "رام بلاس آدک اینڈ کمپنی سے بول رہے ہیں؟"

"جی نہیں"۔

"تب فون کیوں اٹھایا آپ نے؟"

"آپ نے غلط نمبر لگایا ہے اس لئے"

"نانسنس"

یہ تخاطب سنتے ہی کلیجہ ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ لیکن غلط نمبر لگ جانے پر کبھی کبھی ایسی مدھر باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ طبیعت باغ باغ ہوجاتی ہے۔ اس لئے اکثر غلط نمبر کا لگ جانا برا نہیں لگتا۔

گھنٹی بجتی ہے۔

"رام بلاس بابو ہیں؟"

"نہیں"

"نہیں ہیں؟ کہاں گئے؟ یوں کیسے کام چلے گا! ابھی کل ان سے بات ہوئی تھی کہ آٹھ بجے کے پہلے ہی وہ ایک گاڑی بالو اور دس بورا سمنٹ بھیج دیں گے۔ یہاں مستری آکر بیٹھے ہیں۔ کب کام شروع ہوگا؟"

درمیان میں ہی روک کر کہنا پڑتا ہے کہ رانگ...

www.taemeernews.com

بات پوری ہونے سے پہلے ہی آواز آتی ہے۔
"رنگ کون چاہتا ہے۔ ابھی پلستر ہی شروع نہیں ہوا، رنگ لے کر کیا کروں گا؟ کیا منہ میں لگاؤں گا یا سر پہ پوتونگا؟"

وہ چاہے منہ میں لگائیں یا سر پہ پوتیں مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔ لیکن اُن کے چکر میں اپنا سر درد کیوں مول لوں؟ خود کو قابو میں رکھتے ہوئے میں نے کہا "رنگ نہیں، رانگ نمبر آپ نے لگایا ہے۔"

"تب بلا وجہ اتنی دیر پریشان کیوں کرتے رہے؟ ایڈیٹ!"

اس خوبصورت گفتگو کے بعد میں اپنے کام میں لگ جاتا ہوں۔

لیکن آدھے گھنٹے کے بعد ہی پھر گھنٹی بجتی ہے اور آواز آتی ہے "کون؟ جگو؟ ذرا بابو جی کو بلاؤ۔"

میری طرف سے 'ہلو' سن کر ہی انہوں نے سمجھ لیا کہ میں جگو نوکر ہوں۔ عاجزی سے کہتا ہوں "میں جگو نہیں ہوں۔"

"کون ہو تم؟"

"ایک بیکار نوجوان۔"

مذاق کرتے ہیں۔ رام بلاس بابو سے کہیئے کہ پارک اسٹریٹ سے...."

"براہ کرم یہ بات آپ خود کہیئے کیوں کہ یہ رانگ نمبر ہے۔"

کبھی کبھی رانگ نمبر لگنے پر مزہ بھی آتا ہے۔ کسی میٹھی آواز میں سینما چلنے کی فرمائش ہوتی ہے۔ کوئی کہتا ہے "کل تمہاری بیوی کو سر[illegible]

میں تصور میں چٹخارے لیتا ہوں کیونکہ رائٹ نمبر میں کوئی مجھے ایسی دعوت نہیں دیتا، کوئی کہتا ہے۔ راکھال بابو! ارے آپ دلی سے کب آئے؟ آج شام کی پارٹی ہمارے یہاں ہوگی۔ ڈولی کو لے کر آیئے گا ورنہ میں خود چھ بجے موٹر لیکر آجاؤں گی؟

یہ سب ضرور اچھا لگتا ہے مگر یہ کمبخت رام بلاس بابو میرا دماغ خراب کئے دے رہا ہے۔ اس کا راز ٹیلیفون ڈائرکٹری اُلٹنے پر معلوم ہوا۔ ہم دونوں کے چھ ہندسوں کے نمبروں میں صرف ایک ہندسہ الگ ہے اور وہ بھی قریب ہی قریب۔ کہنے کا مطلب ۴۰-۴۱ سے ہے۔ سمنٹ، سرخی، بالو کے چکر میں پریشان شخص چار سے چھٹک کر پانچ میں انگلی ڈال دیتا ہے۔ اور میں فوراً رام بلاس بابو کا دفتر بن جاتا ہوں۔ رام بلاس آدک کھنی اس طرح ناک میں دم آجاتا ہے!

نیچے باتھ روم میں نہا رہا ہوتا ہوں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی سنتے ہی اوپر آتا ہوں آرڈر ملتا ہے "دس ہزار اینٹ، بیس بورا سمنٹ...."

چھٹی کے دنوں میں بھی سکون نہیں ملتا۔ ذرا سی جھپکی آئی، اُدھر سے آواز آئی۔

"بابو۔ بابو کہاں ہے؟"

چڑھ کر کہتا ہوں "گنگا کے اُس پار۔"

آخر جب درد حد سے سوا ہوگیا تو مجھے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا کہ فون کرنے والے احتیاط برتیں۔

"رام بلاس بابو؟"

میں پوچھتا "یہ کو[illegible] آواز ہے؟"

"کیا کہہ[illegible]"

www.taemeernews.com

"ہائے ظالم! تمہارا کب دیدار ہوگا؟"

اُدھر سے ناراضگی بھرے الفاظ میں سوال ہوتا

کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ابھی میں مسٹر سرخی کا روزگار نہیں کرتا

مناسب کمپنی کھولنے پر غور کر رہا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو ایک

لنگڑے فوجی کا ناول دے سکتا ہوں"

"کیا بک رہے ہیں۔ پاگل تو نہیں ہوگئے ہیں؟"

دوسرا منظر دیکھئے:۔

"میرے یہاں چونا نہیں آیا؟"

"بھیج رہا ہوں۔ ساتھ ہی ایک بورا کالک بھی"

"کالک؟ اس کا کیا کروں گا؟"

"منہ پر ملئے گا۔ آپ، آپ کے گھر کے دوسرے

لوگ اور محلے ٹولے والے۔ محبت سے پہرے پر کالک ملئے گا۔"

"ہاٹ؟" ٹیلیفون کے اندر آتش فشاں پھٹتا ہے۔

"آپ کو معلوم ہے کہ میں کون ہوں؟ اس لہجے کا مذاق کرنے

کی ہمت کیسے ہوئی؟ میں آپ کا بیس سال پرانا گاہک ہوں"

"آپ کا نام گاہک کی فہرست سے آج ہی ہٹا دیتا

ہوں۔ خبردار آئندہ کبھی چونا سرخی کی بابت کسی بھی طرح کی

بات کی تو گولی مار دوں گا۔"

تیسرا منظر:۔

میں نے کہا "تو کون ہے؟"

"تو؟ کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب کیا ہے؟ چالیس ہزار تمہارے یہاں بقایہ

پڑا ہے اور انہیں ابھی آپ کہئے؟"

"میرے یہاں چالیس ہزار روپیہ بقایا ہے؟"

"جی ہاں! آپ کے یہاں نہیں ہے تو آپ کے ماما کے

یہاں ہوگا۔ آج اگر شام کو پانچ بج کر سینتالیس منٹ، بارہ

سکنڈ پر روپیہ وصول نہیں ہوا تو میں تمہیں اور تمہارے

ماما کو دس سال کے لئے لال حویلی بھجوا دوں گا۔"

"معاف کیجئے گا، لگتا ہے کہیں غلطی ہوگئی ہے؟"

"غلطی؟" میں گرج اٹھا "میں رام بلاس آدک، آج

پچیس سال سے روزگار کر رہا ہوں اور مجھ سے غلطی

ہوجائے؟ جو ایسی بات زبان پر لائے گا، میں اُس کا منہ

نوچ لوں گا۔"

"ایں!"

یہیں لائن کاٹ دیتا ہوں۔

پھر جو چھٹے تو اس طرح میں لطف لیتا رہا کبھی

کبھی تصور کی آنکھ سے دیکھتا کہ سبھی گاہک رام بلاس بابو

کی گدی پر جمع ہوکر جھگڑ رہے ہیں۔

لیکن آدمی کی بدقسمتی بھی کوئی چیز ہے۔

اِدھر دو دن کے اندر مجھے تین خط ملے ہیں، جن میں

پہلا یوں ہے:۔

محترم!

آج سے دو سال قبل آپ کا ایک ناول خلانے کے

لئے، آپ سے روبرو بات چیت ہوئی تھی۔ کنٹریکٹ فارم

تیار کرنے کے بعد آپ سے فون پر میں نے بات چیت کی۔

اُس وقت آپ نے چور، اٹھائی گیر، حرامزادہ جیسے الفاظ

سے میرا استقبال کیا۔ اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مستقبل

میں آپ کی کوئی بھی کہانی ہم نہیں خریدیں گے۔ آپ کے

خلاف میں نے ہتک کا دعویٰ نہیں کیا، اتنا ہی کافی ہے۔

آپ کا

فلاں... فلاں

www.taemeernews.com

دوسرا خط یوں ہے :

تمہارا نیا ناول پڑھ کر طبیعت اتنی خوش ہوئی کہ مبارکباد دینے کے لئے فون لگایا۔ جواب میں تم نے مجھے الو، گوبر اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ ایک ادیب ہو کر تم نے میری اس طرح بے عزتی کی ہے۔ اب دیکھنا ہے تم کیسے اپنی ساکھ بنائے رکھتے ہو۔ (ایک رسالے کا نام) سے تمہارا نیا ناول میرے پاس تنقید و تبصرہ کے لئے آیا ہے۔ سوچا تھا اپنی تنقید سے تمہیں امر بنا دوں گا۔ لیکن اب یہ سوچا ہے کہ ایسی تنقیص کروں گا کہ مستقبل میں ناول لکھنے کا ارادہ ترک کر دو گے۔

تمہارا ہی

ایک پرانا دوست اور حالیہ دشمن

اور یہ میرا خط ہے :-

بیٹا۔ تمہیں خط لکھنے کی خواہش نہیں ہو رہی ہے میرا خیال تھا کہ میں نے ایک شریف اور اچھے لڑکے کو اپنی لڑکی دی ہے۔ لیکن اب لگ رہا ہے کہ میں نے زندگی کی سب سے بڑی بھول کی ہے۔ تم اتنے بڑے شرابی اور شیطان ہو گئے ہو، یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔ کل بردوان سے جب کلکتہ آیا تو سب سے پہلے تمہیں فون کیا۔ جواب میں تم نے مجھے یہ صلاح دی کہ میرا گھر مسافر خانہ یا دھرم شالہ نہیں ہے اس لئے میں کسی اور جگہ ٹھہر دں۔ یہاں حرام کی کمائی کا لنگر خانہ نہیں کھلا ہوا ہے اس لئے کہیں اور کھانا کھاؤں اور ریٹرن ٹکٹ کٹا کر گھر واپس جاؤں! شاید تم بہت زیادہ شراب پینے لگے ہو ورنہ کوئی بھی داماد اپنے سسر کو ایسی صلاح نہیں دے سکتا۔ فی الحال میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور کل ہی گاؤں لوٹ جاؤں گا۔ اب آئندہ میں تم سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ ایک الگ خط میں یہ تمام باتیں اپنی لڑکی کو بھی لکھ رہا ہوں۔

فلاں ... (میرے سسر)

اب مجھے ہوش آیا ہے کہ دوسروں کی جڑ کاٹتے رہنے پر کبھی کبھی اپنی جڑ بھی کٹ جاتی ہے۔

سیڑھیوں پر جانے پہچانے قدموں کی آواز سنائی دے رہی ہے جو تیزی سے میرے کمرے کی طرف آ رہی ہے۔ جی ہاں، میری بیوی کے قدموں کی آواز!

●●

سمجھوتا

○

ایک مینیجر نے اپنی سیکریٹری سے کہا "اب شادی تو ہم نے کر ہی لی ہے اس لیے یہ بات پوشیدہ رکھنا اور ہوشیار رہنا۔ اگر اسے ہماری شادی کا علم ہو گیا تو وہ ہمارا جینا دوبھر کر دے گی۔"

سیکریٹری نے مسکرا کر جواب دیا۔ "آپ کو بھی میرے پہلے شوہر سے خبردار رہنا ہوگا کیوں کہ وہ بڑا ظالم آدمی ہے۔ بات بات پر پستول نکال لیتا ہے۔"

○

www.taemeernews.com

اڑیا: فتور انند

ترجمہ، اسماعیل آذر

غیر ضروری مہمان

(نام رامچندر مشرا تخلص نام، فتور انند. تاریخ پیدائش یکم جون ۱۹۱۵ء بمقام کٹک.
والد کا نام، دویادھر مشرا. ۱۹۳۸ء میں اڑیسہ میڈیکل اسکول سے ایل. ایم. پی اور ۱۹۴۷ء میں اٹکل یونیورسٹی سے بی اے کیا. ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا. ۱۹۴۶ء میں آپ کی بنائی جاتی رہی. ۱۹۴۸ء میں آپ کی پہلی تصنیف "کوی وھمی" مزاحیہ رسالہ "ڈگر" میں شائع ہوئی. موصوف ۱۹۶۹ء میں "ڈگر" سے منسلک ہوئے. آپ کا پہلا ناول "ناکٹا چرما" ۱۹۵۲ء میں چھپ کر منظر عام پر آیا.

دیگر تصنیفات: ۱. "نیلو تھوکوی" (شعری مجموعہ) ۱۹۵۵ء ۲. "ساہتیہ چاسو" (مجموعہ مضامین) ۱۹۵۹ء ۳. "ہیریشا" (مجموعہ مضامین) ۱۹۵۹ء ۴. "بید دسوکو" (مجموعہ مضامین) ۱۹۶۲ء ۵. "نگڑ واری ساہتیہ سمد (مجموعہ مضامین) ۱۹۶۳ء ۶. "ہسوکورا" (مجموعہ مضامین) ۱۹۷۱ء ۷. "بردھتو بھا نڈو (مجموعہ مضامین) ۱۹۷۵ء ۸. امرتسبے بیاد (مجموعہ مضامین) ۱۹۷۵ء ۹. "آدرشو ہندو ہوٹل" (ترجمہ) ۱۹۷۶ء ۱۰. "بھارتو شرشٹھو ہاسیہ گلپو (ترجمہ) ۱۹۸۰ء ۱۱. "دوٹ" (مجموعہ مضامین) ۱۹۸۲ء ۱۲. "بھالو چنا" (انشائیے) ۱۹۸۳ء ۱۳. "گت" (مجموعہ مضامین) ۱۹۸۲ء ۱۴. "کلیکتی چینکا (ڈرامہ) ۱۹۸۳ء ۱۵. "ساہتیہ بے اوسڑوں" ۱۹۸۳ء (مجموعہ مضامین).)

اڑیسہ کا پہلا خلائی طیارہ "برن راکٹ" اپنی راہ بھٹک کر ایک انجانے سیارے میں اتر گیا تھا. اس کے خلاباز اس سیارے میں اترے تو ایسے مست ہوئے کہ لوٹنے کا نام نہیں لیا. انہوں نے صاف سنا دیا کہ اب وہ بدخواہوں، مطلب پرستوں، بے ایمانوں، ضمیر فروشوں کی دنیا میں کبھی نہیں لوٹیں گے. اڑیا سائنس دانوں کو ان لوگوں کی مدد سے کیا خوب معلومات حاصل ہوئیں اور ان معلومات سے وہ سائنسی ترقی کے لئے کیا کچھ کر لیتے! آہ! کمبختوں نے کیا چونا لگایا! تمام سائنس دانوں کے منہ یوں بگڑ گئے گویا بے خودی میں انھوں نے املی پر زبان رکھ دی ہو. اس سانحے سے ایسا شدید جھٹکا لگا کہ سب کے سب کچھ دنوں تک سکتے میں آ گئے تھے. لیکن انھیں سنبھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگی. انہوں نے خود کو یہ کہہ کر دلاسہ دیا۔ "ایک بار کی ناکامی سے اس قدر ٹوٹ جانا بھی کیا ہے۔ کیا ہم میں مردمی نہیں ہے؟ ہم ایک اور خلائی طیارہ بنائیں گے۔ ایک اور ٹولی کو خلابازی کی تربیت دے کر تیار کریں گے۔

www.taemeernews.com

رابرٹ بردس صاحب نے سات مرتبہ جنگ ہاری تو آٹھویں مرتبہ کہیں جاکر کامیاب ہوئے تھے۔ ہماری ہار تو فقط ایک بار ہوئی ہے۔ اٹھو بھائیو! کام پر جُٹ جاؤ" چنانچہ "کوہ نور جنتری" دیکھی گئی۔ پیٹھا پور کے ایک مشہور و معروف جیوتش سے صلاح، مشورہ کیا گیا اور بالآخر آساڑھ کے ڈھلتے دنوں میں اکادشی کے روز کام کا آغاز ہوگیا۔ لوہار پہلے تجربے سے طاق تھے ہی، دھونکنی اور ہتوڑے کی کھٹ پٹ کھٹ پٹ سے دس خانوں والا ایک "بیجو راکٹ" پھٹ سے کھڑا کردیا۔

تیاری تو ہو چکی۔ مگر خلابازوں کا بھی تو کچھ پتا چلے۔ تین افراد کو سولہ روز تک خلائی تربیت دی گئی تھی۔ کمبخت آخر دم تک ہاں ہوں کرتے رہے اور عین موقع پر ٹھیکے کی پیشگی جیسی ایک موٹی رقم لے کر رفو چکر ہوگئے۔ بہت ڈھونڈا مگر نشان نہ ملا۔ شبھ لگن کے نکل جانے کے اندیشے نے سائنس دانوں کو بے تاب کر ڈالا۔ ابھی وہ لوگ پیچ و تاب کھا ہی رہے تھے کہ ایک پروہت نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں گھبرانے کی بھلا کون سی بات ہے۔ اتنی چھوٹی سی بات پر تم لوگ خواہ مخواہ مغز کھپی کر رہے ہو۔ دیہاتوں میں تم نے دیکھا نہیں تو کم از کم سُنا ضرور ہوگا کہ دلہا اگر شادی کے عین موقع پر بتا بتا دیتا ہے تو کھیت میں کام کرتے ہوئے ایک اچھے تگڑے نوجوان کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ نہلا دھلا کر ایک دھوتی باندھ دی جاتی ہے اور منڈپ میں گھسیٹتے ہوئے لاکر شادی کا کام بڑھا لیا جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حساب بٹھا کر تین کا شکار ہم بھی کر لیتے ہیں۔ انھیں تھوڑی سی تربیت دے کر طیارے میں ٹھونس دیتے ہیں اور منٹ سے اوپر چھوڑ دیتے ہیں"۔

بات بنتے کی تھی، سبھوں کو بھا گئی۔ سب کے سب شکار کو نکلے۔ دیر ان سے علاقہ میں انھیں ایک نہایت ہی تنگ جھونپڑی نظر آئی۔ اس جھونپڑی میں جبکہ ایک کی گنجائش محال تھی وہاں انھوں نے تین اشخاص کو نیند کے مزے لوٹتے دیکھا۔ اس حسین انکشاف سے سائنس دان بہت متاثر ہوئے اور اس بات سے اتفاق کیا کہ یہ تین سرد طیارے جیسی تنگ جگہ میں کھب کر اطمینان سے سفر کر سکتے ہیں۔ لیکن جونہی انھیں جگایا گیا وہ لوگ ہڑبڑا کر ایک دوسرے سے لپٹ گئے اور لوٹنیاں کھاتے ہوئے بڑبڑانے لگے۔ "میں گریا نہیں ہوں! میں بھُریا نہیں ہوں! میں سُریا نہیں ہوں! میں تو سسرال سے لوٹ کر یہاں آرام کر رہا تھا۔ میں تو ماموں کے گھر سے لوٹ رہا ہوں۔ میں خالو کے گھر سے لوٹ رہا ہوں۔ . . . ."

سائنس دان انھیں تسلیاں دینے لگے اور جب نیندوں کو قرار آیا تو خلائی طیارے میں چلنے کی بات کہی۔ تینوں کچھ دیر تک دم بخود بیٹھے رہے۔ بعد ازاں باہمی مشورے کے لئے تخلیے میں چلے گئے۔ ایک نے کہا۔ "یار! موقع سنہرہ ہے۔ زمین پر ہم ہوں گے نہ ان کی گرفت میں آئیں گے۔"

تینوں نے سائنس دانوں کے روبرو اپنی رضامندی اور ساتھ ہو لئے۔ سائنس دانوں نے انھیں مشینی آلوں کو عمل میں لانے کی ترکیبیں بتائیں۔ نیز ڈھارس دیتے ہوئے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ ہم زمین پر ہوتے ہوئے بھی تم لوگوں سے بات چیت جاری رکھیں گے۔ اگر تم کچھ بھول جاؤ تو ہم تمہیں یاد دلاتے رہیں گے۔ خاطر جمع رکھنا۔"

درزیوں نے خلائی لباس پہنا دیا۔ گریا، بھُریا اور سُریا نے دائیں بائیں اچٹتی سی نگاہیں ڈالیں اور طیارے میں غڑاپ سے گھس کر دروازہ بند کر لیا۔ سائنس دانوں نے ہر طرح جانچ پڑتال کے بعد طیارے کو داغ دیا۔ "بیجو" ایک زوردار

www.taemeernews.com

آواز کے ساتھ بلند ہونے لگا اور پلک جھپکتے نظر سے غائب ہوگیا۔ سائنس دانوں نے خلا بازوں سے فوراً رابطہ قائم کرلیا۔ اس واقعہ کے ایک گھنٹہ بعد پولیس کے ایک جمعدار نے سائنس دانوں سے مل کر کہا۔ "تین قیدی جیل کی دیوار پھاند کر بھاگ گئے ہیں۔ ہم نے سنا کہ وہ ادھر آئے ہیں۔ ان کے نام ہیں۔ گریا، جھریا، اور سریا۔ گزشتہ الکشن کے دوران کئی جرائم میں ملوث ہو کر جیل کی ہوا کھا رہے تھے۔ الکشن میں انہوں نے خوں ریزی سے بھی گریز نہیں کیا تھا۔ یقیناً وہ لوگ ادھر ہی آئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟

سائنس دان سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ایک نے بمشکل تمام کہا۔ "وہ لوگ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔" ایک پولیس والے نے حیرت سے پوچھا۔ "ہائیں! تینوں مر گئے؟ وہ کیسے؟" "نہیں" سائنس دان نے جواب دیا۔ "ابھی مرے نہیں ہیں۔ فی الحال بذریعہ طیارہ خلاء میں پہنچ کر زمین کا چکر لگا رہے ہیں۔ اب وہ صحیح سلامت لوٹیں گے یا نہیں یہ بتانا مشکل ہے۔" یہ سُن کر پولیس والوں کے چہرے اتر گئے۔

پولیس والوں کے جاتے ہی اصلی خلا باز آن دھمکے۔ انھیں دیکھتے ہی سائنس دانوں کا غصہ عود کر آیا۔ انہوں نے جھاڑ پلاتے ہوئے کہا۔ "آنے میں اتنی دیر سے کہاں مر گئے تھے؟ مرے تھے تو مر ہی جاتے۔ زندہ ہونے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟" ایک خلاء باز نے گھگھیاتے ہوئے کہا۔ "ہم آ ہی رہے تھے کہ راستے میں دُرگا ٹاکیز سامنے آگئی۔ بڑی اچھی فلم چل رہی تھی۔ ہم نے سوچا کہ کل اسے دیکھنے سے تو رہے۔ آج ہی دیکھ لینا بہتر ہے۔ بہرحال فلم ختم ہوتے ہی تو دوڑے آ رہے ہیں۔" ایک سائنس دان اور بپھر گیا۔ "دور ہو جاؤ نامعقولو! غیر ذمہ دارو! تمہاری ضرورت اب نہیں رہی۔ تین داغی تمہارا چانس مار چکے ہیں۔ تم لوگ اب بچے ہوئے سینما ہالوں میں جا کر فلمیں دیکھا کرو۔"

اصلی خلاء بازوں کو نکال کر سائنس دان نقلی خلاء بازوں کی طرف متوجہ ہوگئے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ چیخ پڑے ــــ "ستیاناس! تینوں سو چکے ہیں! کوئی آواز نہیں آ رہی ہے۔ راکٹ کے ایندھن کو اب تک بند نہیں کیا ہے۔ اس کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے۔ فی سکنڈ آٹھ میل کے بجائے چوبیس میل کی رفتار سے اُڑان بھر رہا ہے۔ ارے، یہ نامعقول خلاء میں گم ہو جائیں گے۔ ان کی واپسی ممکن نہیں ہے۔"

خطرے کی گھنٹی دھڑا دھڑ بجائی گئی۔ بڑی کوششوں کے بعد تینوں نے آنکھیں کھولیں۔ گریا نے خفت آمیز لہجے میں زمین سے پوچھا۔ "کیا ہے؟ ہم کہاں ہیں؟" زمین سے جواب ملا۔ "تم سب جہنم میں ہو۔ فوراً ایندھن بند کر دو۔" حکم کی تعمیل ہوئی۔ سائنس دانوں نے کمپیوٹر دیکھ کر کہا۔ "تمہارا راکٹ فی سکنڈ تیس میل کی رفتار سے بھاگتا ہوا سارے سیاروں کی کشش سے آگے نکل چکا ہے۔ اُلٹا طیارہ یعنی ریورس راکٹ چلاؤ اور فوراً رفتار بند کرو۔ نزدیک کوئی ستارہ یا سیارہ جو بھی ملے اس پر اتر جاؤ۔"

گریا نے طیارہ بند کیا اور ریورس راکٹ کو عمل میں لے آیا۔ تھوڑی دیر بعد اسے دیکھا کہ ایک روشن گولہ ان کی طرف بڑی تیزی سے بڑھتا چلا آ رہا ہے اور ساتھ ہی اس کی گولائی بھی بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے فوراً زمین کو خبر کر دی۔ زمین کے سائنس دانوں نے کہا۔ "وہ گولہ تمہاری طرف نہیں آ رہا بلکہ تم اس کی طرف بڑھ رہے ہو۔ الٹے طیارے کو پوری طاقت سے چلاؤ۔ تین منٹ بعد اسے مکمل طور پر بند کر دینا۔ بس اب بائیں طرف تھوڑا ڈھل کر سامنے کی طرف خوب تیز چلاؤ۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ اب طیارہ بند کرو۔ ہاں، اب کیا نتیجہ نکلا؟"

www.taemeernews.com

گریا نے جواب دیا۔ "سیدھے پہنچنے کے بجائے اس کے اطراف چکر کاٹتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اب کیا کریں؟"

جواب آیا۔ "وہ نیچون کا کوئی غیر منکشف چاند لگتا ہے۔ تمہارے طیارے پر بڑی کشش ثقل ہے کہ وہ زمین سے تقریباً چار گنا بڑا ہے۔ اب راکٹ کی رفتار دھیمی کر دو۔ طیارہ اس کے مدار میں داخل ہو چکا ہے۔ اس کا مدار مدار زحل جیسا ہی لگ رہا ہے۔ اب تم اس پر آرام سے اتر سکتے ہو۔ ریٹرو راکٹ، پارا شوٹ سبھی کچھ کام پر لگا دو۔ آہستہ آہستہ طیارے کو سیارے پر ٹکا دو۔ بس اب سیڑھی کھول کر طیارے سے نکل جاؤ۔ خلائی لباس پہنے رہنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔ اس کا کرۂ باد بالکل ہماری زمین کے کرۂ باد سے ملتا جلتا ہے۔"

لباس اتار کر تینوں نئی زمین پر اتر پڑے۔ انہوں نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور دیکھا کہ سیارہ دنیا کا ایک نیا ایڈیشن ہے۔ اچانک بھریا نے چلا کر سبھوں کی نگاہیں ایک جانب مرکوز کر دیں۔ انھوں نے دیکھا کہ آٹھ دس مرونگ جیسی سواریاں ان کی طرف لپک رہی ہیں۔ تینوں کو پاؤں تلے کا سیارہ کھسکتا محسوس ہوا۔ سواریاں تقریباً ایک سو گز کے فاصلے پر رک گئیں۔ سواریوں سے چند لمبے لمبے خوب رو انسان ایک جیسے کپڑوں میں ملبوس دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ وہ لوگ اپنے ہاتھ اوپر کئے ہوئے تینوں کے قریب پہنچے اور مسکراتے ہوئے ایک آواز میں کہا۔ "سوپرجات"! تینوں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں اب تک پھٹی ہوئی ہیں لہٰذا فوراً سنبھلتے ہوئے جواباً کہا۔ "سوپرجات، سوپرجات، نمسکار!"

وہ لوگ اور قریب آ گئے اور کہا۔ "آپ حضرات ہماری حکومت کے معزز مہمان ہیں۔ شہر چلئے۔ آپ لوگوں کے لئے سرکاری مہمان خانے میں انتظام کیا جائے گا۔"

سب کے سب انھیں مرونگ جیسی گاڑیوں میں جا بیٹھے۔ راستے میں تینوں نے ان لوگوں سے دریافت کیا۔ "آپ لوگ تو بالکل ہمارے اڑیا بھائی لگ رہے ہیں۔ آپ لوگوں نے اتنی دور اپنی آبادی کیسے بسالی؟ ہم تو آپ لوگوں میں کوئی فرق نہیں دیکھ رہے ہیں!"

انھوں نے مہذبانہ انداز میں کہا۔ "آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ جدوپتی شری کرشن جی اڑیا ہی تھے۔ سولہ ہزار گوپیوں میں سے انہوں نے چند گوپیوں کو ان کے شوہروں کے ساتھ یہاں لاکر بسا دیا تھا۔ یہیں بلاکر یہاں کل پانچ ریاستیں ہیں۔ سبھوں کا رسم الخط ایک ہے مگر زبان میں تھوڑی بہت اونچ نیچ ضرور پائی جاتی ہے۔

پہلے انھیں "محفوظ کرے" میں لے جایا گیا۔ وہاں کے ایک پولس والے نے بتایا۔ "آپ لوگوں کے جسم میں بیرونی جراثیم رنگ گئے ہوں گے۔ اس لئے آپ لوگوں کو پندرہ سکنڈ فیٹیگ سمی باتھ لینا پڑے گا تاکہ ان جراثیموں کا اتلاف ہو سکے۔" تینوں ایک شیشے کی بند کوٹھری میں کھڑے ہو گئے۔ آپریٹر نے فیٹیگ ریز چھوڑی تینوں باہر آئے۔ آپریٹر نے چپکے سے ایک پولس افسر سے کہا۔ "ان لوگوں کا جسم پاک نہیں ہو پایا۔ تاہم ہمارے لوگوں پر اس کا خراب اثر نہیں پڑے گا۔"

ملک کے صدر نے ان لوگوں کا پرجوش استقبال کیا اور کہا۔ "ہمارا الکشن عنقریب ہونے جا رہا ہے۔ فی الحال کوئی وزارت نہیں ہے۔ سارا بوجھ مجھ پر لدا ہوا ہے۔ دو مہینے تک لوگوں پر الکشن کے اثرات ڈالنے ہیں۔ آپ لوگ تب تک کے لئے مہمان خانے میں ٹھیریں۔ الکشن کے بعد آپ سے گفت و شنید ہوگی۔ وہ تجربہ کار خدمت گار آپ کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کر دیئے گئے ہیں۔

www.taemeernews.com

مہمان خانے میں گریا نے اپنے خدمت گار، مدھو، سے پوچھا ــ "اے جی مدھو! کتنی پارٹیاں الکشن لڑ رہی ہیں؟"

مدھو ــ کتنی کیا مطلب؟ ہمارے ملک میں دو ہی پارٹیاں تو ہیں۔

ــ بائی! دو پارٹیاں؟ ہماری زمین پر تو پچاس سے کم نہیں ہیں۔

ــ باپ رے باپ! پچاس پارٹیاں؟ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں کہوں کہ دو سے زیادہ پارٹیاں دغابازی، جعلسازی، بے ایمانی جیسے واہیات الفاظ کی جڑ بنیاد ہوتی ہیں۔ لگتا ہے وہاں کے سیاست دانوں کا معیار ابھی بلند نہیں ہوا ہے ورنہ اتنی پارٹیاں نہیں ہوتیں۔ یہاں کی دو پارٹیوں میں ایک حکمراں ہوتی ہے تو دوسری مخالف جماعت کہلاتی ہے۔

گریا، مدھو یا اور سر یا خدمتگار کی بات سے متفق نہیں ہوئے اور انھوں نے بات کا رخ موڑ دیا۔ ڈیڑھ مہینہ گزر گیا۔ انھیں حیرت تھی کہ الکشن کو گنتی کے چند دن رہ گئے ہیں لیکن سڑکوں پر مائیک کا کوئی شور و شغب نہیں۔ امیدواروں کا وہ گھر گھر جا کر پگڑ دھکہ کرنا، چائے پلانا، باسی تباسی کھانا، بچوں کو گود میں لے کر مٹھائیاں کھلانا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اب تک امیدواروں کی شناخت بھی نہیں ہوئی ہے۔ کم از کم پروپگنڈہ ہی اگر چلتا تو تینوں کو دھاندلی کس دو تین ہزار تو پیٹ ہی لیتے۔ امیدوار کا پتا تھا نہ پروپگنڈے کا۔ آخر بات کیا ہے؟!

"الکشن کو پندرہ دن باقی ہیں" ــ اس خبر سے ان کے ہاتھ، پیر اور زبان میں کھجلی ہونے لگی ہے، جسم میں ایک عجیب اضطرابی کیفیت کا عالم ہے، جذبات بے قابو ہو رہے ہیں ــ لیکن امیدوار اور ووٹر دونوں سرد پڑے ہوئے ہیں!

ضرور کوئی گڑبڑ ہے!

گریا نے دوسرے خدمت گار رادھو سے دریافت کیا ــ "کیوں جی، تمہارا الکشن ملتوی ہو گیا کیا؟"

ــ "نہیں تو۔"

ــ تو پھر! ارے ابھی کوئی گہما گہمی نہیں، پروپگنڈہ نہیں، قتل سناٹہ نہیں، دیواری اشتہار نہیں۔ امیدواروں کا پتہ ہے نہ ہی خواہوں کا۔ یہ کیا الکشن ہے؟

ــ یہ: ھاندلی ہمارے ملک میں نہیں چلتی صاحب۔ ہم لوگ پروپگنڈہ کرتے ہیں نہ عیاری کو راہ دیتے ہیں۔ یہاں دو پارٹیاں ہیں۔ دونوں اپنا اپنا منشور حکومت کو پیش کر دیتی ہیں اور حکومت ان منشوروں چھپوا کر عوام میں تقسیم کر دیتی ہے۔

ــ اگر پروپگنڈہ نہیں کرو گے تو کیسے پتا چلے کہ امیدوار نے عوام کی فلاح کے لئے کیا کیا کام کئے؟

ــ جس نے عوام کی فلاح کے لئے واقعی کچھ کیا ہو! اسے پروپگنڈے کی کیا ضرورت؟ یہاں کے لوگ ایسے شخص کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔ جو لوگ دھوکے باز ہوتے ہیں وہ عوام کے دل سے اپنی غلط کاریوں کو مٹانے کے لئے یہ سارے تماشے کرتے ہیں۔ یہاں تو چوری چھپے کسی نے اگر پروپگنڈہ کرنے کی کوشش کی تو اس کی ضمانت کی رقم ڈوب جاتی ہے۔

ــ اچھا بابا، پروپگنڈہ نہیں کرتے نہ سہی، کم از کم دیوار پر دو چار اشتہار تو چپکا دو۔

ــ یہاں ووٹروں پر دباؤ ڈالنا خلاف قانون سمجھا جاتا ہے۔ انھیں اپنے طور پر خوب سوچ سمجھ کر ووٹ دینے کی آزادی

www.taemeernews.com

حاصل ہے۔ ہر ووٹر دو مہینے تک الکشن مینی فسٹو پڑھتا ہے اور ٹھنڈے ماحول میں غور و فکر کے بعد اپنی رائے دیتا ہے۔ آپ ہی بتایئے صاحب، ووٹر جب ایک اہم رائے دینے جا رہا ہو تو اس وقت خاموشی ضروری ہے کہ نہیں؟ اس کے برعکس اگر سارا امیدوار اسکے اطراف شور کریں کہ بھائی مجھے ووٹ دو میں تمہیں دو روپے دیتا ہوں ــــ مجھے ووٹ دو میں تمہارے بیٹے کو نوکری دلاتا ہوں ــ ایسے میں کیا وہ صحیح رائے دے سکتا ہے؟ اسی لیئے تو الکشن سے دو مہینے قبل یہاں مکمل خاموشی منائی جاتی ہے۔

ــــ تمہارے الکشن کا یہ ڈھب ہمیں متاثر نہیں کر سکا۔ ہمارے ملک میں الکشن کے دوران دس دس کے نوٹ ہوسر کے نوٹ برساتی کیڑوں کی طرح اڑنے لگتے ہیں۔ عوام اپنا سارا کاروبار چھوڑ چھاڑ کر لوٹنے میں لگ جاتے ہیں۔ شکاری جتنا بڑا ہوتا ہے اسی حساب سے لوٹ مار کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ الکشن میں قریب قریب سبھوں کی جیبیں گرم ہو جاتی ہیں یہاں کا الکشن تو ہم دیکھ رہے ہیں ایک دم خشک ہے۔

ــــ آپ کے ووٹروں کو کیا اتنی سوجھ بوجھ نہیں کہ یہ روپے کہاں سے آتے ہیں۔ کہاں جاتے ہیں؟ کیا انہیں معلوم نہیں کہ بے ایمان تاجر قیمتوں میں اضافہ کر کے خوب منافع خوری کرتے ہیں اور امیدوار انھیں روپیوں کو بٹور کر ووٹروں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ تو راہبوں کی دولت چرا کر انھیں کو خیرات کی صورت لوٹانا ہوا۔

ــــ ایسی باتیں ہمارے نزدیک مضحکہ خیز کہلاتی ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ۔ الکشن کے بعد یہاں دل بدلی تو ضرور ہوتی ہوگی؟ ہمارے ملک میں یہ دھندہ خوب چلتا ہے۔ لوگ اسے اب بھیڑی ہیوپار کہنے لگے ہیں ــــ! یہاں دل بدلی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کسی نے ایسی حرکت کی تو اسے ممبرشپ سے خارج کر دیا جاتا ہے اور اس ممبر کی جگہ آئندہ عام انتخابات تک خالی رہتی ہے۔ ضمنی انتخابات لڑکر الگزاروں کی رقم کو بے دردی اڑانا یہاں معیوب سمجھا جاتا ہے۔

گریا، جھریا، سریا نے سوچا کیسی واہیات جگہ پر وہ لوگ آگئے ہیں۔ اگر ان کا ملک ہوتا تو الکشن کے اس حسین موسم میں ان کا انگ انگ تھرکتا۔ جیب میں ہاتھ بھرنے کی جگہ نہ ہوتی۔ دنگے فسادات کا سیلاب امڈ آتا۔

ان سے آخر چپ بیٹھا نہ گیا۔ تینوں پارٹی اپنے دھرم کے پرچار میں نکل پڑے۔ امیدواروں سے مل کر یقینی جیت کے حربے بتانے لگے۔ پارٹی کے لیڈروں سے مل کر ہیوپار کا جوڑ توڑ بتانے لگے۔

نئی زمین کے سائنس دانوں نے صدر مملکت کو بتایا کہ مہانوں کے سر کی خطرناک ذہنی شعاع آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی ہے۔ کچھ دن اگر یہی حال رہا تو ہماری قوم کو متاثر کر سکتی ہے۔ اور ان لوگوں کو بہرحال سمجھا بجھا کر ان کے طیارے کا رُخ انھیں کے اپنے سیارے کی طرف موڑ دینا بہتر ہے۔ ورنہ اگر یہ لوگ کسی اور سیارے کی طرف نکل گئے تو اسے زہر آلود کر سکتے ہیں۔

صدر مملکت راضی ہو گئے۔

∞

www.taemeernews.com

خودنوشت

احمد جمال پاشا

یکم جون ۱۹۳۶ء کو الہ آباد میں پیدا ہوا۔ دراصل یہ سرکاری تاریخ پیدائش ہے میں اس سے چار سال قبل یکم جون ۱۹۳۲ء میں باقاعدہ پیدا ہو چکا تھا۔

پدرم سلطان کا دلچسپ سلسلہ شاہی اور فقیری کا خاندانی شجرے میں پایا جاتا ہے۔ فارسی کے مشہور شاعر صوفی اور معاصر ولی دکن۔ میر ناصر علی سرہندی کا اجداد میں شمار ہے۔ تواتر کے ساتھ نسل در نسل عربی، ترکی، فارسی، اور اردو شعراء اس کثرت سے گزرے ہیں کہ شاعری کا کوٹھ ختم ہو چکا ہے۔ آخری سلسلہ والد اور بڑے بھائی تک ملتا ہے۔

جس ماحول اور فضاء میں آنکھیں کھولیں شعر و ادب سے معمور تھی۔ گھر کتابوں، رسالوں سے بھرا ہوا تھا۔ خواتین میں محمدی بیگم نذر سجاد حیدر، جہاں بانو نقوی، حجاب اسماعیل، مرزا ادیب، عظیم بیگ چغتائی، شوکت تھانوی، ایم اسلم، راشد الخیری، شرر اور سرشار بے حد مقبول تھے۔ حور، زیب النساء، جوہر نسواں، عصمت، بنات، سہاگن اور پھول کھانے کے کمرے سے باورچی خانے تک نظر آتے۔ مردانے میں طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ، نیرنگ خیال، ساقی، اُردو، ادیب، زمانہ، ادبی دنیا، الناظر، نگار اور اودھ پنچ کا دور دورہ تھا۔ والد کے پرانے احباب میں جوش، آسی، کیفی ضامن علی، جگر، قاضی نور رشید احمد، حمید حسین، فراق، سرفا علی، یلدرم، نیاز، ثاقب عزیز، صفی، زور، حسینی اور اعجاز حسین وغیرہ تھے۔ شام کو شطرنج کی بیٹھک جمتی رات کو شعری ادبی نشستیں اور مشاعرے ہوا کرتے۔

ابتداء میں میرزا ادیب کے "صحرا نورد کے خطوط" "سورج مکھی" اور چغتائی نے بہت متاثر کیا پھر جاسوسی ناول پڑھنے کا دورہ پڑا۔ تیرتھ رام فیروزپوری مسز عبدالقادر، حجاب امتیاز علی اور شفیق الرحمن ہمارے پسندیدہ ادیب تھے۔

اسکول میں اُنہی سے دوستی ہوئی جو شاعر ادیب تھے۔ جن کی مداخلت پر جاسوسی کی جگہ ادبی اور مزاحیہ کتب نے لے لی۔ نرالی دنیا، آریہ دوست، مستانہ جوگی کی جگہ ادیب لطیف سویرا، شاہراہ، نقوش، سب رس اور آئینہ پڑھنے لگے۔ اسکول سے کالج اور یونیورسٹی پہونچے تو ادب اوڑھنا بچھونا ہو چکا تھا۔ اساتذہ میں پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب، احتشام حسین، آل احمد سرور، نورالحسن ہاشمی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین خاں اور ساتھیوں میں تمر رئیس، قاضی عبدالستار، شہاب جعفری، تنویر احمد، اقبال مجید، قیصر تمکین، شوکت عمر، احراز نقوی، آغا سہیل، حسن کمال، عمار رضوی، شارب ردولوی، انتخار اعظمی، محمود الحسن، ندا عباس، حسن عابد، سبط اختر اور سلام مچھلی شہری تھے۔ جو کافی ہاؤس اور چائے خانوں میں جمتے سرور اور احتشام صاحب کے یہاں ادبی نشستوں میں بحثیں ہوتیں، کہانیاں، نظمیں پڑھی جاتیں۔ شرکت کرنے والوں میں مقامی اور باہر کے مشاہیر بشمول بابو سکسینہ، عبدالستار صدیقی، مجنوں گورکھپوری، اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم، جوش ملیح آبادی، نیاز، جعفری، مخدوم، مجاز

www.taemeernews.com

زیدی، فراق، جمیل، پرویز، زور، صدیقی، ہاشمی، مالک رام وغیرہ ہوا کرتے۔

۱۹۵۰ء سے مزاحیہ لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۵۲ء تک ہماری گاڑی ادب کی پٹری پر جو چلی تو اب تک چلتی چلی جارہی ہے مزاحیہ مضامین کے مجموعے "اندیشۂ شہر"، "لذتِ آزار"، "ستم ایجاد"، "چشم حیراں" اور "مضامین پاشا" شائع ہو چکے ہیں۔ طنز و مزاح اور دوسرے موضوعات پر اب تک تقریباً پچاس کتابیں اور رسالے شائع ہو چکے ہیں۔

میرا رجحان اور دلچسپی ہمیشہ ادب سے رہی۔ سیاست کے نام سے ہمیشہ وحشت رہی نہ کبھی کسی پارٹی میں شامل ہونے یا گروہ بندی کا خیال آیا نہ کبھی اس میں دلچسپی رہی۔ جب سے ادیبوں نے سیاستدانوں کے پیچھے دوڑنا شروع کیا۔ میں نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ صحافت سے پڑھانے کے پیشے میں داخل ہوا۔ اپنی دلچسپیاں پڑھنے پڑھانے تک محدود کرلیں۔ اُردو کے مزاحیہ ادب کو ترقی دینے کے خیال سے عالمی ادب میں دلچسپی پیدا کی۔ طنزیہ مزاحیہ مضامین، انشائیے اور تنقیدیں لکھتا رہتا ہوں۔ تراجم کا سلسلہ بھی جاری ہے مزاحیہ ادب کے جائزے لیتا رہتا ہوں۔ لکھنے اور پڑھنے کے سلسلے میں محنت اور مشق پر یقین رکھتا ہوں۔ کتابوں خصوصاً نادر و نایاب قلمی کتب کا شوق ایک بڑی لائبریری کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ میری باغبانی ہے۔ دیسی اور ولایتی پھلوں اور پھولوں کے علاوہ سب سے زیادہ دلچسپی کیکٹس میں ہے۔ ملکوں ملکوں کی سیکڑوں عجیب و غریب قسمیں جمع کی ہیں۔ جن کے پھول دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

مزاحیہ ادب کی تاریخ مرتب کرنے اور انشائیہ پر کئی سال سے کام کر رہا ہوں۔ پڑھنا لکھنا بہت سکون، فرصت اور تنہائی چاہتا ہے اسی لئے ادبی ہنگاموں سے طبیعت بھاگتی ہے۔

شریکِ حیات کو قواعد، ادبیات اور مزاح سے دلچسپی ہے اصلاحی جذبہ شدید ہے۔ "داؤد میموریل اُردو گرلس ہائی اسکول" قائم کیا جس میں ۵ سو طالبات ہیں اس کی سکریٹری ہیں۔ دو لائبریریاں "شمیم میموریل لائبریری" اور "سرور چلڈرن لائبریری" قائم کرنے کے بعد اب لڑکیوں کے لئے ایک پالی ٹکنیک قائم کرنے میں مصروف ہیں۔ لائبریری کا بڑا ہال تعمیر کروا چکی ہیں۔ ایک مکتب اور عربی مدرسہ چل رہا ہے۔ جب ہم دونوں دماغی اور جسمانی طور پر تھکے ہوئے ہوتے ہیں تو اپنے آپ کو تازہ کرنے کے لئے تازہ ترین کتب و رسائل شعر و ادب پر گپ کرتے ہیں۔ پڑھائی لکھائی کا سلسلہ وقفوں سے فجر تا عشاء جاری رہتا ہے۔ سفر سے بہت گھبراتا ہوں۔ ہوائی جہاز کے ہر سفر کو سفرِ آخرت سمجھتا ہوں۔ ڈرتا تو بجلی کے کڑکنے سے بھی ہوں۔ جو بھی چیز لکھتا ہوں مختلف نشستوں میں پھر اسے بار بار ٹھیک کرتا ہوں۔ میں نے حال ہی میں ایک مضمون کتاب کی جلد اور ایک انشائیہ "بے ترتیبی" لکھا تھا دونوں کو تقریباً ستر ستر بار RE WRITE کیا تھا۔ میں اپنی کسی تحریر یا خیال سے مطمئن چھپ جانے کے بعد نہیں ہوتا۔ قطع و برید، تراش و خراش کا سلسلہ برابر جاری رکھتا ہوں تخلیقی نثر لکھنا سب سے مشکل فن ہے جو بڑی ریاضت چاہتا ہے۔ یہ خرگوش نہیں کچھوے کا عمل ہے۔

www.taemeernews.com

افسوس کہ طبیعت کی عجلت اور صحت اتنی محنت و ریاضت نہیں کرنے دیتی کہ ادب و مزاحیہ ادب کا حق ادا کر سکوں۔

بنیادی طور پر پکا مسلمان ہوں۔ کیوں کہ اسلام مذہب انسانیت ہے۔ اور بلاگہری انسانی ہمدردی کے شخصیت سوز و ساز سے محروم رہتی ہے۔ ایسی ظرافت جس سے شخصیت کی خواہ کتنی ہی توسیع کیوں نہ کی گئی ہو بین اگر اس سے سماشرے کے سماجی اظہار کا کام نہ لیا گیا ہو۔ اُس میں "پک دیک پیرز" والی گہری انسانی ہمدردی نہ ہو تو ادب میں کسی پائیدار مقام کی حامل نہیں ہو سکتی۔ تمسخر، تضحیک، پھکڑ، شخصی ہجو، مزاح برائے تفریح کبھی بھی ادب کا جز نہیں بن سکتے۔ ادبی ظرافت اور مسخرے پن کا کوئی میل نہیں۔ ادب میں طنز اور مزاح کی جو کچھ بھی اہمیت ہے وہ بہت گہرائی سے صالح اور عظیم مقصدیت سے جڑی ہوئی ہے۔ جو ڈان کو "کزوٹ" کی طرح فہقہوں میں سے آنسوؤں کو برآمد کر سکے۔ اور آنسوؤں میں سے قہقہے بلند ہو سکیں۔ میں اسی ظرافت کی تلاش میں زندگی کے میدان میں اتر چکا ہوں۔ چند رن اور بنا کر بس اب آؤٹ ہو جانا ہے۔ کیوں کہ صحت ساتھ نہیں دے رہی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے کیا حق بات کہی تھی۔ "اب کچھ کچھ سوچنا سمجھنا، پڑھنا اور لکھنا آیا تو بلاوا آگیا۔"

احمد جمال پاشا

کپور — ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

جو ادیب طنز نگار ہیں اُن میں سے ایک آدھ سے مجھے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان ہی میں سے یہ حضرت کپور بھی ہیں۔ کپور کی کشش مجھ پر اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک مزاح نگار ایک طنز نگار ہیں۔ اور اس سب کے باوجود ایسے ہیں جیسے کہ عام طور پر ہم آپ ہوتے ہیں۔ تنقید میں لوگ کبھی انھیں اچھا کہتے ہیں، کبھی برا۔ مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ آرڈی نینس کیسے پسند ہوتے ہیں۔ الٹی چیز سیدھی یا سیدھی الٹی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر حیرت ضرور ہوتی ہے، کیوں کہ طنز کا تقاضہ ہے۔ وہ یک رنگی میں ظرافت اور ظرافت میں یک رنگی پیدا کرے، مگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا۔ غالب، اقبال، اور کپور۔ غالب اور اقبال کی خطا اس وقت معاف کیجئے: اور کپور کی بات کیجئے۔ جو طنز نگار اپنے قارئین کو اپنا ہمراز و ہمساز بنا سکے وہ طنز نگار نہیں، مولوی یا لیڈر ہوگا! خود جل کر دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسانا دو متضاد چیزیں ہیں جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس لئے کہ طنز نگار خود زمانے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیئے۔ طنز نگاروں پر کبھی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے۔ مجھے یہاں وہ باتیں نہیں کرنی ہیں جو ابھی ابھی کہی گئی ہیں۔ ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خرابہ ہو سکتا ہے، خون زیادہ خرا

www.taemeernews.com

کم، ایسے ہی مضامین پر میں سر دُھنا کرتا ہوں۔ یہی تاثیر دلبری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ اُنہوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنادیا۔ طنزیات و مضحکات میں طنز کا "یہ تصرف دوام" سبارک سمجھا جائے یا نہیں، حیرت انگیز ضرور ہے۔ انہوں نے طنز کی وضاحت کی ہے۔ امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کرسکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔ اس گرفت میں کپور ایسے آئے جیسے علمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی اُستاد وارد ہو جائے۔ کپور دو اور دو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاؤ دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو مجھے گوارا ہے۔"

(بہ طرز پروفیسر رشید احمد صدیقی)

"کپور کی طنز نگاری ہمارے ادب کے تہذیبی سرمائے کے اس سماجی اظہار سے منسلک ہے جو معاشی و سماجی حالات اور میکانکی قوتِ نقد کے ارتقاء کی جدوجہد، تخلیقی عمل اور جمود کے سماجی ٹکراؤ سے انفرادی پسندیدگی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اس کا عرفانی مفہوم میرے نقطۂ نظر کے فلسفیانہ ربط اور اشتراکی حقیقت نگاری کی طبقاتی کشمکش کے اجتماعی شعور میں عام ہے۔ یہ ریاضیاتی تناسب اور مابعد الطبیعات کے لاشعوری تضاد کے بعد المشرقین میں مل جائے گی۔ کبھی کبھی یہ بُعد المغربین کی نامیاتی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے مگر اجتماعِ ضدّین مارکسی نقطۂ نظر سے قطعی غیر منطبق ہے کیوں کہ اس کے مثبت و منفی اثرات اپنے سطحی مفہوم کی توضیح کے لئے مروجہ عصری روایات کی مادّیت، ہیئت، اور مواد کی گتھیوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی جبریت کی ہیئت پرستی جو ادب برائے زندگی کی ترویج میں انسان و مکاں کو اپنی گرفت میں لاکر رجعت پرستی کا تاریخی تجزیہ کرتی ہے، تاریخی مادّیت کے سماجی محرکات کی سطحی خارجیت کی داخلی کشاکشوں سے آلودہ ہوکر اپنے مبہم مفہوم میں سماجی ڈھانچے کو پیش کرتی ہے۔ کپور کی واقعیت کا جامد تصور اُن کے مزاحیہ نصب العین کی توجیہہ کر دیتا ہے۔ طنز و ظرافت کی یہی مادّی کشمکش سماجی نظام کی حکمیانہ پیروڈی پیش کرتی ہے۔ اس سے سماجی پیچیدگیوں کے مافوق الفطرت مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور بین الاقوامی بورژوا سماج کے مخصوص فلسفۂ حیات کی ذہنی کشمکش پر درباری طبقے کے طبقاتی شعور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حاکم اور محکوم کی یہ کشمکش اُن کے طنز کا نشانہ ہے۔"

(بہ طرز پروفیسر احتشام حسین)

"اردو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ صرف کا نقطۂ خیال ہے۔ یا زبردے کی موہوم کر۔ اس طرز کے طنز اور صحیح ظرافت میں فرقِ مشرقین ہے۔ یہ فرق یہاں کم معلوم ہوتا ہے مگر دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن اسے ظرافت سے کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اس کے پیش کرنے سے طنز و ظرافت کی اہمیت میں اضافہ ممکن نہیں۔ اس لحاظ سے یہ اوروں پر فوقیت رکھتا ہے، دُنیائے طنز میں اس کی وہی اہمیت ہے جس کی حامل پطرس کی ظرافت ہے، یہ گویا مزاح کا بلند ترین نقطہ ہے اس سے آگے فکر کی رسائی نہیں، اس محدود طاقت پرواز کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، تفصیل کی یہاں نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، نہ وقت، غالباً یہ پطرس کو دیکھ کر میدان میں آئے، مگر افسوس کہ ان میں پطرس کے محدود اوصاف کا بھی مطلق پتہ نہیں، ان کی کتابوں کے دیباچے پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے۔ لیکن اس جہاد سے بھی کوئی دینی یا دنیوی فائدہ مقصود نہیں کیونکہ

www.taemeernews.com

ان کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، تخیل ادنیٰ، علمیت غائب، شخصیت اوسط، املا غلط، انشاء غلط، برخود غلط، پھر کوماۂ تقلید میں مثلِ آفتاب روشن، اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان سے اور روحِ طنز سے کوئی لگاؤ بھی ہے۔ نظر جب معمول جسم پر ہے۔ دوسرے کی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ ان کی عینک مانگے کی ہے۔ آواز اپنی نہیں محض ایک صدائے بازگشت ہے۔ یہ آواز اردو طنز کی تکمیل ہے۔ یہاں، جو کچھ لکھا جائے گا اس سے ان کی تحقیر مقصود نہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ یہاں صرف، اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کی نظر سطحی ہے۔ اسی وجہ سے اُن کے قارئین کو ذہنی جمناسٹک کی ضرورت پڑتی ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب تک "نرم گرم" سے بہتر کارنامہ پیش نہیں کیا۔ یہ خیال کہ "نرم گرم" اردو میں طنز و ظرافت کا بہترین کارنامہ ہے۔ نہایت حوصلہ شکن ہے جس کو یہ طنز کہتے ہیں اس کا ظرافت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طنز و ظرافت کے نام سے ہی معلق ہیں۔ ان کی اہمیت باوجود قابلِ قدر اضافوں کے بہت زیادہ نہیں، ان کی وقعت مشاعروں کے سبحان اللہ سے زیادہ نہیں۔ اس کا سبب ان کی مزاحیہ کجرویوں کے سوا کچھ نہیں، ان کی حیثیت ایک ایسے طالب علم کی سی ہے ان کی شخصیت ایسی ہے جیسی کہ عام طور پر شخصیت ہوا کرتی ہے جو ان کی قوتِ ایجاد کی کمی ظاہر کرتی ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے لئے ایک عمر چاہیئے۔ یہ ایک طالب علم کے کارنامے ہیں جو قابلِ رشک ہیں۔ یہ مضامین اتنے شگفتہ و دل بہار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف اس کا اہل نہیں کیونکہ یہ عمر طبعی پر پہونچنے سے قبل ہی مصنف بن بیٹھے یہ مضامین اسی عجلت اور کم سنی کا نتیجہ ہیں۔ اس سے ان کی مزاحیہ بوکھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی بوکھلاہٹ مصنف کو دلیر بنا دیتی ہے۔ اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس سے فرشتے لرزتے ہیں اور نقاد قلم اٹھاتے ہیں۔"

(بہ بطرز پروفیسر کلیم الدین احمد)

"مجھے ـــ یہ ـــ کہنا ہے ـــ کہ ـــ کپور ـــ کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ و مزاحیہ ہوتے ہیں، ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہنچا ہوں اُن سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے یعنی ان مضامین میں طنز ہے ـــ طنز ـــ میں یہ کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ کہہ چکا ہوں طنز ہے۔ ایسا طنز جو سودا، غالب، اکبر، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، شفیق الرحمٰن، غلام احمد، فرقت اور کنہیا لال کپور کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کی بے شمار مثالیں مغربی ادب سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً پوپ، سوئفٹ، لیوکاک، مارک ٹوین وغیرہ کے یہاں جا بجا آپ کو ملے گا۔ اور قدم قدم پر ملے گا، یہی وہ طنز ہے جس سے کپور اپنے مضامین میں طنز کا احاطہ کرتے ہیں۔ یعنی اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آجاتا ہے، دوسرے معنوں میں یوں سمجھئے کہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہو اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے اور کچھ نہ ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہے اور ہر جگہ اس بات کا ہونا مشکل ہے مگر پھر بھی اُنہوں نے اس مشکل کو بخوبی نبھا دیا ہے، نبھانا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں مجھے ـــ طنز ملتا ہے طنز لہٰذا اس سے

www.taemeernews.com

یہ بات بخوبی واضح، ثابت اور روشن اور عیاں ہوجاتی ہے کہ ان کے یہاں قاری کے علاوہ ناقد کو بھی بہ آسانی طنز دستیاب ہوجاتا ہے۔ اس طنز کو جو ان کے یہاں ہے ہم سوائے طنز کے اور بھلا کہہ بھی کیا سکتے ہیں جو کہ طنز ہے یعنی طنز ہی ہے! اگر کچھ اور ہوتا بھی تو طنز ہوتا۔ طنز کا ہونا اس امر کی دلیل اور کلی شہادت ہے کہ ان مضامین میں ہم کو طنز مل جاتا ہے! اسی لئے میں نے دلائل و شواہد سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طنز نگار کپور کے یہاں مجھے طنز ملتا ہے جس میں ظرافت کی چاشنی، مغرب کے اثر سے آتی ہے اور جنسہ موجود ہے جس کی وجہ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے یہاں جو چیز ہے وہ سوائے طنز کے اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ طنز ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں، اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے جس کے لئے قسم کھانے کی میں اب حلف اٹھانے تک کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے۔"

(بہ طرز ڈاکٹر عبادت بریلوی)

"اس خطوط کو اغلاطِ عبادت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے اس لئے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا، اقتباس بالا ص۹۲، سطر ۱۰ خط جو میں نے اپنی خوشدامن کو تحریر کیا تھا۔ حاشیہ نمبر ۲ مجھے بانکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ برسیدہ اور سقیم حالت میں کپور کے مضامین کا مل گیا ہے۔ خاندان میں جملہ پرسانِ حال کو اس کی خوشخبری پہنچادو کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں سرد دن ہوں۔ اندازہ ہے کہ اس کا تعلق بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے" جزئی باتوں سے قطع نظر ۱۲ کتابوں کے ۷۰۰ دفتروں میں ایک نسخہ اور بھی ناقص مقدمہ لنڈا نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو مصنف کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حاشیہ "دھوبی کی کاپی" صفحہ، سطر ۵ باوجودیہ کہ مضامین طنزیہ ہیں اور ظرافت کے باب میں اضافہ کرتے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان میں جا بجا معمہ کی علامتیں واضح نہیں کی گئی ہیں۔ صفت مشتبہ حالت میں ملتی ہے، کتاب میں صرف ایک، باران کا استعمال ملتا ہے اس سے مراد غالباً کاتب ہے۔ جس کو شارحین نے کتابت کا غلط مطلب اخذ کرکے نہ جانے کیا قرار دے دیا ہے۔ (ج چ ۱۰) صحت سے بعید ہے، یہ نسخہ بیسویں صدی سے متعلق ہے (چ۔ غ ۱۳/۵) جہاں تک میرا علم ہے یہ مضامین نصاب میں داخل کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں" ہنگامہ تحریر" نسخہ تبریزی مطبوعہ الناظر جلد ہشتم ۱۰ حوالہ بلا سند کے ہے اس وجہ سے اسے مسترد سمجھا جائے۔ یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کیوں کہ کسی مستند فرہنگ میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ یہ مہملات کا ایک نادر مجموعہ ہے۔ جو ۲۲ × ۱۲ فٹ کے ۶۶۲ رم صفحات پر مشتمل ہے۔ ۷۰ اسطر فی صفحہ اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر نایاب ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط کا اقتباس قابل توجہ ہے۔ "میرا خط میرے نام" رسائل میں شائع کروانے کی غرض سے تحریر کیا گیا تھا۔ اب تک کئی سال ناموں میں معمولی سی ردوبدل و ترمیم کے ساتھ شائع ہوچکا ہے۔ حافظے کے لئے ملاحظہ ہو رسالہ" نرالی دنیا" "الٹی دنیا" "سیدھی دنیا" اور" ہنگامی دنیا" اس کے بعد چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ ہنگامہ ہوگیا تھا گو کہ میرے اعتراضات سنگین اور صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ گھریلو جھگڑے ۱۲۳۔ موٹر گائیڈ ۱۲۔ کرامات اُلو عرف کالا جادو یعنی ساجن سوہنی ۱۲ اصولی بحث میں یہاں صرف چند اعتراضات پر اکتفا کروں گا مثلاً کتاب کے صفحہ ۳۴ سطر ۱۳ میں لا، کا غلط استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے مصنف کی تنبیہ ضروری ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے۔ کیوں کہ اس کو معاف کرنے پر بھی اعتراض ہرگز رفع نہ ہوگا۔ پھر سند تو تعلقی غلط ہے، حروف تہجی

www.taemeernews.com

کی ترتیب سرے سے غلط ہے۔ ابجد کے لحاظ سے کتاب کا پہلا لفظ الف سے شروع کرنے کے بجائے لیے سے شروع کیا گیا ہے۔ مصنف سخت تنقید کا مستحق ہے۔ ۱،۲،۳،۴،۵،۶،۷،۸،۹، اس بات کو معترض الیہ کی جانب ہرگز نہ منسوب ہونا چاہیئے اس کے مایوس کن رویہ سے برانگیختہ ہو کر فحش و دشنام سے کام لینا یہ بھی ایک کام ہوگا اس قسم کے کاموں کی سخت ضرورت ہے۔ جی تحقیق کے شہ سواروں نے اس نسخے پر اب تک جو رسا کیا، ان کے ساتھ تنبیہی کارروائی کا ہونا سخت ضروری ہے۔ الفاظ سے جا بجا مترشح ہوتا ہے کہ سہو کاتب کا روادار کھا گیا ہے۔ الف۔۔۔۔ ب پ ت ٹ ث، ج چ ح خ، د ڈ ذ، ر ڑ ز، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف، ق، ک گ، ل، م، ن، و، ہ، ا، ھ، ی، ے، ۱ ۲ ۳ ۴ ۵ ۶ ۷ ۸ ۹ ۱۰ ۱۱ ۱۲ شاذ کی جگہ ح کا استعمال کم از کم ۱۷ جگہ صریحاً کیا گیا ہے جس کا نہ تو مزاح سے کوئی تعلق ہے اور نہ کاتب سے۔ یہ کھلا ہوا طنز ہے۔ رسالۂ حمزہ ۱۵ ۲۰ ۲۳ ۲۲ فتح تنہیں، د، اور دط، نیک الفت، نی انی لحت، الفتحہ کا مصدر مغارعی سکوت کی حالت میں ملتا ہے۔ مزاح میں مرثیہ کی کیفیت کی ذمہ داری اسی لاابالی پن پر ہے۔ ۲۵ ۲۵ لفظ کی تصغیر میں بامعنی لفظ کثیر الاستعمال محتاج ثبوت و سند کے اعتبار سے ضبط کرنے کے لائق ہیں۔ فقرات شرجا بجا نسخے میں ملتے ہیں جو قطعاً نا معتبر ہیں۔ عبارت ذیل کے لکھتے اس سلسلے میں حوالے کے بعد بھی فراموش نہیں کیے جا سکتے کیوں کہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ پس جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نسخے کا تعلق بیسویں صدی سے ہرگز نہیں بلکہ اٹھارھویں صدی سے ہے۔ اور مصنف مرد نہیں بلکہ کوئی خاتون ہیں جن کی اردو دانی میں ہمیں شبہ ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ عروس ضمتیں بہ صفۂ اول و صفۂ ثانی میں جا بجا اشتباہ ہے۔ پھر یہ کہ کرۂ ہمزہ بحذف الف لغو اور سراسر مہمل و نامستعمل، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاتون جن کو ہم کپور کے نام سے فی الحال فرض کیے لیتے ہیں ان کے لیے سہو طبعی بود، کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ۲۲ ۲۱ ۲۲ ۲۲ ۲۲

www.taemeernews.com

برق آشیانوی

مختصر حالاتے

سُنا ہے کہ میں ۱۹۱۸ء میں پیدا ہوا۔ سُنا ہے اس لئے لکھ رہا ہوں کہ یہ بات میں نے اپنے والدین سے سُنی ہے والدین کوئی بات غلط نہیں بتلاتے البتہ اسکول میں شریک کراتے ہیں تو تاریخ پیدائش غلط بتلاتے ہیں۔ اگر صحیح بتلاتے بھی ہیں تو ہیڈ ماسٹر صاحب غلط لکھوانے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ تین چار سال زیادہ ملازمت کرنے کا موقع حاصل رہے۔ بہرحال میرے تعلیمی صداقت نامے میں میری تاریخ پیدائش ۱۹۱۸ء ہے۔ انگلش میڈیم سے تعلیم حاصل کی۔ والد صاحب نے کچھ نہیں تو تیل بیچنے کے قابل بنانے کے لئے گھر پر زبردستی فارسی پڑھادی۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی میں داخلہ لیا لیکن والد صاحب کا سایہ اُٹھ گیا تو تعلیم ترک کر کے پیشہ تدریس سے وابستہ ہوگیا اور عثمانیہ ٹریننگ کالج سے ٹیچرس ٹریننگ پاس کرلی۔ کچھ عرصہ بعد تدریس کا پیشہ ترک کر کے جیل ڈیپارٹمنٹ کی ملازمت اختیار کر کے جیلر کے عہدہ سے وظیفہ پر سبک دوش ہوگیا۔ شاعری کا ذوق بچپن سے تھا۔ نثر نگاری بعد میں شروع کی۔ طبیعت مزاح کی جانب مائل تھی۔ مزاح نگار کی حیثیت سے پورے ملک میں جانا پہچانا جاتا ہوں۔ مزاحیہ شاعری بہت بعد میں شروع کی۔ مزاح گو کی حیثیت سے بھی اہل ملک جانتے ہیں۔ نثر کی چار کتابیں شائع ہوچکی ہیں تین مزاحیہ مجموعے اور ایک سنجیدہ ناول۔ مزاحیہ شاعری کا ایک مجموعہ شائع ہوچکا ہے تقریباً تمام کتابوں پر اردو اکیڈیمی سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔

برق آشیانوی

اعضائے رئیسہ اور سر

انسان کے جسم میں کئی اعضاء ہوتے ہیں جن میں سے صرف چند ایسے ہوتے ہیں جن کو اعضائے رئیسہ کی سند عطا فرمائی گئی ہے۔ ان اعضائے رئیسہ کی تعداد کسی حکومت کی کابینہ کے وزراء کی تعداد کیطرح خاصی کم ہوتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر کوئی وزیر اپنی وزارت سے مستعفی ہوجائے تو اس کا قلمدانِ وزارت کسی اور وزیر کے سپرد کردیا جاسکتا ہے۔ لیکن اعضائے رئیسہ میں سے کوئی عضو رئیس استعفیٰ دیدے (یعنی کام کرنے سے انکار کردے) تو اس کا قلمدانِ "ریاست" (رئیس کی نسبت سے ریاست کا لفظ استعمال ہوا ہے) کسی دوسرے عضو رئیس کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔

www.taemeernews.com

جیسا کہ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے اعضائے رئیسہ کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے کہ انہیں انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے بعض صورتوں میں تو گننے کے لئے صرف ہاتھوں کی انگلیاں ہی کافی ہوجاتی ہیں۔ ان میں بھی خاص طور پر بعض اعضائے رئیسہ کو دیگر اعضائے رئیسہ پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کی مثال کے لئے بھی ہم قلمدان ہائے وزارت کو پیش کرسکتے ہیں مطلب یہ کہ بعض وزارتوں کے قلمدانوں کی حیثیت دیگر وزارتوں کے قلمدانوں سے ممتاز، اہم، وقیع اور بااختیار ہوتی ہے۔ اور بعض وزارتیں تو صرف وزارتیں ہوتی ہیں جو جلسوں، مشاعروں، کلچرل پروگراموں یا مشاعروں کی صدارت کرنے یا عمارتوں کے سنگِ بنیاد رکھنے یا درخت اگاؤ مہم کے موقعوں پر پودا لگانے کے لئے زیادہ موزوں و کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ ان مصروفیتوں کے بعد جو وقت بچ جاتا ہے وہ اضلاع کے دوروں میں صرف ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بعض وزارتیں نہایت اہم ہوتی ہیں۔ زیادہ تفصیل اور مثالوں کی ضرورت ہم اس لئے نہیں سمجھتے کہ وزارتوں کی اہمیت اور فرق کو ہم جیسے غیر سیاسی آدمی کے مقابلے میں سیاسی شعور رکھنے والے عوام بہ آسانی سمجھ جاتے ہیں۔ ہم نے تو تمام عمر سیاسی زندگی سے الگ تھلگ رہ کر گزاری ہے حتیٰ کہ بعض سماجی انجمنوں میں بھی سیاست داخل ہوگئی تو ہم وہاں سے زمین پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں کیوں کہ محاورے کے لحاظ سے سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنا نہیں آیا، ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ جب سے ہم نے بھاگنا سیکھا ہے تو زمین پر پاؤں رکھ کر ہی بھاگ رہے ہیں۔ دو ایک بار کوشش کی کہ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگیں لیکن ہمارے پاؤں سر تک نہیں پہنچ سکے۔ اگر محاورے کا مطلب یہ ہو کہ پاؤں ہمارے ہوں سر دوسرے شخص کا تو ایسی جرأت کرنا بھی ہم سے نہ ہوسکا۔ غرض ہم نے وزارتوں اور قلمدانوں کی جو بات کی ہے تو وہ بھی اعضائے رئیسہ سے مماثلت کی حد تک۔

اعضائے رئیسہ میں جن اعضاء کو امتیاز اور اہمیت حاصل ہے اُن میں دل، دماغ، سر، جگر، معدہ وغیرہ ہیں۔ اُن کے بعد آنکھ، ناک، کان گردے وغیرہ ہیں۔ دل، دماغ، سر اور جگر (مراد آبادی نہیں) کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ اگر ان میں سے کوئی ایک عضو کابینہ سے استعفیٰ دے دے تو کوئی دوسرا عضو اس کا قلمدان نہیں سنبھال سکتا۔ البتہ ایک کان، ایک آنکھ، ایک گردہ یا ایک پھیپھڑا استعفیٰ دے دے تو دوسری آنکھ، دوسرا کان، دوسرا گردہ یا دوسرا پھیپھڑا قلمدان "ریاست" کو سنبھال لیتا ہے۔ خود ہمارے گردے نے بغاوت کی تو اس کو کابینہ ہی نہیں بلکہ پارٹی سے بھی خارج کردیا گیا۔ اس لئے کہ اس نے پتھروں کا ایک ذخیرہ جمع کر رکھا تھا اور کسی وقت بھی دوسرے اعضائے رئیسہ پر پتھراؤ کرسکتا تھا۔ اس کو ڈاکٹروں نے ناقابلِ برداشت قرار دے کر عمر بھر کے لئے انتخابات میں حصہ لینے سے محروم کرکے پارٹی یعنی جسم سے خارج کردیا۔ چنانچہ وہ گمنامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دے کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ ہم نے اس کو بہت سمجھایا کہ سیاسی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کرکے ہماری طرح گوشۂ گمنامی میں گذارے لیکن اس نے نہ مانا اور ہمارے جان کے درپے ہوگیا تھا۔ جو ہم برداشت نہ کرسکے۔ اور اس کو نکلوا کر پھینکوا دیا جس کے بعد ہماری زندگی میں سکون اور امن قائم ہوگیا۔

انسان کے جسمانی نظام میں اعضائے رئیسہ کے علاوہ اعضائے غریبہ بھی ہوتے ہیں۔ ان دونوں طبقوں کے درمیان ایک طبقہ اعضائے متوسط کا بھی ہوتا ہے۔ اعضائے غریبہ کی نہ کوئی حد ہوتی ہے نہ کوئی حساب۔ یہ تو سر کے بالوں

www.taemeernews.com

کی طرح بے شمار ہوتے ہیں۔ ویسے مردم شماری میں ان کی تعداد درج کرلی جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا شمار بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ سر کے بالوں کا۔ اعضائے غریبہ کی نگاہ اعضائے رئیسہ کو ہمیشہ دامن گیر رہتی ہے۔ چنانچہ ہر دنت ان کی کس مپرسی اور خستہ حالی پر نظر رکھتے ہیں، صرف نظر رکھتے ہیں، نظر کے علاوہ کچھ اور رکھنا مصلحت کے خلاف ہوتا ہے البتہ اعضائے متوسط ہمیشہ ہماری طرح معلق لٹکتے رہتے ہیں۔ اعضائے رئیسہ ان کو اعضائے غریبہ میں شمار کرتے ہیں اور اعضائے غریبہ انہیں اعضائے رئیسہ میں گنتے ہیں۔ چنانچہ یہ نہ ادھر کے رہتے ہیں اور نہ ادھر کے بلکہ چمگادڑوں کی طرح زندگی کی شاخ پر الٹے لٹکتے رہتے ہیں۔

اعضائے رئیسہ کی اس تقسیم کے بعد ہم اعضائے رئیسہ میں سے ایک نہایت ہی اہم عضوِ رئیس کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ اس عضوِ رئیس کا نام ہے "سر"۔ "سر" وہ عضوِ رئیس ہے جس کے کسی ادنیٰ اشارے کے بغیر دیگر تمام اعضائے رئیسہ بھی کوئی کام نہیں کرسکتے اس لئے کہ سر میں دماغ ہوتا ہے اور دماغ میں عقل۔ چنانچہ سر کو اعضائے رئیسہ کا صدر، رہنما یا پیشوا جو بھی ہو کہا جاسکتا ہے۔ ہماری اس گفتگو کو ملا حظہ فرمایا یہود بہت دیر تک غور سے سنتے رہے اور سر کا ذکر آتے ہی انہوں نے اپنی پوری عالمانہ شان کے ساتھ فرمایا۔

"میاں! یہ انگریز بھی بڑے ذی فہم اور عقل مند ہوتے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی دانشور ادیب یا شاعر کو جب کوئی خطاب دیتے ہیں تو "سر" کا خطاب دیتے ہیں۔ دل، جگر وغیرہ کا خطاب نہیں دیتے۔"

ہم ان کی عالمانہ گفتگو کو سن کر یا تو سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں یا پھر پائے تسلیم کو سرِ تسلیم پر رکھ کر بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں جس میں ہم آج تک کامیاب نہیں ہوسکے۔ چنانچہ اس وقت بھی ہم نے صرف سرِ تسلیم سے کام لیا۔ پائے تسلیم کو اپنی جگہ پر ہی رہنے دیا۔ اور تقریر جاری رکھتے ہوئے عرض کیا۔

غرض اعضائے رئیسہ میں "سر" سب سے بڑا عضوِ رئیس ہے۔ اس لحاظ سے اس کو رئیس اعظم بھی کہا جاسکتا ہے۔ بہرحال یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ سر میں دماغ ہوتا ہے۔ جس کو عرفِ عام میں بھیجا کہا جاتا ہے اور عرفِ خاص میں "مغز" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سر میں "بھیجا" ہوتا ہے اور بھیجے میں عقل جو موٹی بھی ہوتی ہے اور دبلی بھی ہوتی ہے موٹی عقل کے مقابلے میں دبلی عقل زیادہ کارآمد سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے کہ بہت دور تک دوڑ سکتی ہے۔ اور بہت تیز دوڑتی ہے۔ ہر سر میں بھیجا ضرور ہوتا ہے لیکن ہر بھیجے میں عقل کا ہونا ضروری نہیں۔ بعض لوگوں کے سر میں بھیجا ہوتا ہے لیکن اس میں عقل نہیں ہوتی ایسے لوگوں کو فوج میں آسانی سے ملازمت مل جاتی ہے بعض لوگوں کے سر میں بھیجا بھی ہوتا اور عقل بھی لیکن وہ عقل سے کام نہیں لیتے بلکہ عقل کے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتے ہیں۔ ایسے لوگ پولیس اور جیل کی ملازمت کے لئے کارآمد ہوتے ہیں۔ جن کے ہاتھ میں ہمیشہ ایک ڈنڈا (غلام سرور ڈنڈا نہیں) بھی ہوتا ہے۔ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے سر میں بھیجا ہوتا ہے بھیجے میں عقل چلتی ہے اور وہ عقل سے کام بھی لیتے ہیں۔ ایسے لوگ پروفیسر، لکچرار یا ٹیچر ہوجاتے ہیں جن بھیجوں میں عقل کی

www.taemeernews.com

مقدار ضرورت سے کچھ زیادہ ہوتی ہے وہ بیرسٹر یا ایڈوکیٹ ہو جاتے ہیں۔ اس پیشے کے لئے قانونی ڈگری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی بدبختی کی وجہ سے قانونی ڈگری حاصل کرنے میں جاتو دکھا کر بھی ناکام ہو جاتے ہیں تو وہ کسی اخبار یا ماہ نامے کے ایڈیٹر بن جاتے ہیں بعض بھیجوں میں عقل لچکدار ہوتی ہے تو وہ لیڈر بن جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں کئی اور قسم کے سر اور بھیجے ہوتے ہیں جن میں عقل کی مقدار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ چنانچہ مقدار کی مناسبت سے تجارت، ملازمت یا زراعت جیسے پیشے اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طبقہ اُن لوگوں کا ہے جن کے بھیجوں میں عقل ہمیشہ بیدار رہتی ہے اور دن کا آرام اور رات کی نیند حرام کر دیتی ہے۔ اگر عقل روتی اور آنسو بہاتی رہتی ہے تو یہ لوگ سنجیدہ شاعر یا ادیب بن جاتے ہیں۔ اور اگر مسکراتی اور ہنستی رہتی ہے تو ایسے لوگ مزاح نگار ادیب یا مزاح گو شاعر بن جاتے ہیں۔ ان تمام طبقوں کے علاوہ ایک نہایت ہی عجیب الخلقت طبقہ ایسا بھی ہے جس کے سر میں بھیجا تو ہوتا ہے لیکن نہ معلوم قدرت کی کیا مصلحت ہے کہ اُلٹا رکھا ہوتا ہے۔ اس طبقے کے بارے میں کچھ عرض کرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس لئے کہ آج کل ہماری بیوی بھی ہمارے مضامین شوق یا دلچسپی سے نہیں بلکہ جستجو سے پڑھنے لگی ہیں۔

سر میں بال ہوتے ہیں (سبحان اللہ ہم نے بھی کیا نئی بات بتائی ہے) اور یہ بلا لحاظ صنف ہر سر میں ہوتے ہیں۔ یعنی مردوں اور عورتوں کے سروں میں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں۔ اس حد تک تو قدرت نے ہر دو اصناف کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے لیکن ڈاڑھی اور مونچھ کی حد تک عورتوں کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا گیا اور انہیں اس "نعمت" سے محروم رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے عورتیں مردوں کی طرح ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرنے اور مونچھوں پر تاؤ دینے کے قابل نہیں رہیں۔ اور مجبوراً انہیں دست پناہ اور چیلن کا سہارا لینا پڑا۔ اگر عورتوں کو بھی ڈاڑھی اور مونچھوں کی نعمت سے سرفراز فرمایا جاتا تو شعراء جس طرح اپنے محبوب کے ابروؤں کی کمانوں اور گیسوؤں کی درازی کی تعریف کرتے ہیں اسی طرح مونچھوں کے تناؤ اور ڈاڑھی کی درازی کی تعریف کرتے۔ عورتیں بھی جنہوں نے سر کے بال جمانے اور کٹانے میں نت نئے فیشن ایجاد کئے ہیں اس سے زیادہ ڈاڑھی سنوارنے کے دلکش اور دلفریب فیشن ایجاد کرتیں۔

بعض لوگوں کے سروں میں بال کم ہوتے ہیں اور بعض لوگوں کے سروں میں بالکل نہیں ہوتے۔ جن سروں میں بال بالکل نہیں ہوتے ایسے سر گنجے کہلاتے ہیں کہا جاتا ہے کہ سروں میں بالوں کا نہ ہونا بڑے آدمی ہونے کی علامت ہے۔ ہمارے سر سے تین چوتھائی بال غائب ہو چکے ہیں لیکن ہم ایک چوتھائی بھی بڑے آدمی نہیں بنے۔

وزن اٹھانے کے معاملے میں بھی سر نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ حج بیت اللہ کے دوران جب ہم اپنے قافلے سے بچھڑ کر منیٰ کے بازار میں "بامرد سامان" پھر رہے تھے (کیوں کہ ہمارے ساتھ ہمارا سر بھی تھا اور اس پر سامان بھی) تو ہمارا سر بہت مفید ثابت ہوا اس لئے کہ صبح سے دوپہر تک ہم اپنا سامان یعنی بستر اور سوٹ کیس اپنے سر پر لادے اپنے کیمپ کی تلاش میں مارے مارے پھرتے رہے۔ ویسے کبھی کبھی اپنے شانوں پر بھی رکھ لیتے تھے لیکن سر پر رکھ لینے میں جو آرام اور لطف آتا تھا۔ وہ شانوں پر لے کر پھرنے میں نہ تھا۔ اس کے علاوہ ہمارے سر پر "سامان کا سایہ" دھوپ کی شدت سے بچنے میں بھی معاون ثابت ہوا۔ آخر میں جب ہم اپنے مسایل سے فارغ ہو کر حرم پہنچے تو سب سے پہلے فاروق سیف الدین کے حق میں درازیٔ عمر مطلوب کی دعا مانگی اور اپنے لئے دعا مانگی کہ یا اللہ ہمارا حج قبول فرما۔

www.taemeernews.com

بھارت چندکھنہ

قصہ مختصر (خودنوشت حالات)

نام، بھارت چندکھنہ (کھنہ کو بھوکے کھانا، خوش باش "کہنہ" اور ناقص جنوبی خطہ کے لوگ "کھنا" بولتے ہیں)
پیدائش، کشمیر ۲۲، جون ۱۹۱۲ء بقید حیات تادم تحریر
وطن، ہندوستان (تقسیم سے پہلے اور بعد)
سکونت، سکندرآباد آندھراپردیش میں (نہایت بے سکون)
تعلیم، ایم اے (عثمانیہ) تاریخ
ٹرائپوس (TRIPOS) کیمبرج، قانون، اور تاریخ میں (جو ملازمت حاصل کرنے میں بالکل بے کار ثابت ہوئی)
سروس، انڈین اڈمنسٹریشن سروس (موظف)
پیشہ، ٹائیلوں کی فیکٹریوں میں فیصلوں کو ایسے انوکھے فن اور فائن ٹوچ قلم سے تحریر کرنا کہ فریادی کی فریاد فرد نہ ہو اور فائیل فری طریقے پر رواں دواں، اور کارروائی اور فیصلے کے درمیان کے فاصلے برقرار رہیں۔ نیز یہ امر بطور خاص ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ فیصلوں کی ذمہ داری اپنے عہدہ سے ایک درجہ نیچے یا ایک درجہ اوپر والوں کے سر پر رہے۔ اس فن کے کمال کا مظاہرہ مختلف محکموں میں کرسکا ہوں۔
زندگی، ازدواجی (جس میں ملک کے دستور کے تحت دی گئیں سب آزادیاں صفر بن کر رہ گئی ہیں)
اولاد، دو لڑکیاں، پہلی یعنی بڑی، چھوٹی سی عمر میں خود دو "چاند کی ٹکڑیوں" کی ماں بن چکی ہے اور اپنے ماں باپ کو نانی نانا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس بزرگی کے رتبے پر پہنچا دیئے جانے پر ہر اور خصوصاً اولاد الذکر بڑی شرم محسوس کرتے ہیں۔
دوسری یعنی چھوٹی، کرکٹ کی اصطلاح میں بالکل "فلوک" سے عالم وجود میں آئی لیکن اُس اوپر والے کی عنایت سے خاندان کی پہلی ڈاکٹر بن گئی ہے اور نہ صرف صحت قائم رکھنے بلکہ والدین کو اپنے ہوش وحواس، برقرار رکھنے کے متعلق بھی صحیح مشورے دیتی ہے۔ (اولاد نرینہ نہیں رہا۔ اگرچہ پیشوایانِ مذہب کا خیال ہے کہ اس کمی کی وجہ سے جنت کے دروازے ہمارے لئے ہمیشہ بند رہیں گے۔ لیکن اولادِ نرینہ کے چکر میں پڑکر اور آدھ درجن بچوں کے باپ بن کر ہم اپنی موجودہ زندگی کو دوزخ میں تبدیل کر دینے کے لئے تیار نہیں۔ درحقیقت ہمارا عقیدہ ہے کہ لڑکوں سے لڑکیاں بھلی کہ لڑکے ہمیشہ اپنے ماں باپ کا ہاتھ اپنی پتلون کی طرح تنگ اور ان کی پریشانیوں کو اپنے بالوں کی طرح درازکئے رکھتے ہیں۔ باقی رہے پیشوایان مذہب تو اُن کو میرا جواب یہ ہے کہ ——— "ہم نہیں جانتے جی ان باتوں میں آنے والے"

www.taemeernews.com

مشغلے، کرکٹ۔ پنجاب (تقسیم سے پہلے) اور عثمانیہ کی کرکٹ ٹیموں کی نمائندگی۔ کیمبرج بلو ریاست کی ٹیم کی نمائندگی اور کپتانی۔ بہرحال نمائندہ ٹیموں کے لئے انتخاب نہ کئے جانے کی نوبت نہ آنے سے پہلے ہی) فرسٹ کلاس کرکٹ کھیلنا ترک کیا۔ (اب کرکٹ کامنٹری کرنے کی کوشش کرتے ہیں)

کُتّے سے والہانہ محبت

متعدد ٹیکسوں کی ادائی قبل از وقت کرکے رسائد کھو دینا اور بعض اوقات دوبارہ ٹیکس ادا کرنا۔

سرکاری طور پر دورہ کرنے کے ضمن میں، آل انڈیا ریڈیو یا کسی رسالہ کے بے وقوف مدیر سے مضمون لکھنے کے لئے جو معاوضے یا رقوم ملیں اُن میں کچھ بیوی کے تصرف سے بچانے کی ناکام کوششیں۔

کچھ سنی دیکھی کو لکھنا نثر میں۔

گھوڑ دوڑ کے میدان میں کامل طور پر اور سرتاپا چند ہونے کا ثبوت دینا۔ اس کے باوجود ــــ

چھٹتی نہیں یہ لت کہ ہے ایسی پڑی ہوئی

سب سے بڑی خوشی، اگر نل کھولوں تو اُس میں سے موت کی ہچکیوں کی سی آوازوں کے بجائے پانی نکلے۔

اگر بجلی کا سوئچ آن کروں تو کرنٹ کی سپلائی کو اُسی یقین کے ساتھ حاصل کروں جس طرح آج کل کے امتحانوں میں پرچے حل کرنے کے لئے طلباء "فارن ایڈ" حاصل کرتے ہیں۔

ریل یا ہوائی جہاز میں جگہ حاصل کرنے کے لئے ان اداروں کے بکنگ کلرکوں سے اگر یہ جواب ملے کہ سیٹ مل سکتی ہے۔

اگر کسی کو لینے یا چھوڑنے کے لئے ریلوے اسٹیشن یا ایرڈروم (بشرطیکہ موخرالذکر غیب و غریب ادارے کے ملازمین اسٹرائیک پہ نہ ہوں) جائیں تو ریل گاڑی یا ہوائی جہاز وقت مقررہ پر آئے یا جائے۔

اگر سینما میں فلم ختم ہونے پر اور قومی ترانہ بجنے کے دوران سینما ہین مخلوق احترام کے ثبوت میں خاموشی سے بغیر ہلے جُلے کھڑی رہے۔

اگر موٹر کا ہارن سُن کر سڑک کے بیچوں بیچ چہل قدمی کرنے والے پیچھے ہٹنے سے ہٹ جائیں۔

اگر دھوبن ہمارے کپڑوں سے پتھر توڑنے کی کوشش میں کپڑے پھاڑ کر یا قمیصوں وغیرہ کے بٹن توڑ کر نہ لائے۔

جب ڈاک خانے سے لفافے خریدوں تو بند کرنے کے لئے اُن پر گوند لگی ہوئی ہو، یا پھر استعمال سے پہلے ہی اس طرح چپکے ہوئے نہ ہوں جس طرح الیکشن کا ٹکٹ حاصل کرنے کے لئے نیتا سے مزین سند

سب سے بڑا اشتعال، اگر کوئی شخص نل کے پانی کا استعمال کرنے کے بعد نل بند کرنا بھول جائے یا اس طرح بند کرے کہ پورا پانی بند نہ ہو اور یا پھر نل بند کرتے ہوئے اپنی جوانی قوت کا اس شدت سے مظاہرہ کرے کہ نل بند کرنے کی ٹوٹی کے THREADS تباہ ہو جائیں۔

اگر دعوت میں کوئی شخص اپنے الوداعی ہاتھ سے DISH کا چمچہ پکڑ کر جیمے کا ہینڈل گندہ کرے (یہ شاید اس مقصد

www.taemeernews.com

کیا جاتا ہے کہ دوسرے اس DISH کی طرف متوجہ نہ ہونے پائیں)

اگر چھری کانٹے سے کھانے کی کوشش میں کوئی شخص کاٹنا اس طرح پکڑے جس طرح عنقریب میز پکڑتے ہیں اور چھری اس طرح جس طرح قتل کا ارتکاب کرتے وقت قاتل چھرا پکڑتا ہے۔

اگر کوئی مہمان حلوہ یا ایسی کوئی چیز ہاتھ سے کھاتے ہوئے اپنے آلودہ ہاتھوں کو ہمارے صوفے کے کپڑے سے پونچھنے لگے۔

اگر کوئی شخص فلش استعمال کرنے کے بعد زنجیر کھینچ کر یا ہینڈل دبا کر پانی چھوڑنے اور اس کو صاف کرنے کا کام آئندہ استعمال کرنے والے کے لئے چھوڑ دے۔

جب کوئی معزز مہمان آدھ پاؤ تیل سر میں ڈال کر تشریف لاتے ہیں، اپنے سر کو ہمارے گھر کی دیواروں سے گھستے ہیں اور جب ایسا کرتے ہوئے تھک جاتے ہیں تو صوفہ پر دراز ہو جاتے ہیں تاکہ اپنی یادوں کے نشان مستقل طور پر چھوڑ جائیں۔

جب کوئی احمق، معزز مہمان ہماری موٹر سے اُترنے کے بعد ہندوستانی ساخت کے موٹر کے دروازے کو بند کرنے کے لئے ایسی وحشیانہ قوت سے دے مارتا ہے کہ نہ صرف موٹر کا مالک بلکہ اس کے دروازے کا تمام اندرونی سسٹم درہم برہم ہو جاتا ہے اور موٹر کے دروازے کو مزید استعمال کرنے کے لئے بیس پچیس روپے کے اخراجات کا بار الگ اٹھانا پڑتا ہے۔

ہماری سب سے بڑی شیخی، ہندوستان کی وہ واحد شخصیت ہونا جس کو کیرج کرکٹ "بلو" ہونے کے ساتھ ساتھ انڈین اڈمنسٹریٹو سروس کا رکن ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

ہماری شہرت،

"کیا ہوا لوگ اگر ہم کو گدھا کہتے ہیں ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

تصنیفات، مُسکراتے آنسو، (افسانوں کا مجموعہ) مصیبتیں (مضامین) ٹھنڈی بجلیاں (مضامین)
تیز نمکش (ڈرامے اور مضامین) کیا نام نہ ہوگا (مضامین)

ضرورت ہے۔ ایک صدر کی

مبادا کہ عنوان سے کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو یہ بات شروع میں ہی واضح کر دی جاتی ہے کہ اس عنوان کا تعلق کسی ترقی یافتہ یا پس ماندہ ملک کے صدر کے چناؤ سے نہیں، کسی سرکاری، غیر سرکاری، ترکاری، ریزگاری یا ریاکاری فروشوں کی انجمن کے صدر کے انتخاب سے بھی نہیں ہے۔ بلکہ موضوع کا تعلق ایسے صدور سے ہے جن کو کسی ادبی جلسے، کسی تہذیبی محفل، کسی مشاعرہ، کسی شام غزل، کسی شب بہاراں، کسی کتاب کے رسم اجراء، کسی دانشور کو جس کی کشتی حیات بحر فنا میں ڈوبنے ہی والی ہو خراج عقیدت پیش کرنے یا پھر کسی رنگا رنگ پروگرام کے موقعہ پر صدر بنا کر جلسے میں کسی اصل دلہن کی طرح سجا دیا جانا مقصود ہو، جس میں یہ صدر خاموش، غمگین، شرمسار، لاچار آنکھوں میں نیند کا خمار سنبھالے جلسے [illegible]

www.taemeernews.com

والی جملہ ستم رانیوں کو اپنی کسی کا پھل سمجھ کر، سہتا ہوا چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ اس کی ناز برداری کے سلسلے میں پانی کا ایک گلاس (شکلاس صاف ستھرا ہونا ضروری نہیں) اس کے سامنے دھر دیا جاتا ہے تاکہ اس کو صرف خون کے گھونٹ ہی پینے پہ اکتفا نہ کرنی پڑے۔ البتہ اس کو اس بات کی پوری پوری آزادی ہوتی ہے کہ ؎

تھک جائے جو اک پہلو تو وہ پہلو بدل ڈالے

مگر بانیانِ جلسہ اس بات کی گیارنٹی فراہم نہیں کرتے کہ صدارت کے فرائض ادا کرتے ہوئے اکڑ جانے کے بعد صاحبِ صدر کا جوتا چپل اسی جگہ پر جہاں وہ اس سے رخصت ہوئے تھے ان کا انتظار کرتا، ان کی طرح اپنی رکھی ہوئی جگہ پر راکاامل پائے گا۔ کیوں کہ ایسے جوتوں کے انتظار میں اردو کے کئی آبلہ پا شیدائی، ہاتھ کی صفائی دکھلاتے ہوئے اپنے دکھتے پیروں کی حفاظت کا اہتمام اور بدبخت صدر کی اپنے جوتے سے محرومی کا پکا انتظام کر دیتے ہیں اور پھر یہ ظالم صاحب صدر کی پریشانی کی کیفیت کو دور سے دیکھنے کے لئے جلسہ کے اختتام تک موجود بھی رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے تجربہ کار صدور بوقتِ صدارت اپنے جوتوں کو اپنی صدری کے اندر کچھ ویسی ہی احتیاط سے سینے سے لگائے رکھتے ہیں جس طرح الہ دین کے قصہ کا جادوگر طلسمی چراغ کو سنبھالے رکھتا ہے۔ البتہ یہ کیفیت کسی دی آئی پی کے ساتھ پیش نہیں آسکتی۔ کیوں کہ موصوف کے جوتے اتارتے ہی اُن کا پرسنل اسسٹنٹ پرسنل اٹنڈنٹ کے فرائض سنبھالتے ہوئے ان پر جھپٹ کر گرتا ہے اور ان کو اپنی پرسنل کسٹڈی میں لے لیتا ہے۔

یہ ایسے جلسے ہوتے ہیں جو معشوق دھوبی، درزی، یا حجام کے وعدوں کی طرح کبھی وقت یا تاریخ اعلان کردہ منعقد نہیں ہوتے، جن کے بارے میں اعلانات چھپواتے وقت بانیانِ جلسہ کے کسی قلم تراش قسم کے انسان کے دماغ میں جلسہ کا جو کبھی بھولے سے بھی اعلان میں عظیم الشان قسم سے کم درجے کا نہیں ہوتا ایک موہوم و مبہم سا خاکہ ہوتا ہے، ایک طرح کی کانپتی ہوئی پرچھائیں، ایک جھجکتا ہوا سا خیال، جلسہ منعقد کرنے کی ایک آرزو۔ بس یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے دل میں کوئی خواہش پیدا ہوئی، قلم حرکت میں آیا اور ایک اعلان جاری ہوگیا۔

اس اعلان میں مقام، تاریخ، وقت اور سال کا قطعی تعین نہیں ہوتا بلکہ مبہم سے اشارے ہوتے ہیں۔ پھر یہ سوچ شروع ہوتی ہے کہ جلسہ کہاں کونسی ہوگی یا ہوسکتی ہے۔ اس ضمن میں کانفرنس ہال کے خیال، اسمبلی کی چھت، شہر نگاراں کا سب سے بڑا تھیٹر اوپن ایئر تھیٹر اور شاندار اسٹیڈیم، شادی گھروں، کالج کے میدانوں، سرائے خانوں، خانقاہوں، مندروں کے پچھواڑوں، درگاہوں کے احاطوں، ہوٹلوں کے تہہ خانوں، فیکٹریوں کے گوداموں، مرغزاروں اور زیارت گاہوں کے محل وقوع ذہن میں آتے ہیں۔ جب یہ سب مقامات پیشگی ہی سارے سال کے لئے بک ہو چکے ہوتے ہیں اور ان کو کسی وسیلے سے بک نہیں کیا جا سکتا تو ان کسی پرانی بارہ دری پر ٹوٹتی ہے جس کے بارہ دروازے اس کی صدیوں پرانی شان و شوکت کی یاد میں تنہا کھڑے ہیں۔ ایسے ٹوٹے پھوٹے اور لنگڑے ہو گئے ہوتے ہیں جس طرح کسی آرکسٹرا کے مریض کے جوڑ۔ جو ہلکے سے ہوا کے جھونکے سے بھی لرزنے لگتے ہیں۔ اور جن میں سے ایسی آوازیں پیدا ہوتی ہیں جیسی کسی ہندوستانی دہشت انگیز فلم کے

www.taemeernews.com

ایسے وحشت ناک سین میں سنائی دیتی ہیں جس میں ازلی بے وقوف ہیروئن، پیدائشی چالاک دلن کے بھائیوں میں آکر کسی انتہائی اندھیری رات کو کسی بھوت بنگلے میں ہیرو سے ملاقات کرانے کا یقین دئے جانے پر بھاگم بھاگ پہنچ جاتی ہے۔ اور بنگلے میں سے آنے والی خوفناک آوازوں کو سُن کر بے تحاشا چیخیں مارنے لگتی ہے اور جب تھک جاتی ہے تو کوئی خون منجمد کر دینے والا دردناک فلمی گانا شروع کر دیتی ہے۔ ان ہولناک آوازوں کو سُن کر سینما ہال میں بیٹھے بچے ماؤں کی چھاتیوں سے چمٹ جاتے ہیں اور مائیں سہم کر اپنے احمق شوہروں کے شانے تھام لیتی ہیں۔ ایسے جلسہ گاہ میں اگر جلسہ شروع ہونے سے عین پہلے بجلی آف ہو جائے تو جلسہ میں بھی خوف کی لہر پھیل جاتی ہے۔ گھپ اندھیرے میں کوچہ بانیانِ جلسہ آپس میں گفتگو اور تکرار سے گزرتے ہوئے جو تم پیزار پر اتر آتے ہیں کہ فلاں ابن فلاں نے ہمارے موجودہ برقی انتظام کی برکتوں کو جانتے ہوئے بھی اخراجات میں انتہائی کفایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے پٹرومیکس کا انتظام بھی احتیاطاً رکھنے سے سب کو باز رکھا تھا۔ بانیانِ جلسہ کی خوش قسمتی اس میں ہوتی ہے کہ یہ سارا ایکشن اندھیرے میں انجام پاتا ہے اور اس کو فلمانے کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ اس افراتفری کی کیفیت میں بعض تجربہ کار منتظمین صدر جلسہ کو جا کر تھام لیتے ہیں کہ کہیں وہ مٹی کا مادھو ڈر کے مارے جلسہ سے فرار نہ ہو جائے اور جس کی خبر ہو چکی کو پٹرومیکس، دیکس کی بتی، اگربتی یا چائے کی پتی بھی پورا نہ کر سکے۔

بات جو انتخاب صدر کے تعلق سے شروع ہوئی تھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی انتخاب صدر کا مسئلہ، اگرچہ اس کو کوئی خاص کام انجام دینا نہیں ہوتا اس کے روایتی مقام کے باعث بہت اہم ہوتا ہے۔ اولاً کسی ناشر (ن۔ الف۔ شین) یعنی نہایت اہم شخصیت کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ مقصد بسا اوقات صرف جلسہ کی زینت ہی نہیں ہوتا بلکہ کسی منتظم جلسہ کے پیش نظر کسی اٹکی ہوئی فائل کا نکلوانا، کسی فراموش شدہ سڑک کی مرمت، بجلی کا کنکشن، بلدیہ ٹیکس کو جو کسی مکان کو کسی بلدیہ کے منتظم نے محل سمجھ کر عاید کر دیا ہو کم کروانا، کسی مقام پر پانی کی سبیل یا ایسی ہی بعض مصیبتوں سے چھٹکارا پانا ہوتا ہے۔ اس لئے صدارت کے لئے ناشروں کا گانٹھنا محض تعارف حاصل کرنے یا ربط پیدا کرنے کے مقصد سے کیا جاتا ہے اور جلسہ کے بعد شخص متعلقہ کوئی موقع پاکر راست برسرِ مطلب آجاتا ہے۔ خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ جب کوئی اہم شخصیت صدارت کرنا قبول فرمالیتی ہے تو پرسنل اسسٹنٹ بعض صورتوں میں اہم شخصیت کی آمد کی اطلاع بانیانِ جلسہ کو بتلا دیتا ہے۔ یہ اطلاع ہار کی موزونیت سے تعلق رکھتی ہے۔ کیوں کہ ایسا بھی ہو چکا ہے کہ جب کسی بہت اہم شخصیت کے لئے ان کی اہمیت کے اعتبار سے بانیانِ جلسہ نے نہایت عظیم الشان قسم کا ہار پہنایا تو شخصیت کا قد ہار کی لمبائی سے ایک فٹ کم نکلا اور چونکہ اس اہم شخصیت کو رس بیدرہ قدم چل کر کسی تصویر کی نقاب کشائی کرنا تھا، اس لئے موصوف بائیں ہاتھ سے ہار کو اٹھائے اس طرح قدم اٹھا رہے تھے جس طرح بارش میں عورتیں ساڑی کے نچلے حصہ کو خراب ہونے سے بچانے کے لئے اونچا اٹھا کر چلتی ہیں۔ اور یہ ناپ کی بات اس وقت سے اور بھی اہمیت حاصل کر چکی ہے جب کسی ایسے ہی جلسہ میں منتظمین نے ایک نہایت عمدہ موٹا تازہ ہار صاحب صدر کی آرائش کے لئے بنوایا تھا مگر جب جلسہ میں گلپوشی کی رسم انجام دی جانے لگی تو معلوم ہوا کہ صاحب صدر کی شخصیت اپنی اہمیت کی موزونیت کے اعتبار سے نہایت غذا گزیدہ تھی۔ سر پر ٹوپی کی بجائے ایک عظیم الشان پگڑ بندھا تھا جو غالباً موصوف کو وراثت میں ملا تھا ورنہ

www.taemeernews.com

فی زمانہ سر کو ڈھانپنے کے لئے اس قدر کپڑے کا استعمال امرِ محال معلوم ہوتا ہے' اس میں اس قدر کپڑا تھا کہ تمام بانیانِ جلسہ کے لئے ایک ایک کرتہ پاجامہ سلائی کرنے کے لیے کافی تھا۔ اور پھر شاید خدا کو یہی منظور تھا کہ وہ ہار ان کے سر کے محیط سے چھوٹا ثابت ہو جس کے باعث پہلے تو صاحبِ صدر کا پگڑ سر سے کھسک کر ان کے قدموں میں آ رہا۔ پھر ان کی جٹائیں پریشان ہو کر ان کے چہرے پر نقاب کی شکل میں نمودار ہوئیں اور بالآخر ہار پہنانے کی کشمکش میں ہار کا دھاگا ٹوٹ گیا اور سرِ محفل صاحبِ صدر کے سر پر پھولوں کی بارش ہو گئی۔ اور صاحبِ صدر کسی پرانے زمانے کے شاہی دربار کے مسخرے کی طرح حاضرین کے لئے تصویرِ فرحت بنے عضے سے کانپتے کھڑے تھے۔ کیفیت یہ تھی کہ ؎

گھونگٹ کے تار رنگے گئے رنگِ عتاب میں

جب سے یہ واقعہ ہوا ہے بانیانِ جلسہ بطور احتیاط پھولوں کو ربر کی ڈوری میں پرو کر لاتے ہیں تاکہ اگر بفرضِ محال ہار صدرِ جلسہ کے سر اور گردن کے محیط سے کم نکلے تو کم از کم ربر کی ڈوری کی مدد سے گلے میں ہار کی طرح نہ سہی' چوڑی کی طرح سر میں پہنا دیا جائے اور گردن میں پھانسی کے پھندے کی طرح پہنا رہے۔

بے پناہ طور پر اہم شخصیتوں کو صدر بنانے میں ایک اور بڑی مصیبت جو مضمر ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ بسا اوقات سین سے یکلخت بغیر کسی اطلاع کے غائب ہو جاتے ہیں' بالکل اسی طرح جس طرح کوئی مشکل کشا کسی دفتر میں دوسرے دن بننے کا وعدہ کر کے اسی دن ایک ماہ کی رخصت پر بوریا بستر باندھ کر رفوچکر ہو جاتا ہے اور ڈیڑھ ماہ بعد طلوع ہوتا ہے۔ بہرحال جلسہ میں یہ حال ہوتا ہے کہ حاضرین' مقررین اور منتظمین سب موجود مگر صاحبِ صدر غیر موجود ہوتے ہیں۔ جب پون گھنٹہ انتظار میں گزر جاتا ہے اور مدعوئین شور و غل مچانے کے موڈ سے بڑھ کر اپنے دل میں کچھ اور ٹھانے نظر آتے ہیں تو صاحبِ صدر زیرِ بحث کے دولت خانہ' خانہ ہائے دوستاں اور دوسرے اڈوں پر جہاں وہ بعض اوقات پل سکتے ہیں' ٹیلی فون کھڑکھڑائے جاتے ہیں۔ بعض مرتبہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر موصوف کو گھوڑوں کے چوک نزد پھسل بنڈہ' حیدرآباد میں صدارت کرنی تھی تو وہ اس وقت جنگل میں منگل منانے بھاگڑہ نشگل پہنچے ہوتے ہیں۔ اور بعض مرتبہ تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی آمد و رفت کا جاننے والا ان کی حرکات و سکنات سے بالکل لاعلمی کا اظہار کرتا ہے منتظمین جلسہ سر پیٹ لیتے ہیں اور جلسہ میں آکر سامعین کی صفوں میں سے کسی سادہ لوح انسان کو گلے میں ہاتھ ڈال کر اٹھا لاتے ہیں اور ڈائس پر لا کر سامعین سے اس کا تعارف کراتے ہیں۔ اعلان کردہ صدر کی غیر موجودگی کے تمسخر سے اپنے غم و غصہ کو صدرِ دستور کی گونا گوں سہو و خیانت' بھاری سرکاری' غیر سرکاری' معاشرتی اور جمہوری ذمہ داریوں کی چادر میں لپیٹ کر معافی مانگتے ہیں۔ اور سامعین میں سے پکڑے ہوئے بکرے کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ موصوف کی صدارت میں ان کے جلسہ کی شان کچھ اور بڑھ جائے گی۔ کیوں کہ مسندِ صدارت پر ان کی موجودگی آمد بمقابلہ "آوردہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد نئے صدر کو تالیوں کی گونج میں ہار پہنانے کی کارروائی سرانجام پاتی ہے۔

حاضرینِ کرام! خاکسار بیان کر چکا ہے کہ بعض اوقات صدر اعلان کردہ کی نقل و حرکت سے متعلقین اور غیر متعلقین

www.taemeernews.com

ہر دو ناواقف ہوتے ہیں۔ ایسے ہی بیک گراؤنڈ میں اصل صدر کے طلوع نہ ہونے پر جب سامعین میں سے پکڑے ہوئے ہیرے کو صدارتی ہار پہنایا جا رہا تھا، تو عین اس وقت اصل صدر صاحب نہ معلوم کہاں کہاں سے بھٹکتے ہوئے جلسہ میں جلوہ افروز ہو گئے اور آناً فاناً ڈائس پر پہنچ گئے۔ ان کو وہاں موجود پا کر گل پوشی کرنے والے ہاتھ ہوا میں منجمد ہو گئے۔ گل پوشی کرانے والی جھکی گردن مارے شرم کے کچھ اور جھک گئی اور سامعین صدور کے اس جوڑے کو بیک وقت ڈائس پر دیکھ کر بے اختیار سیٹیاں اور تالیاں بجانے لگے۔

اس کیفیت میں کنوینر جلسہ نے خود بھی ایک نلک شکاف قہقہہ لگایا۔ پھر فاتحانہ انداز سے فرمایا کہ "مجھے یقین کامل تھا کہ ہمارے معزز صدر وعدہ فرما کر ضرور وعدہ وفا کریں گے۔ وہ دیر سے ضرور تشریف لائے ہیں، مگر ادبی جلسوں میں دیر، دیر نہیں ہوتی بلکہ مروجہ روایات کا ثبوت فراہم کرتی ہے اور بہر صورت دیر آید درست آید کی مثل تو مشہور ہے ہی۔ مجھے اس بات کی بڑی مسرت ہے کہ اعلان کے مطابق جلسہ کی کارروائی عزت مآب کی صدارت میں شروع ہو رہی ہے"

یہ سن کر ظاہر ہے کہ سامعین میں سے پکڑ کر لایا ہوا ہار غا کھسکنے کی کوشش کرتا ہے مگر کنوینر صاحب اپنی ٹانگ سے ان کی راہِ فرار کو روکتے ہوئے مزید یہ اعلان کرتے ہیں کہ "عزت مآب کی صدارت میں جلسہ کا پہلا دور منعقد ہوگا اور صاحب صدر کے تشریف لے جانے پر ایک مختصر سی محفل شعر و لطیفہ گوئی برپا ہوگی جس کی صدارت ہمارے عارضی صدر صاحب کریں گے"

اس اعلان پر مزید سیٹیوں، تالیوں اور کرسیوں کی سیٹوں کو پٹخنے کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ اصلی صدر کو ہار پہنایا جاتا ہے جس کو گلے سے اتار کر موصوف میز پر سامنے رکھ دیتے ہیں۔ پھر تصویر لی جاتی ہے اور کنوینر صاحب میز پر سے ہار اٹھا کر ایک کارکن کے حوالے کر دیتے ہیں تاکہ تصویر کشی میں آسانی ہو۔ مگر وہ کارکن کو یہ تاکید بھی کر دیتے ہیں کہ ہار کو محفل شعر کے صدر کے لئے محفوظ رکھنا ہے۔ یہاں اس بات کی وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ یہ ہار اپنی افادیت کی آخری منزل پر اس وقت پہنچتا ہے جب کنوینر صاحب اس کو دوسرے صدر کے پنجے سے بچا کر بالآخر اپنے گھر لے جاتے ہیں اور اپنی بیگم کو بھی یہ کہہ کر خوش کر دیتے ہیں کہ ؎

ہار پھولوں کا مری جان تیرے واسطے لایا ہوں آج شب

لیکن جب بانیانِ جلسہ کی گرفت میں کوئی نامور اہم ٹھوس اور چکنی ہستی نہیں آتی اور ایسا بارہا ہوتا آیا ہے کہ کوئی نہ کیا شگوفہ کھل جاتا ہے، مثلاً اسمبلی کی تحلیل، وزارت کی نئی تشکیل، قلمدانوں کی نئی تقسیم، کسی غیر متوقعہ اور اچانک وفات سے کسی اہم جگہ کا خالی ہو جانا، الیکشن کی آمد اور ڈیکلرز کی آمد و رفت وغیرہ سے اہم شخصیتیں اپنے معمول کے سب معمولی کام چھوڑ کر اپنے رشتے استوار کرنے، اپنے لئے زیادہ اہم مقام حاصل کرنے کے لئے مختلف مقامات کے دوروں پر نکل پڑتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر "تاش" منڈی سے دفعتاً اسی طرح غائب ہو جاتے ہیں جس طرح مداری کی تھیلی سے انڈے، راشن کی دکان سے شکر یا کیروسین کا تیل اور بیری کھونٹی پر ٹنگی ہوئی پتلون کی جیب سے ریزگاری۔ ان حالات میں بانیانِ جلسہ کو کسی ن۔م بشی

www.taemeernews.com

یعنی نہایت معمولی شخصیت کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر شخصیت خواہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو اس میں بھی صدارت کا رتبہ حاصل کرنے کے لئے چند خوبیوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔

سب سے پہلے غیر اہم شخص کے حلیے کو دیکھا جاتا ہے۔ سوال خوبصورتی کا نہیں ہوتا، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ایسا شخص معقول ہونے کے علاوہ دید کے ناقابل نہ ہو۔ اس کی صورت شکل ڈراؤنی اور گھناؤنی نہ ہو اور محفل میں مسرورات کو مسلسل گھورنے والا نہ ہو۔ اور اس بات کی پڑتال بھی کرلی جاتی ہے کہ اس کے پاس کم از کم ایک جوڑا کپڑوں کا ایسا ہو جن کو پہن کر وہ جلسے میں معقول سا انسان نظر آئے۔ ان امور کے متعلق اطمینان کر لینے کے بعد اس کے کپڑے پہننے کے سلیقے پر بھی نظر ڈالی جاتی ہے، کیوں کہ بعض ایسے شرفا بھی سفید پوشوں میں نظر آتے ہیں جو اپنی بہترین بش شرٹ کا ستیاناس اس طرح کر کے رکھ دیتے ہیں کہ اوپر کے دو بٹن چھوڑ کر تیسرے بٹن کو سب سے اوپر والے کاج میں لگا دیتے ہیں اور اپنی اس حماقت سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ بعض یہی سلوک پتلون کے سامنے کے بٹنوں اور کاجوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ اور پھر کئی ایسے بھی بے خبرے ہوتے ہیں جو پتلون کے زپ یا بٹنوں کے استعمال کو یکسر بے ضرورت سمجھتے ہیں۔

نیز ان بے ہودگیوں سے ہٹ کر صدر کے انتخاب میں صدر کی صحت کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ بانیانِ جلسہ اپنے شکار کو بالکل اسی طرح دیکھتے ہیں جس طرح کوئی ماہر بادرچی مرغ خریدتے وقت اس کے صحت مند ہونے کا یقین کر لینا چاہتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زندگی اس وقت ایک ایسے دھڑے سے دوچار ہے جس میں عام سفید پوش سیاہ سنڈی میں سفید چینی کی قیمت سن کر مارے غصہ کے لال پیلا ہو جاتا ہے۔ وہ چینی کو چائے کی پیالی میں اسی احتیاط اور اختصار سے ڈالتا ہے جیسے کوئی ہومیو پیتھک ڈاکٹر دوائی کی پڑیاں بنا رہا ہو، صابن کی قیمتوں کی ترقی اقبال کی وجہ سے اس کے استعمال میں اس پر اس طرح نرمی سے ہاتھ پھیرتا ہے جس طرح کوئی بزرگ کسی برخوردار کو دعا دیتے وقت اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتا ہے۔ اور توشہ پیٹ کی قیمتوں پر آئے ہوئے عروج سے مرعوب ہو کر اس کو ٹوتھ برش پر ایسی چابکدستی سے پھیرتا ہے جس طرح کوئی پیشاوری کا ماہر قطرۂ خون کو شیشے کی سلائیڈ پر جانچنے کے لئے پھیلاتا ہے کہ آخر اس نے مریض کے دل میں اس قدر شور کیوں مچا رکھا تھا۔ ایسے دورِ حیات میں صاحب صدر کے رشتۂ حیات کی پختگی کو جانچنا اس لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ کہیں دورانِ جلسہ صاحب صدر پر دل کا دورہ نہ پڑ جائے اور منتظمین جلسہ کے لئے یہ ضروری ہو جائے کہ پہلے کسی ڈاکٹر کو فوراً فراہم کریں پھر اسٹریچر اور ایمبولنس کا انتظام کریں۔ صدر کو اس میں ڈال کر اسپتال پہنچائیں، اور اگر موصوف ملک عدم کے راستہ پر چل پڑے ہیں تو ان کے کفن دفن کا اہتمام بھی کریں۔

پھر بانیانِ جلسہ اس بات کا یقین بھی کر لینا چاہتے ہیں کہ صدارت کے لئے جس شخص کو گانٹھا جا رہا ہے وہ پابندی سے وقت پر جلسہ گاہ وارد ہو جائے گا۔ وہ کسی ایسے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتے جس میں صاحب صدر انکم ٹیکس نہ دینے کی پاداش میں گرفتار ہو کر وقتِ صدارت تہاڑ جیل خانے میں تشریف فرما، مچھروں اور کھٹملوں سے نبرد آزمائی کر رہے ہوں یا پھر گرفتار ہونے کے ڈر سے روپوش ہو چکے ہوں۔ چنانچہ وہ ایسے سفید پوش کو ڈھونڈتے ہیں جو انکم ٹیکس کے محکمہ کی دسترس سے

www.taemeernews.com

باہر ہو، مگر ایسا بھی نہ ہو جو اپنی شرافت کو بھاڑ میں جھونکتے ہوئے منہ پھاڑ کر سفر خرچ، بھتہ، اور صدارت کے دوران پہنے جانے والے کپڑوں کی دھلوائی اور استری کروانے کے اخراجات طلب کر بیٹھے۔ ان کے پیشِ نظر تو ایسا شخص ہوتا ہے جو نہ صرف سفر خرچ وغیرہ کا مطالبہ نہ کرے بلکہ مقام جلسہ پر پہنچنے کے لئے جو راستہ اسے اختیار کرنا ہو اس راہ پر آتے ہوئے چند کارکنوں کو بھی اپنی شکستہ حال موٹر میں بٹھا کر ساتھ لیتا آئے تاکہ صاحبِ صدر کو جلسہ گاہ کی تلاش میں زحمت نہ اٹھانی پڑے۔ بعض مرتبہ تو ہوشیار جلسہ ساز تکلف برطرف کرتے ہوئے صدرِ جلسہ کو اس بات کا پابند بھی کر دیتے ہیں کہ آتے ہوئے مائیکروفون فٹ کرنے والے کو ساز و سامان کے ساتھ لیتے آئیں۔ ایسی صورت میں بعض مرتبہ ایسی صورتِ حال بھی پیدا ہو چکی ہے کہ لفٹ دینے کے بعد مائیکروفون لگانے کی اُجرت بھی صاحب صدر کو بالآخر ادا کرنی پڑی۔ کیوں کہ جلسہ کے بعد جملہ بانیانِ و منتظمینِ جلسہ ہوا میں تحلیل ہو گئے تھے!

پسند

برنارڈ شاہ ہمیشہ اپنی پسند کی چیزیں خریدتا اور بیوی سے کہتا: "تمہاری پسند کبھی معیاری نہیں ہوتی تم کبھی اچھی چیز پسند نہیں کرتیں"

ایک دن بیوی نے جل کر کہا "آپ نے تو سمجھ رکھا ہے جیسے آج تک میں نے ایک بار بھی اچھی چیز پسند کی"

برنارڈ شاہ نے فوراً جواب دیا: "نہیں۔ ایک بار کا تو میں بھی قائل ہوں شادی کے وقت تمہاری پسند یقیناً میری پسند سے بہتر تھی"

www.taemeernews.com

پرویز یداللہ مہدی

ایک نظر ادھر بھی...

(پرویز کے مختصر حالات حادثات و تصنیفات کا ٹریلر)

پہلا حادثہ ، ۲۱ جون ۱۹۴۳ء

درمیانی حادثے ، بے شمار و بے حساب

آخری حادثہ ، ؟؟

بے ساختہ نام ، سید یداللہ مہدی حسینی

خود ساختہ نام ، پرویز یداللہ مہدی

وطن مالوف ، حیدرآباد المتخلص بہ دکن (مرحوم)

وطن موجود ، شہر نگاراں و دل نگاراں بمبئی

شوق ، دوسروں کو ہنسانے کی کوشش میں اپنا خون پانی کرنا۔

پیشہ ، تین چار پشت اُدھر پیشہ آبا سپہ گری و پیری مریدی تھا بعد والوں کو کان پر قلم رکھ کر نکلنے کا پیشہ بہت جچا یا۔ کچھ جراثیم ادھر بھی منتقل ہوئے چنانچہ ریفریجریشن انجینئر ہو کر بھی فری لانس ادیب کی حیثیت سے زیادہ جانا پہچانا جاتا ہوں۔

شائع شدہ تصنیفات

۱۔ چیئر بھاڑ ۔ (مجموعہ مضامین) ۲۔ چوڑی کے غلام ۔ (مجموعہ مضامین)
۳۔ تو تو میں میں ۔ (مزاحیہ ڈرامے) ۴۔ ٹائیں ٹائیں فش ۔ (مجموعہ مضامین)

ریلیز ہونے کیلئے بے چین تصنیفات

۱۔ چہ خوب ۔ (ناول) ۲۔ دامانِ خیالِ یار ۔ (ناولٹ) ۳۔ اڑن چھو (ناولٹ)
۴۔ لیلیٰ کا کُتا ۔ (ناولٹ) ۵۔ ایسی کی تیسی ـــــ (خاکے)

انڈر پروڈکشن عرف زیرِ تکمیل تصنیفات

۱۔ زیر و زبر ۔ (ڈرامے) ۲۔ مرغِ اعظم ۔ (طویل ڈرامہ)۔
۳۔ آئینہ ہیں شاعر ۔ (مضامین کا انتخاب)

www.taemeernews.com

زیرِ قلم تصنیفات کا ساتھ ہے ۔ انجام خُدا معلوم!
نوٹ:۔ مذکورہ بالا معلومات میرے علم و اطلاع کے مطابق درست ہیں، تاہم اگر
تعارف کی کسی شق پر 'غلط بیانی' کا شبہ ہو تو اسے 'کتابت' کی غلطی پر محمول کیا جائے۔

کہانی پر بیٹھنا

اللہ والے مراقبے میں بیٹھتے ہیں۔ ڈھونگی پیر فقر "چلّہ" بیٹھتے ہیں۔ جنگجو آدمی "گھوڑے" پر بیٹھتے ہیں۔ پسپھسے کمزور دل لوگ گدھے پر بیٹھتے ہیں۔ حسین لوگ سر آنکھوں پر بیٹھتے ہیں۔ خبیث لوگ اعصاب پر بیٹھتے ہیں۔ لیکن جن بدنصیبوں کی قسمت پھوٹ جاتی ہے وہ "کہانی" پر بیٹھتے ہیں، اور ان دنوں بفضلِ تعالیٰ ایک ایک کہانی پر کئی کئی کہانی نویس ایک ساتھ بیٹھتے ہیں۔ نتیجتاً بے چاری کہانی اتنا بوجھ سہہ نہیں پاتی اور "پردۂ سیمیں" پر پہنچنے سے پہلے ہی کاغذ پر دم توڑ دیتی ہے۔

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مُرجھا گئے

کہانی پر بیٹھنے کی اصطلاح اگرچہ کہ خالص فلمی اصطلاح ہے لیکن ملک کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے۔ فلمیں آج ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک بن چکی ہیں البتہ ایسے اصحاب جن کی "کُل" اس جزوِ لاینفک سے ابھی تک محروم ہے ان کی خاطر اس فلمی اصطلاح کی مختصر سی وضاحت پیش ہے جیسا کہ سبھی جانتے ہیں فلمی دنیا ہر بات ہر ادا نرالی ہے یہاں فلمی کہانی پر بحث مباحثے کے لئے کہانی نویسوں کی جو ٹولی جل بیٹھک بلائی جاتی ہے، اسے انگریزی میں (SITTING) کہتے ہیں اور ہندوستانی میں کہانی پر بیٹھنا !

فلمی دنیا میں بے شمار اچھے بُرے کہانی نویس پہلے سے موجود ہیں اور آئے دن نئے نئے کہانی نویس بھی اپنی قسمت آزمانے آتے رہتے ہیں۔ تاہم کہانی نویسوں کی اس بھیڑ کے باوجود کہانیوں میں نہ تو کوئی انفرادیت نظر آتی ہے نہ یکسانیت ہاں، ہر کہانی نویس کا کہانی پر بیٹھنے کا اپنا جداگانہ اسٹائل ضرور ہوتا ہے۔

ایک مشہور کہانی نگار ہیں جن کے نام کو فی الوقت ہم صیغۂ راز میں رکھنے پر مجبور ہیں۔ آدمی ویسے کافی مہذب اور سلیقہ مند ہیں۔ لیکن فلمی کہانی پر جب بھی بیٹھتے ہیں، بڑے ہی پھوہڑ انداز میں "اکڑوں" بیٹھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ہم نے انہیں ازراہِ مذاق ٹوکا "قبلہ آپ کی اس مخصوص بیٹھک کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے آپ کہانی پر نہیں بلکہ "ضرورت" کے نئے بیٹھے ہوں۔

——— جواب میں موصوف نے اپنی بیٹھک میں ذرا بھی تبدیلی کئے بغیر فرمایا۔ "یہ درست ہے کہ میں فی الوقت

www.taemeernews.com

ضرورت کے تحت مزدور بیٹھا ہوں لیکن جس "مزدرت" کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے وہ فی الحال مجھے لاحق نہیں ہے البتہ مزدرت چاہے فطری ہو یا غیر فطری، ہر مزدرت مند اسی طرح اکڑوں بیٹھتا ہے۔"

ایک اور مشہور اور معمر فلمی کہانی نویس و مکالمہ نگار ہیں، کسی زمانے میں جن کا طوطی بولتا تھا۔ وقت واحد میں آٹھ آٹھ فلمیں لکھتے تھے۔ کام کرنے کا ان کا طریقہ کار جداگانہ ہونے کے ساتھ مضحکہ خیز بھی ہوا کرتا تھا۔ کرتے یوں تھے کہ لکھنے کے کمرے میں فلموں کی تعداد کے حساب سے میز کرسیاں لگوایا کرتے تھے۔ کام کے اوقات کو بھی فلموں کی تعداد کی مناسبت سے برابر برابر تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ پہلی کہانی کو مقررہ وقت دینے کے بعد دوسری کہانی کے لئے چھلانگ لگا کر دوسری میز پر پہنچ جاتے تھے۔ اس کے بعد تیسری، پھر چوتھی، اسی طرح تمام دن چھلانگ لگا کر کہانیوں پر کام کیا کرتے تھے۔ موصوف چونکہ حقے سے بھی شغف فرماتے تھے چنانچہ حقے کی نلی نئے بھی موصوف کے ساتھ اچھلا کرتی تھی۔ چنانچہ ان دنوں سنا ہے موصوف کا حقہ "میوزیم" میں پہنچ گیا ہے اور خود موصوف کسی "سرکس" میں بھرتی ہو گئے ہیں۔

بعض کہانی کار اس زور سے کہانی پر بیٹھتے ہیں کہ بے چاری کہانی کا کچومر نکل جاتا ہے۔ چونکہ کہانی نویس حضرات فلم ساز کی مرضی پر کہانی پر بیٹھتے ہیں اس لئے اس کی مرضی کے خلاف اٹھ نہیں سکتے اور جو کم عقل اپنی مرضی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر انہیں کسی کہانی پر "بیٹھنا" تو درکنار "کھڑا ہونا" بھی نصیب نہیں ہوتا۔

کہانی پر کہانی کار کے علاوہ فلم ساز، اور ہدایت کار کے ایسے چمچے بھی بیٹھتے ہیں جو نام نہاد قسم کے دانش ور ہوتے ہیں۔ روزانہ اُجرت پر کام کرنے والے ان پیشہ ور حضرات کا کام کہانی کو آگے بڑھانا نہیں ہوتا بلکہ کہانی کار کے کام میں روڑے اٹکانا ہوتا ہے۔ کہانی پر بیٹھنے والے جھگڑے میں سب سے تکلیف دہ پوزیشن یا تو کہانی کار کی ہوتی ہے یا پھر کہانی کی۔

اس قبیل کا ایک واقعہ بھی سن لیجئے۔۔۔ ایک بیٹھک کے دوران جیسے ہی فلم ساز کے چمچے کو یہ علم ہوا کہ کہانی کے تقاضے کے مطابق کہانی کار نے آخر میں ہیرو کو مار دیا ہے تو وہ دوڑا دوڑا گیا اور فلم ساز کو موقع واردات پر لے آیا۔ فلم ساز جس وقت کہانی کار کے روبرو پہنچا غصے سے بھنایا ہوا تھا آتے ہی برس پڑا۔ "مسٹر تم کو اتنا مال دے کر کہانی پر اس واسطے بٹھایا تھا کہ تم ہم کو ہی مار ڈالو!" کہانی نویس ہکا بکا رہ گیا۔ گڑبڑا کر بولا۔ "میں کچھ سمجھا نہیں سیٹھ جی میں آپ کو کیوں ماروں گا۔ میں نے تو صرف ہیرو کو مارا ہے۔ وہ بھی کہانی کی ضرورت کے پیش نظر۔" اب سیٹھ نے غصیلی نظروں سے اپنے چمچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بولتا ہے کہ اس نے ہم کو نہیں ہیرو کو مارا ہے۔" چمچے نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت جواب دیا۔ "یہ سچ ہے سیٹھ جی! کہ اس نے ہیرو کو مارا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اپنے من پسند ہیرو کو مرتا دیکھ کر پبلک آپ کو مار دے گی۔ ہیرو تو لاکھوں روپے لیکر جھوٹ موٹ مرے گا۔ پھر زندہ ہو جائے گا۔ لیکن فلم پٹ جانے کے بعد آپ کا سورگ باسی ضرور ہو جائے گا۔"

www.taemeernews.com

چمچے کی اس شاطرانہ چال نے بے چارے کہانی کار کو آن واحد میں کہانی پر سے ایسا اٹھایا کہ بے چارہ مدتوں کسی کہانی پر نہیں بیٹھ سکا۔ بیٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا۔

فلمی کہانی کے بارے میں بھی جانتے ہیں کہ بہت کم لکھی جاتی ہے زیادہ تر اُڑائی جاتی ہے تو پھر کہانی پر بیٹھنے کا یہ کھڑاگ کس لئے پھیلایا جاتا ہے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے۔ اُڑائی ہوئی کہانی میں کہانی نویس ایک ساتھ سر جوڑ کر "توڑ جوڑ" کرتے ہیں۔ اور پھر "بارہ مسالے" کی ایسی چاٹ تیار کرتے ہیں۔ جسے پبلک چٹخارے لے لے کر دیکھتی ہے اور فلم ساز روپے لٹورتا ہے اور ٹھاٹھ کرتا ہے۔ البتہ فلم پٹ جانے کی صورت میں "ٹھاٹھ" کے بجائے "کھاٹ" فلم ساز کی منتظر ہوتی ہے۔ جس پر وہ اس وقت تک پڑا رہتا ہے جب تک کہ اس کی کوئی اگلی فلم "ہٹ" نہیں ہو جاتی۔ اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ یہی کھاٹ بے چارے فلم ساز کو قبرستان یا شمشان گھاٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔

کہانی پر بیٹھکوں کا اہتمام زیادہ تر ہوٹلوں میں کمرے بک کروا کے کیا جاتا ہے۔ اونچے کہانی کاروں کی بیٹھک بھی اُونچی ہوا کرتی ہے۔ یعنی یہ سلسلہ اکثر دور دراز کشمیر کی برفیلی وادیوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ جو بیٹھک سطح مرتفع سے جتنی زیادہ اونچی ہوتی ہے کہانی اتنی ہی نچلی سطح کی ہوتی ہے یعنی وہی بات جتنی اُونچی دکان اُتنا ہی پھیکا پکوان۔

ہوٹلوں میں کمرے بک کروا کے جو بیٹھکیں بلائی جاتی ہیں ان میں ایسے کہانی کاروں کو بڑا فائدہ ہوتا ہے۔ جو چھت سے محروم ہوتے ہیں لیکن ایسے کہانی کار بھی ہوٹلوں میں بیٹھک کو ترجیح دیتے ہیں جو شاندار بنگلوں اور فلیٹوں میں رہتے ہیں اس کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ کہانی کار ابتداء میں چھت سے محروم ہوتا ہے اور یہ محرومی چونکہ اس کے مرحوم ہونے تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ اسی لئے اس کی زندگی اس مصرعے کی تفسیر ہوتی ہے ؎

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جاکر۔۔۔۔!!

"پردۂ سیمیں" پر خواتین کی جس قدر بھرمار ہے، پردے کے پیچھے اتنا ہی کال، یعنی فلم کے فنی شعبوں میں ابتداء ہی سے مردوں کی عمل داری رہی ہے فلمی کہانی کے میدان میں بھی شروع سے مردوں کا راج رہا۔ کبھی کبھار ایک آدھ خاتون ادیبہ کے ناول پر فلم ضرور بنی ہے۔ ایک آدھ فلم کے مکالمے بھی کسی خاتون ادیبہ سے لکھائے گئے ہیں لیکن یہ فلمیں چونکہ باکس آفس پر کامیاب نہ ہو سکیں۔ اس لئے پھر کسی نے ان کی ہمت افزائی کی ہمت نہیں کی۔ ابھی حال ہی میں ہماری ملاقات ایک ایسی خاتون ادیبہ سے ہوئی جو فلموں میں کہانی گیت اور مکالمے لکھنے کی خواہشمند ہیں۔

ہم نے ان سے پوچھا۔ "جیسا کہ آپ جانتی ہیں فلمی دُنیا کے کسی شعبے میں بغیر جدوجہد اور Struggle کے چانس نہیں ملتے۔ آپ بھی یقیناً جدوجہد کے دور سے گزر رہی ہوں گی"۔

"جی ہاں" خاتون ادیبہ نے جواب دیا۔

www.taemeernews.com

"مردوں کی بہ نسبت میں سمجھتا ہوں آپ کو اتنے حوصلہ شکن حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا۔ ہمتے انہیں کر دیا۔

"آپ کا کہنا کسی حد تک درست ہے۔ لیکن آزمائشوں سے میں بھی گزر رہا ہوں۔"

محترمہ کے اس اعتراف پر ہم نے پوچھا "کیا ان آزمائشوں نے آپ کو نا امید تو نہیں کر دیا!

"ہرگز نہیں جناب!" موصوف نے ٹھوس لہجہ میں کہا۔ "نا امیدی مجھے چھو کر بھی نہیں گزر سکتی۔ آپ کی دعا سے میں تو اُمید سے ہوں۔"

محترمہ کے اس جواب نے ہمیں اس قدر چونکا دیا کہ دوبارہ پھر ان سے ملاقات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی البتہ آج بھی جب موصوف کا یہاں آنا ہوتا ہے تو جی چاہتا ہے کہ چل کر ملاقات کی جائے۔ ان سے نہیں ان کی "امید" کے نتیجے سے!

عام خیال یہ ہے کہ موجودہ رجحان کے مطابق فلمی کہانی لکھنا کچھ مشکل کام نہیں۔ لیکن اسے سنانا ایک فن ہوتا ہے اور یہ آرٹ کسی فائن آرٹس کالج سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اس آرٹ کے ڈانڈے کسی فائن آرٹس سے نہیں ملتے بلکہ مسمریزم، ہپناٹزم سے ملتے ہیں۔ بعض کامیاب کہانی کاروں کے بارے میں یہ افواہ مشہور ہے کہ "انہیں جیسا خطرناک جادو تک جانتے ہیں ــــ!

ایسے ہی ایک کہانی نویس کے تعلق سے مشہور ہے کہ کہانی سناتے ہوئے کہانی کا ایک حصہ بن جاتے تھے یعنی جب کہانی میں رونے دھونے کا سین آتا، موصوف خود دھاڑیں مار کر رونے لگتے تھے۔ اسی طرح مزاحیہ سین سناتے تو خود ہنسی کا غبارہ بن جاتے اور مار دھاڑ کے سین سناتے تو کافی خوں خوار ہو جاتے تھے یعنی مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ سنا ہے ایک مرتبہ کوئی نازک سا نوجوان پروڈیوسر موصوف کے یہاں کہانی سننے پہنچا لیکن تھوڑی ہی دیر بعد موقع واردات پر موجود راویوں کے بیان کے مطابق نوجوان فلم ساز کہانی نویس کے کمرے سے حواس باختہ نکلا اور پھر بے تحاشہ سڑک پہ دوڑتا چلا گیا۔ جب گھر کے بھیدی سے اس کی وجہ پوچھی گئی تو معلوم ہوا کہ کہانی نویس نے بے چارے فلم ساز کو کہانی کا وہ سین سنانے کی کوشش کی تھی جس میں ویلن ہیروئن کی آبروریزی کی کوشش کرتا ہے۔

موصوف کے تعلق سے چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ جو آخری کہانی انہوں نے سنانے کی کوشش کی تھی وہ ایک مرڈر مسٹری (MURDER MYSTERY) سے بھرپور کہانی تھی۔ جس کے پہلے ہی سین میں ایک قتل دکھایا گیا تھا۔ چنانچہ ان دنوں کہانی نویس موصوف قتل کے جرم میں عمر قید کی سزا کاٹ رہے ہیں۔ یہ تو خیر ایک ایسے کہانی نویس کی داستان تھی جنہوں نے راست اپنے ہاتھ خون میں رنگے تھے۔ اب ایک ایسے کہانی نویس کا قصہ سنئے جو چار چار قتل کرنے کے باوجود آزاد انہ گھوم پھر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ موصوف ایک مدد دھانسو کہانی کے ساتھ فلم انڈسٹری میں داخل ہوئے۔ ایک فلم ساز کو پھانسا، کہانی سنائی۔ ادھر کہانی ختم ہوئی ادھر فلم ساز ختم۔ دوسرے پروڈیوسر کا بھی یہی حشر ہوا۔ اس کے بعد ایک اور غافل فلم ساز ان کی کہانی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب اس خونی کہانی کے چرچے

www.taemeernews.com

انڈسٹری میں اس قدر عام ہو چکے تھے کہ تمام فلم ساز چوکنے ہو گئے۔ اپنی جان سبھی کو پیاری ہوتی ہے۔ انہی دنوں ایک نئے فلم ساز کی آمد کی خبر سُن کر کہانی نویس اپنی خونی کہانی سمیت پہنچ گئے۔ لوگوں نے بے چارے نو آموز فلم ساز کی جان کی خیر منائی۔ فلم ساز سچ مچ سخت جان ثابت ہوا۔ کہانی سننے کے بعد بھی زندہ نظر آیا۔ ایک دن بیتا۔ دوسرا دن بیتا، پھر تیسرا اسی طرح چار دن بیت گئے۔ لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ خطرہ ٹل گیا لیکن پانچویں روز اچانک فلم ساز کے انتقال کی خبر پھیلی۔ نامہ نگاروں نے کہانی نویس کو جا گھیرا۔ سب کی زبان پر یہی ایک سوال تھا۔ پچھلے تین فلم ساز تو کہانی سُنتے ہی ڈھیر ہو گئے تھے۔ لیکن یہ چوتھا فلم ساز چار دن تک کیسے اور کیوں کر زندہ رہا ــــــ!"

جواب میں کہانی نویس نے چٹکی بجاتے ہوئے یہ مسئلہ حل کر دیا، "دراصل اس فلم ساز کو میری کہانی چار روز بعد سمجھ میں آئی۔۔ بس ــــ"

کہانی نویس کے ہاتھوں فلم سازوں کا حشر آپ نے سُنا بلکہ دیکھا لیکن جب کہانی نویس فلم ساز کے ہتے چڑھ جاتا ہے تو اس کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ کہتے ہیں کہ ایک مشہور فلم ساز کے ہاں ایک نو آموز کہانی نویس کہانی سنانے پہنچا۔ کہانی جس وقت شروع ہوئی فلم ساز کے چھوٹے بچے بھی وہیں پاس بیٹھے کھیل میں مشغول تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کہانی نویس کو محسوس ہوا کہ فلم ساز کا دھیان کہانی کے بجائے اپنے بچوں کی طرف ہے، وہ اپنے بچوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ کہانی کے ساتھ ایسا سوتیلا سلوک کہانی نویس کو کھل گیا۔ اس نے کہانی روک دی اور جھنجھلا کر بولا "میں کہانی سُنا رہا ہوں اور آپ کا دھیان بچوں کی طرف لگا ہوا ہے۔ آخر اس بے توجہی کی وجہ ــــ؟"

فلم ساز نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا "میں دراصل اپنے بچوں کے مستقبل کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔"

یہ جواب سُن کر کہانی نویس اور بھی جھنجھلا گیا اور بولا "مگر میری کہانی سے آپ کے بچوں کے مستقبل کا کیا تعلق؟"

جواب میں فلم ساز نے اسی طرح سرد لہجے میں کہا "بڑا گہرا تعلق ہے اگر میں نے آپ کی کہانی پر فلم بنا ڈالی تو پھر ان بچوں کا جو حشر ہوگا وہ مجھے ابھی سے صاف نظر آ رہا ہے۔"

فلمی کہانیاں عموماً فلم ساز اداروں کی معاشی حیثیت اور ان کی سابقہ فلموں کے معیار اور مزاج کو مدنظر رکھ کر تیار کی جاتی ہیں۔ اس لئے کہانی کی خرید و فروخت کے معاملے میں صحیح پارٹی کے در پر صدا لگانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ بڑا لطیفہ ہوا۔ میرے ایک شناسا کو فلمی کہانیاں گڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ آئے دن اپنی طویل طویل کہانیاں سُنا کر مجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں کہ کون سی پارٹی یہ کہانی سنتے ہی خرید لے گی ــــ؟ ایک روز جب موصوف نے اپنی فلمی کہانی سنائی جس میں مزدوروں کے مسائل، ہڑتالوں اور سرمایہ داروں کی سیاسی چالوں کی بھرمار تھی۔ چنانچہ موصوف نے کہانی ختم کر کے جیسے ہی مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ اس کہانی کو کونسی پارٹی کو سنانا مناسب ہوگا۔ تو میں نے برجستگی سے کہا "یہ کہانی آپ کمیونسٹ پارٹی کو سنائیے۔"

www.taemeernews.com

کہتے ہیں ہر فن کار کو تخلیق کے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ چاہے فن کار مقدر کا سکندر ہو یا مقدر کا چھندر۔ تخلیق کا کرب اس کا مقدر ہوتا ہے۔ اس کلیے کی روشنی میں یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ کہانی کو جنم دینا کسی جیتے جاگتے ہمکتے ہوئے وجود کو جنم دینے سے کم نہیں ہوتی۔ البتہ فلمی کہانی کا جنم عموماً غیر فلمی ہوتا ہے۔ یعنی فلمی کہانی فطری طریقہ سے خود بخود پیدا نہیں ہوتی۔ "بلکہ سیزیرین" کے ذریعہ اسے بطن فنکار سے باہر لایا جاتا ہے۔" بعض اوقات تو فلم ساز اور اس کی حاشیہ بردار چنڈال چوکڑی اس قدر دھما چوکڑی مچاتی ہے کہ جو کہانی جنم لیتی ہے وہ اس نومولود کی طرح نحیف اور کمزور ہوتی ہے جو ساتویں ہی مہینے میں تولد ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے آپ میں سے بہتوں نے کہانی کار کو نہ دیکھا ہو۔ لیکن انڈوں پر بیٹھی ہوئی مرغی ضرور دیکھی ہوگی۔ بے چارے کہانی کار کی کچھ ایسی پوزیشن ہوتی ہے۔ اور جس طرح مرغی یہ نہیں دیکھتی کہ جن انڈوں پر اُسے بٹھایا گیا ہے وہ اس کے اپنے ہی ہیں یا کسی اور کے اسی طرح کہانی کار کو بھی اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ کہانی کس کی ہے۔ اس کا کام تو بس کہانی پہ بیٹھنا ہوتا ہے۔ البتہ مرغی اس معاملے میں خوش قسمت ہوتی ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد انڈوں میں سے "چوں چوں" کرتے چوزے نکل آتے ہیں۔ جب کہ اکثر کہانی کار اپنی "چول چول" ڈھیلی کروانے کے بعد بھی کہانی کے انڈوں میں سے چوزہ تو دور مُردہ چوہا بھی نہیں نکال پاتے۔ بس کڑک مرغی کی طرح کڑکڑاتے رہ جاتے ہیں! □□

مجرم

ایک لڑکی نے اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھے آدمی کی طرف اشارہ کر کے سہیلی کو بتایا۔

"یہ شخص میرا مجرم ہے۔"

"وہ کیسے؟" سہیلی نے تعجب سے پوچھا:

"اس نے مجھے دو لاکھ روپے سے محروم کر دیا ہے۔"

"مگر کیوں؟ کس طرح؟" سہیلی نے مزید تعجب سے دریافت کیا۔ "اس لیے کہ اس نے اپنے لڑکے کو میرے ساتھ شادی نہیں کرنے دی۔"

www.taemeernews.com

رشید قریشی

جو میں کہوں تو مری داستاں دراز نہیں

میں ۲۷ جون ۱۹۲۰ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوا۔ یہ سرکاری تاریخ پیدائش ہے اور اسی کو تسلیم کر لینے میں خیر ہے۔ کیونکہ صحیح تاریخ کا افشا مفاد عامہ کے منافی ہوگا۔ باضابطہ تعلیم کے لئے باسمہ تعالیٰ میں داخل کیا گیا۔ ابھی انٹرمیڈیٹ ہی میں تھا کہ ڈاکٹر زور نے کسی نہ کسی طرح میری ادبی صلاحیتوں کا اندازہ لگا لیا۔ بہرحال ان کی شاگرد نوازی کی خوردبینی تھی یا محض تحقیق و تشویش کے باوجود آج تک بھی مجھے پتہ نہ چل سکا کہ مجھ میں مخفی پروفیسری کا کون سا جوہر ہے؟ اور کہاں پوشیدہ ہے ——— والد صاحب چاہتے تھے کہ میں تحصیلدار بنوں اور اسی خدمت کیلئے مجھے گھوڑے کی سواری سکھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ اس بنا پر کہ امیدوار کو یہی ایک سواری سیکھنا ہوتا ہے۔ باقی سواریاں تو تحصیلداری خود سکھا دیتی ہے۔ اس غرض کے لئے جو گھوڑا دستیاب ہوا تھا اُسے سوار کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ دوڑتے دوڑتے ایکدم رک جاتا اور سوار بیچارہ سوار رہنا مشکل ہو جاتا۔ تین دنوں کی مشق میں میں نے جو سواری سیکھی، وہ گھوڑے کی ایال کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس کی گردن پر سوار ہو جانے تک محدود رہی۔ گھوڑے کی گلوخلاصی کیلئے ڈاکٹر زور نے یہ منصوبہ بنایا کہ میں تحصیلدار بننے کے بجائے مصنف بن جاؤں۔ انہوں نے مجھ سے افسانے لکھوائے، ان کے مجموعے کو "من کی دنیا" کا نام دیا اور "ادارہ ادبیات اردو" سے شائع بھی کروا دیا اور اس طرح ایم اے (اردو) کی تکمیل کے بعد میں دوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ لیکن ریڈیو کا دروازہ کھلا اور میں وہاں ملازم ہو گیا۔ یہاں جمنے بھی نہ پایا تھا کہ محکمہ تعلیمات کی ایک کرسی نے مجھے سمیٹ لیا۔ یہ کرسی بلند ہوتی گئی اور میں نائب مستقر کی حیثیت سے، وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہوا۔ بیکاری۔ نہ بیماری کی صورت اختیار کر لی، تو جناب بھارت چندکھنہ نے جناب عابد علی خان صدر نشین مجلس عاملہ اردو اکیڈیمی کو چارہ سازی پر آمادہ کیا اور اردو اکیڈیمی میں ایڈمنسٹریٹو افسر کی جائداد پر میرا تقرر عمل میں آگیا۔ آج تک بھی ایڈمنسٹریٹو افسر زندہ ہوں۔

مزاح سے مجھے فطری لگاؤ ہے لیکن یہ لگاؤ صرف لطف محفل کے فروغ میں صرف ہوتا۔ زندہ دلان حیدرآباد کو زندہ دلی سوجھی تو انہوں نے مجھے بھی اپنی ٹولی میں شامل کر لیا۔ اس ضمن میں امام الفن (مرحوم) مجتبیٰ حسین پیش پیش رہے۔ انہوں نے مجھے ورغلایا کہ رشید بھائی آپ بے کھٹکے مزاح نگار بن جائیے اس سے آپ کو کسی قسم کا کوئی ضرر نہیں پہنچے گا۔ لوگ ویسے بھی آپ پر ہنستے ہی ہیں۔ میں مجتبیٰ حسین کی رہنمائی میں گمراہ ہو گیا اور مزاح کے میدان میں آگیا۔ یہاں مصطفیٰ کمال نے اپنی طنزناک مسکراہٹ سے میرا سواگت کیا اور میرے مزاحیہ مضامین کو "مزاح شریف"

www.taemeernews.com

کے نام سے کتابی صورت دے دی ——— مصطفیٰ کمال مجھے کبھی کبھی برلس کے رنگ ماسٹر کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ نظر نہ آنے والے برقی چابک کے زور پر مسکراتے مسکراتے، ٹہلتے ٹہلتے، مزاح نگاروں سے مختلف کرتب کرواتے ہوئے ۔ اب کبھی سنجیدہ نگاری کی لہر اٹھتی ہے۔ اور کوئی ادب پارہ سرانجام ہو جاتا ہے تو وہ بھی مزاح کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔ تاہم ایک اثر انگیز ڈرامہ "محبوب" میں نے لکھا جو اسٹیج پر پیش ہوا اور کتابی صورت میں بھی آگیا ہے۔ اس ڈرامے نے مجھے مزاح کے سمندر میں ایک جزیرہ پر کھڑا کر دیا ہے: مگر یہ زندگی میں صرف ایک بیوی کا شوہر ہوں۔ جو مزاحیہ یا طنزیہ کسی بھی قسم کی ادبی معروفیت کو تضیع اوقات سمجھتی ہے اور سات بچوں (تین لڑکوں، چار لڑکیوں) کا باپ ہوں۔ سارے بچوں کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو چکا ہوں اور ہر ایک نے اپنی اپنی دنیا بنالی ہے۔ شکر ہے ان کی دنیاؤں پر ابھی تک مزاح نگاری کے سانولے سنہرے بادلوں کا سایہ نہیں پڑا ہے اور وہ کھلے پن سے ہیں۔

اب ایک آخری آرزو یہ ہے کہ ایک مزاحیہ ناول لکھوں .... اور .... مزاح سے تائب ہو جاؤں

یا ..... جو بھی پہلے واقع ہو۔

-:-:-:-:-:-

آئینہ

مرہما یا اور کبریٰ بیگم

کیا کوئی نئی بات نظر آتی ہے ہم میں
آئینہ تمہیں دیکھ کے حیران سا کیوں ہے

آئینہ کو آئینہ دیکھنے والے میں نئی بات جو نظر آرہی ہے وہ یہ ہے کہ چہرہ کی جلد جگہ جگہ سے کٹ پھٹ کر خیموں میں بٹ گئی ہے اور سر کے بالوں کی چمکتی سیاہیاں بدرنگ بھوری پڑ گئی ہیں۔ جیسے بھونرے اڑ گئے اور ان کی جگہ بگلے بیٹھ گئے۔

عموماً بوڑھوں کو آئینہ دیکھنا ہی نہیں چاہیئے اور جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ حتی الامکان اس سے منہ چھپاتے ہی رہتے ہیں لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ خود آئینہ انھیں چوری چھپے دیکھتا اور ان پر ٹھٹے لگاتا پھرتا ہے۔ اب ذرا اسی واقعہ کو لیجئے ایک بزرگ کی نظر اتفاقاً ایک دوشیزہ کے دمکتے چہرہ پر پڑ گئی۔ پہلی نظر چونکہ جائز ہوتی ہے۔ اس لئے یہ نظر کچھ زیادہ دیر ٹھہری

www.taemeernews.com

بس غضب ہوگیا! — دوشیزہ کی آنکھوں پر لگی عینک کے رنگین شیشوں نے شور مچا دیا کہ لوگو دیکھو! یہ بڈھا بُری نظر سے گھور رہا ہے۔ اب وہ بزرگ کانپتے لرزتے یقین دلانا چاہتے ہیں کہ بوڑھی آنکھوں میں بھی نظر کی سکت ہی نہیں ہوتی اور یہ کہ وہ تو عینک کے شیشوں میں اپنی صورت کے ساتھ ساتھ جنت کی اُس حور کی جھلک دیکھ رہے تھے جو بہت جلد ان کے تصرف میں آنے والی ہے۔ لیکن ان کے بیان کو کسی نے بھی قبول نہیں کیا اور یہ فیصلہ سنا دیا گیا کہ بڑے میاں کا جسم تو بوڑھا ہوگیا، دل ابھی تک جوان ہے۔ بوڑھے جسم میں جوان دل، کہاں؟ جسم بوڑھا تو دل بھی بوڑھا۔ البتہ جوانی کی یاد میں کبھی کوئی دھڑکن چنچل مچھلی کی طرح اچھل جاتی ہے اور پھر وہی بڑھاپے کا گندہ ٹھہرا ہوا پانی۔ اب اس اتفاقی، غیر محسوس، خیالی جوانی مردی کو بھی مورد الزام ٹھہرایا جائے تو مایوس و مجبور و معذور بوڑھے از مرفو جوان ہونے کے جتن نہ کریں تو کیا کریں؟ خود میں بھی اس بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں۔

ہوا یہ کہ میں ایک دن گھریلو فضا کی گھٹن سے گھبرا کر پھاٹک کے سامنے کرسی ڈال کر بیٹھ گیا۔ بھینسوں، بکریوں اور کتوں کو دیہی اذیتوں سے محفوظ خوش و خرم دنیاداری کرتے دیکھ کر یک گونہ سکون مجھے حاصل ہو رہا تھا کہ ..... ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کو گھسیٹتی ہوئی میرے پاس پہنچ کر رُک گئی غصہ سے اپنے دیدے پھاڑتی اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا اور چلائی۔ "اب سیدھی طرح اسکول چل ورنہ ..... دیکھ ..... یہ ..... یہ بڈھا تجھے پکڑ لے گا" ..... یہ بڈھا ..... یہ ... میں بڈھا ..... میں پوری طاقت سے کھنکار اٹھا اور وہ روتا، چیختا، اڑیل بچہ ..... سہم کر یوں چُپ ہوگیا جیسے میری کھنکار نے اس کے سارے آنسو قبض کر لئے۔ میرا سر کرسی سے اُچھلا جیسے تلوار سے قلم ہوگیا! اور میں اپنے بغیر سر کے دھڑ کو گھسیٹتا ہوا گھر کے اندر چلا گیا۔ بستر پر گر کر میں نے وہ سارے آنسو تکیہ میں جذب کر دیئے جو اس نٹ کھٹ بچے نے روک لئے تھے۔ یہ مقام فضیلت مبارک ہو ..... میں بڑبڑانے لگا ..... اب تجھے رونے والے ضدی بچوں کو ڈرانے کیلئے استعمال کیا جا رہا ہے ..... مبارک ہو۔

"کس سے باتیں کر رہے ہیں جی آپ؟" بیگم نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا ..... "تمہارے کان بجنے لگے ہیں۔ یہاں کون ہے جس سے میں باتیں کروں گا؟"

بیگم سرہانے آ بیٹھیں اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شفقت آمیز لہجہ میں کہنے لگیں ..... "میں شرمندہ ہوں جی۔ ان نواسوں، نواسیوں، پوتروں، پوتریوں کو سنبھالنے میں آپ میرے ذہن سے بالکل اُتر جاتے ہیں .... اور آپ اپنے سر کے بالوں پر اُسترا پھروا لیجئے، بہت سفید ہو گئے ہیں ..... میری بچپن کی ایک سہیلی نے آپ کو دیکھا تو مجھ سے پوچھا، یہ تمہارے مرحوم سُسر ہیں نا؟ سُن رہے ہیں نا آپ .... ؟ میں سب کچھ سن رہا تھا .... لیکن میں رو رہا تھا .... اور خشک آنسو رونے والا جواب دینے کی کوشش کر رہے تھے چیخنے لگتا ہے۔ اس لئے میں دبک گیا رہا گیا .... جیسے سو گیا۔

دوسرے دن بیگم نے مجھے علی الصبح جگا دیا۔ کہنے لگیں اب آپ روز چہل قدمی کے لئے جایا کیجئے۔ میں نے سنا ہے، ریس کورس کی طرف آپ کے جیسے کئی ذلیل و خوار بوڑھے چڑیاں لگھاتے ..... چہل قدمی کے لئے آتے ہیں .... ان کی سنگت میں آپ کا وقت بھی دلچسپ گزرے گا اور صحت بھی اچھی ہو جائے گی اور ہو سکتا ہے یہ نکما بڑھاپا بھی دور ہو جائے۔ میں نے بیگم

www.taemeernews.com

کی بات مان لی کیوں کہ اس طرح ان سے چند گھنٹے تو چھٹکارا میسّر آسکتا تھا۔ ایک دن میں چہل قدمی کے لئے نکلنے ہی والا تھا کہ بیگم نے رک جانے کو کہا ..... "دیکھئے ادھر بچوں کے لئے پتلا پانی دودھ ملتا ہے ... وہاں مارکٹ کے پاس جو دودھ والا ہے وہ اچھا دودھ دیتا ہے۔ آپ یہ دودھ کا ٹین اپنے ساتھ لیتے جائیں" میں حیرت سے بیگم کو گھورنے لگا تو انھوں نے سمجھایا ..... "اس میں مشکل ہی کیا ہے؟ جاتے جاتے ٹین دودھ والے کو دیتے گئے اور آتے آتے دودھ بھرا ٹین لیتے آگئے" بچوں کے خیال سے میں اس مشورہ پر کاربند ہوگیا۔ چند دن بعد بیگم نے کہا ..... "اب آپ تھیلی بھی ساتھ لے جایا کیجئے۔ اس طرح اصل پٹھہ کا گوشت بھی آیا کرے گا"۔ اس مشورہ میں اپنے ذائقہ کا سامان تھا، اس لئے ٹین کے ساتھ تھیلی بھی میرے ہاتھ میں آگئی۔ ... اور دونوں ہاتھوں، پاؤں سے میری چہل قدمی جاری ہوگئی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ ایک ہاتھ میں ٹین اور دوسرے میں گوشت کی تھیلی لئے گھر لوٹ رہا تھا کہ میرے ایک بہی خواہ سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے میری یہ درگت دیکھی تو خبردار کیا کہ تھیلی اور ٹین کی خانگی ملازمت سے ہاتھ چھڑالو ..... ورنہ ..... دیکھو ..... ادھر ہی آٹے کی گرنی بھی ہے ..... ٹکڑیوں کی ٹال بھی ..... بات میری سمجھ میں آگئی اور میں نے بیگم سے کہہ دیا۔ اب میری چہل قدمی ختم ہوتی ہے کیونکہ جس سڑک پر یہ چہل قدمی ہو رہی ہے اس پر میرے ایک تیز قدم ہمقدم کو ہارٹ اٹیک ہوگیا اور اس واردات کی بناء پر اس سڑک کا نام ہی 'دل بند روڈ' مشہور ہوگیا ہے

بوڑھے شوہر جن کی زندگی کا بیمہ نہیں ہوتا بہت احتیاط سے برتے جاتے ہیں۔ ان کی بیماریوں کے مبہم اشارے بھی دور اندیش بیویوں کے حواس باختہ کر دیتے ہیں۔ میں چہل قدمی کو موقوف کر کے گھر بیٹھ رہا تو بیگم نے حکیم قلع قمع کو بلوالیا۔

حکیم صاحب : آپ کیا بچپن سے بوڑھے ہیں؟

میں : جی نہیں۔ بچپن میں تو میں بچہ ہی تھا۔

حکیم صاحب : تو کیا جوانی میں بوڑھے ہوئے؟

میں : جی نہیں، جوانی میں تو بیگم صاحبہ لائق ہوئیں۔

حکیم صاحب : تو گویا بڑھاپے سے آپ بوڑھے ہوئے ہیں۔

میں : جی ..... وہ تو ٹھیک ہے لیکن طب نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ بڑھاپا، بڑھاپے میں بھی کیوں رہے؟

حکیم صاحب کچھ دیر سوچتے رہے اس کے بعد پوچھ بیٹھے۔ "آپ علاج پر کتنا خرچ کر سکتے ہیں؟"

میں نے جواب دیا ـــ "مگر میرا بڑھاپا دور ہوگیا۔ میرے بال کالے ہو گئے تو میں گریجویٹی کی پوری رقم آپ کی نذر کردوں گا"۔ ..... کہنے لگے "میاں ـــ قلع قمع کے معنی ہی ہیں۔ بڑھاپا دفع .... اور رہا بالوں کا کالا ہونا تو صرف اتنا کہوں گا کہ اگر میری دوا کسی سفید مرغ کو چالیس دن کھلائی جائے تو اکتالیسویں دن ..... ایک کالا کوا آپ کے سامنے حاضر ہو کر بانگ دینے لگے گا"۔ میں اور ایک سفید مرغ ..... ہم دونوں ایک ساتھ حکیم صاحب کی گولیاں

www.taemeernews.com

کھانے لگے۔

اس اثنا میں خبر ملی کہ میری ایک عزیزہ کبریٰ بیگم جو چالیس برس پہلے کراچی چلی گئی تھیں اب بیوہ اور اکیلی واپس آگئی ہیں۔ یہ کبریٰ بیگم وہی تھیں جن سے میری شروع شروع کی جوانی نے پہلی پہلی محبت کی تھی۔ اور ہو سکتا تھا کہ ہماری شادی بھی ہو جاتی لیکن میری بدقسمتی کہ محبت بھی ہوئی تو بخیل باپ کی بیٹی سے .... اور آپ جلتے ہیں ..... پہلی محبت اندھیرا۔ دوسری محبت ٹھوکر۔ اور تیسری محبت کڑھا ـــــ میں اندھیرے میں ٹٹولتا رہ گیا۔ اور ایک پردیسی نے دو طرفہ شادی کا انتظام کر کے میری کبریٰ بیگم کا اغوا کر لیا۔ کبریٰ بیگم اب شاید میرے اغواء کے لئے آئی تھیں۔ کیونکہ رات کے ۱۰ بجے چار پیسے کے لئے بلایا گیا تھا۔ میں نے سوچا ان دعوت کو ٹال جاؤں کیونکہ حکیم صاحب کے علاج کو صرف ۳۰ دن ہوئے تھے اور تکمیل کے لئے ابھی ۱۵ دن باقی تھے لیکن پھر ایک ترکیب ذہن میں آئی کہ ۱۰ گولیوں کی ایک گولی بنالی جائے اور کبریٰ بیگم کے ساتھ چائے پی لی جائے۔ مثل مشہور ہے قسمت مرد کی کمر توڑ ڈالتا ہے لیکن عورت کی صرف چوڑیاں توڑ سکتا ہے۔ کبریٰ بیگم دلہن تو نہ رہیں لیکن بیوہ بھی نظر نہ آئیں اور ایک خاص تبدیلی جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ جن آنکھوں سے بات بے بات آنسو ڈھلک پڑتے تھے اب وہاں ایک ابر سا چھایا رہنے لگا تھا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کبریٰ بیگم نے پوچھا: "یاد ہے ..... مولسری کے پاس کا وہ چھوٹا سا ویران کمرہ ..... آپ ایک رات وہاں مجھے شیطان دکھانے لے گئے تھے ..... یاد ہے؟" میرا حلق سوکھنے لگا۔ "یاد ہے ....." کبریٰ بیگم کو پھر کچھ یاد آیا ..... "آپ مجھے کبوتر کہا کرتے تھے ..... اور میں آپ کو الو!" میں نے حسرت سے کبریٰ بیگم کی طرف دیکھا .... اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ ان کی آنکھوں کا ابر ..... جھکتا جھکتا ..... میری طرف بڑھ رہا تھا ..... عین اسی وقت گولی کا خیال آیا اور ایک جھٹکے سے میں نے اپنا منہ پھیر لیا۔ گولی کو منہ میں ڈال کر نگلنا چاہا تو ..... وہ کمبخت حلق کے ابتدائی حصہ تک گئی لیکن ادرک بچانے کون سا دباؤ کارفرما ہوا کہ اچھل کر پھر منہ میں آگئی۔ زور لگا کر میں نے گولی کو پھر حلق کی سمت ڈھکیلا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا حلق پکڑ لیا۔ کبریٰ بیگم نے تشویشناک لہجہ میں پوچھا۔ "یہ آپ کو کیا ہو رہا ہے؟" میں چپ رہا۔ لیکن کہنا چاہتا تھا "کبوتر۔ میرے منہ میں انٹرکان ٹی نینٹل گولی بال، گورنمنٹ منعقد ہو رہا ہے .... مجھے گولی نگل جانے دے ... پھر دیکھ کیا ہوتا ہے؟" اچانک پیٹ کے پاتال سے ایک سائیکلونی ٹھسکہ ابھرا۔ اس کو روکنے کی جان توڑ کوشش جو میں نے کی تو ..... غٹ سے ..... گولی حلق سے نیچے ـــــ گولی کا حلق سے نیچے جانا تھا کہ ٹھسکہ مخالف سمت اختیار کر گیا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا پیٹ پکڑ لیا ..... اور تڑپ کر اٹھا تو بیچ بردار کنگرو کی طرح زقندیں بھرتا ..... یہ جا ..... کبریٰ بیگم کا دروازہ ..... وہ جا ..... اپنا باتھ روم ..... باہر سے بیگم نے حکم سنا دیا۔ اب اس حکیم کی دوا بند کر دیجئے۔ فائدہ وائدہ کچھ بھی نہیں اُلٹا پیچش لگ گئی۔ اس کے بعد ایک شادی میں کبریٰ بیگم سے دوبارہ ملاقات ہوئی۔ میں دلہن سے آداب و قبول کیلئے زنانہ میں گیا تو کیا دیکھتا ہوں کبریٰ بیگم دلہن پر سایہ فگن کھڑی ہیں۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا "خیریت؟" اور ان کی طنز بھری مسکراہٹ نے جواب دیا ..... "میری خیریت پر مٹی ڈالو ..... تمہارا ٹھسکہ کیسا ہے بولو؟"

www.taemeernews.com

حکیم صاحب اپنی دوا کے اثرات کی تفتیش کے لئے آئے تو میں نے وہ ادنکھتا سفید مرغ ان کے حوالے کردیا۔ اور سارے علاجوں سے تائب ہوگیا۔ کیونکہ یہ حقیقت اب مجھ پر گہن سے نکلے سورج کی طرح روشن ہوگئی تھی کہ جو آدمی دوبارہ جوان بننا چاہتا ہے وہ بوڑھا بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔

-۱۰ -۲۰ -۳۰

بیماری ——○

ہوسٹل میں رہنے والے بیٹے کی بیماری کی اطلاع ملنے پر باپ مزاج پرسی کے لیے اس کے پاس گیا۔ باپ نے کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ ایک خوبصورت لڑکی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ باپ نے بیٹے کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے خیریت پوچھی تو بیٹے نے کہا۔ "پاپا! بخار نے حال ہی میں پیچھا چھوڑا ہے"

باپ نے کہا:

"ہاں بیٹا! میں نے ابھی ابھی اُسے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تھا"

www.taemeernews.com

شفیق فرحت

خاکہ بقلم خود

خاکہ تو ہم کسی نہ کسی طرح مارے باندھے لکھ دیتے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اُس کاہل فرشتے نے بیکار ٹال دی تھی جس کے سپرد ہماری ماڈلنگ کا کام خدائے مطلق نے کیا تھا۔ اس نے کتنی دلچسپی اور ایمانداری سے اپنے فرائض ادا کئے یہ تو تصویر سے ہی سمجھ میں آرہا ہے۔ اور 'عیاں راچہ بیاں'۔

مگر بقلم خود والی شرط کسی طرح پوری ہی نہیں ہو پاتی۔ اور اتنی مہنگی پڑ رہی ہے جتنے اشاڑھ کے بعد کے آلو ۔! کیوں کہ کوئی قلم اتنے عرصے ہم سے وفا نبھاتا ہی نہیں کہ جتنے عرصے میں ہم چند سطریں گھسیٹ دیں۔ ایک تو جیٹ ایج۔ اس پہ فطرت پارہ و شرارہ اور مزاج شاہانہ اور صوفیانہ۔ قلم آیا نہیں کہ اس کے حق میں دعائے مغفرت کی گھڑی آگئی۔ (واضح ہو کہ اب یہ چند سطریں Pen Corner پہ بیٹھ کے لکھی جارہی ہیں اور راہگیر ہمیں شبہ اور سپاہی میاں شک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں!)

ہم دنیا کے کسی کونے میں کسی صدی کی کسی تاریخ کو ٹپک پڑے (صحیح مقام اور تاریخِ ولادت وغیرہ وغیرہ سے ابھی سب کو باخبر کردیا تو اگلی صدی کے محققین کے لئے روزگار کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا!) گھر کے کام کاج۔ اماں باوا کی ڈانٹ پھٹکار اور بڑے بھائیوں اور ایک عدد بڑی بہن کی مار سے بچنے کی خاطر اسکول کالج چلے جایا کرتے تھے۔ سو ایک دن بی۔ اے کی ڈگری تھما کے اُنہوں نے ہمیں پناہ دینے سے انکار کردیا کہ اس سارے عرصے میں ہمارے ہنگاموں سے وہ سب پناہ مانگتے اور امان ڈھونڈتے پھرتے رہے تھے۔ لہٰذا بقیہ ڈگریاں یعنی ایم۔ اے اردو ایم۔ اے فارسی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی اور ڈپلوما ان جرنلزم ہم نے انتقاماً چھین لیں۔ مزید انتقام کی خاطر کالج میں نوکری کرلی تاکہ جو جو مظالم دورِ طالب علمی میں ہم پر ڈھائے گئے تھے ان کا ہم اپنی شاگردوں سے پورا پورا انتقام لے سکیں۔ معلوم ہوتا ہے انتقام کی کچھ قسطیں ابھی باقی ہیں۔ (کچھ کمپاؤنڈ انٹرسٹ کا گھپلا ہے) اسی لئے ہر ممکن کوشش کے باوجود ابھی تک نوکری سے نکالے نہیں گئے!

دیگر تمام امور کی طرح لکھنے میں بھی ہمارے ارادے یا کسی باقاعدہ پلان کا دخل نہیں۔ لہٰذا راقم کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے۔

ابھی تک صرف ایک دو بچی اپنی ہی طرح نحیف و نزار کتاب کے حقوق اپنے نام محفوظ کروانے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ باقی مضامین ذروں کی طرح اِدھر اُدھر بکھرے ہیں۔ اور غیر مطبوعہ کے متعلق وثوق سے

www.taemeernews.com

کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ لہٰذا ریسرچ سکالرس کو جماعت ہمارے مرنے کی دعا مانگنی چاہیئے۔

تعزیت ہماری

یہ تو خیر آپ کے علاوہ ہم نے بھی سن رکھا تھا کہ جیتے جی بعض دور اندیش حضرات کچھ اس قسم کا وصیت نامہ تیار کر دیا رکھتے ہیں کہ:۔

بعد مرنے کے قبر پہ میری بونا آملو

اور بعض عاقبت اندیش آبِ زمزم میں بھگویا ہوا کفن۔ اور چند ایک اپنی قبر کی جائے وقوع کے علاوہ اس کا ڈیزائن بھی کسی اچھے آرکیٹک سے بنوا لیتے ہیں۔ اور ایک آدھ کے متعلق یہ بھی سنا گیا ہے کہ اپنی تقریب چہلم کی دیگیں خود اپنی نگرانی میں پکوائیں۔ اور بصد اصرار احباب و اغیار کو کھلائیں

مگر ایسی کسی سماجی اور سیاسی افواہ سے نہ کبھی ہم نے عبرت پکڑی نہ ہمیں اپنی یا پرائی موت یاد آئی۔

کہ وصیت خالص اقتصادیات اور ٹیکسیات کا مسئلہ ہے۔ اور ملکِ عزیز میں ان دونوں کا جو حالِ نار ہے اسے تو اللہ بھی نہیں دیکھ پا رہا۔ مزید الجھاوے سے فائدہ۔ خواہ مخواہ ایک SUMMIT برائے وصیت نامہ بلانی پڑے گی۔

رہی کفن کی فراہمی کی بات۔ تو اس میں کپڑے کی بڑھتی ہوئی گرانی اور آبِ رود گنگا و موسیٰ کی نایابی سے لے کر پریم چند شاکی تک کے آثار پائے جاتے ہیں۔

تو: سے بھی ہم نے سماجیات و ادبیات و آبیات کے محقق و نقاد کی نذر کیا۔

ر ان کا بھی بھلا اور اپنا بھی بھلا۔

مگر جب ہماری ایک دوست نے ہمیں سے ہماری تعزیت بہ صیغۂ واحد حاضر کچھ اس انداز اور اس خلوص اور شدت سے کی تو ہمیں رن دھاڑے بغیر بیک کے وہ سارے تارے نظر آ گئے جنھیں گننے کی فرصت کبھی رات میں بھی نہ ملی۔ اور ہمارے اندر اس ہارٹ اٹیک کے سارے آثار پیدا ہو چلے کہ جس سے ہمارے وہ پڑوسی انتقال فرما گئے تھے جن کی اصل تعزیت کرنے کے لئے وہ تشریف لائی تھیں۔

ہماری ان کرم فرما کو اپنی عقل اور اپنے خلوص پہ اتنا ہی ناز ہے جتنی کہ وہ ان ہر دو صفات سے بے نیاز ہیں؛ جانے والے الیکشن میں ٹکٹ کے حصول کے لیے انھیں پوری کوشش کرنی چاہیئے؛ جانا تھا آپ کو بیگم مرحوم بیگ سے تعزیت کرنے اور ہمدردی جتانے مگر چونکہ ہمارے پتے سے خلق کو اکثر اوروں کے گھر مل جایا کرتے ہیں لہٰذا کچھ تو

www.taemeernews.com

ہمیں ٹھور ٹھانے کے لیے Care oil کی طرح استعمال کرنے کی خاطر کچھ اپنے پھیلے ہوئے جسم کی پھولی ہوئی سانسوں کو قابو میں کرنے کی کوشش میں اور کچھ آہ و فغاں کے نتیجے میں خشک ہونے والے حلق کو چائے پانی سے تر کرنے کی احتیاطی تدابیر کی تمنا میں وہ آگئیں ہمارے دروازے پر جو ROUND THE CLOCK SERVICE STATION کی طرح ہر وقت کھلا رہتا ہے۔ اور ہر بلا کے لئے حاضر۔

سہ پہر بلکہ چار پہر کا وقت۔ بعد از طعام مسلسل آدک جاوک سے بچتے بچاتے قیام کے جو چند لمحات نصیب ہوئے تھے انھیں غنیمت جان کر ہم مختلف اخباروں کے مختلف اتواروں کے سنڈے ایڈیشن کے مطالعے میں غرق فنا کے در پے تک پہنچے ہوئے تھے کہ آپ پہ شور دھماکے کے ساتھ داخل ہوئیں اور پُرزور نشانے کے ساتھ آرام کرسی پر یوں بٹ ہوگئیں کہ ہم کرسی کی عافیت اور ان کی واپسی دونوں کی طرف سے مایوس ہو گئے۔۔۔!

ابھی ہم اپنے خطبۂ استقبالیہ کے جملۂ افتتاحیہ کا افتتاح بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کی آواز کا گولا چھٹا۔

"لے ہے۔ بڑا سناٹا ہے"!

جی میں آیا کہہ دیں۔ "سناٹا کبھی تھا ۔۔ اب کہاں ۔۔

حیف اس چار گھڑی سناٹے کی قسمت

پچھلے تجربات کی روشنی میں ہم آنے والے وقت سے دودھ کے جلے کی طرح ڈرے ہوئے تھے۔ بیکسی سے جواب دیا۔

"ہاں اس وقت گھر میں کوئی ہے جو نہیں"!

بس اتنا سننا تھا کہ انہوں نے شہر کے اس ڈرامہ ورک شاپ (کہ جس کے پاس نادم تحریر و تقریر نہ ڈرامے ہیں نہ ورک نہ شاپ ۔۔!) کے آنریری آرٹسٹ اِن ویٹنگ کی طرح ریہرسل شروع کر دی۔

تعزیت کا موڈ طاری کرنے کی خاطر پہلے ایک آہِ سرد اس شدت سے بھری کہ ہمیں اپنے بگڑے ہوئے چھت کے پنکھے کے ٹھیک ہو جانے کا دھوکہ ہوا ۔۔!

پھر وہ رقت پیدا کی کہ کئی دنوں سے سوکھے نلوں میں پانی کی اُمید بندھ گئی۔

بعد اس زبانِ بے زبانی کے فرمایا "ہاں، اب گھر میں بچا ہی کون ہے۔ اماں ختم ہوگئیں۔ ببّو مر گیا۔ ابّا مر گئے۔ ابرار چٹ پٹ ہو گئے۔ وہ ایک ایک کر کے پچھلے پندرہ برسوں کی casualties یوں گنواتی گئیں اور یوں کشتوں کے پشتے لگاتی گئیں۔ جیسے یہ سب کی سب آج کی صبح سے آج کی شام تک کی وارداتیں ہوں۔

اللہ اللہ۔ ان کی آواز کا وہ سوز۔ لہجے کا وہ درد۔ آنکھوں کا آبشار۔ بھنوؤں کا چڑھاؤ۔

میں نے ان کی اس تاریخی اور واقعاتی غلطی کی اصلاح کی کوشش ناکام میں ایک کمزور سی آواز نکالنی چاہی (کہ ان مدوں کی یاد سے تمزدہ ہونے کا کچھ حق مجھے بھی تھا!) مگر انہوں نے ایسا کوئی موقع فراہم نہ ہونے دیا۔ کہ رنگِ دنیا دستورِ زمانہ کی طرح وہ بھی سوال اپنا جواب اپنا بیان اپنا پر عمل کرتی تھیں۔ لہٰذا لوے منٹ کے ٹیپ کی طرح وہ

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

اب مجھے ان کی جہالت سے زیادہ اپنی غیر ذمہ داری کا احساس ہوا۔

"خیر کتنے بھی ہوں۔ چھانٹ چھونٹ کے ایک مجموعہ تو نکل ہی سکتا ہے۔ دیکھو مجھ سے زیادہ تمہارا ہمدرد شاید ہی کوئی ہو۔ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے۔ سامنے چھپے گا تو جیسا چاہو گی چھپوا لوگی اور جیسے چاہو گی تبصرے لکھوا لوگی۔ منہ دیکھے کی مروت بہت ہوتی ہے۔ بعد میں سب ختم۔!

پھر اب تک کی سب سے طویل سانس جو کسی طرح بھی چار سو میٹر سے کم نہ ہوگی لے کر اور ایک ایک آنکھ سے آدھا آدھا آنسو ٹپکا بولیں "وہ سکینہ چہارم کا حشر نہیں دیکھا تم نے۔ پہلی برسی پر ایک ڈھنگ کا جلسہ تک ہوا۔

اب ان کی تعزیت مجھے واقعی ہارٹ فیلیر کی حدوں تک پہنچا چکی تھی۔ سکینہ چہارم تو چار کتابوں کی مصنف تھی۔ اس کا یہ عبرتناک انجام۔ اور یہاں ایک کے بھی لالے پڑے ہیں۔ کہ لکھے۔ چھپنے اور کھونے ہر تین میں ہر وقت زبردست سے رفی مقابلہ ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا یقین کے ساتھ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ کہ بعد مرنے کے گھر سے کیا نکلے گا اور کہاں کہاں سے نکلے گا اور اتفاقاتِ زمانہ کی کیسی کیسی تصویر و تفسیر بن کے نکلے گا۔ گمنامی کی موت کے خیال سے میری وحشت عروج پر پہنچ چکی تھی۔ لہٰذا میں سب کچھ بھول بھال اپنے تعزیتی جلسے کا شاندار پلان بنانے لگی۔ جس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل وہ بتاتی جاتی تھیں۔

"دیکھو دو چار اچھے مضامین لکھوا رکھو۔"

"مگر لکھے گا کون۔"

"ارے اس میں کیا مشکل ہے۔ کسی ریسرچ اسکالر سے اپنے اوپر کام کروا لو۔"

"ہیں۔ خود اپنے اوپر۔"

"اے تو چلو کوئی اپنے ہی جیسا ادیب ڈھونڈھ لو۔ اس پہ تم تھیسس لکھوا دو۔ وہ تم پہ لکھوا دے گا۔ ایک فل سائز خوبصورت تصویر بھی کھنچوا رکھو۔ اور خاصی بڑی رقم اس جلسے کے لئے وقف کر جانا۔ باقی انتظامات میں سنبھال لونگا۔"

اب مجھے ان کی تعزیت سے بڑی تقویت اور مسرت حاصل ہو رہی تھی۔ سو اٹھتے اٹھتے اپنے ترکش کا آخری تیر چھوڑ کے انہوں نے اس کا میڈی کو ٹریجڈی بنا دیا۔

"سنا ہے بیگ صاحب کو کپڑوں کا بھی بہت شوق تھا۔ ایک سے ایک اعلیٰ سوٹ مرحوم چھوڑ گئے۔ سب خیر خیرات میں چلے جائیں گے۔"

ایک عمر کے بعد آدمی کو کپڑے لتوں کا شوق بھی کم کر دینا چاہیے۔

"تمہارے پاس بھی تو ڈھیروں قیمتی ساڑیاں ہیں جو اب وہ باہمت دشمن کی طرح سامنے نکل کر حملہ کرنے لگیں۔

"ہاں ہیں تو۔۔۔" مجھے اپنی رنگ برنگی ساڑیاں یاد آئیں تو اس دل پہ کہ جس پہ [illegible] بس ہوتے ہی دنیا تھا سانپ لوٹ گئے یا اللہ اتنی محبت اور محنت سے خریدی ساڑیاں کیا اب کسی شریف بی اور وظیفہ بی کے تن پہ سجیں گی۔

www.taemeernews.com

"ارے کس سوچ میں پڑ گئیں؟"

بس آج سے فیصلہ کر لیا۔ اب اور نہیں خریدوں گی۔

"خیر خیر اتنی دور اندیشی تو سب میں ہونی ہی چاہیئے۔ مگر تمہارے پاس تو پہلے ہی بہت ہیں"۔

ایک کے بجائے ان کی تعزیت سے اب دل میں آگ لگنے لگی۔

"وہ سب خدا کو حاضر و ناظر جان کر میں تمہارے نام کئے جاتی ہوں"۔

"ارے تو یہ کیوں ایسی بری بات منہ سے نکالتی ہو۔ وہ تو یونہی بات میں بات نکل آئی۔ سوچا کبھی یہ سب کہنے سننے کا موقع ملے نہ ملے۔ آدمی بلبلہ ہے پانی کا ــــ لے ہاں وہ مرزا بیگ صاحب کا گھر تو بتا دینا میں تو انھیں کی تعزیت کے لئے گھر سے نکلی تھی۔ تمہاری باتوں میں اصل بات تو بھول ہی گئی۔

پھر دروازے تک پہنچتے پہنچتے مزید ہمدردی کی خاطر اعلان نامہ جاری کیا۔

"ویسے تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے تمہارے مرنے کا غم نہ ہوگا۔ اجی ہوگا۔ اور بہت ہوگا۔ یہی یقین دلانے تو آگئی تھی۔

□□

ا

○

ایک غریب نیگرو ایک مال دار امریکی کے باغ کی زمین کھود رہا تھا۔ کام پورا ہونے پر اسے پیٹ بھر کر روٹی ملنے کی امید تھی۔ کھدائی کرتے کرتے اسے دس سینٹ کا سکہ ملا۔ اس نے اُسے اٹھا کر اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ چند منٹ پر اُسے ایک اور سکہ نظر آیا۔ اس نے اسے بھی اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ چند منٹ بعد اسے ایک اور سکہ ملا۔ پھر ایک اور۔ یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا۔ اس کے بعد اچانک یہ بھید کھل گیا کہ اس کی پتلون کی جیب میں سوراخ ہے ــــ!!

○

www.taemeernews.com

فکر تونسوی

بقلم خود

میں تونسہ میں پیدا ہوا۔ میں پیکنگ میں بھی پیدا ہو سکتا تھا۔ مگر وہاں میرا نام فکر تونسوی نہ ہوتا۔ کچھ اور ہوتا۔ مثلاً چیانگ کائی شیک ہوتا۔ لیکن چیانگ کائی شیک وہاں طنز نگار ہوتا۔ سیاست داں نہ ہوتا۔ اور کمیونزم کے ہاتھوں سلطنت نہ گنوا بیٹھتا

میرے اندر جتنی شرافت نفس اور تحمل ہے، وہ مجھے والدین سے ورثے میں ملی ہے، میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ اگرچہ کبھی کبھی اس وراثت پر شرم بھی آتی ہے، غصہ بھی۔ لیکن دنیا کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا۔ ورنہ دنیا کا کوئی اعتبار نہیں۔ جگہ جگہ یہ کہہ کر خوش ہوتی پھرتی کہ فکر تونسوی ناخلف نکلا۔ اچھے بھلے خاندان کا ناک وغیرہ.....!

ہر اردو ادیب کی طرح شاعری سے اپنا ادبی آغاز کیا۔ چونکہ بلند پایہ شاعری تھی۔ اس لئے کسی کے پلے نہیں پڑی۔ بعد میں افواہ اڑادی گئی کہ اپنی شاعری خود فکر تونسوی کی بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ روایت کا تقاضا تو یہ تھا کہ شاعری ناکام ہوتی۔ تو نقاد بن جاتا لیکن نقاد اور سخن فہم نہیں بنتے تھے۔ مال دزدیدہ کا دھندا کرتے تھے ـــــ اس لئے شاعری ترک کردی۔ تو شادی کرلی۔ یہ تو بعد میں کھلا کہ شادی بھی اور سخن فہم نہیں ہے۔ شرافت نفس کی طرح ایک روایتی ورثہ ہے۔

چنانچہ شرافت نفس کی طرح بیوی سے بھی بیلی پرکار بھگتا رہا ہوں۔ مگر اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ ہر شخص دُہری زندگی گزار رہا ہے۔ میں کیوں مستثنیٰ ہوتا۔ البتہ میری طنز نگاری میں بیوی کے کردار کی بہت بڑی دین ہے۔ اگر اپنے طنزیہ پیکر سے بیوی کا کردار نکال دوں تو میری طنزیہ تخلیقات یتیم خانے کے یسائن بورڈ بن کر رہ جائیں۔

بیوی کی آڑ لے کر چپراسی سے لے کر وزیر تک اور وزیر سے لے کر چپراسی تک سب کی کھلی اڑائی ہے۔ ایک مرتبہ ایک وزیر نے میری تحسین فرماتے ہوئے کہا۔ "آپ بیوی کی کھلی مضحکہ خیز حد تک اڑاتے رہتے ہیں۔ کیا وہ بُرا نہیں مانتی؟"

میں نے کہا۔ "کیا آپ بُرا مانتے ہیں؟"

طیش میں آکر بولے۔ "مگر میں..... میں..... میں تو وزیر ہوں؟"

عرض کیا۔ "یہی غلط فہمی ہے۔ حالانکہ آپ میری بیوی ہیں؟"

قریب ہی اُن کا چپراسی کھڑا تھا۔ چوری چھپے مسکرادیا۔ شاید وزیر اور اپنی ہم آہنگی پر۔ میرے ایک دانش ور دوست ہیں، کم از کم وہ اپنے آپ کو دانش مند گردانتے ہیں، میں گردانتا ہوں یا نہیں؟ میری پوزیشن واضح نہیں ہے کیوں کہ بیچ میں دوستی حائل ہے۔ اور یوں بھی گدھے کو گدھا کہنا تضیع اوقات ہے۔ کیوں کہ گدھا جب اپنے گدھے پن پر اعتراض نہیں کرتا۔ تو اپنے منہ سے ایسے بھونڈے لفظ نکال کر اپنی زبان دانی کی کوالٹی کیوں خراب کی جائے۔

www.taemeernews.com

ایک مرتبہ وہ دانش ور دوست فقرے بازی پر اُتر آئے۔ احباب کی محفل میں کہنے لگے۔ "کرتوتسوی عوام کے حق میں اس لئے لکھتا ہے کیوں کہ جانتا ہے کہ عوام ہمیشہ مفلس رہیں گے۔ اور وہ ہمیشہ عوام پر لکھتا رہے گا۔"

فقرہ اگرچہ منفی تھا۔ مگر چست تھا۔ اس لئے احباب نے قہقہہ لگایا۔ میرا قہقہہ سب سے بلند تھا۔ طنز نگار اگر اپنا مضحکہ اڑوا کر لطف حاصل نہیں کر سکتا۔ تو دوسرے کا مضحکہ اُڑا کر کیسے لطف تخلیق کر سکتا ہے۔ بعد میں گھر آکر لینن کی کتاب ایک بار پھر پڑھی۔ کہیں غلطی سے وہ تو منفی تحریر نہیں لکھ گیا۔ مگر وہاں منفی تحریر نہ ملی۔ تو مجھے اور بھی زیادہ لطف حاصل ہے — یہ اور بات ہے۔ کہ اُس دوست سے میری دوستی ابھی تک قائم ہے۔ کئی دوست زندگی بھر جینئس رہتے ہیں۔ اگرچہ ویل جینئس۔ مجھے سوسائٹی کا انتظامی ڈھانچہ پسند نہیں ہے اور یوں بھی کسی ادیب کو پسند آتا ہے؟ دُنیا کے ہر ادیب کی یہی ٹریجڈی ہے) لہٰذا اُس کا قلم ہمیشہ ایک خواب دیکھتا ہے۔ اس خوشحالی کے ڈھانچے کا خواب جس کی تعبیر ہیولیٰ آدم ہو۔ چنانچہ میں نے بھی طنز کا بظاہر مسکراتا مگر بباطن تیکھا قلم ہاتھ میں لیا اور ہیولیٰ آدم کا تعاقب کرتا رہا۔ مگر چالیس برس کی مسلسل نگارش کے بعد کھلا۔ کہ آدم کی رفتار تیز ہے ہیولیٰ کی رفتار سست — چنانچہ ایک دُور اندیش بھلے مانس نے سمجھایا۔ کہ اب باقی کام آئندہ نسلوں پر چھوڑ دو۔ اور میں قریب قریب اُس سے اتفاق کر گیا ہوں۔ انتظامی ڈھانچے سے تال میل توڑ کر مکھیوں اور مچھروں کی تعداد گنتا رہتا ہوں۔

کسی سے دشمنی مول نہیں لیتا۔ البتہ کئی دشمن مجھ سے دشمنی مول لے لیتے ہیں اور خطا کھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ غصہ میں آکر اپنے معصوم پوتے کو تھپڑ جما دیا۔ اور تھپڑ مارنے کے بعد خود رونے لگا۔ پوتا نہیں رویا کیوں کہ وہ آئندہ نسل کا نمائندہ تھا۔ جسے انتظامی ڈھانچہ بدلنا تھا۔ مگر وہ نہیں رویا۔ کیوں کہ شاید اُسے یہی ڈھانچہ پسند تھا۔ پوتے نے پوچھا "دادا جان! آپ رو رہے کیوں؟"

میں نے کہا۔ "اس لئے کہ تم ایسی حرکتیں کر رہے تھے۔ جس سے تم سوشلزم نہیں لا سکتے"

وہ میرا جیسے مضحکہ اڑاتے ہوئے بولا۔ "میں کیوں سوشلزم لاؤں گا۔ میں آپ کی طرح بے وقوف تھوڑے ہوں۔ لوکر شاہی، تاجروں اور سیاست دانوں سے سانٹھ گانٹھ کر دولت اکٹھی کروں گا اور ہم تینوں مل کر کورس گائیں گے ع

ہم ایک ہیں، ہم ایک ہیں، ہم ایک، ایک، ایک ہیں"

(سلسلہ صفحہ ۲۸۸ پر)

ڈاکٹر نے ایک فلم ایکٹریس کو مشورہ دیتے ہوئے کہا۔ "مسلسل شوٹنگ سے آپ کی صحت خراب ہو رہی ہے لہٰذا آپ کی روٹین میں تبدیلی کی ضرورت ہے"

"تبدیلی!" ایکٹریس نے حیرت سے پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحب میں تو گذشتہ دو سال میں چار کاریں، زیورات کے تین سیٹ پانچ بار یورپ اور اتنے ہی شوہر تبدیل کر چکی ہوں"

---

www.taemeernews.com

نکرتہ نوی

بیویوں کی ٹریڈ یونین

چند دن ہوئے میں رات کو جب گھر لوٹا اور مردانہ روایت کے مطابق دیر سے لوٹا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری اکلوتی اور پہلی اور آخری بیگم نے اپنے گورے گورے کندھے پر ایک سیاہ پٹہ لگا رکھا ہے۔

میں نے عرض کیا "یہ کیا ہے حضور"؟

وہ بولی۔ "جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

میرا ماتھا ٹھنکا کہ آج دال میں کچھ کالا ہے۔ چاند سا چہرہ جو کل تک رشکِ بتاں تھا، آج کسی انجمن ندامِ دلبراں کا پوسٹر معلوم دے رہا تھا جس پر لکھا تھا ؎

اُٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمراء کے در و دیوار ہلا دو

میں نے کچھ مسکرا کر (اور کچھ ڈرکر) کہا ؎ انقلاب زندہ باد! کھانا لے آؤ۔

وہ اپنی سڈول باہنوں کو کسی جھنڈے کی طرح لہرا کر بولی: "آج کھانا نہیں بنے گا، آج چولھا ڈاؤن اسٹرائیک ہے"۔

شبہ یقین میں بدلنے لگا کہ معاملہ گمبھیر ہے اور اب بیگم کے ساتھ رومانٹک گفتگو کرنا فضول ہے۔ یہ کس ستم گر نے گھر پر انقلابی جھنڈا گاڑا ہے کہ آج محترمہ کی آنکھوں میں کاجل کی تحریر کی بجائے مطالبات کا چارٹر دکھائی دیتا ہے۔ بھائے کی سنجیدگی کو دیکھ کر میں نے بھی اپنا لب و لہجہ بدل لیا اور مالکانہ وقار کے ساتھ کہا: "بیگم! تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ تم میری بیوی ہو"!

تڑاق سے جواب آیا: "مگر میں ایک ورکر بھی ہوں اور آپ میرے مالک ہیں اور میری محنت کا استحصال کرتے ہیں"۔

"مگر ڈارلنگ" میں نے پھر اپنا لہجہ بدل لیا: "مالک تو تم ہو، میرے دل و جان کی مالک، اس گھر کی مالک، اس سلطنت کی تم نواب واجد علی شاہ ہو۔ بتاؤ ہو کہ نہیں؟"

ایک دن پہلے تک میرا ہی فقرہ طلسمِ ہوش رُبا کا کام کر جاتا تھا اور بیگم تڑپ کر میرے بازوؤں میں آگرتی تھی لیکن آج آغوش میں آنے کی بجائے اس نے اپنی نرم و نازک مٹھی دکھائی اور میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی: "سیٹھ جی! لچھے دار لفظوں کے یہ چھلاوے اب نہیں چلیں گے۔ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستی ہوئی بیویاں اب بیدار ہو چکی ہیں اور اب تو اپنے حقوق منوا کر دم لیں گی اور ....

"ہوس سے ٹکرائے گا چور چور ہو جائے گا"

www.taemeernews.com

میں نے کہا۔ کیا آج ہمارے گھر میں کوئی ترقی پسند شاعر آیا تھا؟"

وہ بولی۔" نہیں شاعر میرے اندر سویا ہوا تھا آج جاگ اٹھا ہے۔ لہٰذا میرے مطالبات مانئے نہیں تو۔۔۔"

" کون سے مطالبات؟"

سب سے پہلے بیگم نے حلق میں تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں گھنگھروؤں کی مانوس جھنکار نہیں تھی بلکہ طبل جنگ کی سی گھن گرج تھی۔ سب سے پہلے میرا مطالبہ یہ ہے کہ میرے کام کے اوقات گھٹائے جائیں۔ صبح پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک اٹھارہ گھنٹے روزانہ کام کرتی ہوں، انہیں کم کرکے نو گھنٹے کئے جائیں۔ ہر مہذب سماج میں یہی دستور ہے۔"

" مگر ڈارلنگ یہ تو ہندوستانی سماج ہے۔"

وہ بھڑک اٹھی۔" اور بائی دی وے، جب تک مطالبات کی گفتگو جاری رہے آپ مجھے ڈارلنگ کے لقب سے مخاطب نہ کریں۔۔۔ ہاں، تو ہندوستانی سماج کو مہذب بنانے کے لئے نو گھنٹے کے اوقات آپ کو منظور ہیں؟"

میں نے کہا۔" دیکھو (ڈارلنگ نہیں) درکر بیگم! گھر میں اگر صرف نو گھنٹے کام ہوا تو اس سے پروڈکشن پر برا اثر پڑے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کام کی دو شفٹیں کرنا پڑیں گی۔ دو شفٹیں اور دو بیویاں۔ کیا تم چاہتی ہو کہ میں اس گھر میں دو بیویاں لے آؤں؟"

سوکن کا چلایا عورت کی نازک رگ ہے۔ میں نے اس رگ پر جان بوجھ کر انگلی رکھ دی کہ ٹریڈ یونین کے اندر انتشار پیدا ہو جائے مگر بیگم کے اندر جیسے وہ قدیم حاسد عورت مر چکی تھی۔ وہ بولی۔" یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے۔ آپ چاہیں تو کوئی ملازمہ رکھ سکتے ہیں۔"

بیگم سوکن والے پہلو سے صاف بچ کر نکل گئی۔ اس کی یہ چترائی میرے لئے پریشان کن تھی۔ چنانچہ میں نے ایک اور ہتھیار نکالا۔ "مگر اسے تنخواہ کہاں سے دیں گے؟ جتنی تنخواہ ملتی ہے تمہارے گورے گورے ہاتھوں پر لاکر رکھ دیتا ہوں۔ تم چاہو تو اس تنخواہ میں سے ملازمہ رکھ سکتی ہو۔ اس تنخواہ میں ملازمہ نہیں رکھی جا سکتی۔"

" تو پھر کیا کیا جائے؟"

" میں نے کہا نا؟ یہ مالک کی اپنی پرابلم ہے اُسے خود سوچنا چاہیئے۔"

" آل رائٹ۔" میں نے تنگ آکر کہا۔" میں اس پر ہمدردانہ غور کرے گا۔ اب اگلا مطالبہ پیش کیا جائے۔"

" دوسرا مطالبہ چھٹیوں کا ہے۔"

" مستقل چھٹی کا؟ اس کی تو میں کئی بار پیش کش کر چکا ہوں۔ مگر ہر بار تم نے اسے حقارت سے ٹھکرا دیا۔"

" دیکھئے آپ اسے مذاق میں مت ٹالئے (حالانکہ اللہ قسم! یہ مذاق بالکل نہیں تھا) ہندوستان بھر کے سارے کامگار کو اتوار کی ہفتہ وار چھٹی ملتی ہے مگر مجھے اتوار کو سب سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر اتوار کو آپ کے احباب آدھمکتے ہیں۔ کوئی لنچ کھانے اور کوئی ڈنر اور کوئی یوں ہی گھومتے گھماتے چائے پینے آ ٹپکتا ہے۔ دیوالی، دسہرہ، عید، بقر عید، کوئی چھٹی بھی

www.taemeernews.com

تو نہیں ملتی ہے۔ نہ میڈیکل چھٹی نہ ایمرجنسی چھٹی۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟" یہ کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگی۔

میں بھی رونا چاہتا تھا لیکن مینجمنٹ میں رونے کا رواج نہیں تھا۔

مطالبہ (خدا جھوٹ نہ بلوائے) بالکل جائز تھا۔ لیکن مینجمنٹ کا رویہ بھی اس کے متعلق بڑا واضح تھا کہ کسی بھی مطالبے کو جائز قرار نہ دیا جائے بلکہ اگر مطالبہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو اُسے اُس کی بجائے احسان کا درجہ دے دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا۔ "دیکھو بیگم! عورت ذات کی تاریخ گواہ ہے کہ اُسے موت سے پہلے کوئی چھٹی نہیں ملتی۔"

"لیکن میں تاریخ کا دھارا موڑنا چاہتی ہوں۔"

"میری پیاری ہٹلر! اگر تم عقل کا تھوڑا سا بھی استعمال کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ سماج کا سارا ڈھانچہ عورت کے کندھے پر کھڑا ہے۔ جس دن بھی عورت نے چھٹی کی، سماج میں ایک تعطل آجائے گا۔ بھائیں بھائیں کرتی ہوئی ایک ویرانی گھر پر مسلط ہوجائے گی۔ سارا کام اس روز چوپٹ ہوجائے گا، یوں لگے گا، فیکٹری پر جبری تالہ بندی کرادی گئی ہے۔ بچے روئیں گے۔ میں روؤں گا، گھر کی بلّی اور طوطا اور چوہا بھی روئیں گے۔ میں پوچھتا ہوں تمہاری چھٹی کے دوران کام کون کریگا؟"

"آپ کیجئے گا۔" جذبات سے بالکل عاری ہو رہی تھی، ظالم!

اب میں نے پینترا بدلا اور کہا۔ "اچھا چلو میں تمہاری ہفتے وار چھٹی منظور کرتا ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس چھٹی پر تم کرو گی کیا؟"

"میں بیٹھی رہوں گی، لیٹی رہوں گی، تاش کھیلوں گی، سہیلیوں کے ساتھ گھومنے جاؤں گی، فلم دیکھوں گی۔"

لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیگم صرف میری نقل کرنا چاہتی ہے، اور یجنل بالکل نہیں ہے۔ ایک بار دل میں یہ شیطانی خیال بھی آیا کہ اسے اوور ٹائم کا لالچ دے دوں، یعنی چھٹی کے دن کام کرو تو دوگنی اُجرت ملے گی، اور ٹائم کی رقم جمع کر کے ایک ساڑھی خرید لینا۔ لیکن بیوی کو اوور ٹائم کی ترازو پر تولنا کچھ اچھا نہیں لگا۔ لہٰذا میں نے مردانہ فراخ دلی کی انتہائی بلندی پر کھڑے ہو کر آواز دی "دیکھو بیگم! تمہاری چھٹی منظور کی جاتی ہے۔ مگر ایک شرط پر کہ تم اس دن بال بچوں کو ہمراہ لے کر میکے چلی جاؤ گی۔"

میکے کے 'نچ' پر بیگم کچھ بوکھلا گئی۔ میکہ ہر عورت کی کمزوری ہے میکے کے سامنے سارا ٹریڈ یونین ازم منتشر ہوجاتا ہے۔ اگرچہ بیگم کی سمجھ میں یہ بات فوراً نہیں آئی کہ اس کا مطالبہ تسلیم کرلیا گیا ہے یا مطالبہ کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا گیا ہے۔ مطالبے کے ساتھ شرط کی نچ لگا کر میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے تھے۔ میں نے سوچا کہ اس سے بیگم بھی خوش ہوجائے گی اور میں بھی۔ بیگم کی غیر حاضری میں خاوند کو جو آزادی نصیب ہوجاتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی شادی شدہ مرد لگا سکتے ہیں جو ایک مستقل یکسانیت سے نالاں رہتے ہیں۔

بیگم نے زیرِ لب تبسم سے اس فیصلے پر صاد کیا اور میں نے دل ہی دل میں خوش ہو کر کہا کہ:

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

www.taemeernews.com

بیگم کا تیسرا مطالبہ یہ تھا کہ گھر کے اخراجات کے لئے اُسے جو رقم دی جاتی ہے اس میں اضافہ کیا جائے کیونکہ اشیاء کے پُرانے نرخ قائم نہیں رہے ہر چیز پہلے کے مقابلے پر دوگنی مہنگی ہوگئی ہے مگر اخراجات کی رقم بدستور وہی ہے۔

گویا یہ مہنگائی الاؤنس کا مطالبہ تھا جو بیک وقت جائز اور ناجائز تھا۔ میں نے جھٹ کہا "بیگم! مجھے تمہارے اس مطالبے سے ہمدردی ہے، بلکہ صرف ہمدردی ہے"

وہ تڑپ اُٹھی "مگر صرف ہمدردی سے تو بنیائن بھی نہیں آسکتی"

"تو بنیائن نہ خریدو۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ روکھی سوکھی کھا کے ٹھنڈا پانی پی" تو اس کا کچھ مطلب تھا، کچھ فلاسفی تھی۔ افسوس یہ ہے بیگم! کہ تم ٹریڈ یونین ازم کے جوش میں بزرگوں کی فلاسفی بھول گئیں"

اس کے جواب میں بیگم نے جو کچھ ارشاد فرمایا وہ بہت اذیت ناک تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ روکھی سوکھی کی فلاسفی پر یقین نہیں رکھتی وہ معیارِ زندگی کو گرا کر محلے میں اپنی ناک کٹوانا نہیں چاہتی۔ اس نے آنسوؤں کا ہتھیار نکال کر مجھ پر بار بار حملے کئے اور دھمکی دی۔ گھر کے اخراجات کی ذمہ داری تم خود سنبھال لو۔ خالی خول ہمدردی اور بزرگوں کی فلاسفی کے ساتھ تم ایک ہفتہ میں ہی دیوالیہ نہ بن گئے تو بیگم کہلانا چھوڑ دوں گی۔

"تو پھر میں کیا کروں ڈارلنگ! جتنی آمدنی ہے اس سے زیادہ کہاں سے لاؤں؟"

"اپنی آمدنی بڑھاؤ" انقلابی بیوی نے نعرہ لگایا۔

"کیسے؟"

"رشوت لو، جیب کتری شروع کردو، اسمگل کیا ہوا مال بیچو، کوئی پرمٹ لائسنس لے لو۔ ساری دنیا اسی طرح ترقی کررہی ہے"

اور میرا جواب یہ تھا کہ مجھ سے یہ نہیں ہو سکے گا۔ گزشتہ ایک سو برس سے خاندانی شرافت ہمارے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے میں اُسے چند کرنسیوں، اناج کے چند دانوں، بنیانوں اور آلو گوبھی کی خاطر تباہ و برباد نہیں کرسکتا۔

مگر بیگم مُصر تھی "ہر دور میں اخلاق اور شرافت کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ اخراجات میں کمی کردینا بزدلی ہے اور بزدل انسان کو کسی معزز بیوی کا خاوند بننے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے میرا یہ مطالبہ مان لو، ورنہ جنرل اسٹرائیک کے لئے تیار ہوجاؤ"

اس نے مجھے بزدل کہا۔ میرے شوہرپن کو مشکوک قرار دیا۔ جنرل اسٹرائیک کی دھمکی دے کر گھر کے مفاد پر ضرب لگانے کا اعلان کیا۔ یہ رویّہ سیدھا طلاق کی منزل کی طرف بڑھا جارہا تھا مگر میں نے بھی تہیہ کرلیا کہ بیوی کو طلاق دوں گا، خاندانی اخلاق کو طلاق نہیں دوں گا۔

چند منٹ کی بحرانی خاموشی کے بعد بیگم بولی "تو کیا ارادے ہیں؟"

"مطالبہ رد کیا جاتا ہے" میں نے تاریخ انسانیت کا عظیم ترین اعلان کیا۔

www.taemeernews.com

"لیکن یہ میرا بنیادی مطالبہ ہے۔ اگر اسے رد کیا گیا تو میں اس بات پر غور کروں گی کہ پہلے دو مطالبے بھی واپس کروں یا نہ کراؤں"؟

"مجھے یہ چیلنج منظور ہے"

اس مرحلے پر آکر سمجھوتے کی بات چیت ٹوٹ گئی۔ مصلحت کے مطابق بیگم پلنگ پر جا لیٹی۔ خصلت کے مطابق میں یوں ہی کوئی پرانا رسالہ اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔ گھڑی کی ٹک ٹک ہمارے غم اور مسرت دونوں کو پیچھے چھوڑ کر وقت کی بے نیاز منزلیں طے کرتی رہی۔ میں نے کھانا نہیں کھایا، شاید بیگم نے بھی نہیں کھایا اور پھر یوں لگا کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے سے آہستہ آہستہ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ شاید ہم اندر ہی اندر روتے روتے سو گئے تھے۔ کھو گئے تھے۔

اور پھر جب بھوک کے گھڑیال نے دو بجائے تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ایک گرم گرم آنسو میری پیشانی پر آگرا ہے اور پھر ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز اور نرم و نازک ہاتھوں کا لمس اور چوڑیوں کی مترنم جھنکار۔

"یہ کون تھا؟"

یہ کوئی ٹریڈ یونین لیڈر نہیں تھا؟

یہ کوئی انقلابی بھی نہیں تھا۔

یہ میری اکلوتی، پہلی اور آخری بیگم تھی جو کہہ رہی تھی:

"اٹھو کھانا کھالو ——— مجھے نیند نہیں آرہی ہے!"

OO

OO

کسی صاحب نے صبح ہی صبح مقامی اخبار میں خود اپنے انتقال کر جانے کی خبر چھپی ہوئی دیکھی تو مدیر کو ٹیلی فون کر کے کہا:

"آج آپ کے اخبار میں میری موت کی جو خبر چھپی ہے ..... آگے یہ بتانا چاہتے تھے کہ وہ غلط ہے لیکن مدیر نے بیچ میں اٹک سوال کیا" تو پھر آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟"

OO

www.taemeernews.com

مجتبیٰ حسین

خودنوشت

۱۵ر جولائی ۱۹۳۶ء کو ضلع گلبرگہ (کرناٹک) میں پیدا ہوا۔ تادمِ تحریر زندہ ہوں (یہ نہ پوچھئے کہ کس طرح زندہ ہوں)۔ لوگ میرے بارے میں اتنا لکھ چکے ہیں کہ اب اپنے بارے میں کچھ لکھنے سے گریز اس لئے کرتا ہوں کہ لوگوں نے میرے بارے میں جو کچھ لکھا ہے کہیں اس کی تردید نہ ہو جائے۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کی تکمیل کی۔ اردو میں مزاح نگاری کرنے کے لئے اتنی تعلیم کافی ہوتی ہے۔ حیدرآباد کے روزنامہ "سیاست" سے اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز کیا۔ مزاح نگاری میرے لئے ایک حسنِ اتفاق ہے۔ شاہد صدیقی روزنامہ "سیاست" کا مزاحیہ کالم "شیشہ و تیشہ" لکھا کرتے تھے۔ ۱۹۶۲ء میں جب اُن کا انتقال ہوا تو مجھے حکم دیا گیا کہ میں یہ کالم لکھوں۔ اس طرح ۱۲ر اگست ۱۹۶۲ء کو دن میں ٹھیک ساڑھے دس بجے حکم کی تعمیل میں مزاح نگاری شروع کی۔

ہر شخص کی ایک شخصیت ہوتی ہے اور اسے بنانے میں کسی اور شخص کا دخل ضرور ہوتا ہے۔ میری شخصیت (جیسی بھی وہ ہے) کی تشکیل میں میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر، جائنٹ ایڈیٹر روزنامہ "سیاست" کا ہاتھ ہے۔

۱۹۶۸ء میں میرے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ "تکلف برطرف" شائع ہوا۔ اس کے بعد مزاحیہ مضامین کے کچھ اور مجموعے "قطع کلام" "قصہ مختصر" "بہرحال" اور "بالآخر" شائع ہوئے۔ شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ "آدمی نامہ" اور ایک عدد سفرنامہ "جاپان چلو۔ جاپان چلو" بعد میں شائع ہوئے۔

۱۹۷۶ء میں حیدرآباد میں مزاح نگاروں کی ایک کُل ہند کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کے بعد سے ملک میں طنز و مزاح کی محفلیں جا بجا آراستہ ہونے لگیں بلکہ دوسری زبانوں پر بھی اس کا اثر پڑا۔

حیدرآباد میں بیس برس گزارنے کے بعد ۱۹۸۲ء میں دہلی آگیا۔ اب دہلی میں رہتا ہوں۔ نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ کے اشاعتی ادارہ میں ایڈیٹر ہوں۔

اب تک جتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں اُنھیں مختلف اکیڈیمیوں سے انعامات مل چکے ہیں۔ اڑیا زبان کے ادیبوں کی انجمن "سرس ساہتیہ سبھا" نے ۱۹۸۰ء میں مجھے "ساہتیہ رتن" کے خطاب سے نوازا اور اڑیا زبان میں میرے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ شائع کیا۔ ۱۹۸۳ء میں بزم ساز و ادب نئی دہلی نے "نشانِ امتیاز" کا اعزاز عطا کیا۔ ۱۹۸۴ء میں غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی نے جب اُردو طنز و مزاح کے لئے بھی غالب ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا تو پہلا غالب ایوارڈ برائے اردو طنز و مزاح مجھے عطا کیا۔

۱۹۸۰ء میں یونیسکو کی دعوت پر جاپان گیا۔ ۱۹۸۴ء میں اُردو مجلس برطانیہ کی دعوت پر انگلستان جانے کا موقع ملا۔ وہاں سے فرانس، امریکہ اور کناڈا کی سیر کی۔ ان دنوں سفرنامہ لکھ رہا ہوں۔

www.taemeernews.com

ہندوستان کی ساری زبانوں میں میرے مضامین کے ترجمے شائع ہو چکے ہیں۔ ساری زندگی دوستوں کے لئے جیتا رہا۔ اب اپنے لئے جینے کی سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اب بہت دیر ہو گئی۔

ے دیکھو ہم نے "ایسے" بسر کی اس آباد خرابے میں

قصہ داڑھ کے درد کا

اور ایک دن اچانک ہماری داڑھ میں یوں درد شروع ہو گیا جیسے آسمان پر یکایک قوس قزح نکل آتی ہے اور قوس قزح سا نکل آنا تھا کہ ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ یوں تو ہم انواع و اقسام کے 'دردوں' سے گزر چکے تھے۔ پیٹ کا درد، سر کا درد، کمر کا درد، دل کا درد، قوم کا درد، اور اولاد کے درد سے لے کر خواجہ میر درد تک ہم بھی دردوں سے آشنا تھے، لیکن داڑھ کا درد ہمارے لئے بالکل نیا تھا، اردو شاعری میں جگہ جگہ ایسے مصرعے پڑھتے آئے تھے کہ

ع آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

یا

ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

لیکن ہمیں ان مصرعوں کی صداقت پر کبھی یقین نہیں آیا تھا۔ کیوں کہ ہم نے آج تک کسی درد کو حد سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر صاحب، داڑھ کا درد ہی ہمیں وہ واحد درد نظر آیا جو حد سے گزر جانے کی بڑی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر بدھے جبڑے کی داڑھ میں درد ہو رہا ہو تو وہ صرف داڑھ تک محدود نہیں رہے گا بلکہ یہ حد سے گزر کر آپ کے گال کو آپ کے جبڑے سے کم از کم پانچ چھ انچ دور کر دے گا اور جبڑے اور داڑھ کے درمیان ایک "غیر جانبدار علاقہ" پیدا کر دے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کا گال آپ کے جسم سے کافی فاصلہ پر واقع ہے۔ آپ سڑک پر چلنے لگیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کا گال آپ سے آگے چل رہا ہے اور آپ صرف اسے پکڑنے کے لئے بھاگے جا رہے ہوں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جو گال آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے وہ آپ کا نہیں کسی اور کا ہے۔ جبڑے اور گال کے درمیان یہ جو "ہجر کی کیفیت" پیدا ہو جاتی ہے وہ بڑی کربناک ہوتی ہے اور یہی داڑھ کے درد کا نصب العین بھی ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو داڑھ کے درد میں مزہ ہی کیا باقی رہ جائے گا۔

جب داڑھ کا درد اپنی حدوں کو پھلانگ کر سائنات کی وسعتوں میں پھیلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے تو آدمی اس درد کی وسعت کے آگے ایک ادنیٰ سا ذرہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب پہلے پہل ہمارے بدھے جبڑے والی داڑھ کا درد حد سے سوا ہو گیا اور ہم بدھی جانب زیادہ جھکاؤ محسوس کرنے لگے تو اس عدم توازن کے احساس نے ہم میں بڑی بے چینی پیدا کر دی۔ آئینہ میں صورت دیکھی تو پتہ چلا کہ آئینہ میں ہماری جگہ ایک بھوت کھڑا ہے۔ ہم گھبرا کر فوراً دانتوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھاگے

www.taemeernews.com

وہ ہمیں پہلے سے جانتے تھے لیکن داڑھ کے درد کے ساتھ انھوں نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اس بات کی شکایت کی تو بولے "بھائی صاحب! داڑھ کے درد کے بعد آدمی کی پہچان بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ مجھے تو اپنے سارے ہی مریض "ہم شکل نظر آتے ہیں۔ کس کس کو کہاں تک پہچانوں؟ یوں بھی آپ کے سامنے اگر بہت ساری ڈبل روٹیاں ایک ساتھ رکھ دی جائیں تو آپ ان ڈبل روٹیوں کو کیسے پہچانیں گے کہ یہ ڈبل روٹی زید ہے اور یہ ڈبل روٹی بکر ہے۔ داڑھ کے درد کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ آدمی کے چہرے کو دیکھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آدمی کا چہرہ ڈبل روٹی بنانے کی مشین میں سے ڈھل کر نکلا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل اور دلچسپ گفتگو کے بعد جب ہم نے اپنی آمد کی غرض و غایت بتانی چاہی تو وہ بولے: "غرض و غایت بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ آپ کا گال خود اس غرض و غایت کی غمازی کر رہا ہے۔" یہ کہہ کر انھوں نے ہمارا منہ کھولنا چاہا تو یوں لگا جیسے منہ پر تالا لگ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے انھوں نے ایک ایسا زاویہ بنایا کہ ہماری داڑھ انھیں نظر آ گئی جو ہمارے سارے وجود کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا منہ غڑاپ سے بند کرتے ہوئے کہا "اس وقت تو میں اس داڑھ کو نہیں نکال سکتا۔ چند روز اور اس داڑھ کے ساتھ نباہ کیجئے۔" ہم نے کہا "ڈاکٹر صاحب! مجھے اس داڑھ کے ساتھ نباہ کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن یہ جو میری گردن پر ٹیڑھا چہرہ اُگ آیا ہے کم از کم اسے تو ٹھیک کر دیجئے۔ یہ عدم توازن مجھ سے اور بالخصوص میری بیوی سے بالکل نہ دیکھا جائے گا۔"

وہ بولے۔ "بھیا۔ ٹیڑھے چہرے میں توازن و تناسب پیدا کرنے کا ایک ہی علاج ہے۔"

ہم نے پوچھا "وہ کیا؟"

بولے۔ "کسی طرح آپ کے بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد کو داخل کرنا ہوگا۔ پھر یہ درد بھی پھیل کر آپ کے بائیں جبڑے کی حدوں کو پھلانگتا ہوا کنپٹی کی دستوں میں پھیل جائے گا اور اس کے بعد آپ کے دونوں جبڑے "جیومڑی" کے اصولوں کے مطابق مساوی ہو جائیں گے، کہئے تو آپ کے بائیں جبڑے کی داڑھ میں درد کا انتظام فرما دوں؟"

ہم نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب، چاہے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو، میں چاہتا ہوں کہ آپ میری داڑھ کو نکال پھینکیں۔ میں یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ذلت کی موت مرنا نہیں چاہتا۔ ٹیپو سلطان نے کیا خوب کہا تھا کہ "شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب بولے "قبلہ، خبردار! آپ کی داڑھ کا درد اب فلسفہ بگھنے لگا ہے۔ یہ بڑا خطرناک اسٹیج ہے۔ اپنے آپ پر قابو پائیے ورنہ تاریخ میں ٹیپو سلطان کا تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا لیکن آپ کا رہا سہا جغرافیہ بھی برباد ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر میں ہر مریض کی داڑھ فوراً نکال دیا کروں تو میرا کاروبار کیسے چلے گا؟ ایک داڑھ پر مجھے کم از کم سو روپے تو ملنے ہی چاہئیں۔ آپ اپنی داڑھ کا پہلے سو روپے کی حد تک علاج کر لیجئے، اس کے بعد میں بلا چوں و چرا آپ کی داڑھ نکال دوں گا۔" یہ باتیں کہتے ہوئے اچانک ڈاکٹر صاحب کی مصنوعی بتیسی ان کے منہ سے باہر نکل آئی اور وہ اپنے پوپلے منہ سے بولے "اب آپ میری فیس مشورہ دیجئے اور چلتے بنئے۔"!

www.taemeernews.com

ہم نے کہا "حضور! آپ نے مشورہ ہی کون سا دیا ہے جو میں آپ کو اس کی فیس ادا کروں؟"
وہ بولے: "میں نے تو تمہیں ایک زرّین مشورہ دیا ہے کہ داڑھ کے درد کو فلسفہ سے دور رکھو ورنہ آدمی باقی نہ رہو گے فلسفی ہو جاؤ گے۔"

ہم غصّے کے مارے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے باہر نکل آئے چند قدم ہی چل پائے تھے کہ داڑھ مذکور میں اچانک بجلی سی کوند گئی۔ برق کی ایک رو تھی جو داڑھ سے نکل کر سارے بدن میں لہرا گئی۔ ایک تجلّی تھی جو آنکھوں کو چکا چوند کر گئی۔ یوں لگا جیسے ہماری داڑھ میں اچانک ایک ہرن نے کلیلیں بھرنا شروع کر دیا ہو۔ جیسے کسی نے ہماری داڑھ میں توپ داغ دی ہو یا ایک ٹرین چلتے چلتے ہماری داڑھ میں پٹڑی سے اُتر گئی ہو۔ جیسے ہماری داڑھ میں نوجی انقلاب آیا ہو۔ کیفیات کا اتنا ہجوم تھا کہ ہمارے لئے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ ہماری داڑھ میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں؟ یوں لگتا تھا جیسے ہم سراپا داڑھ بن گئے ہیں۔

ہم درد کے اس اچانک حملے سے سنبھلنے کے لئے ایک الکڑک پول کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ یوں لگا جیسے ساری کائنات ایک بہت بڑی داڑھ ہے۔ داڑھ ہی کائنات ہے۔ داڑھ کے سوا اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ ہر شئے داڑھ سے شروع ہوتی ہے اور داڑھ پر ختم ہو جاتی ہے۔ عدم سے پہلے بھی داڑھ تھی اور ہستی سے پرے بھی داڑھ ہے، ازل داڑھ اور ابد داڑھ۔ یکلخت ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سورج ہمارے منہ میں آ گیا ہو اور ہم اُسے چبا چبا کر کھا رہے ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ سورج کو چبا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں پھر سورج کے ان ٹکڑوں کو لوگوں میں بانٹ دیں کہ سبھی اپنے اپنے گھروں میں اُجالا کر لو۔ ہر شخص کا اپنا سورج الگ ہونا چاہیئے۔ ہر شخص کی صبح الگ ہونی چاہیئے۔ اتنی بڑی کائنات کو ایک سورج کے تابع کر دینا مناسب نہیں ہے۔ آؤ کہ ہم سب مل کر سورج کو تقسیم کریں اور اس کے ٹکڑوں کو اپنی اپنی جیبوں میں رکھ لیں تاکہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئیں۔

داڑھ کے درد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ درد بالاقساط ہوتا ہے یعنی درد کی ایک لہر جاتی ہے اور دوسری آتی ہے۔ جب درد کی پہلی لہر جا چکی تو ہم پر یہ عظیم انکشاف ہوا کہ درد کی ہر لہر کے ساتھ ہم میں "جدید شاعر" بننے کی زبردست صلاحیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسے پیغمبرانہ انکشافات صرف داڑھ کے درد میں ہی ممکن ہیں۔ اچانک ہم پر یہ راز کھلا کہ "جدید شاعری" اصل میں "داڑھ کے درد کی شاعری" ہے جس میں آدمی کا سارا کرب سمٹ آتا ہے اور وہ سورج کو چبا کر کھا جانے کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ ہم اب تک حیران تھے کہ ہمارے اکثر جدید شاعر ایسے تکلیف دہ اور کرب انگیز خیالات کو آخر کس طرح اتنی آسانی اور روانی سے اپنی شاعری میں پیش کر دیتے ہیں۔ اب داڑھ کے درد سے سابقہ پڑا تو احساس ہوا کہ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے جدید شاعر بننا ہو تو پہلے اپنی داڑھ میں درد پیدا کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح ــــ

؎ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

آپ یقین کریں کہ درد کی پہلی لہر کے ساتھ ہی ہم نے شاعر بن جانے کی ٹھان لی تھی اور سوچا تھا کہ دوسری لہر میں ڈوب کر ایک شاہکار نظم نکال لائیں گے لیکن درد کی پہلی لہر اور دوسری لہر کے درمیان وقفہ ہوتا ہے وہ آدمی کو پھر خیال کی رفعتوں سے پستیوں

www.taemeernews.com

میں لے آتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ جب ہمارے پاس کوئی تخلص ہی نہیں ہے تو پھر نظم کہنے سے کیا فائدہ ؟

خیر صاحب ہم اسی طرح درد کی لہروں سے گزرتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس دن گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جو بچہ ہمیں دیکھتے ہی لپٹ جایا کرتا تھا وہ ہمیں دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگ گیا۔ وہ بیوی جو ہمارے گھر میں قدم رکھتے ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہمارے سامنے رکھ دیتی تھی وہ ہمیں دیکھ کر چپ چاپ رسوئی گھر میں چلی گئی۔ ہم گھر کی اس بدلی بدلی فضا کو بھانپ نہ سکے۔ جب بڑی دیر تک کسی نے ہمارا حال نہ پوچھا تو ہم نے غصّے سے کہا۔ "آخر اس گھر میں سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ آخر معاملہ کیا ہے؟"

ہمارے اس سوال کو سُن کر بیوی نے کہا "مجھے آپ سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ دفتر میں اپنے عہدہ دار کی گالیاں سُن کر آتے ہیں اور غصّہ ہم لوگوں پر نکالتے ہیں۔ میں تو آپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی سمجھ گئی تھی کہ آج آپ کا "موڈ" اچھا نہیں ہے۔ جبھی تو آپ گال پھُلائے اور مُنھ لٹکائے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب کوئی آپ کا حال پوچھے تو کیسے ؟ آپ تو ایسی حالت میں کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج آپ کے عہدہ دار نے کچھ زیادہ ہی ڈانٹ پلائی ہے۔ ذرا دیکھئے تو آپ کا گال پھول گیا ہے۔ اتنی ڈانٹ تو آپ نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔

ہم نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔ "اری نیک بخت، تجھے ہمیشہ اُلٹی حجت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ میں داڑھ کے درد کی وجہ سے مرا جا رہا ہوں اور تجھے اس میں میرے عہدہ دار کی ڈانٹ نظر آ رہی ہے"۔

ہمارے اس انکشاف کو سُنتے ہی سارے افرادِ خاندان کی باچھیں کھِل اُٹھیں۔ بچے دوڑ کر ہم سے لپٹ گئے اور بولے اگر سچ مچ آپ کی داڑھ میں درد ہے تو ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے۔ ورنہ ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ آج بھی آپ دفتر سے ڈانٹ سُن کر آئے ہیں۔ اور اب تھوڑی ہی دیر میں ہماری پٹائی ہونے والی ہے"۔

داڑھ کے درد کے بعد آدمی خواہ مخواہ ہی مغرور نظر آنے لگتا ہے۔ سیدھے جبڑے والی داڑھ کے درد کے زمانے میں ہی ہمارے آدھے دوست صرف اس لئے ہم سے کنارہ کش ہو گئے تھے کہ ہم صورتاً انھیں مغرور نظر آنے لگے تھے۔ جگہ جگہ ہمارے غرور کے چرچے ہونے لگے تھے کہ صاحب ادھر جب سے دفتر میں اسے ترقی ملی ہے بس ہمیشہ مُنھ پھُلائے رہتا ہے۔ کسی سے سیدھے مُنھ بات نہیں کرتا بلکہ یوں کہیئے کہ ٹیلیگرام کی زبان میں بات کرتا ہے۔ سیدھے جبڑے میں اتنا غرور آ گیا ہے کہ یہ ہمیشہ دونوں اینچ پھُولا رہتا ہے"۔

اب یہ محض اتفاق تھا کہ ہماری ترقی اور داڑھ کا درد دونوں ایک ساتھ شروع ہوئے تھے ورنہ کہاں غرور اور کہاں ہم! بعد میں جب بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد شروع ہو گیا تو ہمارے بقیہ آدھے دوستوں نے بھی ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نہ داڑھیں رہیں اور نہ ہی دوست۔ اب کسے کیسے سمجھاتے پھریں کہ بھائی صاحب سارا قصور داڑھ کے درد کا ہے۔ ہم تو ازل سے معصوم آدمی ٹھہرے۔ زندگی میں ایک ہی بار ہم نے غرور کا مظاہرہ کیا تھا۔ جب ہم اپنی شادی کے موقع پر گھوڑی پر سوار ہو کر اپنی سالقہ دُلہن یعنی موجودہ بیوی کے گھر گئے تھے اور اس غرور کا جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ ہمارے پلّے

www.taemeernews.com

بچوں کی صورت میں دنیا پر ظاہر ہے۔ اس غرور کا کفر اس طرح ٹوٹا ہے کہ ہمیں خود "غرور" کے معنی معلوم کرنے کے لئے "ڈکشنری" دیکھنے کی ضرورت پیش آئی ہے۔ مگر کیا کریں کہ اس داڑھ کے درد کی وجہ سے ہم دنیا والوں میں ایک مغرور آدمی کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔

ہمارے ساتھ ایک اور ستم بھی ہوا تھا یعنی نہ صرف ہم داڑھ کے درد میں مبتلا تھے بلکہ قدرت نے ہمارے عہدہ دار کو بھی اسی نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازا تھا۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ داڑھ کا درد رکھنے والے دو اشخاص کسی بات پر متفق نہیں ہوتے کیونکہ داڑھ کے درد کے بعد آدمی "داخلیت پسندی" کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اپنی ذات کی تنہائی میں بند ہو کر اپنی بساط کے مطابق داڑھ کے درد کو قبول کرتا ہے۔ نتیجہ میں "ترسیل کا المیہ" پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ ہم کوئی تجویز لکھ کر اس کے پاس بھیج دیتے اور وہ اسے مسترد کر دیتا۔ وہ کوئی آرڈر لکھ کر ہمارے پاس بھیجتے اور ہم اس میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے۔ "ترسیل کا المیہ" اس نوبت کو پہنچ گیا تھا جہاں ہم دونوں میں دفتری آداب کے خلاف "تو تو میں میں" کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ غلط فہمی اور بھی بڑھتی مگر ایک دن جب ہم عہدہ دار کے کمرے میں اچانک چلے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنا گال پکڑے بیٹھا ہے۔ ہم نے پوچھا کیا آپ کی داڑھ میں کچھ ہو رہا ہے"؟

وہ بولا۔ "ہاں بہت درد ہے"؟

اس پر ہم نے اپنا گال پکڑتے ہوئے کہا۔ "ادھر بھی وہی حال ہے"؟

تب ہم نے اسے سمجھایا کہ اصل میں ہم دونوں کے اختلافات کی اصل وجہ ہم دونوں کی داڑھیں ہیں۔ ہم دونوں کی داڑھوں میں جب ایک ساتھ درد ہوتا ہے تو اس کا لازمی انجام اختلافِ رائے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ آسان بات ہمارے عہدیدار کی سمجھ میں آگئی۔ یوں بھی اس وقت تک اس کی عقل داڑھ گرنے کی منزل میں پہنچ گئی تھی۔

بعد میں ہم دونوں نے متفقہ طور پر ایک معاہدہ کیا۔ جب ہم کسی فائل میں کوئی تجویز پیش کرتے تو اس تجویز کے نیچے دستخط کرنے کے بعد چھوٹے حروف میں "داڑھ کا درد" بھی لکھ دیتے۔ وہ فائل دیکھ کر سمجھ جاتا کہ یہ تجویز داڑھ کے درد کے دوران میں لکھی گئی ہے۔ اگر وہ اس تجویز کو مسترد کرتا تو وہ بھی دستخط کرنے کے بعد نیچے چھوٹے حروف میں "داڑھ کا درد" لکھ دیتا۔ کچھ دن بعد اس نے یہ طریقہ بھی بنا لیا تھا کہ جب بھی کوئی فائل اس کے سامنے پیش ہوتی تو وہ اس پر لکھ دیتا "داڑھ کے درد کے بعد پیش کی جائے"۔ اس طرح دفتر میں دو اقسام کی فائلیں بن گئی تھیں یعنی داڑھ کے درد سے پہلے کی فائلیں اور داڑھ کے درد کے بعد کی فائلیں۔

فائلوں کی بات تو چھوڑیئے، ہم نے اپنی پوری زندگی کو اسی طرح دو حصّوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک زندگی وہ جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی اور دوسری زندگی وہ جو داڑھ کے درد کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اب تو ہماری ساری داڑھیں اکھڑ چکی ہیں گویا ہم بھی اب دانتوں کے ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہیئے کہ اب تو ہماری مصنوعی بتیسی کے دانتوں کے اکھڑنے کی بھی باری آگئی ہے۔ مصنوعی بتیسی کے دانت نہ ٹوٹیں گے تو اور کیا ہوگا کیوں کہ جب ہم اپنی مصنوعی بتیسی نکال کر سو جاتے ہیں

www.taemeernews.com

تو بچے اس بتیسی کو کھلونے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گھنٹوں یہ اپنے ڈیڈی کے دانتوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم پولی شکایت کرتے ہیں تو بیوی کہتی ہے "ایسی بھی کیا جلدی ہے، کھانا تو دس بجے کھاتے ہو۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اگر بچے آپ کی مصنوعی بتیسی سے کھیل لیتے ہیں تو ایسی کون سی آفت آجاتی ہے۔ کبھی نہیں اتنی توفیق تو نہیں ہوتی کہ بچوں کے لئے کھلونے ہی لے آؤ! اب بچوں نے تمہاری بتیسی میں سے اپنے لئے ایک کھلونا ایجاد کر لیا ہے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یوں بھی تم گھر میں ہمیشہ منہ پھلائے رہتے ہو۔ حسرت رہ گئی کہ بچے تمہارے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھیں جو دانتوں کا دیدار کرادے۔ اب اگر بچے تمہاری مسکراہٹ کے بغیر دانت دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں تو انھیں خوش ہو لینے دو کہ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔

ادھر جب سے ہمارے بچپن کے دوست مانگے رام جی ہمارے پڑوسی بن کر آئے ہیں، ہماری مصنوعی بتیسی بے گھر ہوگئی ہے۔ مانگے رام جی کو جب بھی کچھ کھانے کی ضرورت پیش آتی ہے تو پکار کر کہتے ہیں "بھیا تمہاری بتیسی اگر خالی ہو تو تھوڑی دیر کے لئے بھیج دینا میں مونگ پھلی کھا کر ادھ سماج کے خلاف ذرا دانت پیس کر تمہاری بتیسی واپس کر دوں گا۔" مانگے رام جی ہمارے ہم پیالہ و ہم نوالہ تو تھے ہی اب "ہم دانت" بھی ہو گئے ہیں۔

مگر صاحب کبھی کبھی ہمیں اس زندگی کی یاد آتی ہے جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی۔ کیسی ہنس مکھ اور تر و تازہ زندگی تھی۔ ہمارے گال کتنے سڈول تھے۔ ہمارا چہرہ کتنا متناسب تھا۔ نہ جانے ہمارا چہرہ کہاں کھو گیا۔ اب تو صرف چہرہ کی تہمت اپنی گردن پر اٹھائے پھرتے ہیں۔

ع۔ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

OO

ایک بار نادار طلباء کی امداد کے لیے جلسہ کیا گیا اس میں آئی ایس جوہر بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے مدعو تھے۔ اور اپنی تقریر میں کہا:
"مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ (POOR STUDENTS) کی مدد کے لیے جلسہ ہو رہا ہے۔ میں بخوشی چلا آیا کہ میں خود بھی اپنے زمانہ میں کمزور طالب علم تھا۔"

www.taemeernews.com

مسیح انجم

مسیح انجم "شگوفہ" کی عدالت میں

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب میں سرکاری طور پر قسمیں کھانے پر مامور تھا۔ دن بھر میں کوئی پچیس تیس بار بس یہی ایک قسم کی قسم کھاتا:

خدا کی قسم صحیح صحیح ترجمہ کروں گا!

ہر بار قسم کھاتے وقت مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ایک نان ویجٹرین کے سامنے بار بار اڈلی سامبر کی ڈش پیش کی جارہی ہو۔ یہ بھی کوئی قسم ہوئی! نہ ندرت، نہ ورائٹی! ندرت اور ورائٹی ہو تو قسم ہی کیا، گالیاں کھانے میں بھی مزہ آجاتا جب میں قسم کھالیتا تو اس کے فوری بعد گواہ کو بھی قسم کھلاتا کہ کہو، خدا کی قسم جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا!"

اس طرح قسم کھانے اور کھلانے کا مجھے معاوضہ بھی ملتا تھا۔ مہینے کے ختم پر جب میں "معاوضہ" اور "محنت" کا موازنہ کرتا تو بہت ساری قسمیں "فری" میں پڑتی تھیں۔ یہ ۱۹۵۳ء کی بات ہے۔ مجھے میٹرک کامیاب کئے ہوئے تین، چار دن ہی ہوئے تھے کہ ایک دن تایا جان نے حکم دیا کہ جاؤ، عدالت جاکر میری رخصت کی درخواست دے آؤ! (والد کو تایا جان اور والدہ کو تائی ماں کہنے کا سبق مجھے بچپن ہی میں پڑھایا گیا تھا) میرے تایا جان عدالت منصفی سدی پیٹ میں صیغہ فوجداری میں نقل نویس کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے حکم کی تعمیل میں عدالت پہنچا اور ان کی درخواست پیش کردی۔ اتنے میں ایک شناسا نے یہ بتایا کہ عدالت میں COPYIST کی ایک اسامی خالی ہے، درخواست دے دو، تقرر ہوجائے گا۔

ہم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ فوراً درخواست دے دی۔ خدا کی دین کا حال ہم سے پوچھئے کہ دینے گئے تھے رخصت کی درخواست تایا جان کی۔ لیکن واپس لوٹے تو COPYIST (بروزن TYPYIST) کا دُم چھلّہ ساتھ لگا ہوا تھا۔ دوسرے ہی دن نقل نویسی پر مامور ہوگئے۔ پہلے روز ہی یہ عقدہ کھلا کہ نقل نویسی میں عقل کی قطعی ضرورت نہیں۔

چند ہی دنوں میں ہماری تلگو دانی اور انگریزی دانی کے چرچے چہار دانگ عدالت میں پھیل گئے۔ البتہ ہماری اُردو دانی کو کوئی بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ کیوں کہ وہاں کے عملے میں کئی ایک جیّد اور خوانٹ قسم کے منشی کامیاب اہلکار تھے جن کے آگے ہماری اردو دانی کا دیا جلتا نہ تھا۔ البتہ ہماری تلگو دانی اور انگریزی دانی کا سکّہ خوب چلتا تھا۔ وہ بھی محض اس لئے کہ پورے

www.taemeernews.com

علے میں ہم دوسرے شخص تھے جو میٹرک پاس تھے۔

نقل نویسی پر مامور ہوئے چند ہی دن گزرے تھے کہ ایک روز عدالت کے اجلاس پر محکمہ آبکاری کی طرف سے گانجے کا مقدمہ پیش ہوا۔ فاضل مجسٹریٹ گواہوں کے بیانات کی سماعت فرما رہے تھے۔ اور مترجم صاحب گواہوں کے تلگو بیانات کا اردو ترجمہ مجسٹریٹ تک پہنچا رہے تھے۔ ایک گواہ نے اپنے بیان کے دوران یہ بتایا کہ ملزمین نے گانجے کے درخت "بنتی چٹلو" (BENTA CHETLU) کے درمیان بوئے تھے۔ چونکہ گانجہ کی پتیاں گیندے کی پتیوں سے مشابہ ہوتی ہیں اس لیے غیر قانونی کاروبار کرنے والے گانجے کے پودوں کو گیندے کے پودوں کے درمیان بوتے ہیں۔ اب جو مترجم صاحب "بنتی چٹلو" کے ترجمہ پر پہنچے تو بغلیں جھانکنے لگے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو لفظی ترجمہ کر ڈالا۔

"گولے کے درخت"

فاضل مجسٹریٹ جو تلگو سے ناواقف تھے، حیران کہ یہ گولے کے درخت کیا ہوتے ہیں؟ پتہ نہیں اجلاس پر مجسٹریٹ کو کس نے بتایا کہ ان کے ماتحتین میں ایک ایسا رنگروٹ بھی ہے جو یہ مشکل آسان کر سکتا ہے (اس وقت تک ہماری تلگو دانی کی مجسٹریٹ کو خبر نہ تھی) چنانچہ اجلاس پر ہماری طلبی ہوئی۔ ہم حیران کہ یا اللہ یہ ماجرا کیا ہے؟ اور ہم سے ایسا کونسا جرم سرزد ہوا ہے کہ اجلاس پر طلبی ہوئی ہے۔ ہم نے اپنے شرٹ کو جو پتلون سے باہر ہوا جا رہا تھا، اچھی طرح "اِن" (IN) کیا۔ بال ٹھیک سے جمائے چہرے پر "یادِ حشت" کے آثار لئے وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کا ورد کرتے ہوئے تھر تھر کانپتے اور لڑکھڑاتے قدموں سے اجلاس پر حاضر ہوئے۔ اور فوراً "YOUR HONOUR" اور "MY LORD" کہتے ہوئے دھڑا دھڑ دو تین کرنشی آداب بجالائے۔ فاضل مجسٹریٹ نے ایک اُچٹتی سی نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے پوچھا "ہاں تو جناب یہ بنتی چٹلو کیا ہوتا ہے؟"

اس آسان لفظ پر ہمارے اوسان جو خطا ہو رہے تھے فوراً بحال ہو گئے۔ کیوں کہ ہم ان درختوں کو نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ کئی بار ان درختوں میں آنکھ مچولی بھی کھیلی تھی۔ بلا جھجک ترجمہ کر دیا:

"گیندے کے درخت"

مجسٹریٹ صاحب بہت خوش ہوئے۔ ترسیل کا المیہ ختم ہو گیا اور گواہ کی جان چھوٹی۔ اسی وقت مجسٹریٹ نے مترجم کو حکم دیا کہ جاؤ تم اپنے سکشن میں کام کرو۔ ادھر خاکسار کو حکم دیا کہ کرسی پر بیٹھو اور قسم کھاؤ کہ خدا کی قسم صحیح صحیح ترجمہ کروں گا۔ پھر تو ہم مترجم کی کرسی پر براجمان ہو گئے۔

ہائے! وہ بھی کیا دن تھے جب ہم فاضل مجسٹریٹ کی سیدھی جانب کرسی پر بیٹھے مترجم کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ مہینہ بھر تنخواہ ہم کھاتے اور اس کا معاوضہ تنخواہ کی شکل میں "گولے کے درخت" والے مترجم صاحب پاتے! اس وقت ہماری عمر ۱۸ ۱۹ سال کی تھی۔ لیکن دیکھنے میں بالکل "لونڈا" نظر آتے تھے۔ چہرے پر دور دور تک سبزے کا پتہ نہ تھا۔ ویسے ہمارے بالغ ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ داڑھی اور مونچھوں کو ہمارے بالغ ہونے کی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ہم جب تک عدالت میں رہے، مترجم رہ کر بھی COPYIST کے COPYIST ہی رہے۔ ہمیں اس بات کا شدید ملال رہا کہ "گیندا" اور "گولا" میں جو نازک فرق ہوتا ہے، اس کے بتانے کا معاوضہ کبھی نہ ملا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے حلقے میں لوگ

www.taemeernews.com

کے جوانوں، جمعداروں اور سب انسپکٹروں کے سیلوٹس آئے جن کا کوئی شمار ہی نہیں۔ لیکن سیلوٹس سے انسانی ضروریات و خواہشات کی تکمیل تو ہو نہیں سکتی۔ بالآخر ۱۹۵۶ء میں حالت کو خیرباد کہا اور حیدرآباد چلے آئے۔ ہمیں اگست کا مہینہ دو طرح سے عزیز ہے۔ ایک تو اس لئے کہ ہمارے ملک کو اسی مہینے میں انگریزوں سے نجات ملی۔ دوسرے، اس لئے کہ ہم کو اسی مہینے میں تسمیں کھانے سے نجات ملی۔

جہاں تک میرے دیگر احوال کا تعلق ہے، وہ خاصے دلچسپ ہیں۔ آندھرا پردیش کے نقشہ میں ایک حقیر سا نقطہ ہے، جس کا نام ہے دیلکشور۔ یہی میرا پیدائشی گاؤں ہے۔ میٹرک کی سند میں تاریخ پیدائش ۱۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء لکھی ہوئی ہے۔ میرے پیدا ہوتے ہی والدین نے مجھے اپنی چچی کی گود میں ڈال دیا کہ جاؤ بیٹا! تم اپنے چچا کا گھر روشن کرو۔ کیوں کہ میرے چچا کے گھر میں کوئی "چراغ" نہیں تھا جو ان کا گھر روشن کرتا۔ البتہ ہمارے گھر میں بہت سے "چراغ" روشن تھے جن کی موجودگی میں میرا وجود ایک فاضل چراغ سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ بچپن ہی میں مجھے یہ سبق پڑھایا گیا کہ میں والد کو تایا جان اور والدہ کو تائی ماں، اور چچا کو ابا جان اور چچی کو امی جان کہوں۔ گویا یوں سمجھ لیجئے کہ میری مزاح نگاری کا آغاز یہی ہے۔ اسی لئے بچپن میں بعض عزیز و اقارب مجھے چھیڑنے کی خاطر ازراہ مذاق کہا کرتے "ارے یہ لونڈا! یا پ کہو باپ نہیں بولا۔ پڑوسی کو چچا کیا بولے گا!"

میری ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں ہوئی جہاں ایک چاؤڈی کو مدرسہ کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا اور یہ مدرسہ بھی ایسا تھا جہاں نہ تو چپراسی کا انتظام تھا اور نہ فرنیچر کا۔ لڑکے خود بلا لحاظ مذہب و ملت باری باری روزانہ مدرسہ میں جھاڑو لگاتے اور اپنی نشستوں کا آپ انتظام کر لیا کرتے تھے۔ ہر لڑکا اپنی بغل میں بستہ کے ساتھ ساتھ چٹائی یا ٹاٹ دبائے اسکول کو چلا آتا۔ ہمارے اُستاد خود بھی بوریے پر تشریف فرما ہوتے۔ وہ ذات کے برہمن تھے تلگو تو خیر ان کے گھر کی لونڈی تھی لیکن اُردو پر بھی خاصا عبور تھا۔ املا نویسی کے گھنٹے میں ایسے ادق اور مشکل الفاظ لکھواتے کہ بس پھر پیری سی آجاتی۔ وہ کچھ اس قسم کے الفاظ کا املا لکھواتے جن میں طلباء کے پٹنے کا خاصا اہتمام رکھا گیا ہو۔ جیسے: حتی الامکان، قسطنطنیہ، استنبول وغیرہ اس قسم کے الفاظ سے جماعت دوم ہی میں پالا پڑا تھا۔

میں نے سیدی پیٹھ ہائی اسکول سے میٹرک کامیاب کیا۔ یہاں میں نے پریم چند کے افسانے پڑھے اور کافی متاثر ہوا۔ انہی دنوں میرے دل میں یہ جذبہ پیدا ہوا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔ لیکن روزانہ مدرسے کو آٹھ میل پیدل جانے اور آنے کی مسافت اس جذبے کو کچل دیتی۔ اور پھر دوسری بات یہ کہ ادبی ماحول کا دُور دُور تک کوئی پتہ نہ تھا۔

میری عملی زندگی کا آغاز شہر حیدرآباد سے ہوتا ہے۔ یہیں میں نے محکمہ تعلیمات میں ملازمت اختیار کی۔ اور یہیں میں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے خانگی امیدوار کی حیثیت سے بی اے اور بی۔ ایڈ کے امتحانات کامیاب کئے۔ یہیں میری ملاقات ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے ہوئی۔ اور پھر یہ ملاقات رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہوتی گئی۔ اب تو میں اپنے آپ کو ان ہی کے خاندان کا ایک فرد تصوّر کرتا ہوں۔ میری حوصلہ افزائی کرنے میں مجتبیٰ حسین کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین جتنے اچھے مزاح نگار ہیں اس سے کہیں زیادہ سادگی پسند ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ فیصلہ کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ

www.taemeernews.com

آیا مجھے اِن کے مضامین زیادہ پسند ہیں یا ان کی سادگی۔

میں نے افسانے سے اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا۔ میرا پہلا افسانہ ۱۹۶۲ء میں روزنامہ "ملاپ" میں شائع ہوا۔ مجھے افسانے کے فسوں سے نکال کر طنز و مزاح جیسی تیز دھاری دار تلوار پر چلنے کے لئے اُکسانے والے میرے عزیز دوست مصطفیٰ کمال ہیں۔ اُنہوں نے میرا پہلا مزاحیہ مضمون روزنامہ "رہنمائے دکن" میں شائع کیا (یہ اُن دِنوں کی بات ہے جبکہ کمال صاحب "رہنمائے دکن" کا ادبی صفحہ ترتیب دیا کرتے تھے) اس کے بعد کمال صاحب نے ماہنامہ "شگوفہ" میں میرے کئی مضامین شائع کئے۔ "شگوفہ" اور "زندہ دلانِ حیدرآباد" میری کمزوری بن گئے۔ پھر اس کے بعد اُنہوں مجھے "شگوفہ" کی مجلسِ ادارت میں شامل کر کے میری عزت بڑھائی۔

یوں تو میرا نام محمد مسیح الدین ہے لیکن میں مسیح انجم کے نام سے مزاح نگاری کرتا ہوں۔ جہاں تک طنز و مزاح کا تعلق ہے، میں خالص طنز کو پسند نہیں کرتا۔ کیوں کہ خالص طنز گالی کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ رذیل کو رذیل کہنا ادب نہیں، گالی ہے۔ اور بات بڑھک فوجداری تک جا پہنچتی ہے۔ مزاح نگاری کے لئے اعلیٰ ظرفی اولین شرط ہے۔ اور اس شرط پر وہی مزاح نگار کھرا اُترتا ہے جس نے ساری انسانیت سے ٹوٹ کر پیار کیا ہو اور جس میں غم و آلام کو پی جانے کا حوصلہ ہو۔

میں دوستوں کی محفلوں میں مزاح کے نام پر اوچھے فقرے کسنے سے بھی بہت گھبراتا ہوں۔ اور یہ فیشن آج کل بہت عام ہے میں تو اس بات کا قائل ہوں کہ جو بھی کہو بزبانِ قلم کہو۔ اس میں ہر دو ادیب اور قاری کی پوزیشن بالکل محفوظ رہتی ہے۔ اور پھر آج کا المیہ یہ ہے کہ آپ چوٹ تو کسی اور پر کرتے ہیں لیکن آستینیں کوئی اور چڑھاتا ہے۔

میں اپنے ذوق کی تسکین کے لئے مزاح لکھتا ہوں۔ میری مزاح نگاری نے کسی اور کو نہ سہی، کم از کم میری ذات کو تو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ اب مجھ میں وہ حماقتیں باقی نہ رہیں جو اکثر ادیبوں اور شاعروں کی ذات میں سرائیت کر جاتی ہیں۔ مثلاً ٹولسٹوئی کے کوٹ اور ٹائی پر اپنی تصویریں کھنچوانا اور رسالوں میں چھپوانے کے لئے بھجوانا۔ اب میں بالکل ہی ایک سیدھا سادا انسان ہوں۔ لیکن اس کے باوجود ہر نیا ملنے والا مجھ سے کچھ گھبرا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی واحد وجہ صرف میری داڑھی ہے۔ میں نے داڑھی محض اس لئے چھوڑ رکھی ہے کہ مجھ میں اور طلباء میں کچھ تو امتیاز رہے۔ لوگ اپنی عمروں کو چھپانے کے لئے داڑھی منڈاتے ہیں۔ اور میں محض اس لئے داڑھی بڑھاتا ہوں کہ لوگوں کو میری عمر کا صحیح اندازہ ہو اور وہ میری بزرگی کا احترام کریں۔ لیکن اس کے باوجود میں اپنی عمر سے کوئی دس بارہ سال پیچھے نظر آتا ہوں۔ اس میں نہ تو آئینہ کا قصور ہے اور نہ میری بینائی کا۔ بلکہ دوستوں اور ڈاکٹروں کی یہی رائے ہے۔ جس روز میرے دوست احباب میری صحیح عمر کو پہچاننے لگ جائیں گے اس وقت داڑھی رکھنے کے فیصلے پر نظرِ ثانی کروں گا۔ مجھے ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ میری داڑھی پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔ اب تو یہ داڑھی میری شناخت کا واحد ذریعہ بن گئی ہے۔ چنانچہ میرے افسانہ نگار دوست جناب عاتق شاہ جب کبھی میرے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو یہی پوچھتے ہیں کہ "داڑھی ہے؟" "داڑھی کدھر گئی؟"

مصطفیٰ کمال بھی جب مجھ پر مہربان ہو جاتے ہیں تو اپنی مادری زبان کی بجائے سرکاری زبان اردو کو زحمت دیتے ہیں۔

www.taemeernews.com

مثلاً: ایکاڈا اُناؤ گڈّیوا اَناؤ؟ (کہاں ہیں داڑھی والے بھائی؟)

جب داڑھی کا ذکر آ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں اپنا بچا کھچا خاکہ بھی کھینچ دوں۔ ویسے یہ کام ایسا ہی ہے جیسے ایک سرجن خود اپنے دست مبارک سے اپنا آپریشن کرنے بیٹھا ہو۔

اب ذرا ہمارا خاکہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

رنگ: گورا نہ کالا۔ جوانی میں چہرہ اتنا بُرا بھی نہیں تھا کہ حسن کی بھیک ہی نہ ملتی۔ زندگی میں تین، چار مواقع ایسے بھی آئے کہ بالکل ہی سچویشن پیدا ہو گئی تھی ؎

حُسن جب ملتفت ہو تو کیا کہیئے
عشق کی مغفرت کی دُعا کیجئے

قد: محکمہ پولیس میں بھرتی کے لئے جو معیار مقرر کیا گیا ہے، اس سے ایک انچ کم۔

سینہ: ۳۴ انچ اور کمر ۳۶ انچ۔ اگر پتلون میں بیلٹ نہ لگاؤں تو چلتے وقت دونوں ہاتھوں کو معروف رکھنے کی ضرورت پڑے۔

سر: سرسید احمد خاں کا پایا ہے۔ لیکن دماغ سرسید احمد کا نہیں۔ البتہ اس کے صحت مند ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ورنہ کیا عجب کہ جدیدیت کے نام پر اوٹ پٹانگ قسم کے افسانے لکھنے لگ جاتا۔ بال بہت گھنے۔ لیکن نائی کی غفلت سے جب کبھی سائڈ میں چھوٹے ہو جاتے ہیں تو سر کے پچھلے حصّے کے کچھ بال ۱۷ مارچ (اپریل) کی طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں اپنے نائی کی خوشامد اس لئے کرتا ہوں کہ وہ میرے سر میں اپریل کا جواز نہ پیدا کرے۔

پاؤں: لیڈیز سائز (LADY'S SIZE) کی تعریف میں آتے ہیں۔ غفلت سے کبھی بیوی کے چپل پہن لوں تو کام نکل جائے۔

وزن: ابھی وہ نوبت ہی نہیں آئی کہ ڈاکٹر گھٹانے کا مشورہ دیں۔ یوں بھی میں ڈاکٹر اور وزن، دونوں سے بے حد گھبراتا ہوں۔

کمزوری: آج کا سارا کام کل پر ٹالنا۔ شاگردوں کے خوف سے ہوٹلوں اور سڑکوں پر کھاتے اور پیتے (سگریٹ) گھبرانا۔

تصانیف: "سائڈ سے چلئے" "در پردہ" "چاچا" ان میں سے دو تصانیف کو اتر پردیش اردو اکیڈیمی اور آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی سے انعامات ملے۔

اُولاد: تصانیف کی ڈگنی۔

"شگوفہ" کی عدالت میں میرا غیر حلفیہ بیان ادھورا سمجھا جائے گا اگر میں اپنے افسانہ نگار دوست جناب نعیم زبیری اور ممتاز ادیب جناب داؤد اشرف کا ذکر نہ کروں۔ ان دو حضرات نے میری طرز نگارش کو پسندیدگی کی سند اس وقت بخشی جب کوئی چارہ ڈالتا نہ تھا۔ اگر میرے مضامین میں مزاح کی جھلکیاں بنتی رہیں تو اس کی داد مجھے دینے کے بجائے قبول کروں گا۔ اور اگر نہ ہوں تو مجھے دوش مت دیجئے، بلکہ اُن دو حضرات ہی سے باز پرس کیجئے کہ کیوں ایک معصوم کو خواہ مخواہ گمراہ کیا!؟

www.taemeernews.com

مسیح انجم

دسترخوان کے شیر + شعر

آزادی کے بعد ملک میں ایک ایسی ہوا چلی کہ سماجی، ثقافتی اور تہذیبی قدریں بڑی تیزی سے بدل گئیں۔ روایات بدلے لوگوں کے قول و فعل کا بھروسہ نہ رہا۔ نازنینوں کی زلفیں چھوٹی ہوگئیں۔ نوجوانوں نے خط بڑھائے۔ ساکل بڑھے۔ زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے۔ مگر دل بہت تنگ ہوگئے۔ معدوں میں بھاکی وسعت آگئی۔ نتیجتاً دسترخوان کے آداب و قواعد بُری طرح متاثر ہوئے۔ خاص طور پر نان ویجیٹرین بڑا متاثر ہوا۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو مرغِ مُسلّم، دو گوشتہ بریانی اور مکمل لوازمات پر مشتمل ایک ضیافت کا اہتمام کرکے خود ہی دیکھ لیجئے کہ ہمارے نوجوان، شیروں کی طرح اپنی اپنی میزوں کے حدود اور احاطے میں کس طرح اودھم مچاتے ہیں؟ اِدھر ابھی آپ ہاتھ دھوکر اپنی میز کے پاس بیٹھنے بھی نہیں پاتے کہ اُدھر آپ کے حصّہ کی ملّی دسترخوان کے شیر کا لقمہ بن جاتی ہے۔ ادھر آپ تھوڑی سی رواداری برتنے میں مصروف ہوجاتے ہیں تو اُدھر آپ کے حصّے کا مُرغ آپ کو داغِ مفارقت دے جاتا ہے۔ آپ دسترخوان کے شیر پر صرف دانت پیستے رہ جاتے ہیں۔ مگر وہ اپنی داڑھ چلانے میں مگن رہتا ہے۔ بھلا اب اُن دسترخوان کے شیروں کو یہ کون سمجھائے کہ بھئی دسترخوان کے بھی کچھ آداب و قواعد ہوتے ہیں۔ آداب و قواعد کی بات تو دُور کی رہی۔ وہ تو دسترخوان پر پہنچنے سے پہلے مطلع کے طور پر ہاتھ دھو لینے کو بھی ایک جھنجھٹ تصوّر کرتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو مقطع اور مطلع ایک ساتھ کہہ لینے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بعض دسترخوان کے شیر تو دورِ اندیشی کے تقاضے کے طور پر گھر پر ہی مطلع کہہ لیتے ہیں اور پھر دعوت میں تناول طعام کے لئے نکل پڑتے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعی پرواہ نہیں رہتی کہ راستے میں ان کا مطلع کتنا گرد آلود ہوگیا تھا۔ آخر ماضی میں بھی تو دسترخوان کے شیر ہوا کرتے تھے۔ لیکن ماضی، اب ماضی بعید ہوچکا ہے۔

ماضی میں دسترخوان "پہلے آپ" سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن اب "پہلے مَیں" سے شروع ہوتا ہے۔ اور اکثر "تُو تُو مَیں مَیں" بھی ہوجاتی ہے۔ ایسے موقع پر اگر میزبان ذرا "رَف" قسم کا ہو تو وہ لوازمات میں گھونسوں کو بھی شامل کردے گا۔ مگر یہ یاد رکھئے کہ گھونسے کھانے والا ـــــ (دسترخوان کا شیر) گردن جھکا کر یہی کہے گا کہ:

"بچپن میں میری ماں مجھے اسی طرح مار کر کھانا کھلاتی تھی!"

لیکن ماضی میں اگر کوئی دسترخوان کا شیر ڈٹ کر کھانے اور اودھم مچانے پر تُل جاتا تھا تو میزبان کی بھی رگِ حمیت پھڑک اٹھتی تھی۔ اور وہ بھی کھانے پر تُل جاتا تھا۔ اس طرح ہر دو فریق اپنی اپنی ہار کو کرکٹ ٹسٹ میچ کی طرح اپنے لئے ایک وقار کا مسئلہ بنالیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دعوتیں "کھائیں تمام رات، کھلائیں تمام رات" "وہ دن بھی آئیں اُن کو جگائیں تمام رات" میں تبدیل ہوجاتی تھیں۔ بالآخر میزبان اسپورٹس مین اسپرٹ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دسترخوان کے شیر کی پیٹھ تھپک کر یہ ڈکلیر

www.taemeernews.com

کرتا:

"You are the man of the match!"

تب وہ دسترخوان کا شیر "MAN OF THE SERIES" کا مثل حاصل کرنے کے لئے سلسلہ وار کئی دعوتوں میں معرکے سر کرتا اور بکرے اور مرغوں کی "باقیات" کے ڈھیر دسترخوانوں پر لگا دیتا۔ اور کئی دن تک پیچش کے مرض میں مبتلا رہتا۔

لیکن اب جو دعوتیں دی جاتی ہیں وہ "لیٹیڈ اوورس" کی بنیاد پر دی جاتی ہیں۔ محدود مہمان ۔ اور لامحدود بن بلائے مہمان۔ محدود لوازمات اور محدود بوٹیاں۔ بعض وقت تو بریانی کی پلیٹ میں بوٹیوں کی مقدار اس حد تک کم کردی جاتی ہے کہ وہ "نوادرات گذشتہ" کا اشتہار بن جاتی ہیں۔ اور بوٹی کو کھوجنے کے لئے ایک مہمان کو باضابطہ اعلان کرنا پڑتا ہے کہ "جو شخص بھی بوٹی کو تلاش کرکے لائے اُسے پچاس روپے نقد انعام!" ایسے موقع پر میزبان سے گوشت کے بارے میں دریافت کرنا بالکل فضول ہے۔ وہ مہمانوں پر اپنی دھاک جمانے کے لئے یہی جواب دے گا کہ

"ساری بوٹیاں گھل گئی ہیں۔ کیوں کہ گوشت جو منگایا گیا تھا وہ "بغیر ہڈی" کا تھا۔" اگر دعوت شیرمال اور قورمہ کی ہو تو دسترخوان پر کٹوروں میں شوربا ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دے گا۔ اُس وقت بوٹی کو تلاش کرنے کے لئے ایک مہمان کو باضابطہ لنگوٹ لگا کے شوربے میں ڈبکی لگانے کی نوبت آجاتی ہے۔

ہم نے مردت میں دسترخوان پر ڈٹ کے کھانے اور ادھم مچانے والے نوجوان کو شیر سے تشبیہ دی ہے۔ اور یہ بات جنگل کے شیر کے لئے بھی توہین کے مترادف ہے۔ اگر شیر کو اس بات کا پتہ چل جائے تو وہ ہمارے خلاف عدالت میں ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر بیٹھے۔ کیوں کہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا ہے تو وہ کسی جانور کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتا، بلکہ تصورِ جاناں اور "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسدؔ" میں مصروف رہتا ہے۔

لیکن جہاں تک دسترخوان کے شیروں کا تعلق ہے وہ بڑے بے حیا ہوتے ہیں۔ انھیں "ہوکا" نام کی ایک بیماری مستقل لگی رہتی ہے جو دعوتوں کے میزان میں پسند چیزوں کو دیکھنے اور سونگھنے سے عود کر آتی ہے۔ جس کا خمیازہ ضیافت کرنے والوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کا واحد علاج اُبلے ہوئے موٹے چاول اور چٹنی ہے۔ (مگر واضح رہے کہ لفظ "چٹنی" کسی شاعر کا تخلص نہیں ہے) اس علاج سے اگر مرض میں افاقہ نہ ہوا تو ہمارا ذہنی گاؤں کی ہوشیار ساس اپنے چٹورے داماد کو اسی علاج سے راہ راست پر لاتی ہے۔ طب کی اصطلاح میں اس علاج کو "گھریلو علاج" یا "علاج بالغذا" کہا جاتا ہے۔

دسترخوان کے شیروں کے تذکرے کے بعد ان اشعار کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو دسترخوان پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتے ہیں۔ اس قسم کے دسترخوان کو آپ "اردو دسترخوان" کہہ سکتے ہیں لیکن آج کل یہ "اردو دسترخوان" اردو میڈیم کے مدارس کی طرح اکا دکا ہی نظر آنے لگے ہیں۔ پرسوں ہم نے بہت کوشش کی کہ کہیں سے اشعار سے مزین دسترخوان حاصل کریں۔ لیکن بُری طرح ناکام رہے۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ "تم پتھر گڑھی جاؤ۔ وہاں بہت سی دکانیں ہیں۔ کسی ایک دکان پر جاکر دسترخوانوں سے مختلف شعر نوٹ کرلینا۔ اور اگر اشعار والے دسترخوان نہ ملیں تو نکر کر ضرورت نہیں۔ وہاں کی ہوٹلوں

www.taemeernews.com

میں بہت سارے شاعر مل جائیں گے۔ ان سے بلا معاوضہ شعر لکھوا لینا"

مجھے یہ بات بے حد پسند آئی۔ میں پتھر گٹی گیا اور ایک دکاندار سے پوچھا" جناب! یہ آپ کے پاس اشعار والے دسترخوان ہیں؟" دکاندار نے دریافت کیا" گھر کے لئے یا جہیز کیلئے؟"

میں کوئی جواب دیئے بغیر مسکرا کر رہ گیا اور مختلف دسترخوانوں کو اُلٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ بڑی مشکل سے ایک دسترخوان پسند آیا لیکن اس پر اُردو کا جو شعر تھا وہ بہت ہی دھندلا گیا تھا۔ میں نے دکاندار سے پوچھا کیا آپ کے پاس اردو اشعار کے لیٹسٹ (LATEST) دسترخوان نہیں ہیں؟

وہ کاروباری انداز میں بولا" جناب! جب اُردو کی کتابیں نہیں خریدی جاتیں تو پھر اردو کے دسترخوان کون خریدے گا؟ اب تو میں انگلش میڈیم کے دسترخوان چھپوا رہا ہوں" یہ سنتے ہی میں دکان سے باہر نکل آیا۔

اتنے میں میری نظر ایک لیڈر پر پڑی۔ وہ اپنی کار میں جلسہ گاہ کی طرف جا رہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی مجھے یاد آیا کہ ان کے پاس بھی اردو کا ایک دسترخوان ہے۔ جب وہ اپنا دسترخوان بچھاتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیئے کہ الیکشن آ گئے ہیں۔ وہ اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو جمانا چاہتے ہیں تو اُن کو اسی دسترخوان پر جمع کرتے ہیں۔ ایک بار اُنہوں نے لومڑی کی چال چلی اور اردو کی ترقی کے مسائل پر بحث کرنے کے لئے ادیبوں اور شاعروں کو ڈنر پر مدعو کیا۔ بیشتر خوش ہوئے ادیبوں نے بغلیں بجائیں۔ مقررہ وقت پر دسترخوان بچھایا گیا۔ بڑا شاعر، چھوٹا شاعر، بڑا ادیب اور ادیب مناسب دسترخوان پر بیٹھ گئے۔ کھانا چُنے جانے میں ابھی دیر تھی تو شعرائے کرام دسترخوان پر غزل بہلانے لگے۔ کوئی دسترخوان کے کسی مصرعہ پر گرہ لگانے لگا تو کوئی دسترخوان کی زمین میں شعر موزوں کرنے لگا۔ اتنے میں اُس دسترخوان پر فارسی کا یہ شعر چھپا ہوا تھا ؎

شکر بجا آر کہ مہمان تو
روزی خود می خورد از خوان تو

ایک نئے شاعر نے رَو میں "شکر بجا آر کہ" کو "شکر بجا آر کہ" کچھ اس طرح پڑھا جس طرح اُردو کے ایک ریٹائرڈ اسکالر نے میڈیکل کالج کے بورڈ پر کی اردو تحریر "کلیہ طبیہ" کو "کلمہ طیبہ" پڑھا تھا۔ لفظ "شکر" سنتے ہی دسترخوان پر اونگھتے بیٹھے ہوئے نقاد کے کان کھڑے ہو گئے۔ اس نے نوآموز شاعر سے سوال کیا:

اس شعر میں "تو" ہونا چاہیئے یا "تست"

شاعر بولا" تو!"

نقاد نے ڈانٹا" خبردار! زبان سنبھال کر بات کرو!"

شاعر نے گھبرا کر کہا" مجھے فارسی نہیں آتی!"

اس اطلاع پر نقاد نے شکریہ ادا کیا۔ اور پھر دسترخوان پر چھپے ہوئے ایک اردو شعر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

www.taemeernews.com

"تو پھر یہ شعر پڑھو!"

شاعر کی انا فوراً جاگ پڑی۔ وہ بولا "میں نہیں پڑھتا۔ آخر آپ کون ہوتے ہیں پڑھوانے والے؟"

نقاد نے کسی قدر گمبھیر آواز میں کہا "نہیں آپ کو پڑھنا ہی پڑے گا۔ میں نقاد ہوں!" یہ سنتے ہی شاعر کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے سنبھل سنبھل کر وہ شعر پڑھا ؎

عزیز اب فکر کیوں ہو مجھ کو مہمانوں کے کھانے کی
خدا نے رزق بھیجا ہے مجھے اور میرے مہماں کو

نقاد نے پوچھا "بتاؤ یہ شعر کس کا ہے؟"

شاعر نے جواب دیا "فکر تونسوی کا ہے!"

نقاد نے کہا "فکر تونسوی کو شاعری چھوڑے کئی سال گزر گئے!"

"تو پھر عزیز کا ہے" شاعر نے کہا

نقاد نے نفی میں گردن ہلادی۔

"تو پھر مہماں کا ہے!" شاعر زچ ہو کر بولا۔

نقاد نے کہا "یہ بھی غلط!"

بڑے غور و فکر کے بعد شاعر نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا "پھر تو خدا کا ہونا چاہیئے"

نقاد نے سمجھایا "تخلص کو پہچاننے کا طریقہ یہ ہے کہ تخلص والے لفظ پر چمچے کی علامت (ــــ) ہوتی ہے!"

شاعر نے دسترخوان پر چھپی ہوئی چمچے کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "علامت یہاں ہے اور شعر وہاں ہے۔ وہ روایتی شاعری ہے اور یہ علامتی شاعری ــ چمچہ، پلیٹ، کٹورا"

یہ سنتے ہی نقاد کو جلال آگیا۔ اس کے منہ سے کف بہنے لگا۔ تمام شاعر اور ادیب اردو کی ترقی کے مسائل اور ڈنر کو بھول کر بحث میں الجھ گئے۔ ہاتھا پائی کی نوبت آنے کو تھی۔ اتنے میں ایک کہنہ مشق شاعر نے آگے بڑھ کر کہا "آپ لوگ خواہ مخواہ آپس میں الجھ گئے ہیں۔ جس شعر کو آپ لوگوں نے اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا ہے وہ "بحر" اور "بحث" سے خارج ہے!"

اس ہڑبونگ کا فائدہ اٹھا کر میں اسی وقت لیڈر کے سکریٹری نے سارے ادیبوں اور شاعروں کو یہ کہتے ہوئے دسترخوان سے خارج کر دیا کہ اب آپ لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا سکتے ہیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ وہ نقاد کوئی "ایجنٹ" تھا۔ کونسا ایجنٹ تھا خدا ہی جانے!؟

---

www.taemeernews.com

نریندر لوتھر

خودنوشت

انگریزی مصنف ای۔ ایم فاسٹر کے مطابق انسانی زندگی میں پانچ اہم واقعات یا سانحات ہوتے ہیں۔ پیدائش، کھانا، سونا، سیکس اور موت۔ سیکس میں انسان محبت بھی شامل کرتا ہے بلکہ وہ محبت میں سیکس شامل کرتا ہے ویسے عقلمند لوگ ان دونوں کو علیحدہ ہی رکھتے ہیں ورنہ خواہ مخواہ پیچیدگیاں ہو جاتی ہیں پہلا اور آخری واقعہ زندگی میں صرف ایک بار درپیش ہوتا ہے، باقی تو روزمرہ کی باتیں ہیں۔ انسانی زندگی انہیں واقعات کے گرد گھومتی ہے اور ناول نگار انہیں کو موضوع بناتے ہیں۔

ان میں سے چار سانحات سے میں گزر چکا ہوں بلکہ پہلے کو چھوڑ کر تین سانحوں سے بار بار دو چار ہوا اور جب تک آخری سانحہ نہ گزر جائے یہ تینوں سانحات باقاعدگی اور بے اعتدالی کے ساتھ ہوتے رہیں گے۔ نتیجۃً آخری واقعہ بھی رونما ہو جائے گا۔ اور پھر میری سوانح حیات لکھنے کا کام کسی کے سپرد کیا جائے گا۔ وہ تحریر شاید پڑھنے کے قابل ہو۔ خاص طور پر اس صورت میں جبکہ وہ مستقبل کا سوانح نگار میرا دوست یا رشتہ دار نہ ہو۔

ہمیں اکثر کئی قسم کے فارم بھرنے پڑتے ہیں۔ نوکری کے لئے، راشن کے لئے، پاسپورٹ کے لئے۔ جس طریقے سے ایک امیدوار نے اپنا فارم بھرا تھا اس طرز پر تو میں اپنی زندگی کے حالات کو مختصر طور پر یوں بیان کر سکتا ہوں۔

۱۔ پیدائش ——— ہو چکی۔
۲۔ کھانا ——— ہلکا۔ روز۔
۳۔ سونا ——— بھاری۔ روز رات کو
۴۔ سیکس ——— کبھی کبھی۔
۵۔ موت ——— ابھی نہیں۔ انتظار کیجئے۔

لیکن اس سے آپ کی تسلی نہیں ہوگی۔ اور چوں کہ اس میں کوئی مبالغہ آمیزی کی گنجائش نہیں اس لئے میری بھی تسلی نہیں ہوگی۔ اس لئے کوشش کرتا ہوں کہ طرلین کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر کچھ قلمبند کروں۔

میری پیدائش کے بارے میں کچھ خاص بات نہیں لکھی جا سکتی۔ اس وقت نہ تو کوئی روشن تارہ طلوع ہوا، نہ ہی بارش ہوئی اور نہ ہی کوئی اور خاص واقعہ رونما ہوا۔ ایک متوسط سائز کے شہر میں، ایک متوسط گھرانے میں، موسم میں جب نہ گرمی تھی نہ سردی یعنی مارچ کے اواخر میں پانچواں بچہ اور تیسرا لڑکا پیدا ہوا۔

www.taemeernews.com

اس لحاظ سے کنبہ بھی متوسط تھا۔ عموماً بچے آدھی رات کے وقت پیدا ہوتے ہیں لیکن گھر کے لوگوں کی سہولیت کا خیال کرتے ہوئے میں نے شام کے وقت پیدا ہوا اس سے پتہ چلتا ہے کہ مجھے شروع ہی سے دوسروں کے آرام کا خیال رہتا تھا۔ آج کل کے بچے اکثر ہسپتالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن میں صحت مند تھا اس لئے گھر میں ہی پیدا ہوا۔ ہسپتال جانے کی ضرورت نہ پڑی۔ آج تک اس عادت کو برقرار رکھے ہوئے ہوں ہسپتال جانے سے گریز کرتا ہوں۔ صرف بیماری کی صورت میں ہی اس طرف کا رخ کرتا ہوں۔ البتہ یہ نوٹ کر لیجیے کہ میرے دونوں بچے ہسپتال میں ہی پیدا ہوئے۔ اس لئے مجھ پر وفاداری کا الزام عاید نہیں کیا جا سکتا۔

چودہ یا پندرہ سال تک میں نے کوئی سرکاری کام نہیں کیا۔ لیکن ۱۹۴۷ء میں ملک کو آزادی دلوانے میں میرا خاصہ ہاتھ رہا۔ میں پنڈت نہرو کے ایک جلسے میں حاضر تھا جس میں انہوں نے بار بار کہا تھا کہ آزادی حاصل کرتے ہی رہیں گے اس اعلان کو سن کر میں نے بہت زور سے تالیاں بجائیں۔ اس کے علاوہ میں نے بیشتر قومی لیڈروں کی تقریریں پڑھی اور سنی تھیں۔ اس سے ہمارے لیڈروں کے حوصلے بلند رہتے اور آزادی کی تحریک کو فیضان ملا۔ اور ایک بات جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ کارنامہ میں نے ایک بار بھی جیل گئے بغیر انجام دیا۔ اس کے علاوہ آزادی کی جدوجہد کے باوجود میں نے اپنی پڑھائی جاری رکھی اور ایم۔ اے تک تعلیم پائی۔ آزادی کی جدوجہد کی تاریخ میں ایسے مثبت رد عمل کی مثالیں کم ملتی ہے۔ جس میں کسی شخص نے بیک وقت ہر کام پر مناسب توجہ دی ہو۔

تقسیم ہند کی وجہ سے میں جلاوطن ہوگیا لیکن اس کے باوجود حب الوطنی کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ میں نے اپنی زندگی ملک، قوم اور سرکار کی خدمت میں گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ آج کل ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ اس لئے مجھے ۱۹۵۵ء میں آئی۔ اے۔ ایس میں لے لیا گیا۔ میں نے ہر شعبہ میں، ہر طرح سے پبلک اور سرکار کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ابھی تک یہ کام پورا نہیں ہوا۔ اور اسی لئے ابھی تک اسی دھن میں مبتلا ہوں۔ حکومت ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی کہ میں کس کام کے لئے موزوں ہوں اس لئے کبھی یہاں کبھی وہاں کبھی اس محکمہ میں کبھی اس محکمہ میں بھیجا جاتا ہوں۔ اس محکمہ بدوشی کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ افسر کی کمزوری اور نااہلی کا پتہ نہیں چل پاتا۔ یہ ایک قسم کی مفت ٹریننگ ہے۔ جب ٹریننگ ختم ہو جائے گی تو ذلیفہ دے کر گھر بھیج دیا جاؤں گا۔ اس وقت یہ سوچوں گا کہ اپنی زندگی کے ساتھ کیا کروں۔

معاف کیجئے۔ میں نے ناشتہ والے واقعات کا تسلسل برقرار نہیں رکھا۔ پیدائش کے بعد کھانا اور سونے کی بات ہونی چاہیئے تھی۔ تو وہ بھی سن لیجئے۔ یہ دونوں کام میں بچپن سے کرتا آیا ہوں لیکن ایک اصول کو ہمیشہ مدنظر رکھتا ہوں۔ کھاتے وقت میں کبھی سوتا نہیں اور سوتے وقت کبھی کھاتا نہیں۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ صبح جلدی اٹھنے کی بجائے رات کو دیر سے سونے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ویسے میں نے کئی بار صبح اٹھنے کی کوشش کی ہے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے اب

www.taemeernews.com

دیر سے سونا بھی چھوڑ دیا ہے۔ بیل سونے اور جاگنے کے وقت میں اعتدال ہے۔ صبح سیر کرنے کی عادت ڈالنے کی خواہش بچپن سے ہے اس میں بھی کامیابی وقتاً فوقتاً ہوئی تو سہی لیکن دیر پا ثابت نہیں ہوئی۔ تہر جان اب شام کی سیر پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ اس سے سوشل زندگی پر مضر اثرات پڑتے ہیں لیکن آخر انسان میں کوئی خاص بات تو ہونی چاہیئے۔ ہماری سیر چار پانچ کیلومیٹر لمبی ہوتی ہے اور اس میں پچاس منٹ کے قریب لگتے ہیں۔ اس طرح میں دس منٹ میں ایک کیلومیٹر چلتا ہوں۔ یہ رفتار بیل گاڑی کی رفتار سے زیادہ ہے۔ شادی میں استعمال ہونے والی موٹر کاروں کی رفتار بھی ہماری رفتار سے کم ہوتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ شادی سے ہر چیز کی رفتار میں کمی ہو جاتی ہے۔ کئی بار میں رات کو آٹھ بجے بھی سیر پر نکل جاتا ہوں اور غلطی سے کسی دوست کے گھر پہنچ جاتا ہوں! ایسی صورت میں رات کا کھانا کھا کر ہی واپس ہوتا ہوں۔ شام کی سیر کا یہ پہلو ہم سے پہلے کسی نے دریافت نہیں کیا تھا۔

اب آیئے چوتھے سانحے کی طرف۔ محبت۔ جی ہاں۔ آپ کا خیال صحیح ہے۔ میں نے بارہا محبت کی ہے۔ محبت عجیب سی حالت کا نام ہے جس میں متضاد کیفیتیں پائی جاتی ہیں۔ دکھ اور سکھ، خوشی اور غم، کلفت اور راحت۔ طمانیت اور پریشانی، سیری اور تشنگی اس کے بارے میں شاعروں نے لکھا، مفکروں نے سر کھپایا، عاشقوں نے ذاتی طور پر تجربے کئے اور پروفیسروں نے مشاہدے کئے ہیں۔ لیکن ابھی تک اس کی کوئی جامع اور تشفی بخش تعریف نہیں کی جاسکی اکثر اس کی مذمت ہی کی گئی ہے۔ ایک بار محبت کرتا کرتا میں دامِ ازدواج میں گرفتار ہوگیا اور حبسِ دوام کی سزا مل جو میری بیوی بھگت رہی ہے عشق یقیناً "خلل ہے دماغ کا"۔ اور اگر انسان کبھی ایسے خلل سے دوچار نہ ہو تو واقعی پاگل ہو جائے دماغ کے توازن کے لئے یہ خلل ضروری ہے۔

لکھنا میں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع کیا تھا۔ پہلے صرف انگریزی میں لکھتا تھا حیدرآباد آنے سے اردو انگریزی پر حاوی ہوگئی۔ ایک معروف ادیب کی صلاح پر طنز و مزاح کی طرف دھیان زیادہ دیا۔ ویسے طبعی طور پر میں سیریس کہانیاں اور مضامین لکھنا بھی پسند کرتا ہوں اردو میں دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ویسے چار پانچ کتابوں کا مواد میرے پاس ہے۔ جو مضامین، کہانیوں اور خاکوں کی شکل میں لکھے یا براڈ کاسٹ ہو چکا ہے۔ رضاکارانہ طور پر کم لکھتا ہوں۔ اگر کوئی ڈنڈا لے کر یا چیک دکھا کر لکھوائے تو فوراً لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ میں آرٹ میں صرف ایک ہی میڈیم سے مطمئن نہیں ہوں۔ اس لیے شاعری بھی شروع کی۔ پینٹنگ اور موسیقی میں بھی دلچسپی لینا چاہتا ہوں۔ لیکن بچپن میں موسیقی کے لئے نااہل قرار دے دیا گیا تھا۔ تاہم مجھے طبلہ بجانا سکھایا گیا۔ لیکن طبلہ میں اپنا ہنر دکھانے کے لیے کسی اور کا سہارا لینا پڑتا ہے اس لئے میں نے طبلہ بجانا چھوڑ دیا۔ کوئی پچیس سال تک طبلوں کی ایک جوڑی ہمارے ساتھ بھٹکتی پھرتی رہی۔ دو سال ہوئے میری بیوی نے اُسے بیچ کر ۳۰ روپے کما لیے میرے فن کا فائدہ ہمیشہ مجھے کم اور دوسروں کو زیادہ ہوا ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ کوئی بھی آرٹسٹ اظہارِ خیال کے لئے ایک میڈیم سے مطمئن نہیں رہ سکتا۔ جبکہ۔ مدراپا دنگ نے کہا ہے تخلیقی تحریک مختلف ذرائع سے

www.taemeernews.com

ظہور میں آسکتی ہے۔ ایک ہی فنکار کا وجدان لفظوں میں، رنگ میں، بت تراشی میں، موسیقی میں، رقص یا شاعری میں آشکار ہو جاتا ہے۔ فارم کا انحصار اس بات پر ہے کہ فنکار کا تصور یا جذبہ اُس کے شعور میں کس روپ سے اُبھرا۔ خیر اس جگہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میرا کہنے کا منشا یہ ہے کہ میں صرف ادیب ہونے پر ہی مطمئن نہیں بلکہ چاہتا ہوں کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے اُس کا اظہار کبھی پینٹنگ میں کبھی بت تراشی میں اور کبھی دوسرے فنونِ لطیفہ کے ذریعہ کرسکوں۔ لیکن انسان کی زندگی اتنی مختصر ہے کہ وہ ایک فن پر عبور حاصل کرنے کے لئے بھی کافی نہیں۔

موت کا خیال مجھے بارہا آتا ہے۔ کبھی کبھی خودکشی کا خیال بھی آتا ہے۔ ایسے خیال کیوں آتے ہیں اس کے بارے میں میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بظاہر میں خوشحال ہوں اور مجھے کوئی ایسی دماغی بیماری بھی نہیں۔ عمر کا کوٹا بھی مجھے اوسط سے کم ہی ملا ہے۔ پھر بھی میں نے موت اور اُس کے تصور سے اکثر محبت کی ہے۔ زندگی اور موت دونوں سے یکساں طور پر محبت کرتا ہوں اور ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ کس کے ساتھ نباہ کروں لیکن مجھے معلوم ہے کہ موت صابر اور ماہر معشوق ہے۔ وہ میرا انتظار کرے گی اور ایک نہ ایک دن لذتِ وصل سے سیر ہوگی۔ تب تک میں خود بھی اور دوسروں کو بھی ہنساتا اور رُلاتا رہوں گا۔ اس سے صحت اچھی رہتی ہے۔

حیدرآباد کا تغرافیہ

تغرافیہ ـــــ ایک نئی اصطلاح ہے جو تاریخ اور جغرافیہ کو ملا کر بنائی گئی ہے اس کے تحت تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ تہذیب و تمدن اور سیاسی و اقتصادی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔ طویل عرصہ سے حیدرآباد پر ایک جامع اور مستند مضمون کی کمی محسوس کی جارہی تھی۔ یہ مضمون اس اُمید کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھ کر یہ کمی اور بھی شدت کے ساتھ محسوس کی جائے گی۔

حیدرآباد اصل میں ایک مونث بستی تھی جو بعد میں مذکر شہر بن گیا۔ اس کا اصلی نام "بھاگیہ نگر" تھا۔ جب اس کی سیکس بدلی تو یہ حیدرآباد بن گیا ـــــ اس طرح جنس کی اس پیمانہ پر تبدیلی کا معجزہ پہلی بار یہیں ہوا۔ آج کل کے اونچے سائنسدان اِکے دُکے کیس میں سیکس بدل کر اپنے آپ کو بڑے تیس مار خاں سمجھتے ہیں۔ یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ صدیوں پہلے ہندوستان میں ایک پورے شہر کی سیکس بدل دی گئی تھی۔ یہاں کے لوگوں کو اب بھی یہی خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں دوبارہ پھر ویسی ہی تبدیلی نہ واقع ہو جائے۔ اس لیے وہ کسی قسم کے جنسی تذکرے سے احتراز کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی نوٹ کیا ہوگا کہ یہاں کے پرانے خاندانوں کی بیگمات اور امیرزادیاں ابھی تک اپنے آپ کو جنس مذکر مان کر بات کرتی ہیں۔ مثلاً "میں وہاں گیا"۔۔۔ "میں آپ کو کھاؤں گا" وغیرہ وغیرہ

حیدرآباد بہت خوبصورت شہر ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس کو لاثانی نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ اس نام کا ایک اور شہر

www.taemeernews.com

پاکستان کے صوبہ سندھ میں بھی واقع ہے۔ آزادی سے پہلے جب سندھ، ہندوستان کا ایک صوبہ تھا۔ ان دونوں شہروں میں امتیاز کرنے کے لئے ہمارے شہر کو دکن کا تخلص دیا گیا تھا۔ (اس کے سود مند نتائج کا ذکر بعد میں کیا گیا ہے) تقسیم ہند سے پہلے ان دونوں شہروں میں کافی کنفیوژن (CONFUSION) رہتا تھا۔ اکثر مسافر حیدرآباد سندھ کا ٹکٹ لے کر گاڑی میں بیٹھتے تو حیدرآباد دکن آ پہنچتے۔ مشہور شاعر جوش ملیح آبادی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ (نتیجتہً وہ بے چارے دس پندرہ سال کی تاخیر کے بعد اپنی منزل مقصود تک پہنچے)۔ اس افراتفری سے بچنے کے لئے تقسیم ہند کے وقت سندھی حیدرآباد پاکستان کو دے دیا گیا اور اس کے بدلے کچھ سندھیوں کو لے لیا گیا۔

اس امر کے بارے میں اختلاف رائے ہے کہ یہ حیدرآباد پہلے قائم ہوا یا سندھ کا حیدرآباد۔ اب چوں کہ وہ حیدرآباد ہمارے ملک میں نہیں اس لیے ہمیں یہ کہنے میں کوئی گریز نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ حیدرآباد پرانا ہے اور ہمارا حیدرآباد نیا۔ اس لئے یہ زیادہ خوبصورت بھی ہے۔ کئی مورخین کی رائے ہے کہ بانی شہر محمد قلی قطب شاہ نے اپنے ماہر معماروں کو ڈیپوٹیشن پر سندھ بھیجا تاکہ وہ وہاں کے حیدرآباد کا بغور مطالعہ کر کے یہاں کے لیئے ایک ایسے شہر کا منصوبہ بنائیں جس میں اس شہر کی کوئی بھی خامی نہ ہو۔ ان ماہروں کو یہاں کے لیے نئی خامیوں کی تلاش میں کافی محنت کرنی پڑی۔ اس محنت کے صلے میں ان کو ڈبل ٹی اے اور ڈی اے منظور کیا گیا۔

محمد قلی قطب شاہ کو عمارتیں بنوانے کا بہت شوق تھا۔ ایک بار جب وہ دلی گیا تو شوق شوق میں اس نے ایک بہت اونچا مینار بنا دیا۔ جسے آج کل قطب مینار کہتے ہیں۔ جب یہاں کی رعایا کو یہ بات معلوم ہوئی تو ان میں غیض و غضب کی ایک لہر دوڑ گئی کہ اپنے شہر کو چھوڑ کر دلی میں مینار بنوانے کا کیا مطلب۔ بادشاہ نے دلی والے آرکیٹکٹ کو بلا کر اسے یہاں بھی ویسا ہی مینار بنانے کو کہا۔ لیکن قطب مینار بناتے بناتے وہ آرکیٹکٹ بے چارہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اب اس میں اس بلندی پر پہنچنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ جب اس نے اپنی معذوری ظاہر کی تو بادشاہ نے کہا کوئی مضائقہ نہیں تم چار چھوٹے چھوٹے مینار بنا دو ہم کسی اور نوجوان آرکیٹکٹ کو کہہ دیں گے کہ وہ ان کو ایک دوسرے کے اوپر کھڑا کر کے ایک اونچا مینار تیار کر دے۔ جب چاروں مینار علیحدہ علیحدہ تیار ہو گئے تو ایک مدبر نے صلاح دی کہ عالم پناہ آپ کیوں نہ چار مینار علیحدہ علیحدہ ہی رہنے دیں۔ اس طرح آپ رعایا کو کہہ سکتے ہیں کہ اگر آپ نے دلی میں ایک مینار بنوایا تو یہاں کے لوگوں کے لیے چار مینار بنوائیے۔ اس کے علاوہ آپ کے نام کے چار حصوں یعنی محمد قلی قطب اور شاہ کے لیے ایک ایک مینار یادگار رہے گا۔ بادشاہ کو یہ صلاح پسند آئی اس سے نہ صرف فوری طور پر اس کی شخصیت کو چار چاند بلکہ چار مینار لگ گئے اور ہمیشہ کے لیے اس کا نام امر ہو جانے کا امکان پیدا ہو گیا۔ اس مدبر کو ایسی صلاح دینے کی پاداش میں پدما بھوشن کے خطاب سے نوازا گیا اور اس طرح حیدرآباد کا امتیازی نشان وجود میں آیا۔

چار مینار کی دھوم جب دلی تک پہنچی تو مغل بادشاہ اورنگ زیب کے دل میں اسے دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی اس نے جب دکن کے دورہ کا پروگرام بنایا تو اس کا سپہ سالار اور فوج کے ہزاروں سپاہی سیاحت کے شوق میں اس کے ساتھ ہو لئے۔ یہاں لوٹ مار کرنے والوں کی بھیڑ اتنا تھا کہ اورنگ زیب کو چھ مہینے انتظار کرنا پڑا۔ بے تاب ہو کر اس نے شہر پر دھاوا بول دیا۔ یہ عمارت دیکھی تو اتنی پسند آئی کہ سات سال تک یہیں ٹکا رہا۔ آخر

www.taemeernews.com

چار مینار کی تصویر دل میں لیے وہ دکن میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔

مغلوں کے ایک صوبیدار آصف جاہ نے خود مختاری کا اعلان کر کے یہاں آصف جاہی خاندان کی بنیاد رکھی۔ لیکن مغلوں کے تئیں وفاداری دکھانے کے لیے اس نے اپنا لقب نظام ہی رکھا دیسی ریاستوں کے راجاؤں کو انگریزی سرکار نے ہز ہائی نس کے خطاب سے نوازا تھا لیکن چوں کہ حیدر آباد سطح مرتفع ہے اور یہاں کی سطح دوسری ریاستوں کے مقابلہ میں اونچی یعنی ایکزالٹڈ ہے۔ اس لیے نظام کو محض جغرافیہ کی بنا پر ہز ایکزالٹڈ ہائی نس کا خطاب دیا گیا۔

یہاں کے ایک نظام نے عثمانیہ یونیورسٹی کی بنیاد رکھی۔ اس یونیورسٹی کی خاص خوبی یہ تھی کہ یہاں کا ذریعہ تعلیم اردو تھا اور اردو کے علاوہ باقی تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے تھے۔ جب اردو کے طلباء نے ایجی ٹیشن کیا کہ انہیں بھی اس زبان میں تعلیم حاصل ہونی چاہیئے تو حکومت نے ذریعہ تعلیم بدل کر انگریزی کر دیا۔ یہاں کے پرانے طلباء آج تک انگریزی بھی اردو میں بولتے ہیں۔ آج کل اس یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم ایجی ٹیشن ہے اور ہر مضمون اس کے ذریعہ پڑھایا جاتا ہے دور دراز سے طلباء یہاں یہ مضمون پڑھنے آتے ہیں۔

حیدرآباد میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن کبھی کوئی نہیں جاتی۔ یہ اس لیئے کہ ہر زبان میں دوسری زبانوں کا رنگ زیادہ ہے۔ مثلاً تلگو میں اردو اور مراٹھی کے الفاظ کی بھرمار ہے اور اردو میں کنڑا، تلنگی اور مراٹھی اصطلاحوں کی بہتات ہے۔ اس لیئے یہاں ایک زبان سمجھنے کے لیئے تین زبانوں میں مہارت لازمی ہے۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ تینوں زبانوں کو جاننے کے لیئے تو زبانوں پر عبور کی ضرورت ہوگی اس لیئے لوگوں کا خیال ہے کہ اس ریاست کو دو حصّوں میں بانٹ دینا چاہیئے ایک میں تلگو زبان رائج ہوگی اور دوسرے میں بھی تلگو۔

ہم نے اوپر لکھا ہے کہ سندھی حیدر آباد سے امتیاز کرنے کے لیئے اس شہر کو دکن کا تخلص دیا گیا تھا۔ اس کا ایک اثر یہ ہوا کہ یہاں بے شمار شاعر پیدا ہو گئے۔

حیدرآباد کا بانی محمد قلی قطب شاہ اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر تھا اس نے اتنے شعر کہے ہیں کہ اس کو ایک تخلص کافی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے تین تخلص رکھے۔ قطب شاہ معانی اور ترکمان۔ اس کے بعد روایتاً ہر بادشاہ کو شعر کہنا لازمی ہو گیا۔ لیکن ان بادشاہوں کی شاعری میں وہ بات نہیں جو قلی میں ہے۔ وہ بادشاہ چوں کہ اصلاً قلی تھا اس لیئے اس کی شاعری غریبوں مزدوروں اور قلیوں کے جذبات کی عکاسی کرتی ہے۔ اس کی زیادہ تر شاعری پنجابی میں ہے۔ اس طرح اس نے طبقاتی لسانی اور علاقائی رواداری کی بنیاد رکھی۔ آج کل اس کی شاعری کو یہاں کوئی نہیں سمجھتا۔

حیدرآباد نے بہت بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا کیئے ہیں لیکن ان میں سے کوئی لافانی نہیں ہو سکا کیونکہ یکے بعد دیگرے سب مر گئے۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہاں کی مٹی میں کچھ ایسی بات ہے کہ جو شاعر اور ادیب یہاں پیدا ہوتا ہے وہ ایک نہ ایک دن مر جاتا ہے۔ اس لیئے کئی شاعر یہاں سے ہجرت کر گئے۔ اب جب کہ اس شہر کا تخلص منسوخ کر دیا گیا ہے۔ شاعری کو بھی کافی نقصان پہنچا ہے تاہم دکنی شاعری اب بھی بہت مقبول ہے اور مشاعرے اب بھی بہت کامیاب رہتے ہیں۔ جب بھی شکیلہ بانو بھوپالی دوسرے شعرا کا کلام پیش کرتی ہے تو بے پناہ ہجوم ہوتا ہے۔

اب یہاں کے جغرافیہ کے بارے میں چند اہم معلومات پیش ہیں۔ حیدرآباد کا محل وقوع بہت ہی عمدہ ہے۔ ایک طرف شمال، دوسری طرف مشرق تیسری طرف مغرب اور چوتھی طرف جنوب ہے۔ سب سے زیادہ جنوب ہے اس

www.taemeernews.com

لیئے بھی اسے دکن کہا جاتا ہے۔ "دقوع" کے مقابلہ میں یہاں محل زیادہ ہیں۔ محلات شاہی میں چار محل چو محلہ اور فلک نما زیادہ مشہور ہیں۔ عموماً شہر دریا کے کنارے واقع ہوتے ہیں۔ اس روایت کو پیش نظر رکھ کر اس شہر کے کنارے ایک دریا بہانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کو موسیٰ ندی کہا جاتا ہے۔ یہ دریا ابھی تک پوری طرح آباد نہیں ہوا۔ اس میں پانی برائے نام ہے اور چٹانوں، کائی اور گھاس کی بھرمار ہے۔ چٹانوں کو توڑنے کا ٹھیکہ دھوبیوں کو دیا گیا ہے جو انھیں کپڑوں سے توڑتے ہیں۔ کپڑے سکھانے کی سہولت کے لیے دریا پر جا بجا پل بنائے گئے ہیں ایک پل پر صرف چادریں سکھائی جاتی ہیں۔ اس کا نام چادر گھاٹ پل ہے اس طرح پرانے پل پر پرانے کپڑے سکھائے جاتے ہیں اور نئے پل پر صرف ٹیری لین کے نئے کپڑے۔ مسلم جنگ پل پر اکیس سردیس میں مسلمان سکھائے جاتے ہیں۔ یہ نام نہاد دریا ۵۰ سال میں صرف ایک بار دریا بنتا ہے باقی وقت دھوبی گھاٹ کا کام دیتا ہے۔ جب یہ دریا بنتا ہے تو بڑا غضب ڈھاتا ہے۔ ۱۹۰۸ء میں اور پھر ایک بار ۱۹۷۰ء میں اس کے پانی سے بہت تباہی آئی تھی اب امید ہے کہ اس صدی کی طغیانیوں کا کوٹا پورا ہو گیا ہوگا۔

دریا کے ایک کنارے پر ہسپتال ہے اور دوسرے کنارے ہائی کورٹ، فوجداری کیسوں کے شکاروں کو پہلے ہسپتال کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ علاج معالجہ کے بعد عدالت میں پیش کیا جاتا ہے اگر وہ ان دونوں جگہوں سے زندہ بچ جائیں تو انھیں جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ جو ہائی کورٹ سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ہے۔

یہاں کے بازار اور سڑکیں کشادہ ہیں۔ مرکزی شاہراہ اتنی لمبی ہے کہ اس کے ایک ایک حصہ کا علیحدہ علیحدہ نام رکھا گیا ہے۔ چار مینار کے پاس اس کا نام پتھر گھٹی ہے۔ دریا پار کر کے اس کا نام افضل گنج اور عثمان گنج بن جاتا ہے جو نظام جابی مارکٹ کے بعد وہ جواہر لعل نہرو سڑک بن جاتی ہے۔ اس کے بعد عابد روڈ، بشیر باغ، پھر کنگ حسین ساگر۔ وہاں پہنچ کر ایک شاخ مہاتما گاندھی بن جاتی ہے اور دوسری راشٹرپتی۔ راشٹرپتی سے بچ کر جو حصہ سکندرآباد کی چھاؤنی میں داخل ہو جاتا ہے اسے بریگیڈیر سعید کی وردی پہننا پڑتی ہے۔ اس کے بعد سنا ہے کہ وہ سڑک نظام آباد چلی جاتی ہے لیکن میں کئی بار اس سڑک پر گیا ہوں میں نے تو اسے کہیں بھی جاتے نہیں دیکھا۔ وہیں کی وہیں پڑی ہے۔ اس شاہراہ کے علاوہ بے شمار اور سڑکیں ہیں لیکن فی الوقت ہمارے پاس ان کے نام لکھنے کی گنجائش نہیں۔ مرکزی شاہراہ اتنی کشادہ ہے کہ دس رکشا باند بازو چل سکتے ہیں اور پھر بھی بس کے لیئے جگہ رہ جاتی ہے۔ یہاں کی رکشا بہت چھوٹی اور بسیں بہت لمبی اور اونچی ہوتی ہیں۔

حیدرآباد کی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی آدھی بسوں کے انجن چوری ہو گئے ہیں اس لیئے ان کو دوسری بسوں کے پیچھے باندھ کر چلایا جاتا ہے۔ کئی بار پچھلی بندھی ہوئی بسوں نے بور ہو کر بندھن توڑ واکر بھاگنے کی بھی کوشش کی ہے۔ دو منزلہ بسیں یہاں بہت عام ہیں۔ یہاں کی بسوں کی دو خوبیاں ہیں۔ دو منزلوں میں سے ایک منزل کے مسافر فری سفر کرتے ہیں۔ بسوں کے رکنے کا سسٹم مسافروں کی صحت کی ضرورت کو ملحوظ رکھ کر بنایا گیا ہے۔ روڈ کارپوریشن نے جگہ جگہ اسٹانڈ بنائے ہیں۔ ان کو کہا تو جاتا ہے بس اسٹانڈ لیکن یہ ہوتے اصل میں پبلک اسٹانڈ ہیں۔ لوگ یہاں کھڑے رہتے ہیں۔ بس یا تو اس سے کچھ پہلے ہی یا اس کے کچھ فاصلہ آگے ہی رکتی ہے مسافروں کو وہاں تک بھاگ کر بس پکڑنی پڑتی ہے۔ اس جبری کسرت کی وجہ سے حیدرآباد کی جنتا کی صحت دوسرے شہروں کے رہنے والوں سے بہتر ہے۔ کرایہ دینے کے بھی یہاں دو سسٹم ہیں۔ اگر آپ ٹکٹ خریدنا چاہتے ہیں تو کرایہ پورا لگتا ہے۔ اگر آپ ٹکٹ خریدنے پر اصرار نہ کریں تو آپ آدھے کرایہ پر بھی سفر کر سکتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ اس سے کھلنی کے ٹکٹیں چھپوانے کا خرچ بچتا ہے۔ چھوٹا موٹا بیگ کنڈاکٹر خود ہی "ٹپ" کے طور پر رکھ لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کا

www.taemeernews.com

بس سسٹم ہندوستان میں سب سے زیادہ 'انفارمل' اور سستا ہے۔ یہاں کی بسیں بہت دندناکر چلتی ہیں اور خوب دھواں چھوڑتی ہیں اس سے کم بینائی اور اونچا سننے والے لوگوں کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ بس کدھر اور کب گئی۔ اب چونکہ بسوں پہ ٹرافک لوڈ بھی بڑھ رہی ہے اس لیئے تجویز ہے کہ تین یا چار منزلہ بسیں بنائی جائیں۔ اس سے سفر اور بھی سستا ہوجائے گا۔

حیدرآباد کے مختلف محلوں کے نام جسم کے حصوں یا بیماریوں پر رکھے گئے ہیں۔ مثلاً امیرپیٹ، بیگم پیٹ، رحیم پیٹ وغیرہ بلغم پیٹ بھی ایک محلہ کا نام ہے۔ نئی آبادیوں کے نام جسم کے دوسرے حصوں پر رکھے جائیں گے۔ کچھ اور نام مندرجہ ذیل ہیں۔ ماما جمیلہ کی داڑھی، چیلہ پورہ، گھاسی میاں بازار، کوکا کی ٹٹی۔ گھوڑے کی قبر، زچہ کی قبر، سلیمان جاہ کی چاڑی۔ چوکِ مُرغاں۔ شہر کے اطراف کئی خوبصورت جھیلیں ہیں۔ ایک جھیل حیدرآباد اور سکندرآباد کے درمیان واقع ہے۔ ان جھیلوں کو ساگر کہا جاتا ہے۔ امرود کو جام کہتے ہیں۔ روایت ہے کہ امرود کھاکر اگر کسی جھیل کا پانی پی لیا جائے تو وہی نشہ چڑھتا ہے جو جام نوش کرنے پر آتا ہے۔

اب ایک راز کی بات بتاتا ہوں۔ حیدرآباد دراصل دو شہر ہیں۔ ایک حصہ کا نام حیدرآباد اور دوسرے کا نام سکندرآباد۔ دونوں کو جڑواں شہر بھی کہا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے سکندرآباد۔ سکندرآعظم کے نام پر آباد ہوا تھا۔ سکندر ہندوستان کا پہلا یوروپین حملہ آور تھا۔ پورس سے لڑائی کے بعد وہ حیدرآباد آیا۔ یہاں اس نے یونانی دواخانے کا سنگِ بنیاد رکھا اور اس کے لیے یونانی اکسپرٹ اور فارین ایڈ دینے کا وعدہ کیا۔ یہ دواخانہ اب بھی چارمینار کے بازو قائم ہے۔ سنگِ بنیاد کی رسم کے بعد سکندرآعظم کے اعزاز میں پریڈ گراؤنڈ میں شاندار پریڈ ہوئی۔ اور ساتھ ہی اس شہر کا نام سکندرآباد رکھا گیا۔ یونانی فاتح بجائے خوش ہونے کے معترض ہوا کہ اس کا پورا نام سکندرآعظم ہے اور شہر کا نام صرف سکندرآباد رکھا گیا ہے۔ اس کمی کی تلافی کے لیئے فیصلہ ہوا کہ حملہ آور کے خطاب پہ ایک محلہ کا نام اعظم پورہ رکھ دیا جائے۔ تب کہیں جاکر ہمارے معزز حملہ آور کی تسلی ہوئی۔ اور وہ یہاں سے واپس چلا گیا۔ اس دن سے آج تک اس آمد کی یادگار میں سکندرآباد پریڈ گراؤنڈ پہ ہر سال دوبار پریڈ ہوتی ہے۔ ایک گرمیوں میں اور ایک سردیوں میں۔

ان جڑواں شہروں کی آبادی تقریباً (۲۰) لاکھ ہے۔ پچھلی مردم شماری کے اعداد و شمار کے مطابق غیر شادی شدہ طبقے میں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی تعداد کم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے پچاس سالوں میں عورتوں کی شادیاں زیادہ ہوئی ہیں۔ اب حیدرآباد کے نئے کلکٹر نے احکام جاری کردیئے ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو عورتوں اور مردوں کی شادیاں بیک وقت ہوں۔ اس سے خرچ میں بھی بچت ہوگی اور توقع کی جاتی ہے کہ اگلی مردم شماری تک دونوں کی تعداد میں توازن پیدا ہوجائے گا۔

حیدرآباد کی آب وہوا اور غذا میں ایک خاص اثر پایا جاتا ہے جس سے یہاں کے لوگوں کی یادداشت کمزور ہوجاتی ہے وہ اپنے ماضی کے بارے میں صرف کل اور پرسوں تک ہی یاد رکھ سکتے ہیں۔ اس سے پہلے کے واقعات پرسوں تک ہی منجمد ہوکر رہ جاتے ہیں۔ کوئی واقعہ دو دن پہلے ہوا ہو یا پچاس سال پہلے پرسوں کی بات ہی کہا جاتا ہے۔ اکثر بزرگ ۱۹۰۸ء کی باڑھ کو بھی پرسوں کی طغیانی کہتے ہیں۔

یہاں کے لوگ بڑے ملنسار اور خوش طبع ہیں۔ برتاؤ میں بڑے سلیقہ شعار ہیں۔ ایسے لوگ گورنر اچھے بنتے ہیں اس لیے یہاں کے کئی معزز شہری گورنر بنا کر دوسرے صوبوں کو برآمد کیئے جاتے ہیں۔ سروجنی نائیڈو، پدمجا نائیڈو، رام کرشنا راؤ، سری نیواس۔

www.taemeernews.com

علی یاور جنگ، گوپال ریڈی اور اکبر علی خان یہیں سے گورنر بن کر گئے یہاں کے بنائے ہوئے گورنر اتر پردیش میں خاص طور پر پسند کئے جاتے ہیں۔

حیدرآباد جو بھی آتا ہے اسے اپنا لیتا ہے۔ یہاں کی مٹی ہر شخص کو اپنے وطن کی مٹی لگتی ہے۔ اس لیئے یہاں ہندوستان کے ہر کونے سے بلکہ دوسرے ممالک سے بھی لوگ آکر بس گئے اور جانے کا نام تک نہیں لیتے۔ جنوب کے لوگ اسے حد جنوب مانتے ہیں شمال کے لوگ اسے خط شمال سمجھتے ہیں۔ یہاں کے پرانے شہر میں بغداد اور بصرہ کا ماحول ملتا ہے سکندرآباد کی چھاؤنی پر لندن اسٹریٹ چھاپ ہے کافی ہاؤس پال گھاٹ کے لوگ چلاتے ہیں۔ چائے خانے ایرانیوں کی، ہوٹل دیسی ہیں۔ دیسی ہوٹل کے اکسپرٹ منگلور کے برہمن ہیں۔ بزنس میں مارواڑی اور سندھی پیش پیش ہیں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پارسی یہودی ہر قسم کے لوگ ہر موسم میں پائے جاتے ہیں۔ یہ شاید اسی مذہبی علاقائی اور تہذیبی ہم آہنگی کا نتیجہ ہے کہ یہاں زیادہ تر موسم خوشگوار اور معتدل ہوتا ہے۔ ویسے یہاں گرمیوں میں کڑاکے کی گرمی پڑتی ہے سردیوں میں سردی بھی خوب ہو جاتی ہے۔ برسات کے موسم میں جھڑی بھی اچھی لگتی ہے باقی سال موسم معتدل رہتا ہے۔

حیدرآباد چھوٹے پیمانے پر ہندوستان کی تصویر ہے۔ ہمارے ملک کی طرح اس شہر میں بھی کثرت میں وحدت پائی جاتی ہے۔ یہ شہر بھی ہمارے ملک کی طرح گلہائے رنگا رنگ کا گلدستہ ہے جس کی مہک سے سارا چمن معطر ہے۔

اگر حیدرآباد جیسے آٹھ دس اور شہر ہندوستان میں آباد ہو جائیں تو یہ ملک رشک جنت ہو جائے گا۔

سُنا ہے کہ پانچویں پنچسالہ منصوبے کے لیئے یہ تجویز زیر غور ہے!!

جنت کا مقدمہ!

جنت اور دوزخ کی دیواریں ایک ہوتی ہیں چنانچہ مارے دوزخی جنت کی دیواریں توڑ کر اندر آجاتے ہیں۔ جنت والے بہت پریشان ہوئے کہ بار بار دیوار بناتے ہیں اور دوزخی توڑ ڈالتے ہیں انھوں نے پریشان ہوکر کہا،

"ہم لوگ تم دوزخیوں پر مقدمہ کردیں گے"

سارے دوزخی ہنسنے لگے، بولے "میاں تم مقدمہ جیتو گے کیسے؟ سارے جج اور وکیل تو ہمارے پاس ہیں"

www.taemeernews.com

خودنوشت

وجاہت علی سندیلوی

مرزا غالب کو اپنے محبوب سے یہ شکایت تھی ؎

کب وہ سنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

لیکن مجھے اپنے دوست سے اس کے برعکس شکایت ہے یعنی وہ میری ہی زبانی میری زندگی کا کچا چٹھا سننا چاہتے ہیں اور میرے لئے کچھ اس قسم کی صورتِ حال پیدا کر دی ہے ؎

اس پہ مچلے ہیں کہ زخمِ جگر دیکھیں گے

اس سلسلے میں ایک دفعہ مولانا فروغ اللہ سے گفتگو چھڑی تو فرمانے لگے "میاں زندگی میں جب تک حسن اور عشق کی کچھ چھیڑ چھاڑ، رقیبوں سے جوتی پیزار، شکوۂ فلک بکجدفتار، بزرگوں کی ڈانٹ پھٹکار، گھر سے فرار، تلوار جیسی گفتار، پہاڑ جیسا کردار اور پھر خزاں میں بہار یعنی نیا بننے کا چمتکار شامل نہ ہو، وہ دو کوڑی کی بھی نہیں۔ اُس کو بیان کرنے سے فائدہ؟ کس کو دلچسپی ہے کہ آپ نے کس سن میں بی۔ اے پاس کیا اور آپ کی روایتی شادی کب اور کہاں ہوئی اور آپ نے کس منحوس گھڑی ادب کا کلیجہ چھلنی کرنے کے لئے قلم اُٹھایا اور کیوں اور کیسے کسی کم بخت پبلشر نے آپ کی پہلی کتاب شائع کی جس پر آپ کی سازش سے آپ کے محلّے کے چند پگڑ منڈا دیوں اور شاعروں نے آپ کو ایک کُل ہند انعام دے دیا تھا۔ آپ کی پوری زندگی کے حالات سے کہیں زیادہ پُر لطف، دلچسپ اور سنسنی خیز کسی بندر کے روز ناچے کا صرف ایک پیراگراف ہوگا۔"

اس بے تکی شاعرانہ بے نکان لکچر کے درمیان مولانا نے مجھے ہکا بکا اور حواس باختہ ہو جانے کی وجہ سے خاموش دیکھا تو انہیں شاید رحم آگیا اور اُنہوں نے اپنی منہ کی توپ کے نشانے کا رُخ زرا سا بدل دیا "میرا مطلب یہ ہے میاں! کہ بغیر نک مرچ چھڑکے کسی کے بھی حالاتِ زندگی دلچسپ اور جاذبِ توجہ ہو ہی نہیں سکتے اور اسی وجہ سے میرا عقیدہ کیا ایمان ہے کہ جتنا افسانوی ادب تاریخوں اور آپ بیتیوں میں ملتا ہے اتنا خود افسانوں اور ناولوں میں بھی نہیں۔" اور پھر جیسے ہی وہ دم لینے کے لیئے رکے میں سلام کرتا ہوا یہ کہکر رخصت ہوگیا "حضور میرا بھی عقیدہ کیا ایمان ہے کہ مرزا غالب کا محبوب آپ ہی کا ہم خیال ہوگا۔"

اس یاوہ گوئی کے بعد اب سنیئے حالاتِ زندگی۔ یکم مارچ ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوا۔ میرے والد چودھری عشرت علی صاحب سندیلے کے اچھے بڑے زمینداروں میں تھے۔ سات لڑکیوں کے درمیان میں اُن کا اکلوتا لڑکا تھا، ماں باپ کی بے کراں محبت اور ناز برداریوں میں ابتدائی بچپن گزرا۔ میں آٹھ برس کا تھا کہ دفعتاً بالکل غیر متوقع ایک بچے کی پیدائش کے

www.taemeernews.com

وقت میری ماں کا انتقال ہوگیا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ اس سانحے کا میرے دل و دماغ پر کیا اثر ہوا۔ موت کی سفاکی دیکھنے اور محسوس کرنے کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا اور غالباً اس روز سے میں بچہ نہیں رہا اور میرا خیال ہے کہ کوئی بھی بچہ خواہ وہ کتنا ہی کم عمر کیوں نہ ہو اپنی ماں کے مرجانے کے بعد بچہ نہیں رہ جاتا۔ اُس کی معصومیت میں غم کا زہر گھل جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرا غم کی عظمت پر یقین، اور مجبور کی دردمندی کا احساس میری ماں کی اچانک اور نا وقت موت ہی کی دین ہے۔

میرے والد مجھ سے ٹوٹ کر بے پناہ محبت کرتے۔ اُنہوں نے مجھے اسکول بھیجنے کے بجائے گھر پر مولویوں اور ماسٹروں سے کلام پاک، اردو اور انگریزی پڑھوائی۔ مقامی اسکول میں صرف ایک سال آٹھویں درجے میں میں نے تعلیم پائی۔ اس کے بعد لکھنؤ جو سندیلے سے صرف ۵۰ کیلومیٹر ہے بھیج دیا گیا۔ کرسچین کالج اور پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہاں سے بی۔ اے اور پھر ۱۹۳۹ء میں ایل۔ ایل۔ بی کیا۔ درسی سے زیادہ غیر درسی باتوں میں منہمک رہنے کے باعث میں کبھی شمار طالب علم نہیں رہا۔ البتہ ٹینس اور بیڈمنٹن میں کالج اور یونیورسٹی کے کئی انعامات حاصل کیے۔ تقریری مقابلوں میں لکھنؤ، دہلی، الٰہ آباد میں کل ہند مقابلے جیتے۔ انگریزی انشا پردازی میں ۱۹۳۷ء میں ایک کل ہند مقابلے میں انعام حاصل کیا۔ اسکول، کالج اور یونیورسٹی یونین میں کئی عہدوں پر فائز رہا۔ ۱۹۳۸ء میں یونیورسٹی یونین کا وائس پریسیڈنٹ منتخب ہوا اور یونیورسٹی پارلیمنٹ کی سوشلسٹ حکومت میں ہوم منسٹر چنا گیا۔

زمیندار خاندان کے دوسرے بزرگوں کے برعکس میرے والد ہندوستان کی آزادی کے خواہاں اور کٹر نیشنلسٹ تھے وہ بہت سے ایسے اردو اور انگریزی اخبارات منگواتے جو کانگرس کی جدوجہد آزادی کے موئد تھے۔ ان اثرات کی فضا میں بہت کم عمری ہی سے میں گاندھی جی، جواہر لال جی اور کانگرس کے دوسرے رہنماؤں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگا۔ کالج اور یونیورسٹی میں جدلیاتی مادیت اور کمیونزم کا بہت چوکھا رنگ چڑھ گیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے ابتدائی ممبروں میں میرا بھی نام تھا۔ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک میں اتر پردیش کانگرس کمیٹی کے اردو سکشن کا پروپگنڈا سکریٹری اور اس کے پندرہ روزہ خبرنامے کا اڈیٹر رہا۔ طلباء کی تحریکوں اور کانگرس کی عملی سیاست میں، میں بہت پیش پیش رہا۔ کئی مرتبہ صوبہ کانگریس کمیٹی اور کل ہند کانگرس کمیٹی کا ممبر منتخب ہوا۔

وکالت کا امتحان پاس کرنے اور اس کی مقررہ ٹریننگ لینے کے بعد میں نے ۱۹۴۰ء سے وکالت شروع کردی اور اتفاق سے وہ دو تین ہی سال میں کچھ ایسی چل نکلی کہ میں اُس میں زیادہ مصروف رہنے لگا۔ والد صاحب مرحوم اس وقت بہت ضعیف ہو چکے تھے اور اُن کی شاہ خرچی اور سادہ لوحی سے اُن کی اچھی خاصی جائیداد کی حالت بہت ابتر تھی، اُس کی دیکھ بھال کی ذمے داری میرے ہی سر آگئی۔ بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور وہ اپنی اپنی سسرال میں رہتیں والد صاحب مجھ سے اتنی محبت کرتے اور ہر وقت ایسا اپنی نظروں کے سامنے رکھنا چاہتے کہ اکثر میرا کچہری جانا بھی مشکل ہو جاتا۔ اُن کی خدمت، تیمارداری اور ناز برداری کرنے کی سعادت میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

سیاست کے میدان میں میرے جو حوصلے اور ولولے تھے، وہ وکالت سے زیادہ خانگی ذمہ داریوں

www.taemeernews.com

کی نذر ہو گئے اور مجھ پر میرا ہی یہ شعر صادق آگیا ہے

کبھی میں کہکشاں کو چوم لیتا تھا مگر ہمدم
کروں کیا جب پرِ پرواز زیرِ دام آجائے

آزادی کے بعد بدقسمتی سے رفتہ رفتہ ہمارے ملک کی سیاست نے جو رخ پلٹا ہے اور جس طرح وہ اب حرص، خوشامد، منافقت اور عوام فریبی کی آماجگاہ بن کر رہ گئی اُس کو دیکھتے ہوئے مجھے کوئی پشیمانی نہیں کہ میں اس کے دریا میں صرف پیر ہی بھگو کر چلا آیا اور اس میں چھلانگ نہیں لگائی۔

میری عمر صرف بائیس سال کی تھی اور اس وقت تک میری تعلیم بھی مکمل نہیں ہوئی تھی جب والد صاحب نے میری شادی کر دی ؎

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

کسی لڑکی کو مجھ پر عاشق ہونے کا موقع ہی نہیں ملا۔ رہا میرے کسی پر عاشق ہونے کا سوال تو میں نے وہی کیا جو ایک بیوی بچوں والا بھلا آدمی کرتا ہے یعنی عشق کرنے کے لئے حسین عورتیں تو بہت سی پسند کیں لیکن پھر مرزا غالب کا یہ شعر پڑھ کر ؎

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

صبر کر لیا اور بڑی سعادت مندی سے اپنی بہت چاہنے والی بیوی کی دل جوئی میں لگ گیا۔ میرے دو بیٹے نہال عظمت ایڈوکیٹ اور جمال نصرت الگزیکیوٹو انجینیر ہیں اور تین بیٹیاں ہیں نجمہ۔ صبیحہ اور نگار۔ سب کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر صبیحہ انور کرامت ڈگری کالج میں شعبہ اردو کی صدر ہے۔ اُردو میں خود نوشت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا ہے؎ افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے دوسرا مجموعہ اور تنقیدی مضامین کا انتخاب زیرِ طبع ہیں۔

میں نے ۱۹۴۰ء سے مستقل وکالت کی ہے۔ صرف ایک سال کے لئے قومی آواز لکھنؤ میں بطور سب ایڈیٹر کام کیا۔ میرا سب سے گراں قدر مضمون مسلمان کدھر جائیں؟ ثابت ہوا۔ برطانی حکومت نے روزنامہ ہند کلکتہ سے اس مضمون کے شائع کرنے پر پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی تھی۔ مطالعہ کا شوق میری گھٹی میں پڑا ہے۔ شاید ہی کوئی منحوس دن گزرا ہو جب کم سے کم چار پانچ گھنٹے میں نے اس کار خیر میں نہ صرف کیے ہوں۔ بہت کافی فضول، واہی تباہی اور ادٹ پٹانگ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ انگریزی اور اردو ادبیات کا بھی مطالعہ کیا لیکن سعی کاش کہ میرا مطالعہ منظم اور کسی منصوبے کے تحت ہوتا تو اتنے پڑھنے کے بعد میں بھی کسی کام کا آدمی ہو جاتا۔ وکالت کرنے کے ساتھ ہی ۱۹۴۸ء میں اپنے قصبے سے ضلع پریشد کا ممبر منتخب ہو گیا اور ایجوکیشن چیرمین بنا دیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب صوبائی حکومت کی اردو دشمن پالیسی کے تحت ابتدائی درجوں سے اردو بے دخل کی جانے لگی تو میں نے بڑا احتجاج کیا اور جب

www.taemeernews.com

کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوئی تو قہر درویش بجان درویش کے مصداق نہ صرف چیرمین سے بلکہ نفع پر بیشد کی ممبری سے بھی استعفا دیدیا۔ ۱۹۵۳ء میں جب میونسپل بورڈ کے پریسیڈنٹ کا براہ راست عوام سے انتخاب ہوا تو میں اپنے قصبے کا پریسیڈنٹ منتخب ہوگیا اور قریب بارہ ہزار ووٹوں میں سے مجھے نو ہزار سے بھی زیادہ ووٹ ملے۔ میرے پانچ سال پریسیڈنٹ رہنے کی ایک یادگار قصبے کی قدوائی لائبریری ہے۔

لکھنے کا شوق طالب علمی کے زمانے ہی سے شروع ہوگیا تھا۔ میرے سنجیدہ انشائیوں کے تین مجموعے مزاحیہ انشائیوں، انشائیوں کے چار مجموعے۔ تنقید پر تین کتابیں اور بچوں کو اردو پڑھانے کا ایک قاعدہ شائع ہوچکا ہے کئی کتابوں پر اردو اکیڈیمی سے انعامات بھی ملے۔ اردو سے بے پناہ عقیدت اور محبت ہے کیوں کہ میں اسے صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب کا نشان، زندگی کا ایک نیا عرفان اور خود اپنی پہچان سمجھتا ہوں۔ جب اردو کے خلاف کوئی زہر اگلتا ہے تو مجھے کچھ ایسا لگتا ہے کہ جیسے مجھ پہ بلاواسطہ دشنام طرازی کی جارہی ہو۔

مزاح نگاری کو میں سب سے نازک اور مشکل فن سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ کسی بھی زبان کے ادب کی گہرائی اور گیرائی کا صحیح اندازہ اس کے طنز و مزاح کے معیار ہی سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کی سب زبانوں سے زیادہ شائستہ اور بصیرت افروز طنز و مزاح اردو کا ہے البتہ جب ہم اسے انگریزی کے مقابل میں دیکھتے ہیں تو ہندوستانی کا یہ دیا پستہ قد نظر آتا ہے۔

کوئی تخلص نہیں، کسی مشاعرے میں پڑھا نہیں، کسی اخبار میں چھپا نہیں، لیکن اب آپ سے کیا چوری میں کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہوں۔

لیجئے داستان حیات تمام ہوئی۔ حق، انصاف، مساوات، آزادی، جمہوریت۔ سوشلزم وغیرہ کے اقدار کے ڈکشن میں جو بت تراشے تھے اور جوانی میں جن کی خدا بنا کر پرستش کی تھی اُن کو اب بڑھاپے میں ٹوٹتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ اور ایک طرف یہ اقدار مصلحت اندیشی جاہ طلبی اور موقع پرستی کے ہاتھوں تباہ کئے جارہے ہیں اور دوسری طرف ان کے نعم البدل کوئی دوسرے اقدار اُبھر کر سامنے آئے بھی نہیں رہے ہیں۔ منزل کے چراغ بجھ چکے ہیں اور اندھیری رات میں قافلہ اپنی راہ سے بہت دور بھٹک چکا ہے۔ لیکن اس کا دل کا کیا کروں کہ وہ اب بھی انسان سے مایوس نہیں ہوا ہے، اس کی عظمت کا قائل ہے اور اُس کے مستقبل سے پُر اُمید ——— اپنے لیے یہی کہوں گا کہ کاوش اس بڑھاپے میں تو اپنے کو بوڑھا محسوس کرتا۔ ذہن کی جولانیوں، دل کی رنگینیوں اور آنکھوں میں خوابوں کا کچھ تو ہجوم کم ہو جاتا۔ آخر میں میرا ہی شعر سنیئے ؎

اپنی شرطوں پر بسر کی اُس نے اپنی زندگی
ایک شانِ کبریائی تیرے دیوانے میں تھی

www.taemeernews.com

وجاہت علی سندیلوی

برکت ایک چھینک کی

میری بھابی جان ساری دُنیا کے لئے تو بہت خلیق، بامروّت اور ہنس مُکھ واقع ہوئی تھیں لیکن صرف مجھ سے یعنی اپنے اکلوتے دیور سے جو اپنے والدین سے دُور اُن کی اور بھائی صاحب کی سرپرستی میں زیرِ تعلیم تھا۔ ہر وقت منہ پھُلائے رہتیں اور خدا لگتی پوچھیے تو اس میں ان کا قصور کم اور میرا پاجی پن زیادہ تھا۔ میرے اس پاجی پن میں درپردہ بھائی صاحب کی شہ اور بہت افزائی بھی شامل تھی۔

بھابی جان کی ایک بہت چہیتی چھوٹی بہن شمیم تھی جو میری ہی طرح بی اے کی طالب علم تھی۔ اس کی تعریف و توصیف کرنے اور نت نئے گُن گانے سے ان کا منہ کبھی نہ تھکتا۔ بات چاہے ایران اور توران کی ہو رہی ہو لیکن وہ کسی طرح کوئی پہلو نکال کر اپنی "شمو" کی شان میں کوئی بے ساختہ قصیدہ ضرور پڑھ دیتیں۔ "میری شمو یہ کام ایسے کرتی ہے"، "میری شمو وہ کام ویسے کرتی ہے"، "مجال کیا جو میری شمو کے سر سے دوپٹہ سرک جائے"، "میری شمو کی تہذیب اور شائستگی میرے یہاں سارے قبیلے میں مشہور ہے"، "بڑے بڑے باورچی اور رکاب دار میری شمو کے پکائے ہوئے کھانے پر اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں"، "فلاں درزی کے سیے ہوئے کپڑے میں میری شمو نے ایسا نقص نکال دیا کہ وہ بس جھینپ کر کلا تو ہو گیا"، "میری شمو اپنے درجے میں ہمیشہ اول آتی ہے"، وغیرہ وغیرہ۔

ہو سکتا تھا کہ میں یہ سب کچھ سنتا اور خاموش رہتا اور بھابی جان سے بدمزگی نہ مول لیتا۔ لیکن نہیں معلوم کیوں شمیم کی مداح سرائی سنتے سنتے مجھے اس سے ایک قسم کی چڑھ اور کدورت سی ہو گئی تھی اور جیسے ہی بھابی جان اس کی کوئی نئی خوبی بیان کرنے لگتیں میں خود اس خوبی میں سینکڑوں کیڑے ڈالنے اور اس کو خوبی کے بجائے خرابی ثابت کرنے لگتا، یا پھر اس کے متعلق ایسے مضحکہ خیز اور طنزیہ سوال کرنے لگتا کہ بھابی جان فوراً برہم اور برافروختہ ہو کر مجھ پر نکتہ چینی اور میری ہجو کرنے پر اُتر آتیں اور پھر جب بات بہت زیادہ "ذاتیات" تک پہنچ جاتی تو بھائی صاحب ہنستے ہوئے بھابی جان سے فرماتے: "تم سے ہزار دفعہ کہہ چکا ہوں کہ تم اس حاسد کے سامنے شمیم کا ذکر ہی مت کیا کرو۔ اور مجھ سے آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہتے: "ٹھیک تو کہتی ہیں تمہاری بھابی تم سینما بہت جاتے ہو اور ہر وقت اپنی کتابیں پڑھنے کے بجائے اِدھر اُدھر کی فضول ناولیں اور رسالے دیکھا کرتے ہو۔" اور ان کی باتوں سے بھابی اور لہجے سے میں، مطمئن ہو کر اپنی لفاظی کی کبڈی کسی آیندہ موقع کے لئے ملتوی کر دیتے۔

ایک روز ناشتے پر میرے ہاتھ میں ایک باتصویر انگریزی رسالہ دیکھ کر بھابی جان بولیں،

www.taemeernews.com

"میری شمو تو اس قسم کے رسالوں پر تھوکتی بھی نہیں۔"

"اسی وجہ سے تو اس رسالے کی اشاعت ایک لاکھ سے بھی زائد ہے۔" میں نے کہا۔ نہیں معلوم کیوں اس وقت بھابی جان کچھ خاص طور سے بھری بیٹھی تھیں لہٰذا بلا کسی تمہید کے فوراً ذاتیات پر اُتر آئیں۔ "صرف سوٹ پہن لینے اور انگریزی بال بنا لینے سے انسان مہذب اور تعلیم یافتہ نہیں ہوجاتا ہے اس کے لئے قابلیت اور ذہانت چاہیئے اور اس میں ماشاءاللہ آپ بالکل ہی صفر ہیں۔" اور پھر اس کے بعد اُنھوں نے میرے انگریزی بالوں کو میری حماقت، میری فیشن پرستی کو میری جہالت میری سینا بینی کو میرے شُہدپن اور میرے باتصویر رسالوں کے مطالعے کو میری بے ہودگی اور بدتمیزی سے تعبیر کر ڈالا۔

ان کا حملہ کچھ اس قدر غیر متوقع اور بے محل تھا کہ مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ اس کو میری بے غیرتی سے منسوب کرتے ہوئے وہ اور بھی جُلبُلا گئیں۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھے اور کچھ کہتیں درمیان میں بھائی صاحب کے منہ سے نہیں معلوم کیسے یہ غیر ذمہ دارانہ جملہ نکل گیا "تم اس کی تربیت کے لیئے شمیم کو اس پر کیوں نہیں تعینات کر دیتیں یہ اس کے چسپلو کی زد میں آکر خود بخود سُدھر جائے گا۔" یہ جملہ ایک پٹاخا ثابت ہوا اور بھابی جان واقعی غصّے میں آکر کسی زخمی شیر کی طرح بپھر اُٹھیں۔ خوب خوب صلواتیں انھوں نے مجھ کو، بھائی صاحب کو، بلکہ میرے خاندان کو سنا ڈالیں اور بار بار بریک کے بند کے طور پر کچھ اس قسم کے کلمات دُہراتیں "یہ منہ اور مسور کی دال! کوّے کی چونچ میں انگور؟ میری شمو کے دشمنوں کے منہ میں خاک۔" میں اپنے جیتے جی تو اپنی شمو کو ایسے نکھٹو کے حوالے کر نہیں سکتی۔ ایسی ہی اس کی قسمت پھوٹی ہے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اس کا گلا دبا کر رکھ دوں گی آ وغیرہ وغیرہ۔ بڑی مشکل سے بے چارے بھائی صاحب اُنھیں قائل کر سکے کہ خدانخواستہ ان کا روئے سخن کسی نسبت یا رشتے کی طرف نہیں تھا بلکہ انھوں نے محض تعریضاً اپنا جملہ معترضہ کہہ دیا تھا ورنہ کہاں شمیم جیسی ہمہ صفت موصوف لڑکی اور کہاں ان کا بھائی جیسا بانگڑو لڑکا!

ایک روز شام کو گھوم پھر کر میں گھر پہنچا تو دیکھا کہ ایک ہل چل سی مچی ہوئی ہے اور گھر کا ہر فرد خواہ چھوٹا یا بڑا انتہائی انہماک سے گھر کی صفائی اور آرائش میں مشغول ہے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کل شمو بی آرہی ہیں اور ان کے استقبال کی تیاریاں کی جارہی ہیں۔ میری صورت دیکھتے ہی بھابی جان نے "حکم امتناعی" سنا دیا "دیکھو میاں! کل شمو آرہی ہے۔ وہ تم سے پردہ کرتی ہے لہٰذا تم باہر اپنے کمرے ہی میں رہنا۔ میں تمہارا ناشتہ اور کھانا وہیں بھجوا دیا کروں گی۔ اندر نہ آنا اور وہاں باہر سبزے پر بھی نہ نکلنا کیوں کہ جاڑوں کے دن ہیں اکثر ہم لوگ نکل کر دھوپ میں بھی بیٹھیں گے۔" میں نے بڑی سعادت مندی سے "بہت اچھا" کہا تو میری سزا میں کچھ تخفیف کر دیے جانے کی اُمید دلادی گئی۔ "ارے چار پانچ روز کی تو بات ہے۔ تم کو تکلیف تو ضرور ہوگی لیکن پھر کیا کیا جائے! اتنی مختصر تو کوٹھی ہے۔" میں نے پھر بڑی شرافت سے جواب دیا "مجھے کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ آپ بالکل فکر نہ کیجیئے۔"

شمیم آئی تو واقعی ساری کوٹھی پر ایک نشاط انگیز فضا چھا گئی۔ اس نے میرے آٹھ سال کے بھتیجے جمال اور چھ سال کی بھتیجی عمیدہ کے ساتھ خوب ہڑدنگا اور شور و غل مچایا۔ میرے لئے بھی صرف چند نقرئی قہقہوں کی جھنکار آئی اور

www.taemeernews.com

بس۔ جمال اور حمیدہ سے کُرید کر پوچھا تو پتا چلا کہ ان کی خالہ دراصل شیطان کی خالہ واقع ہوئی ہے۔ اپنی شوخی اور شرارت سے ہر وقت وہ کھلکھلاتی رہتی اور کسی وقت بھی نچلا بیٹھنا تو وہ جانتی ہی نہ تھی۔

ایک روز میں یونیورسٹی سے پلٹا تو اپنے کمرے کو ایک عجیب و غریب حالت میں پایا۔ معلوم ہوتا کہ پانی پت کی چوتھی لڑائی میرے ہی کمرے میں لڑی گئی تھی۔ جوتوں، کپڑوں اور کرسی میزوں وغیرہ سے لڑی گئی تھی۔ میں نے کمرے کی ہر چیز کو اُلٹا پایا۔ حتیٰ کہ دیوار پر تصویروں کے بجائے جوتے ٹنگے ہوئے تھے اور جوتوں کی جگہ تصویریں اوندھی پڑی تھیں بے ترتیبی اور انتشار کا ایک عجیب عالم تھا۔ میرا لحاف زمین پہ پلنگ کے نیچے قالین کی جگہ بچھا ہوا تھا۔ قالین کو الگنی پہ پھانسی دے دی گئی تھی۔ ایک چادر میں بکس سے نکال کر میرے کپڑے گنجیٹ دیے گئے تھے اور بکس میں ردّی اخبارات بڑی احتیاط سے رکھے ہوئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ پہلے تو دل چاہا کہ بھابی جان کو بلا کر یہ حماقت افزا منظر دکھاؤں لیکن پھر میری حمیت نے اس کو گوارا نہیں کیا۔ آتش دان پر رکھی ہوئی میری تصویر کے بڑی بڑی مونچھیں بنا کر عینک لگا دی گئی اور روشنائی سے ایک آنکھ کی تخفیف کر دی گئی تھی۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا "حمیدہ کے چچا پھکڑی مل گھامڑ داس"!

دوسرے دن میں نے اپنا کیمرہ نکالا اور دوپہر میں جب کہ سارا گھر سو رہا تھا کہ میں یونیورسٹی گیا ہوا ہوں اور شمیم باہر سبزے پر جمال اور حمیدہ کے ساتھ اُچک پھاند میں مصروف تھی میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کے اس ٹوٹے ہوئے شیشے سے جو اکثر دوسرا شو دیکھ کر واپسی پر کھڑکی کی سٹکنی کھولتے اور کمرے میں داخل ہونے میں بڑی مدد دیتا، شمیم کی مختلف زاویوں سے تصویریں اتارنا شروع کر دیں۔ میں تصویریں اتارتا جاتا اور ان کے عنوانات میرے ذہن میں خود بخود اُبھرتے جاتے۔ "دوپٹے سے رسّہ کشی" "کیچڑ میں مینڈھک" "جھاڑی میں خرگوش" "پردے کا زردہ" "شمیم بالو ایک باتصویر علمی رسالے پر تھوک رہی ہیں"۔ وغیرہ وغیرہ اور پھر دوسرے ہی دن حمیدہ کی معرفت ان تصویروں کی ایک ایک کاپی عنوانات کے ساتھ شمیم کے پاس بھیج دی گئی۔ جمال نے اس کو یہ دھمکی بھی سُنا دی "ان تصویروں کی ایک ایک نقل اور ساتھ میں چچا جان کی وہ تصویر جو آپ نے خراب کی تھی امی جان کو بھی پہنچنے والی ہے"۔ اس کے بعد میرے کمرے پر کوئی دوسرا حملہ نہیں کیا گیا۔

اور پھر جب کہ دوسرے دن شمیم واپس جا رہی تھی رات میں ایک خوشگوار قسم کا بہت ناخوشگوار حادثہ پیش آگیا جس سے اس کے سامنے میری شرافت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم ہو گئی۔

آٹھ بجے رات کو ایک دم سے پوری کوٹھی کی بجلی فیل ہو گئی۔ میں بھائی صاحب کے پاس برآمدے میں بیٹھا تھا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ سامنے لائبریری میں جا کر آتش دان پر سے اُن کی ٹارچ اُٹھا لاؤں۔ لائبریری میں گھپ اندھیرا تھا۔ میں ہاتھ بڑھائے ہوئے آگے بڑھا تو میرا دایاں ہاتھ کسی کے ملائم چہرے پر پڑا اور پھر ایک نازک سی عینک میرے ہاتھ میں آگئی۔ میں چیخ دبا اور ساتھ ہی مجھے ایک گلوگیر چیخ کی سنائی دی۔ میں نے لپک کر ٹٹولتے ہوئے ٹارچ اُٹھا کر جلا دی۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ شمیم آنکھیں جھپکاتے ہوئے لال پیلی ہو رہی تھی میں نے ہاتھ بڑھا کر

www.taemeernews.com

اس کو اس کی عینک پیش کی لیکن قبل اس کے کہ میں کوئی معذرت کر سکوں اس نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے اپنی عینک لونچ لی اور پیر پٹخ کر "لوفر" "بدمعاش" کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

دوسرے روز وہ اپنے گھر واپس چلی گئی اور میرے لیے میری حماقت کی ایک تلخ یاد باقی رہ گئی البتہ میں اس بات پر یقیناً اس کا شکرگزار تھا کہ اس نے اس واقعے کا کوئی ذکر بھابی جان سے نہیں کیا ورنہ نہیں معلوم مجھ پر کون سی قیامت گزر جاتی۔

بھابی جان کے مرحوم چچا میرے پھوپھا تھے۔ امتحان ختم ہو جانے کے بعد جب میں گھر جانے لگا تو بھائی صاحب کی ہدایت پر میں علی گڑھ اپنی پھوپھی سے ملنے گیا۔ باہر بیٹھک میں بھابی جان کے والد عبدالقدوس صاحب سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ بڑی شفقت اور تپاک سے ملے۔ بڑی دیر تک مجھے بہت سی نصیحتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں مجھے میری پھوپھی کے پاس بھیج دیا۔

عبدالقدوس صاحب کا پرانے زمانے کا بنا ہوا بڑا عالی شان مکان تھا اور اب غالباً اس کا تین چوتھائی حصہ غیر آباد تھا۔ میرا رہبر لڑکا پہلے تو مجھے برآمدے سے ایک وسیع صحن میں لے گیا جس کے سامنے ایک شاندار پچدرا اور چاروں طرف تدواریاں بنی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ایک زینے پر چڑھا، اس کے بعد ایک کوٹھے پر سے گزر کر وہ داہنی طرف مڑ گیا۔ میں وہاں پہنچا تو وہ ایک دم سے غائب ہو چکا تھا اور میں اس شعر کی تفسیر بن کر رہ گیا تھا ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

ایک موڑ پر میرے سامنے دو دروازے تھے۔ میں دونوں دروازوں پر خوب کھٹکھٹایا۔ کنڈی کھٹکھٹانی پر پٹخی۔ "ابے او لڑکے" چیخا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ مجھے واپس ہونے پر بھی راستہ بھول جانے کا احتمال تھا کیوں کہ میں دیکھ چکا تھا کہ یہ مکان کیا پوری بھول بھلیاں تھا۔ چاروناچار میں ایک دروازہ کھول کر آگے بڑھا۔ سامنے پھر ایک بڑا صحن تھا لیکن اس کے داہنے کونے پر جو دروازہ تھا اس سے آبادی کے کچھ نشانات ظاہر ہوتے کیوں کہ دو قطاروں میں پھولوں کے کئی گملے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اس دروازے پر دستک دی تو اندر سے شمیم کی آواز آئی "کون؟" میں نے پٹ کھول کر ذرا جھانکا تو دیکھا کہ شمیم سامنے نیچی کرسی پر بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی مجھے دیکھتے ہی وہ پہلے تو چونک پڑی لیکن پھر اس نے تعجب سے تیوریاں چڑھالیں۔

میں نے کہا: "سلام علیکم"

اس نے جواب دیا: "وعلیکم السلام! اس وقت یہاں آپ کی شانِ نزول کیا ہے؟"

میں نے کہا: "راستہ بھٹک کر منزلِ مقصود پر پہنچ گیا ہوں۔"

وہ آنکھیں نکال کر مصنوعی غصے سے بولی: "کیا مطلب آپ کا؟"

میں ایک چھوٹے سے لڑکے کی رہبری میں پھوپھی جان کے پاس جا رہا تھا لیکن وہ لڑکا درمیان ہی میں کہیں

www.taemeernews.com

غائب ہوگیا اور میں بھٹک کر آپ تک پہنچ گیا۔"

شمیم: "تو جائیے جس دروازے سے آپ یہاں تک آئے ہیں اسی کے برابر والا دروازہ چچی جان کے کوٹھے پر کھلتا ہے۔"

میں: "لیکن مجھے آپ سے ایک معافی بھی مانگنا ہے۔"

شمیم: "تو جلدی سے مانگ لیجئے اور تشریف لے جائیے۔ غالباً آپ کو اس کا احساس نہیں کہ میرے اور آپ کے درمیان سرکاری طور سے پردہ ہے اور آپ کا اس طور سے میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا ہونا انتہائی معیوب ہے۔"

میں: "اچھا تو میں کمرے کے اندر حاضر ہو کر معافی مانگ لیتا ہوں۔" اور میں کمرے میں اندر داخل ہو کر اس کی کرسی کے سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔

شمیم: (گھبرا کر) "ہٹائیے یہ معافی وافی کی باتیں۔ اب آپ تشریف لے جائیے کوئی آجائے گا تو کیا کہے گا۔"

میں: "آپ اپنی بداخلاقی کا الزام کسی دوسرے پر کیوں تھوپنا چاہتی ہیں؟"

شمیم: "آئے تھے آپ معافی مانگنے اور الٹا مجھی کو بداخلاق بنا رہے ہیں۔"

میں: "اس روز اندھیرے کے حادثے کا ذمہ دار صرف اندھیرا تھا۔"

شمیم: "اور تصویریں خود بخود کیمرے میں اتر آئی تھیں۔"

میں: "اور میرے کمرے میں شاید کسی بھوت نے گھس کر غدر مچایا تھا۔"

شمیم: "اس کارِ خیر میں محلے کی کئی لڑکیاں شریک تھیں۔"

میں: "اور جن کی رہنمائی آپ نے فرمائی تھی۔"

شمیم: (ہنستے ہوئے) اچھا پھکڑی مل گھامڑ داس جی! اب یہ انٹرویو ختم ہو جانا چاہیئے۔"

میں: "بشرطیکہ آپ ایک دفعہ پھر مجھے لوفر اور بدمعاش کہہ دیں۔"

شمیم: "سمجھ لیجئے کہ کہہ دیا۔ لیکن اب خدا کے واسطے جائیے۔ آپ جانتے نہیں کہ والد صاحب پردے کے کس شدت سے پابند ہیں۔"

اور پھر دفعتاً باہر صحن میں بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور کسی نے پکارا "شمیم!"

"جی! ابا جان" شمیم نے بدحواسی سے جواب دیا۔ میں سراسیمہ کھڑا تھا۔ قدموں کی آواز قریب تر ہو گئی۔ شمیم نے انتہائی گھبراہٹ میں مجھے اشارہ کیا اور میں غڑاپ سے صوفے کے پیچھے چھپ گیا۔

مولانا عبدالقدوس صاحب کمرے میں آکر اسی صوفے پر جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا بیٹھ گئے اور گھر کی کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے: "آج نسیم کا دیور اپنی پھوپھی سے ملنے آیا ہے۔ ٹھیک ہی کہتی تھی وہ عجیب بوکھل لڑکا دکھائی پڑتا ہے۔"

www.taemeernews.com

اور عین اس موقع پر رد کنے کی انتہائی کوشش کے باوجود میں ایک زبردست چھینک چھینک دیا۔
مولانا عبدالقدوس صاحب غالباً ایک فٹ صوفے کے اوپر اچھل گئے۔ کیوں کہ ہوا میں پرواز کے چند لمحوں کے بعد جب وہ صوفے پر واپس گرے تو اس کا ہر اسپرنگ بے اختیار چیخ اٹھا تھا۔ شمیم منہ پھیر کر صوفے کے ایک کونے میں گر گئی تھی، میں سر جھکا کر خاموشی سے یوں کھڑا ہو گیا جیسے

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

پردے کے زبردست حامی مولانا عبدالقدوس نے اس معصوم ڈرامے سے یقیناً بدترین نتائج اخذ کیے تھے۔ ان پر ایک دم سے شدید قسم کا پاگل پن کا دورہ پڑ گیا "شیطانو! ملعونو! کم بختو! تم نے میری عزت خاک میں ملا دی میری ناک کاٹ لی۔ میرے چہرے پر سیاہی مل دی۔ میری!" وغیرہ وغیرہ۔" وہ چیخے گرجے۔ تڑپے اور پھر انہوں نے اپنے سر کے بال اور داڑھی نوچ کر رکھ دی؛ شمیم نے سسکیوں کے درمیان کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے لپک کر اس کے ایک چھڑی رسید کی۔ میں بچالے کے لیے آگے بڑھا تو مجھ پر تابڑ توڑ کئی چھڑیوں کی بارش سی ہو گئی میں فرش پر گرا تو کئی لاتوں سے ضیافت کی گئی۔ "کمینہ۔ آوارہ۔ بدمعاش۔ خبیث" اور نہیں معلوم کن کن خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

کافی مار دھاڑ کے بعد مولانا نے میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے کہا "چل باہر ابھی ٹھیک کیئے دیتا ہوں تجھے۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی شریف کی ناموس میں بٹہ لگانے کے کیا معنی ہوتے ہیں"؟ میں نے لاکھ کچھ کہنا چاہا مگر مولانا کچھ سننے کے لئے تیار ہی نہ تھے۔ میں جیسے ہی بولنے کے لئے منہ کھولتا وہ فوراً لپک کر تھپڑ رسید کر دیتے۔ مارتے کوستے وہ مجھے ایک دوسرے کوٹھے پر لے گئے اور ایک تنگ اور تاریک کوٹھری میں بند کر دیا۔

میں سمجھتا تھا کہ اس کوٹھری سے براہ راست مجھے کسی جلاد کے پاس مقتل گاہ بھیج دیا جائے گا۔ لیکن چند ہی گھنٹوں بعد مجھے اس سے نکال کر ایک قاضی اور چند گواہوں کے سامنے پیش کیا گیا اور میرا اور شمیم کا باقاعدہ نکاح ہو گیا! مولانا عبدالقدوس صاحب نے یہ بھی ایک ناوری حکم لگا دیا کہ ہم دونوں میاں بیوی شام تک ان کا گھر خالی کر دیں۔ جہیز کے طور پر انہوں نے انتہائی حقارت سے ایک دستاویز مجھے گھسیٹ ماری جس میں انہوں نے پیشتر ہی سے اپنی کل جائداد اپنی دونوں لڑکیوں نسیم (بھابی جان) اور شمیم کو دے رکھی تھی۔

ریل میں شمیم کبھی روتی کبھی ہنستی اور کبھی میری چوٹوں پر مرہم لگاتی۔ بھائی صاحب اور بھابی جان کے سامنے جب ہم دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے پیش ہوئے تو بھائی صاحب مارے خوشی کے چیخے۔ کوے کی چونچ میں انگور" بھابی کچھ دیر تو سکتے میں رہیں پھر ایک ہاتھ سے "میری شمو" کہہ کر شمیم اور دوسرے ہاتھ سے "میرا ببو" کہہ کر مجھے گلے سے لگا لیا۔

واضح رہے کہ کچھ عرصے بعد مولانا عبدالقدوس صاحب سے بھی صفائی ہو گئی اور انھیں جب صحیح واقعے کا علم ہوا تو بہت ہنسے اور اپنی داڑھی میں خلال کرتے ہوئے فرمایا، "جب میں صوفے پر بیٹھا تمہیں بوکھل کہہ رہا تھا تو صوفے کے پیچھے تم پر کیا گزر رہی تھی" میں نے بڑے ادب سے جواب دیا "میں دنیا کی سب سے قیمتی چھینک روکنے کیلئے اپنی ناک مسوس رہا تھا" مولانا نے قہقہہ لگاتے ہوئے فرمایا، "واقعی ہم دونوں ہی کی ناکیں سخت خطرے میں پڑ گئی تھیں۔ ■■

www.taemeernews.com

یوسف ناظم

خودنوشت

نام سیہ محمد یوسف ہے۔ چونکہ شعر کہتا ہوں اس لئے ایک تخلص (ناظم) رکھنا پڑا۔ اس تخلص کی وجہ سے نام میں مزید طوالت پیدا ہو رہی تھی اس لئے صرف یوسف ناظم لکھنا شروع کیا اور یہی نام ٹھیرا۔

جائے ولادت ہے۔ یہ پہلے ضلع اورنگ آباد کا تعلقہ تھا اب یہ خود ضلع ہے۔ ضلع اورنگ آباد پہلے ریاست حیدرآباد کا حصہ تھا۔ ۱۹۵۶ء سے ریاست مہاراشٹرا میں ضم ہو گیا۔

میٹرک تک جالنہ میں تعلیم پائی۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان اورنگ آباد انٹرمیڈیٹ کالج سے کامیاب کیا۔ ۱۹۴۱ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے ۴۴ء میں بی۔ اے اور ۴۶ء میں ایم۔ اے کیا۔ اکاؤنٹ جنرل آفس حیدرآباد میں ملازمت کی۔ ۴۶ء میں شادی کی (حالانکہ ملازمت سے پہلے بھی کر سکتا تھا) ——— مزاح نگاری کا سلسلہ بھی ۴۴ء ہی سے شروع ہوا۔ "میزان" اور "پیام" میں چھپتا رہا۔ اس کے بعد رسائل کی نوبت آئی اور اس کے بعد کتابیں شائع ہوئیں۔

پہلی کتاب "کیف و کم" ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اب تک کیف و کم کے علاوہ فٹ فوٹ (فضرت بکڈپو لکھنؤ) دیوار کے کان (نشتر پبلی کیشنز) زیرِ غور (نشتر عالیبلی کیشنز) سائے ہمارے، فقط، البتہ (ادارہ ادبیاتِ حیدرآباد پبلی کیشنز) ذکر غیر اور بالکیات (مکتبہ جامعہ) شائع ہو چکی ہیں۔ تین کتابیں بچوں کیلئے بھی چھپی ہیں۔ چلکن ڈانس۔ الف سے یے تک اور نگاہ گاندھی جنوبی افریقہ میں۔

کتابوں پر ہندوستان کی کچھ اکادمیوں نے (غلطی سے) انعامات بھی دیئے ہیں۔ غالب ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ایک کتاب "مرغی کی ہم ٹانگیں" مکتبہ جامعہ دہلی سے چھپ رہی ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لئے ہے لیکن بڑے بھی پڑھ لیں تو کوئی حرج نہیں ——— کتاب نما کے چھ نمبر اور تکونے کے چند مستانی مزاح نمبر کی مہمان ادارت غیر ارادی طور پر انجام دی اور حال ہی میں سنسکرت کے شاعر بھرتری ہری کی چند نظموں کا منظوم ترجمہ کیا۔

کچھ دنوں تک "بلٹز" کا کالم "باتیں ہماریاں" لکھا اور پچھلے دو تین سال سے "انقلاب" بمبئی کا ہفتہ وار کالم "اقوالِ یہ" لکھ رہا ہوں۔

دسمبر ۱۹۷۶ء میں سرکاری ملازمت سے ریٹائرڈ ہوا ہوں۔

* *

www.taemeernews.com

لوگ چاہیں ہزار گالی دیں
صاف گوئی ہزار نعمت ہے

عُرف

باقر مہدی

باقر مہدی کے نئے مجموعۂ کلام "ٹوٹے شیشے کی آخری نظمیں" کی اشاعت پر بمبئی کے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ادبی نشست ۱۰ر دسمبر ۷۲ء کو منعقد ہوئی۔ یہ مضمون اسی جلسہ میں پڑھا گیا۔ مضمون پڑھنے سے پہلے راقم نے حاضرین جلسہ کے روبرو صاحب محفل سے یہ اقرار نامہ لکھوایا کہ وہ اس مضمون کے بارے میں راقم سے کوئی باز پُرس نہیں کریں گے۔

ایسا نہیں ہے کہ باقر مہدی صاحب کتابی صورت میں پہلی بار چھپے ہوں۔ ان کی کم سے کم تین کتابیں پہلے بھی شائع ہو چکی ہیں لیکن جب ان کی آخری نظموں کا مجموعہ شائع ہوا تو ان کے قریب کے دوستوں کو بڑی مسرت ہوئی اور اسی مسرت کے اظہار کے سلسلہ میں انہوں نے یہ جلسہ منعقد کیا کہ باقر مہدی صاحب کو ان کی آخری نظموں کی اشاعت پر مبارکباد دی جائے۔ معلوم نہیں باقر مہدی صاحب کی تکہ رس نگاہ اس نکتے پر کیوں نہیں پڑی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنے دوستوں سے اس ذہانت کی توقع نہ رکھتے ہوں۔ بہرحال مجھے بھی اس خوشی میں شریک ہونا تھا۔ اس لئے میں بھی ان کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت لے کر حاضر ہوا ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ آج کل کے زمانے میں عقیدت کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

باقر مہدی شاعر ہیں، نقاد ہیں، مقرر ہیں لیکن اپنے اس غیر مربوط مضمون میں اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں اور تنقیدی شعور کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا سراسر ناانصافی ہوگی۔ یوں ناانصافی سے باقر مہدی صاحب کو بڑا شغف رہا ہے۔ لیکن مجھے اُن کی صحبت کا فیض حاصل ہونے کے باوجود ناانصافی کی مشق نہیں ہوئی ہے۔ اس لئے میں اس سے احتراز ہی کروں گا اور صرف ان کی شخصیت کے بارے میں رفاہ عام کی خاطر کچھ عرض کروں گا لیکن جو کچھ عرض کروں گا، اس سے میرا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ خود اپنے

لہ لیکن صاف گوئی اور تلخ گوئی دو الگ چیزیں ہیں۔

www.taemeernews.com

آپ سے بھی متفق نہیں ہوا کرتے۔ اختلافِ رائے کی یہ منزل تنقید کے میدان میں آخری منزل سمجھی جاتی ہے۔ باقر مہدی کو اس منزل پر پہنچے ہوئے مدت ہوگئی۔

یہ کوئی افواہ نہیں بلکہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ باقر مہدی بھی ردولی جیسے مردم خیز علاقے میں پیدا ہوئے۔ نقادوں کو یوں بھی قدرت کی طرف سے کھلی اجازت ہے کہ وہ جہاں چاہیں پیدا ہوجائیں۔ باقر مہدی کی ولادت سے اُن کے وطنِ مالوف کو ایک فائدہ یہ ہوا کہ اُن کے بعد پھر کسی نقاد کی ہمت نہیں ہوئی کہ ردولی میں پیدا ہو —— باقر مہدی نے لکھنؤ میں تعلیم پائی (جو کچھ انہوں نے پایا اُسے تعلیم ہی کہا جاتا ہے) جب بھی کوئی شخص لکھنؤ کے تکلف، لعل دہاں کے آداب اور تکلفات کا ذکر کرتا ہے، میں باقر مہدی صاحب کے حوالے سے اس کی تردید کردیتا ہوں اور وہ شخص بالکل مطمئن ہوجاتا ہے۔ باقر مہدی کی شخصیت کا یہ پہلو بڑا تابناک ہے اور اگر چمکدار نہیں تو کم سے کم سنگین دلچسپ عالم میں فرد مشہور رہے۔

باقر مہدی صاحب کے متعلق میں نے دو رائیں کبھی نہیں سُنیں۔ پورا ہندوستان یعنی غیر منقسم ہندوستان اس بات پر متفق ہے کہ باقر مہدی جتنے عالم ہیں اُس سے زیادہ ظالم ہیں۔ اُن کی بیباکی کی داستانیں چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہیں۔ ان کی بیباکی وہ معمولی بے باکی نہیں جس کا دعویٰ بہت سے لوگ کرتے ہیں۔ اُن کی بے باکی اور سفاکی میں ذرا سا ہی فرق ہے۔ اُردو کے سارے ادیبوں اور شاعروں کے دلوں میں خوف کی جو ہلکی سی لہر دوڑتی رہتی ہے، اُسی لہر کا نام باقر مہدی ہے۔ شامت کا مارا جو بھی ادیب اور شاعر بمبئی آتا ہے باقر مہدی اس کی مزاج پُرسی کے لئے اس کے دلن تک جانے سے گریز نہیں کرتے۔ وہ اس کارِ خیر کے سلسلہ میں دور دراز مقامات تک ہو آئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ابھی ان کے ارمان، کم ہی نکلے ہیں۔ غالباً دو سال ہوئے کہ لندن یونیورسٹی کے اُردو کے پروفیسر رالف رسل، غلطی سے بمبئی آگئے۔ اُن کی آمد سے متعلق، باقر مہدی صاحب کے ایک دوست خورشید الاسلام نے انھیں خط لکھا کہ رالف رسل میرے اچھے دوست ہیں، تم سے ملنے آئیں گے، خدا کے لئے ان سے لڑنا مت —— افسوس صد افسوس کہ خورشید الاسلام کا یہ خط باقر مہدی کو تین بجے ملا۔ جب کہ ایک بجے تک وہ رالف رسل سے لڑ کر فارغ ہوچکے تھے —— اس واقعہ کے راوی خود باقر مہدی ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی ہوگی اس کے بعد وہ یقیناً خورشید الاسلام سے لڑے ہوں گے کہ انھوں نے یہ خط ٹھیک وقت پر کیوں نہیں بھیجا۔

باقر مہدی صاحب کو پہلی مرتبہ میں نے جگر مرادآبادی مرحوم کے تعزیتی جلسہ میں تقریر کرتے سُنا تھا۔ جگر مرادآبادی کے مرنے میں جو کچھ کسر باقی رہ گئی تھی، باقر مہدی صاحب نے اپنی تقریر سے پوری کردی —— باقر مہدی صاحب روایت شکن آدمی ہیں، —— اسنے روایت شکن مگر ان کی پیشانی ہمیشہ شکن آلود رہتی ہے۔ یوں بھی نقاد کو تنقید کا دامن کبھی نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ چاہے موقع تعزیت کا ہو یا تہنیت کا۔

باقر مہدی صاحب مجھ پر بہت مہربان رہے ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ باعلم آدمی ہیں اور میں لاعلم! وہ ایذرا پاؤنڈ کا ذکر بھی کرتے ہیں تو میں پوچھتا ہوں یہ کس ملک کا بسکٹ ہے۔ وہ اس کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں تو مجھے پوچھنا پڑتا ہے کہ عذرا کہاں کی رہنے والی تھیں —— اس لئے مجھ جیسے لاعلم شخص سے اختلافِ رائے کا سوال پیدا ہی

www.taemeernews.com

نہیں ہوتا۔ اس کے لئے دس بیس سیڑھیاں نیچے اُترنی پڑتی ہیں اور یہ کام باقر مہدی نہیں کر سکتے۔ باقر مہدی علم کی اس بلندی پر ہیں جہاں خود علم کے پہنچنے میں ابھی دیر ہے! مجھ سے ایک مرتبہ البتہ بھول ہوئی۔ میں نے کتب خانۂ جامعہ میں بیٹھ کر جہاں ہر قسم کی الٹی سیدھی باتیں ہوا کرتی ہیں (الٹی اس لئے کہ باقر مہدی صاحب وہیں بیٹھتے ہیں!) کسی دن یہ کہہ دیا کہ میں باقر مہدی کے اشعار کو منظوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میری یہ مہمل بات میرے کسی چہیتے دوست نے باقر مہدی صاحب تک پہنچادی باقر مہدی صاحب مجھ سے کامل تین ماہ تک خفا رہے ـــــ آہ! وہ کتنے خوشگوار دن تھے!!

ایسا ہی ایک سانحہ اور بھی گزرا ہے۔ حیدرآباد کے کسی رسالے میں یہ خبر چھپ گئی کہ میں نے وہاں ایک ادبی جلسہ میں یہ کہہ دیا کہ باقر مہدی، قاضی سلیم کو شاعر تسلیم نہیں کرتے ـــــ باقر مہدی صاحب کسی اور کی کہی ہوئی ہر بات کا بہت بُرا مانتے ہیں اور یہ بات بھی انھیں ناگوار گزری۔ مکتب جامعہ میں انھوں نے میری خبر لی۔ میں نے صرف اتنا عرض کیا کہ اگر وہ قاضی سلیم کو شاعر مانتے ہیں تو اس کا اعلان کر دیں اور پھر باقر مہدی صاحب نے ماہنامہ 'صبا' میں ایک خط چھپوایا کہ وہ قاضی سلیم کو شاعر مانتے ہیں۔ اس وقت سے باقر مہدی اپنے اعلان پر قائم ہیں۔ حالانکہ قاضی سلیم بھی 'صبا' میں اپنا خط چھپوا چکے تھے کہ کسی کے ماننے نہ ماننے سے شاعری میں کیا فرق پڑتا ہے لیکن باقر مہدی ہیں کہ قاضی سلیم کو برابر شاعر مانے جا رہے ہیں۔ خود کردہ را علاجے نیست!

باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کا ردادارانہ مزاج ہے اور وہ سب کو یکساں طور پر ناپسند کرتے ہیں۔ اس میں وہ شدت اور نرمی کا فرق نہیں برتتے۔ باقر مہدی صاحب اس معاملہ میں بڑے محتاط ہیں اور اس بات کا ہمیشہ خیال رکھتے ہیں کہ اُن کی زبان یا قلم سے کسی کے حق میں کوئی کلمۂ خیر نہ نکل جائے۔ اتنا محتاط آدمی ہمیں تو کیا خود باقر مہدی کو آئینے میں بھی نہیں ملے گا۔ باقر مہدی چونکہ اپنی مثال آپ ہیں اس لئے ان کا عکس بھی ان سے مختلف ہے!

اگر سب لوگ پانی کی تلاش میں دریا کی طرف جا رہے ہوں اور صرف ایک شخص ریگستان کی سمت جا رہا ہو تو وہ تنہا شخص سوائے باقر مہدی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ باقر مہدی صاحب نے یہ وطیرہ اُس وقت سے اختیار کیا ہے جب سے کہ انھوں نے بحروں کو توڑ تاڑ کر نالے میں ڈال دیا ہے۔

باقر مہدی کو بمبئی کی جن چیزوں سے نفرت ہے اُن میں سے ایک چیز پگڑی ہے۔ ان کے ہاتھوں کسی کی پگڑی بھی اُس کے سر پر سلامت نہیں رہی۔

مجھے انھوں نے ازراہِ کرم الطاف حسین حالی کا لقب دیا ہے۔ کیونکہ اُردو ادب میں وہ سب سے زیادہ اگر کسی کو ناپسند کرتے ہیں تو وہ مولانا حالی ہیں۔ ناپسندیدگی کے اظہار کے سلسلہ میں یہ بالواسطہ طریقہ انھوں نے صرف میرے لئے اختیار کیا ہے۔ اوروں کے ساتھ یہ رعایت نہیں ہے جو کچھ بھی ہے بلاواسطہ اور بالراست ہے۔

باقر مہدی صاحب کی شخصیت کا کمال یہ ہے کہ وہ ادب کے کسی موضوع پر ایک مدلل اور مبسوط مضمون لکھ کر اس کی مخالفت میں دوسرا مدلل مضمون لکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک ہی محفل میں، ایک ہی موضوع کی تائید اور مخالفت میں گھنٹوں بول سکتے

www.taemeernews.com

ہیں۔ باقر مہدی، ڈائیلوگ اور مونولاگ دونوں کے ماہر ہیں۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ اُن کی یہ دونوں چیزیں بے لاگ ہوتی ہیں۔ اچھا ہوا کہ باقر مہدی صاحب نے وکالت کے پیشے سے شوق نہیں فرمایا، ورنہ معلوم نہیں ان کی وکالت سے کتنے بے گناہ پھانسی پر چڑھ جاتے جن میں خود ان کے موکل بھی شریک ہوتے۔

ادب کا کوئی بھی سیدھا سادا مسئلہ ہو باقر مہدی اسے بڑی صفائی سے اُلجھائیں گے اور بہت دیر تک مسکرائیں گے اُن کی شخصیت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ کوئی ادبی جلسہ یا مشاعرہ ہو لوگ یہ دریافت کرتے ہیں کہ فلاں صاحب آرہے ہیں نا؟ لیکن باقر مہدی صاحب کے متعلق یہی پوچھا جائے گا کہ اس محفل میں باقر مہدی تو نہیں آرہے ہیں! اور ایسا نہیں ہے کہ باقر مہدی صاحب کو یہ بات معلوم نہیں ہے۔

میں باقر مہدی کی شخصیت کی طرح اپنے اس اُلجھے ہوئے اور غیر مربوط مضمون کو یہ کہہ کر ختم کروں گا کہ باقر مہدی اُن لوگوں سے یقیناً مختلف ہیں، جن سے ریاضؔ خیرآبادی کو سابقہ پڑا تھا اور جن کے متعلق انھوں نے کہا تھا ؎

بڑے صاف طینت بڑے پاک باطن
ریاضؔ آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

-۰- -۰- -۰-

-۰- -۰- -۰-

* ایک موٹی عورت کپڑے کی دکان پر گئی اور دکاندار سے بولی "میرے لیے کون سے رنگ کا کپڑا مناسب رہے گا؟" دکاندار نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ "خاتون جب خدا نے تتلی کو بنایا تو اُسے کئی رنگ عطا کیے مگر جب ہاتھی کو بنایا تو اسے صرف بھورا رنگ دیا۔"

-۰-

* ایک دن سقراط کا اپنی بیوی سے جھگڑا ہوگیا۔ آواز سن کر محلے والے جمع ہوگئے تو اُن کی بیوی نے اُن پر پانی سے بھرا ہوا مٹکا انڈیل دیا۔ اس پر سقراط بولے "دیکھا پہلے بادل گرجتے ہیں، پھر برستے ہیں۔"

-۰- -۰- -۰-

www.taemeernews.com

عوامی بھلائی کی جدید اسکیمیں
اور
خشک سالی سے تحفظ کے اقدامات

ریاستی حکومت نے جناب این۔ ٹی۔ راماراؤ کی حرکیاتی قیادت میں عوامی بھلائی کے لئے ایسے بے شمار اقدامات شروع کئے ہیں جو پہلے سے زیر تکمیل اسکیموں کے علاوہ ہیں اور ریاست میں خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کو ممکنہ امداد فراہم کرنے کیلئے کئی قدم اٹھائے ہیں جو سماج کے ان متاثرہ طبقات کی بنیادی ضرورتوں کی تکمیل میں بہت حد تک جائیں گے۔

چند نئی اسکیمیں

* ۶۰ سال اور اس سے زیادہ عمر والے پانچ لاکھ سے زیادہ ندغی مزدوروں کو ۳۰ روپے ماہانہ اولڈ ایج پنشن۔
* رکشا رانوں کو رکشاؤں کا مالک بنانے کیلئے ۲۰٪ معافیت اور بنک کا قرضہ۔
* گرین کارڈ رکھنے والوں کے لئے ۵۰٪ معافیت پر بنڈ لوم دھوتیوں اور ساڑیوں کی فراہمی۔
* کسانوں سے راست دھان کی خریدی جس کی قیمت ۱۰۰ روپیہ فی کیلو گرام زیادہ ادا کی گئی، اس قیمت سے جو اگریکلچر پرائز کمیشن نے مقرر کی ہے۔
* آفلیتوں کے لئے مالیاتی کمیشن کا قیام۔
* حیدرآباد کے پرانے شہر کی ترقی کے لیے بیس کروڑ روپیہ کا علحدہ بجٹ۔

قحط سالی کی راحت اسکیمیں

* ریاستی حکومت کا قحط سالی کے علاقوں میں راحت کاری کے کاموں کیلئے بیس کروڑ روپے کا اجراء اور فوری مزید بیس کروڑ روپیہ کی مرکزی ایڈہاک گرانٹ۔
* چھوٹے کسانوں کے لئے مختصر مدتی قرضوں کی ادائی کو جون ۸۵ء تک ملتوی کردیا گیا۔

ایک ایسی سرکار جو ہمیشہ عوام کی خیر و ترقی کو پورا کرتی ہے

DIPR/562/Adv.II/C4. D/- 13-11-84.

www.taemeernews.com

سوال نامہ

۱۔ آپ کی رائے میں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد کے دور میں ہندوستان میں طنز و مزاح کی کیا کیفیت رہی ہے۔
حسبِ حال ۔ مائل بہ زوال ۔ رو بہ کمال۔

۲۔ کیا پاکستان میں (غیر منقسم ہندوستان کے ادیبوں کے علاوہ) قیامِ پاکستان کے بعد اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں اور آیا وہاں کے پیمانے لکھنے والوں کا فن روبہ انحطاط ہے۔

۳۔ طنز و مزاح میں قدرِ اول کا ادب تخلیق کرنے کے لئے کیا مسلسل مزاح نگاری ضروری ہے؟

۴۔ کیا ہندوستان میں اردو کے مزاح نگاروں کے سامنے کچھ رکاوٹیں ہیں جو بہتر اور موثر مزاح نگاری کی راہ میں حائل ہیں۔

۵۔ ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں (جن میں انگریزی شامل ہے) کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے راست یا بالواسطہ مطالعے سے اگر آپ کسی خاص نتیجے پر پہنچے ہوں تو اس کی وضاحت فرمائیے۔ کیا آپ کے تقابلی مطالعے کی بناء پر کوئی تخصیصات قائم کی جاسکتی ہیں؟

۶۔ کیا آپ مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری کہنے کے حق میں ہیں؟ اگر آپ اس کے حق میں ہیں تو کیا مزاح گو شاعر کو انشائیہ گو شاعر کہا جا سکتا ہے؟

۷۔ اصناف ادب میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کو آپ معیار کے حساب سے کس نمبر پر رکھیں گے؟

جواب نامہ

ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر قمر رئیس، پروفیسر نثار احمد فاروقی، شمس الرحمٰن فاروقی، باقر مہدی، ڈاکٹر وحید اختر، رشید حسن خاں، شمیم حنفی، عمیق حنفی، ابن فرید، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، مظفر حنفی، مناظر عاشق ہرگانوی۔

صـ ۳۳۵ تا صـ ۳۵۹

www.taemeernews.com

ڈاکٹر محمد حسن

۱۔ بنیادی طور پر ہندوستان میں طنز و مزاح مائل بہ زوال ہے گو اس کی بنیادیں وسیع ہوئی ہیں اور اس کا رشتہ زیادہ عوامی ہوا ہے مگر اس کا معیار پست ہوتا جارہا ہے بعض اچھے مزاح نگار بھی اس زوال کے شکار ہوئے۔

۲۔ یقیناً۔ مثلاً ابن انشاء، کرنل محمد خاں، خالد اختر اور سب سے اہم مشتاق احمد یوسفی۔ نہیں۔ وہاں طنز و مزاح نئی منزلیں طے کر رہا ہے۔

۳۔ دونوں غیر ضروری ہیں ان سے سب سے زیادہ اہمیت معیار کو حاصل ہے اور اس کی تلاش میں بصیرت اور ندرتِ تخلیق دونوں ضروری ہیں۔

۴۔ سب سے بڑی رکاوٹ اردو دانی کا زوال اور اردو رسائل اور کتابوں کی بکری میں کمی ہے نئے لکھنے والے سامنے نہیں آرہے ہیں پرانے تھک چکے ہیں۔

۵۔ سب سے بڑا سند طنز و مزاح کی تہہ داری کا ہے اور یہ تہہ داری فکر اور حسیت کی گہرائی اور اندازِ بیان پر قدرت سے پیدا ہوتی ہے۔

۶۔ جی ہاں۔ انشائیہ مزاح نگاری سے مختلف ہے گو ان میں ایک دوسرے کے عناصر مل سکتے ہیں۔

۷۔ ادب میں معاملہ طنز و مزاح یا کسی دوسری صنف کے ادب کا نہیں بلکہ ادبی معیار کا ہے رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی یقیناً ہمارے صف اول کے ادیبوں میں شمار کئے جائیں گے۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

۱۔ ہندوستان میں رشید احمد صدیقی کے دور کے بعد طنز و مزاح کی کیفیت کو مائل بہ زوال ہی کہنا چاہیئے۔ پطرس اور کنہیالال کپور کے بعد ان کے پائے کا آدمی پیدا نہیں ہوا اگرچہ طنز و مزاح نگاری میں زندگی کے آثار ہیں مثلاً فکر تونسوی یوسف ناظم، واہی عظیم آبادی، مجتبیٰ حسین، نریندر لوتھر اور بہت سے دوسرے لکھنے والے اچھا لکھ رہے ہیں اور ان میں سے بعض کا فن رو بہ کمال بھی ہے۔

۲۔ پاکستان میں قیامِ پاکستان کے بعد بلاشبہ چند اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں۔ ابن انشاء اور ابراہیم جلیس تو اب اس دنیا میں نہیں لیکن مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خاں نے اس فن کی نئی جہات کو روشن کیا۔ شفیق الرحمٰن، تمیر جعفری تو خیر پرانے لکھنے والوں میں ہوئے۔ ان کے بعد نئی نسل میں بہت سے لکھنے والے ابھرے ہیں۔

۳۔ طنز و مزاح میں قدرِ اول کا ادب تخلیق کرنے کے لئے مسلسل لکھنا بے حد ضروری ہے۔ چند مضامین یا شعر لکھنے اور کچھ ادب میں کسی کا مقام متعین نہیں ہوجاتا۔

۴۔ ہندوستان میں ماضی کے مزاح نگاروں کے سامنے کوئی ایسی رکاوٹ نہیں جو موثر مزاح نگاری کی راہ میں حائل ہو۔

www.taemeernews.com

۵۔ ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے مطالعے سے بھی یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ہمارے یہاں صورت حال کا مزاح بہت کم ہے۔ ذاتی مزاح جو پھکڑ اور تمسخر کو پہنچا ہے زیادہ ہے۔ صحت مند شگفتہ مزاح خال خال ہے۔ اس طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

۶۔ میں مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری کہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ انشائیے میں مزاح کی پٹ ہو سکتی ہے یعنی انشائیہ نگار کسی حد تک مزاح نگار ہو سکتا ہے لیکن ہر مزاح نگار کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ انشائیہ نگار بھی ہو۔

۷۔ ادب میں نیرنگی خیال غلط نتائج پیدا کرتی ہے۔ ہر ادب میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کا ایک خاص مقام ہوتا ہے۔ اس کے بغیر کسی بھرپور ادبی روایت کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ اردو میں بھی طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی مستقل حیثیت ہے۔

ڈاکٹر قمر رئیس

۱۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد ہندوستان میں طنز و مزاح نہ حسب حال ہے نہ مائل بہ زوال اور نہ روبہ کمال۔ طنز و مزاح لکھنے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔ نئی بستیاں بسیں۔ تنوع پیدا ہوا رونق بڑھی۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس "اہل کتاب کی سنت" میں ایک ایک صحیفہ دے کر فارغ ہوئے۔ ان کے پیرو اس روایت سے منحرف ہوئے اور بے تحاشہ لکھنے لگے۔ شوکت تھانوی، کنہیالال کپور، عظیم بیگ چغتائی، حاجی لق لق، فرقت کاکوروی، کرشن چندر، شفیق الرحمٰن اور کئی دوسرے نام یاد آتے ہیں۔ انھوں نے طنز و مزاح میں ایک نئی جہت افسانویت کا اضافہ کر کے ایک طرف اس کا رشتہ سرشار سے تو دوسری طرف مڈل پاس قارئین اور میلاد اکبر پڑھنے والیوں سے جوڑا۔ یہ بڑا کام تھا۔ عام اور اوسط قاری تو عام اور اوسط درجہ کی ہنسی ہنسنا چاہتا تھا اور ہنسی اس کی صحت کے لئے اتنی ہی ضروری تھی جتنی کہ رشید صاحب کے قارئین کے لئے۔ وہ اس وقت بہت اونچی اور دقیق ہنسی نہیں ہنس سکتا تھا۔ خود میں ایم اے کرنے کے بعد جب علیگڑھ آیا اور رشید صاحب کی زیر نگرانی پی ایچ ڈی کرنے لگا تو مجھے شرم آئی اور میں نے رشید صاحب کے مضامین سے لطف اندوز ہونے کا تہیہ کیا۔ کچھ محنت لگی۔ اگر علیگڑھ کے ماحول نے مدد کی۔ چھ مہینے میں ایسی تربیت ہوئی کہ میں بھی رشید صاحب کے مضامین اور مقولے آیتوں کی طرح اسی والہانہ انداز میں سنانے لگا جس انداز میں (مرحوم) عبدالمعید خاں[1] سناتے تھے۔ تو رشید صاحب اور پطرس کی امت میں جو طنز و مزاح نگار پیدا ہوئے ان کی بڑی ضرورت تھی۔ ان کا زمانہ اردو طنز و مزاح کا دوسرا زمانہ تھا (اردو طنز و مزاح

---

[1] عبدالمعید خاں مرحوم علیگڑھ کے جانے مانے کردار اور رشید صاحب کے پرستار تھے۔ مضامین رشید، تقریباً پوری انھیں حفظ تھی۔ جب بھی ملتے سائیکل سے اتر کر ایک آدھ مضمون راستے ہی میں سنا دیتے اور کبھی کمرہ پر آجاتے تو دو تین مضمون اسی طرح جھوم کر سناتے جیسے کبھی اقبال کے پرستار ان کی نظمیں شکوہ وغیرہ سناتے تھے۔

www.taemeernews.com

کا سہرا اور ابھی نہیں آیا ہے) انھوں نے طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونوں سے محظوظ ہونے کے لئے وسیع پیمانے پر لوگوں کے ذوق کی تربیت کی۔ واقعاتی ظرافت کا معیار بلند کیا۔ زبان اور شعر و ادب سے بھی کام لیا۔ کردار بھی تراشے۔ پھر فکر تونسوی، یوسف ناظم، احمد جمال پاشا اور مجتبیٰ حسین نے مزاح میں طنز کی چاشنی بڑھا کر اور اسے زندگی کا آئینہ دکھا کر زیادہ کارگر اور چٹیلا بنا دیا۔

۲۔ پاکستان میں جو اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں ان میں سے تین سے میری شناسائی ہے یعنی مشتاق احمد یوسفی، ابن انشاء اور کرنل محمد خاں۔ ان کے علاوہ بھی کالم نگار اور مزاح نگار ہیں جن کی تحریریں میں نے کم پڑھی ہیں۔ جن کا ذکر اوپر آیا وہ واقعی اچھے فنکار ہیں۔ ابن انشاء مرحوم اپنے سفرناموں میں کبھی کبھی بھرتی کا مال بھی لے آتے تھے لیکن یوسفی کا نشانہ نہیں چوکتا اور نہ وہ اپنے آپ کو دہراتے ہیں وہ یقیناً اپنے سینیئر لکھنے والوں سے کچھ قدم آگے بڑھے ہیں۔ اور ان کی زیادہ دلکشا تحریروں کے مقابلہ میں ان کے پیش رو مزاح نگاروں کا آرٹ فطری طور پر کچھ پھیکا سا لگنے لگا۔

۳۔ میری دانست میں ضروری نہیں۔ بلکہ اکثر اس کے برعکس دیکھا گیا ہے۔ یعنی وہ جو کسی ضرورت پیشے یا عادت سے مجبور ہو کر مسلسل مزاح نگاری کرتے ہیں وہ قدر اول کی تخلیقات نہیں دے پاتے۔ اتفاق کی بات دوسری ہے۔

۴۔ ہندوستان میں اردو کے مزاح نگاروں کے سامنے اگر کچھ رکاوٹیں ہیں تو وہی ہیں جو شاعروں اور افسانہ نگاروں کے سامنے ہیں مثلاً ادب کے سنجیدہ قارئین کا قحط۔ اچھے ادبی رسالوں اور ناشروں کا قحط تخلیقی محنت کی داد اور صلے سے محرومی وغیرہ۔ یہی عام رکاوٹیں ہیں۔ دوسری طرف اُردو میں طنز و مزاح کے لئے فضا زیادہ سازگار دکھائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر اردو والے نسبتاً زیادہ ستم ظریفیوں اور بوالعجبیوں کا شکار ہیں۔ وہ فیوڈل عہد کی قدروں کا بھاری گٹھڑ سر پر اُٹھائے صنعتی زمانہ کی دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں۔ بیک وقت رُلانے اور ہنسانے والی یہ صورت حال طنز و مزاح کے لئے بڑی سازگار ہوتی ہے۔ بشرطیکہ مزاح نگار اسے محسوس کرے۔

۵۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے طنز و مزاح سے میری واقفیت ایسی نہیں کہ کوئی رائے دے سکوں۔

۶۔ جی نہیں۔ میں اس حق میں نہیں ہوں۔ انشائیہ بھی افسانہ اور شاعری کی طرح ظریفانہ تجربہ اور اظہار کا میڈیم ہو سکتا ہے اس لئے مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری کا مترادف کیوں سمجھا جائے؟

۷۔ مستثنیات سے قطع نظر طنزیہ اور مزاحیہ ادب کم و بیش ہر زبان میں ادبی اقدار کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ اس لئے مناسب ہوگا کہ اس کو اس کے اپنے دستور، مزاج اور معیار کی حدوں میں ہی دیکھا جائے اور اسی میں اس کے امتیازی اوصاف اور خوبیوں کو تلاش کیا جائے۔ اس کے خمیر میں کچھ ایسے عناصر ہوتے ہیں جو اسے بے پناہ مقبولیت بخشتے ہیں لیکن یہ مقبولیت آفاقی اور دیرپا کم ہوتی ہے۔

www.taemeernews.com

نثار احمد فاروقی

اُردو، طنز و مزاح کے بارے میں

سوال از آسمان ، جواب از ریسمان

۱۔ پطرس اور رشید احمد صدیقی جس نسل سے تعلق رکھتے تھے اس کے ساتھ اردو طنز و مزاح کی بڑی جاندار اور شاندار روایت بھی افسانۂ ماضی بن چکی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ آج سے نصف صدی پہلے انگریزی ادب کا مذاق بھی بہت شائستہ تھا اور عربی و فارسی زبان سے بھی اردو والوں کو اتنی بیگانگی نہیں تھی جتنی اب ہوگئی ہے۔ محاورہ، روزمرہ، ضلع جگت، رمز و کنایہ، استعارہ، قولِ محال، وغیرہ صنائع لفظی و معنوی میں طنز و مزاح کی لطافت اور تاثیر پوشیدہ ہوتی ہے، بعد میں آنے والی نسل صرف واقعات سے مزاح پیدا کرسکتی ہے الفاظ سے نہیں۔ یہ صورتِ حال آئندہ، اور بگڑے گی۔ ان شاء اللہ۔

۲۔ ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان میں اچھے مزاح نگاروں کی ایک نسل ضرور اُبھری ہے اور اس کے اسباب وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے۔ مشتاق احمد یوسفی اور شفیق الرحمٰن تو پہلے سے لکھ رہے تھے لیکن دوسری نسل میں کرنل محمد خاں، ابن انشاء جیسے مزاح نگاروں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اُنہوں نے کلاسیکی روایت کو برقرار رکھا ہے۔

۳۔ طنز و مزاح میں اعلیٰ درجے کی تخلیق کے لئے نہ بہت لکھنا ضروری ہے نہ مسلسل لکھنے کی ضرورت ہے۔ پطرس کی مثال کافی ہے۔ انھوں نے ایک مختصر سا مجموعہ اردو کو دیا ہے لیکن اس میں اعلیٰ درجے کا تخلیقی ادب موجود ہے۔ ہمارے بعض لکھنے والے بسیار نویسی کی وجہ سے بے قدر ہو گئے۔ جن حضرات نے اخباروں میں مزاحیہ کالم لکھنے کو اپنا ذریعہ معاش بنایا انھوں نے اگر کوئی اعلیٰ درجے کا مضمون لکھا بھی ہو تو اُسے اخباری فائلوں کے انبار میں تلاش کرنا خود ایک بڑی مشقت ہے اور ابھی تک اخباری کالموں سے طنز و مزاح کے انتخابات بہت ہی کم ہوئے ہیں۔

۴۔ ہندوستان میں اردو مزاح نگاری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اردو زبان کا فطری بہاؤ رُک گیا ہے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور دوسرے سرکاری و نیم سرکاری ادارے یا لیڈر یہ فتویٰ دینے لگے ہیں کہ زبان میں کیا آسان ہے اور کیا مشکل ہے۔ اگر کوئی لفظ اُن کی سمجھ میں نہیں آتا تو اسے اپنی کم علمی پر محمول نہیں کرتے زبان کو دشوار ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اور نتیجہ میں "بہاؤ معاملوں کے وزیر" جیسے ترجمے سامنے آتے ہیں۔ اسکولوں سے اُردو غائب ہے اور اردو کے وہ اساتذہ بھی اب نہیں ملتے جو اس زبان کے نک سکھ سے طلباء کو آشنا کرتے تھے ورنہ یہاں طنز و مزاح کے لئے بہت سازگار ماحول تھا کیوں کہ برطانوی ہند (یا موجودہ پاکستان سے) زیادہ اظہار کی آزادی کے مواقع حاصل تھے۔

۵۔ مجھے ہندوستان کی دوسری زبانوں کے مزاحیہ ادب کا ایسا مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا جس سے تقابلی تنقید میں سہولت ہو، لیکن ہندی ادب سے تھوڑی سی واقفیت ہے۔ اردو کا بیشتر مزاحیہ ادب ہندی میں منتقل ہو چکا ہے اور

www.taemeernews.com

جو اوپر بحث لکھا گیا ہے اس پر بھی اردو کا گہرا اثر ہے۔ بیشتر مجموعی خود ہندی والوں کو اعتراف ہے کہ ان کے ہاں اچھا مزاحیہ ادب موجود نہیں ہے۔ اس کا سبب زبان کا مصنوعی ڈھانچہ ہے۔ اس خول سے ہندی جب تک نہیں نکلے گی طنز و مزاح کی لطافتوں کو نہیں پا سکتی۔ ہندی میں مزاحیہ شاعری کے نام پر جو کلام سامنے آتا ہے اس میں رکاکت، ابتذال، پھکڑ پن اور بازاری لہجہ زیادہ ہوتا ہے۔

۵۔ طنز و مزاح ایک 'رس' ہے یہ نثر و نظم دونوں میں ظاہر ہو سکتا ہے۔ نثر میں بھی اس کا فارم ضروری نہیں کہ انشائیہ ہی ہو۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن ہمارے بیشتر مزاح نگاروں نے انشائیہ (ESSAY) کی شکل کو اپنایا ہے۔ اس لئے ہم مزاح نگار کو انشائیہ نگار کی صف میں رکھ سکتے ہیں۔ لیکن شاعری میں انشائیہ ہوتا ہی نہیں تو "انشائیہ گو" ہونے کا کیا موقع ہے؟ اُسے تو صرف مزاح نگار شاعر کہا جائے گا۔

۶۔ ادب کی درجہ بندی کرنا کسی فرد کا کام نہیں ہے یہ تاریخی عمل ہوتا ہے۔ اس لئے درجہ بندی وہی معتبر ہوتی ہے جس میں زمان و مکاں کی رعایت شامل ہو۔ قصیدہ، غزل، مرثیہ، رباعی، ناول، افسانہ، یہ ساری اصناف کسی نہ کسی دور میں رائج الوقت اور حاوی رہی ہیں۔ "اودھ پنچ" کا زمانہ یقیناً ایسا تھا جب طنز و مزاح ادب پر حاوی تھے لیکن آج یقیناً نہیں ہیں۔ اگر اس زمانے کے اعتبار سے درجہ بندی کرنا ہو تو تخلیقی ادب کی صف میں آخری نشست طنز و مزاح کی ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

۱۔ کسی بھی متحرک صورتِ حال کو کسی مقررہ وقت پر حسبِ حال، روبہ زوال، روبہ کمال وغیرہ کہنا ممکن نہیں۔ اس کے علاوہ ہر زمانے کے اپنے رنگ اور مزاج بھی ہوتے ہیں۔ اقبال کے زمانے میں اگر غالب نہیں تھے تو اقبال کے زمانے کے ادب کو روبہ زوال نہیں کہہ سکتے۔ نذیر احمد کا درجہ بحیثیت ناول نگار کے قرۃ العین حیدر سے کم ہے۔ لیکن نذیر احمد کے زمانے میں ناول کو روبہ زوال یا روبہ کمال، کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارے یہاں مزاح نگاری کی صورت یہ ہے کہ رشید احمد صدیقی یا پطرس کے برابر کا کوئی مزاح نگار اس وقت نہیں ہے۔ لیکن رشید احمد صدیقی اور پطرس کو اپنے مقام پر پہنچنے میں عرصہ لگا تھا۔ ممکن ہے آج کا مجتبیٰ حسین کل کا پطرس ہو۔

۲۔ پاکستان میں مشتاق احمد یوسفی کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر مزاح نگار فی الحال نہیں ہے۔

۳۔ بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے۔

۴۔ کوئی رکاوٹیں نہیں ہیں۔ ایک بار وڈ ورتھ نے دون کی لیتے ہوئے چارلس لیمب سے کہا کہ "چارلس، اگر میں اپنے ذہن کو تیار کروں تو شیکسپیئر کی طرح لکھ سکتا ہوں" لیمب نے جواب دیا۔ "یار ذہن ہی تو نہیں تیار ہے" یعنی ہمارے مزاح نگار کے سامنے صرف یہ رکاوٹ ہے کہ ابھی اس کا ذہن رشید احمد صدیقی کی طرح پختہ یا سودا کی

www.taemeernews.com

طرح جلتا بھنتا ہوا نہیں ہے۔ یا انھیں اکبر الہ آبادی کی طرح کسی نصب العین سے محبت نہیں ہے۔ ہمارے مزاح نگار خود کو سرکس کے مسخرے یا محفل کے لطیفہ گو کی طرح پیش کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس سے ہٹتے ہیں تو ایک طرح بھونڈا پن ہے اور دوسری طرف پند و موعظت۔ مزاح نگاری بہت سنجیدہ چیز ہے۔ طنز کے بغیر مزاح میں گہرائی نہیں آتی۔ یا اگر طنز نہ ہو تو زندگی کے بارے میں کچھ بصیرتیں ہوں، یا کم سے کم زبان کا فنکارانہ استعمال تو ہو۔ جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھایئں کیا۔

۵۔ یہ سوال سمجھ میں نہیں آیا۔

۶۔ انشائیہ بھی مزاحیہ ہو سکتا ہے، غزل بھی مزاحیہ ہو سکتی ہے۔ مزاح گو کو انشائیہ گو کہنے کا کچھ مطلب نہیں۔ انشائیہ (اگر اس نام کی کوئی چیز ہے) صنف سخن ہے۔ مزاح ایک صفت ہے۔

۷۔ اردو کا طنزیہ اور مزاحیہ ادب دنیا کے بہترین طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے معیار کا ہے۔ ہندوستان کی کسی زبان میں اس سرمایے کا طنزیہ مزاحیہ ادب موجود نہیں ہے!!

باقر مہدی

۱۔ کچھ عرصہ ہوا میں نے ایک شعر کہا تھا ؎

قہقہے اشک بن کے نکل نہ سکے ÷ اک تبسم بھی صرف آہ ہوا

یعنی وہ لوگ بھی جو حالات کی سنگینی سے ڈرتے نہیں ہیں اب اشک بار ہی کیوں؟ اس سوال کا جواب تفصیلی سماجی اور سیاسی بیانات اور تجزیئے کے بغیر ممکن نہیں ہے یہاں مختصراً عرض کرنا ہے کہ آزادی کے بعد رہنمائی توقعات نے ہمارے ذہن میں یہ خیال ڈال دیا کہ "اب خوش حالی آئی، اب خوش حالی آئی" اگر ہمارے سیاسی رہبروں نے عوام کو مسلسل جفاکشی، قربانی اور قناعت کے اسباق دیئے ہوتے تو شاید خوابوں کی اتنی پسپائی نہ ہوتی مگر یہ اُن سے ممکن نہ تھا اس لئے کہ پورا معاشرہ جاگیردارانہ لعنتوں میں گھرا ہوا تھا اور اس سے نکال کر سرمایہ دارانہ پیداواری لانا ضروری تھا۔ صنعتوں اور خاص کر بڑے بڑے کارخانے بنانے ضروری تھے اور کسی حد تک یہ کام ہوا بھی ہے مگر سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی جیسے امیر اور غریب طبقے میں تفاوت بہت بڑھ گیا اور ہندوستان کسانوں کا ملک تھا اور ہے چند نیم روشن شہر آبادی کے اژدھام اور غلط منصوبہ بندی سے سیاہ دولت کے مراکز بن گئے ہیں اور سرمایہ داری کے فوائد کم اور نقصانات نے ہمیں گھیر لیا مسلمانوں کے متوسط طبقے کے حرکی افراد ہجرت کر گئے مجبور اور بے کس عوام کی اکثریت پرانی اقدار سے چمٹی رہ گئی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب تقسیم کے بعد ایک طویل عرصے تک جاں کنی کے عالم میں رہا ایسے ماحول میں طنز تو کسی حد تک فروغ پا سکتا ہے مگر مزاح پھیکی ہنسی یا غمگین تبسم سے آگے نہ جا سکا یعنی طنز و مزاح کی طراری اور دانش وری نہ رہی رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد مرزا کھیا لال پوری ایک لطیفہ نگا

www.taemeernews.com

پیدا ہوئے جنھوں نے اردو طنز و مزاح کی روایت کو آگے بڑھایا وہ طنز و مزاح کے قطب مینار (جیسا کہ میرے دوست مجتبیٰ حسین کہتے ہیں) نہ سہی لیکن روشنی کے مینار ضرور تھے میں ایک مضمون ان کے بارے میں لکھ چکا ہوں۔ جو شگوفہ ۱۹۸۱ء میں شائع ہوا تھا ابھی تک ان کی اہمیت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکا ہے اس لئے کہ شروع سے اردو ادب میں طنز و مزاح کی اپنی الگ حیثیت مسلم نہیں تھی اور کیسے ہوتی؟ اس لئے کہ جاگیردارانہ نظام میں مزاح نگاری فقرہ بازی (یہ مزاح نگاری کا ایک اہم جز وہی لیکن سب کچھ نہیں ہے) چہل، الھڑپن نیم فحش جملے یا گالیاں اور ہجویات وغیرہ کا سہارا لے کر زندہ رہتی تھی آخر انگریزی ادب کے بھی بڑے مزاح نگار سرمایہ داری کے دور ہی میں پیدا ہوئے ہیں جاگیرداری نظام نقال، بھانڈ اور مسخرے تو پیدا کرتا ہے مگر ان کی ساری نام نہاد شائستگی اوپری ہوتی ہے جیسے کہ ان کے آداب "جی حضور جی حضور" کہنے والا مسخرا لاکھ اپنی جان کی بازی لگا کر ہنسائے مگر اس کا انجام انشاء اللہ خاں انشاؔ سے بھی زیادہ عبرتناک ہوتا ہے اور سرمایہ داری نظام ہر فن پر قیمت کی مہریں لگاتا ہے اور ہر شئے فروخت ہوتی ہے اور مسخرہ دربار سے نکل کر اپنی دکان لگاتا ہے اور اس طرح مزاح مستقل "بک" مسرت حاصل کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے مگر بے روح اس لئے کہ سرمایہ دار کو فالتو وقت میں مسرت چاہئے جب وہ اپنے استحصالی دھندوں سے الگ رہ کر "فرحت" کا خواہاں ہوتا ہے اور ہمارا ماحول، ہماری زندگیوں کی طرح دو نیم ہے یعنی نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ اس کے علاوہ ہم نے تفریح کو ایک آرٹ اور صنعت نہیں بننے دیا بلکہ یہاں بھی ہماری ذہنی پس ماندگی نے ہمیں پیچھے سے پیچھے، اساتذہ بنا دیا اگر میرے اس بیان کے سلسلے میں مثالیں ضروری ہیں تو ہماری مزاحیہ فلمیں دیکھئے یا گجراتی کے وہ ڈرامے دیکھئے جو اپنے ذو معنی (یعنی نیم فحش جملوں کی وجہ سے بے حد مقبول ہیں یا اردو کا مشہور "ڈرامہ" (میں اُسے ڈرامہ نہیں مانتا اس لئے کہ وہ لطائف کا ایک "پٹارہ" ہے) "اورک کے پتے" اس لئے ہمارے مزاح نگاروں کو اپنے جملوں کی ڈھول پیٹنا اور لفظی قلابازی کرنا تو آتا ہے مگر وہ لطیف مزاح جو ذہنوں کو سرور طبیعت کو شگفتگی بخشے میسر نہیں ہے اور وہ بیچارے کریں بھی کیا جس متوسط طبقے کی درمیانی سطح پر وہ منسلک ہیں وہ اپنے روز و شب روزی روٹی کے حصول میں اتنا سرگرداں رہتا ہے کہ اپنی ذہنی جولانیوں اور دانشورانہ طراری کو فروغ ہی نہیں دے پاتا ہے اس لئے میں اپنے بے کس مزاح نگاروں کو مورد الزام کیسے ٹھہرا سکتا ہوں جب کہ ہم سب "دلدل" میں گھرے ہوئے ہیں اور آدمی جب خود تماشا اور خود ہی تماشائی ہو تو قہقہوں اور تالیوں کا شور بے ہنگم معلوم ہوتا ہے اتنی پس ماندگی اور بے چارگی کے باوجود اودھ کے پچھلے دس پندرہ برسوں میں چند مزاحیہ اور طنزیہ ناولوں نے لکھنے کی مسلسل کوششیں کی ہیں ان کو معیاری نہ کہا جائے گا مگر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کیا صرف نام گنانے سے اُن کی "اہمیت" (جو انہوں نے ابھی نہیں حاصل کی ہے) کا اندازہ ہوسکے گا؟ دوسرے ان سب کی کتابوں کا بغائر مطالعہ کرنے کے بعد ہی اس سوال کا جواب دیا جاسکتا ہے ہاں جب ماحول میں تالیوں کی صدائیں بلند ہو رہی ہوں تو "رونق" کا سوال بھی نہیں اٹھتا ہے اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کی اکثریت مسلم اقلیت پر مشتمل ہے جمشید پور، احمد آباد، مراد آباد، میرٹھ، بڑودا، آسام اور بلچی، بھاگلپور احمد آباد کے قریب و جوار جہاں پر ہندوؤں کا قتل عام ہوا ہے اور عالمی سطح پر بیروت، گوتیمالا، ولاسیر دور پھر آفاتِ زمانہ، یعنی زلزلے، قحط اور سیلاب۔

www.taemeernews.com

اور تمام مصائب کے بعد بھی لوگ ہنستے ہیں مگر دکھے دلوں، پیلے ہونٹوں اور نمناک آنکھوں کا تبسم جاں گداز ہوسکتا ہے فرحت بخش نہیں کل تک کامیڈی ادنیٰ درجے کی "چیز" سمجھی جاتی تھی اور اب ایبسرڈ ڈرامہ (Absurd Drama) نے اسے ایک اعلیٰ درجے کے ڈھانچے میں ڈھال دیا ہے مگر اس کا زیادہ حصہ آج کی زندگی کو ہدف دشنام بناتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کائنات اپنے محور پر لڑکھڑا رہی ہے اس لئے دنیا نویت مذہبی بنیاد پرستی کا قدیم وحشیانہ لباس پہن کر پھر رقص کر رہی ہے دوسری طرف دو بڑی قومیں خون ناحق کی ہولی منانے کی تقریبیں کر رہی ہیں ـــ تو کیا آدمی کی ہنسنے کی جبلت مر گئی ہے اور وہ اب صرف نالہ و شیون کا پیکر خاکی ہے؟ نہیں ایسا بھی نہیں لوگ اب بھی ہنستے ہیں مگر دل سے نہیں۔ آدمی کی مزید سیاسی مذہبی اور سماجی حماقتیں (مزید حماقتیں از شفیق الرحمٰن) روز روشن کی طرح عیاں ہیں مگر سیاسی شاطر چاہتے ہیں کہ زندگی کی تلخ حقیقتوں پر کامیڈی کا رنگین پردہ ڈال دیا جائے تاکہ مصنوعی تہذیب کا پروردہ آدمی کھوکھلے قہقہے لگاتا رہے۔ اس طرح دونوں بڑی سیاسی طاقتیں اپنے اپنے حلقے میں ظلم اور جبر کو فروغ دیتی رہیں ہاں کنہیالال کپور کے بعد اعلیٰ پائے کا طنز نگار ہند و پاک میں پیدا نہ ہوسکا۔ فکر تونسوی بنیادی طور سے ادبی صحافی ہیں کالم نگاری ہلکی اور زیادہ تر سیاسی تحریر کو اپنی سوبیت زدہ اشتراکی حقیقت نگاری کے ذریعہ مقبول بنانے میں اس حلقے میں کامیاب ہوتے ہیں جو اردو ادب کا ہوتا ہے مگر جو اردو ادب کی روایات کا مخالف رہا ہے یعنی پرتاب اور ملاپ قسم کے اخبارات اور ان کے کالموں نے فکر صاحب کو شہرت دی ہے۔ ان کے سارے مضامین اور کتابیں نہیں پڑھی ہیں۔ مجھے صرف فکنامہ پڑھنے کی سعادت خود حضرت فکر نے عطا کی تھی اس کا دیباچہ کرشن چندر نے لکھا تھا اور اپنے مخصوص رومانی انداز میں تحریر کیا تھا۔ کرشن چندر لکھتے ہیں:۔

"افسوس یہ ہے کہ طنز نگار کے آنسو کسی نے نہیں دیکھے افسانہ نگار، ناول نگار و قائع نگار زندگی کے المیے پر آپ کو رلاتا ہے طنز یہ نگار ہنساتا ہے وہ ادب کے صدف میں ایک آنسو کو منجمد کر کے اسے دُر آبدار بنا دیتا ہے اس ہنسی کی پرتوں میں ٹٹول ٹٹول کر اس ایک آنسو کی نرمی گرمی اور آنچ کو پالینا کسی مہذب قاری کا کام ہے"۔ (فکنامہ ص ۱۵)

مطلب یہ ہے کہ طنز نگار خود روتا ہے مگر اتنی احتیاط سے کہ کوئی مہذب قاری ہی اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوسکتا ہے ورنہ عام قاری نہیں فکر خود کپور صاحب کے بڑے معترف ہیں اس لئے کپور کے بعد اس پائے کا طنز نگار تو اردو ادب میں ہند و پاک میں نہیں ہے مگر فکر کی طنز نگاری میں رقت زیادہ قہقہے کم اور تلخی زیادہ کرب کم ہے مگر ایک لفظی شگفتگی کے ساتھ۔ مجھے فکر کی تحریر جاندار تو ضرور لگتی ہے اور میں اسے شوق سے پڑھتا ہوں لیکن ان پر فیصلہ کن رائے دینے کی کوشش اس وقت تک نہیں کرسکتا ہوں جب تک کہ ان کی ساری کتابوں کو مسلسل نہ پڑھوں فکنامہ دلچسپ اور "فکر" خیر یقینی ہے اس کا طنز دیرپا ہے یا نہیں؟ اس میں سماجی معنویت کے علاوہ جمالیاتی مسرت اور بصیرت ہے یا نہیں؟ اس کے بارے میں غور و فکر (تونسوی) کے بعد ہی کوئی رائے دی جاسکتی ہے ـــ فکر تونسوی کے ایک ناقد پر دفیسر گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں ـــ

www.taemeernews.com

"فکر تونسوی کے بارے میں اس بنیادی غلطی کو رفع ہونا چاہیئے کہ وہ محض طنز نگار ہیں اگرچہ ان کی تحریروں کے پیچھے ایک اصلاحی جذبہ ہوتا ہے اور ان کے تخلیقی محرکات سماجی اور سیاسی ہوتے ہیں لیکن اگر وہ صرف طنز کے سہارے چلیں تو ان کی بات پھیکی اور بے مزہ ہو کر رہ جائے یہ ان کے تخلیقی مزاج کا حصہ ہے کہ وہ جگہ جگہ مزاح کا سہارا لیتے ہیں اور ہنستے ہنساتے ہوئے اس طرح چلتے ہیں کہ طنز کی تلخی کہیں برداشت کی حد سے نہیں گزرتی۔" (گفتگو ستمبر ۸۵ء سے جون ۸۶ء ص ۱۹۰)

اس تحریر کو غور سے پڑھیئے تو پتہ چلے گا کہ "غلطی" کو رفع کرنے کے بجائے پروفیسر نارنگ نے اور پھیلا دیا ہے یعنی فکر کی تحریر کا طنز مزاح کے سہارے قابل برداشت بنتا ہے ـــــ ظاہر ہے کہ خالص طنز اور خالص مزاح دونوں ہی مگر ناپید ضرور ہیں۔ جو اپنے کو فخریہ مزاح نگار کہتے ہیں وہ بھی طنز کی نشتریت کو استعمال کرتے ہیں اور جو صرف طنز نگار ہیں وہ مزاح کی پھلجھڑی بھی وار کرنے سے پہلے چھوڑتے ہیں لیکن فکر تونسوی بنیادی طور سے طنز نگار ہیں جیسے کہ شفیق الرحمٰن مزاح نگار گو کہ شفیق الرحمٰن نے چند نہایت کامیاب افسانے بھی لکھے ہیں جیسے "سراب"

اس لئے جب پورا ملک ہی خلفشار، انتشار اور درندگی سے دوچار ہو تو طنز و مزاح کا حال کیسے دگرگوں نہ ہوگا البتہ حال ہی میں انڈین ایکسپریس میں ایک انگریزی صحافی دھرن بھگت نے ایک آٹھ کالمی مضمون مزاح کے بارے میں لکھا ہے اس کا ذکر اس لئے کر رہا ہوں انگریزی بولنے اور انگریزی لکھنے والے ہم اردو بولنے اور لکھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ با اثر ذہین اور معیاری سمجھے جاتے ہیں اس مضمون کا عنوان ہے THE BAD SAD STORY OF INDIAN HUMOUR یعنی ہندوستانی مزاح کی افسوس ناک صورت حال۔ یہ مضمون ۷ اگست ۸۳ء کو شائع ہوا ہے یہاں اس کا خلاصہ دینا بھی ممکن نہیں ہے اس لئے کہ پہلے سوال کا جواب قدرے طویل ہو گیا ہے صرف مختصراً چند جملے لکھ رہا ہوں یعنی لب لباب ہندوستان کے بہت مشہور کارٹونسٹ شنکر نے کہا تھا "ہندوستان کی بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارے یہاں حس مزاح کی بڑی کمی ہے" اس بیان پر خوشونت سنگھ نے اضافہ کرکے کہا تھا "ہم ہندوستانی تنگ مزاج ہیں ذرا ذرا سی بات پر برہم ہو جاتے ہیں" ـــ دھرن بھگت نے اپنے مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ ہندوستانی بے حد مزاحیہ لوگ ہیں اور اس کے ثبوت میں انہوں نے متعدد مثالیں انگریزی لکھنے والے ہندوستانی صحافیوں، شاعروں اور ڈرامہ نگاروں سے دی ہیں خاص کر AIR INDIA کے بابی کوکا BOBBY KOOKA کا یہ جملہ نقل کیا ہے۔

"OUR SISTER AIR LINE, INDIAN AIR LINE, IS IN THE CUSHY POSITION OF BEING AMONOPOLY. LUCKY CHAPS, THEY RAISE THEIR FARE JUST TWICE ADAY — BE FORE AND AFTER BREAKFAST. THERE IS JUSTONE SNAG — TAEY DO NOT SERVE BREAKFAST"

اردو ترجمہ میں اس کا لطف چلا جائے گا اس لیئے یہ انگریزی جملہ یونہی پڑھا جائے۔

www.taemeernews.com

دھرن بھگت نے لکھا ہے" بیسویں صدی میں بھی ہندوستانی انگریزی بے حد سست تھی اور حاضر جوابی کے تیز جملوں کے آگے بھی لکھنا پڑتا تھا (قہقہے) اس نے سلمان راشد کے انگریزی ناول نیم شب کے اطفال MIDNIGHT CAILDREN کا خاص کر ذکر کیا ہے کہ وہ ایک ہندوستانی ناول نگار کا نہایت پُر لطف مزاحیہ ناول ہے سائیں پرانجپے کی فلموں کا ذکر کیا ہے جو ہندی فلموں میں کامیڈی عناصر کو نہایت خوبی سے پیش کرتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی مزاح کے بارے میں شدید بنیادی اختلاف ہے ایک کہتا ہے کہ ہم مزاجاً تنگ نظر اور تنگ دل ہیں دوسرا کہتا ہے کہ ہرگز نہیں ہمارے قہقہے تو فلک شگاف ہیں میری رائے میں اردو ادب میں جب سنجیدہ ادب (خواہ وہ ترقی پسند ہو یا جدید اعلیٰ پائے کا نہیں ہے تو طنز و مزاح کی سطح کی پستی کی شکایت غلط ہے ہمارے بیشتر لکھنے والے مزاح نگاروں سے ملیئے تو آپ کو پتہ چلے گا وہ "بلند شخصیتوں" میں بدتوں سے محفوظ ہیں ان پر تاریخ، عالمی ادب، آرٹ فلمیں، مزاحیہ ناولوں اور دنیا کی کشاکش، کشمکش اور ڈیلما کا کچھ اثر ہی نہیں ہے مجھے ان کی مجبوریوں کا علم ہے اس لئے اتنا ہی کہہ سکتا ہوں ؎

اک شورِ بے نوا سی آنکھوں میں رہ گیا
بے کس کے قہقہوں کا مزا لے گئی ہوا

۲. پاکستان کے بارے میں لکھنا میرے لئے بہت دشوار ہے ایک تو میری یہ کمزوری ہے کہ میں مذہبی اور سیاسی ادعائیت کا شدید مخالف ہوں دوسری مجبوری یہ ہے کہ میں دو بار پاکستان کی "زیارت" کر آیا ہوں وہاں مجھے لوگ کم ہی ہنستے ہوئے نظر آئے تھے مگر یہ تقریباً بیس برس پرانی بات ہے مجھے وہاں کے صرف چند طنز و مزاح نگار ادیبوں کی تحریریں پڑھنے کا موقع ملا ہے نئے ملک کی نئی فضا ہمیشہ سے ولولہ انگیز ہوتی ہے انگریز یہ بات تسلیم نہیں کرتے ورنہ وہ امریکی مزاح کے قائل ہوتے پاکستان میں اردو ادیبوں کی معاشی خوش حالی کا اندازہ کتابوں سے لگائیے جو وہاں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں جی ہاں طبیعت کی روانی ذہن کی بالیدگی اور روح کی شادابی کے لئے معاشی خوشحالی لازمی نہ سہی معاون ضرور ہوتی ہے لازمی اس لئے نہیں کہتا کہ کوئی سعودی یا کسی بھی خلیجی ملک کی خوش حالی کی مثال دے کر کہے کہ وہاں طنز و مزاح تو دور کی بات ہے صحافت بھی اب تک "رینگ" نہیں رہی ہے گو کہ عرب اب اونٹ پر نہیں امریکی تیز رفتار کاروں میں سفر کرتے ہیں بہرحال خوش حالی سنگ بنیاد نہ سہی طنز و مزاح کا ایک اہم ستون ضرور ہے اور پھر جب پاکستان کے اخبارات ادبی خبروں (سیاسی خبریں اور ان پر تبصرے تقریباً ناپید ہیں) سے لبریز ہوں تو ادب ایک مسلسل "چٹخارے" پھبتیاں، فقرہ بازی اور لطائف سے بھرپور ہوتا ہے گو کہ میں مالا مال نہیں کہہ سکتا۔۔۔ وہاں مشتاق یوسفی کی تحریریں سب پر سبقت اس لئے لے جاتی ہیں کہ وہ ایک طرف مغرب زدہ طبقے کا مذاق اڑاتی ہیں تو دوسری طرف وہ مشرق کو بھی ہدف ملامت بناتی ہیں یعنی مشتاق یوسفی چومکھی لڑنے، ہنسنے ہنسانے کے قائل ہیں مجھے یہ لکھتے ہوئے کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی ہے کہ میں نے ان کی زرگزشت دو تین بار پڑھی ہے اور ہر بار مسرور ہوا یہ مزاح ایک ایسی گدگدی پیدا کرتا ہے کہ ذہن و جسم دونوں ایک خاموش قہقہے سے سرشار ہو جاتے ہیں میری رائے میں مشتاق یوسفی کے مزاح کے عناصر ترکیبی

www.taemeernews.com

یہ ہیں :-

۱. زبان و بیان پر بے مثال قدرت .
۲. انگریزی الفاظ کا نہایت پُر لطف استعمال.
۳. ننھے ننھے روشن ڈرامائی مناظر.
۴. اکثر پھکڑ پن، شدید تلخی اور حقارت سے پرہیز
۵. اس کے علاوہ وہ ایک فطری مزاح نگار ہیں جنھوں نے اس کو آرٹ بنانے کے لئے کامیڈین کا روپ نہیں دھارا ہے.
۶. اور آخری بات کہ وہ اصلاح کا جھنڈا ہاتھ میں نہیں لیے ہوئے ہیں بلکہ وہ تماشہ بینوں کے کیمرہ مین یعنی عکاس اور ترجمان ہیں اس کا مطلب ہے کہ وہ تماشہ اور تماشی بینوں دونوں کو ہی نہیں بلکہ خود کو بھی ہمیشہ "زد" پر لیئے رہتے ہیں اسی لئے ان کی تحریر بے حد شگفتہ، تیز اور پُر اثر ہوتی ہے یہاں مثالیں دے کر میں جواب کو طویل نہیں بنانا چاہتا ہوں ورنہ متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں بہر حال "زرگذشت" تو اب ایک کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ کرنل محمد خاں کی کتاب "بجنگ آمد" بھی مجھے پہلے بہت پسند تھی میرا خیال ہے کہ وہ بھی اپنی ندرت کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے یہ سب لوگ ہمارے ہندوستانی مزاح نگاروں کے مقابلے میں بہت پڑھے لکھے زیرک اور آفت زمانہ قسم کے لوگ ہیں۔

حال ہی میں مجھے ایک اور کتاب پڑھنے کا اتفاق ہوا "تادم تحریر" صدیق سالک مجھے نہیں معلوم کہ یہ ان کی پہلی کتاب ہے یا دوسری مگر نہایت دلچسپ واقعات اور چبھتے ہوئے فقروں سے بھری ہوئی ہے ان کے یہاں بھی طنز کی پسی ہوئی (پروفیسر سرور حسن: پسی ہوئی بجلیاں لکھتے ہیں) بجلیاں نہ چمکتی ہیں اور نہ کوندتی ہیں بلکہ جگنو کی طرح چمک کر غائب ہو جاتی ہیں ان کے مختصر سفرنامے بھی خوب ہیں تحریر میں تازگی اور ندرت ہے اور مزاح کی بقا کے لیئے کیا چاہیئے؟

وہاں کے سینیر یعنی بزرگ لکھنے والے روبہ انحطاط ہیں یا نہیں میں اس کا جواب نہ دے سکوں گا میں نے تیسرے اور چوتھے سوالات کے جوابات پہلے سوال کے جواب میں دے دیئے ہیں اور سوالات کے جوابات قرض رہے!

وحید اختر

۱. جس دور کو آپ رشید احمد صدیقی اور پطرس کا دور کہتے ہیں، اس وقت غیر منقسم برصغیر میں اور لوگ بھی مزاح لکھ رہے تھے جیسے عظیم بیگ چغتائی، حاجی لق لق، شوکت تھانوی، کارموزی، شفیق الرحمن، کنہیا لال کپور، فکر تونسوی وغیرہ۔ حالاں کہ ان میں سے بعض ان کے ہم عمر تھے، بعض بعد میں آئے تھے۔ پطرس نے تو چند مضامین کے بعد پھر کچھ مزاحیہ مضامین لکھے ہی نہیں، لیکن اب تک ان کے چند مضامین اردو میں خاصے کی چیز ہیں۔ رشید احمد صدیقی کو میں مزاح نگار

www.taemeernews.com

سے زیادہ طنز نگار سمجھتا ہوں' اس علاکے کو ہیں نے تفصیلی تجزیاتی جائزے کے ساتھ مضامین رشید پر اپنے مضمون میں پیش کیا ہے' جو زیرِ طبع ہے۔ اُن کا مزاح قولِ محال (PARADOX) کے استعمال' چند فقروں' زبان کے ماہرانہ استعمال پر مبنی ہے جو ایک طرح سے اودھ پنچ کے مزاح نگاروں کے لفظوں کے کھیل کی جدید انداز میں توسیع ہے۔ لفظوں سے کھیلنے کا یہ انداز شوکت تھانوی کے یہاں بھی نمایاں ہے بجز اُن کے شاہکار 'سودیشی ریل' یا شیش محل کے خاکوں کے لیکن وہ بنیادی طور پر مزاح نگار ہیں' ان کی ناولوں میں مزاح کا معیار عظیم بیگ چغتائی سے بھی ہلکا ہے۔ چغتائی کے مضامین ہلکے پھلکے ہونے کے باوجود ان کے ترقی پسند اور سماجی شعور کی کہیں کہیں عکاسی کرتے ہیں۔ شفیق الرحمن نے ابتداءً لطائف جمع کرنے سے کی' لیکن بعد میں اُن کے یہاں نئی بلوغت آئی۔ طنز اُن کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہے' اسلئے وہ خالصتاً مزاح نگار ہیں۔ عابد لق لق اور ملا موزی اپنے انداز میں منفرد تھے۔ لق لق کا مضمون' غالب انڈ گوئیے" اردو کے بہترین مزاحیہ مضامین میں سے ہے ـــ اس دور میں چراغ حسن حسرت' عبدالمجید سالک اور ابراہیم جلیس اخبارات میں کالم لکھتے رہے۔ جو سیاسی طنز پارے ہیں۔ ترقی پسندوں میں خواجہ احمد عباس' کرشن چندر اور عصمت چغتائی افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور رہے۔ لیکن ان سب کے خصوصیت سے کرشن چندر کے خاکے طنز و مزاح کے اچھے نمونے ہیں۔ فکر تونسوی نے شاعری چھوڑ کر طنزیہ مضامین اور کالم نگاری پر توجہ کی اور اس میدان میں امتیاز حاصل کیا' اُن کے ہم عروں میں کنھیالال کپور کے یہاں طنز و مزاح کا امتزاج سب سے زیادہ منفرد انداز و اسلوب میں ہوا ہے اور وہ تقسیم سے قبل رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد طنز و مزاح میں سب سے اہم سمجھے جاتے رہے ہیں' سعادت حسن منٹو کے یہاں جو طنز ہے اس کی مثال اردو افسانہ نگاری میں کہیں نہیں ملتی۔ "سیاہ حاشیے" اس کی بہترین مثال ہے۔

آزادی کے بعد کئی مزاح نگار سامنے آئے۔ احمد جمال پاشاہ کی اُٹھان اچھی تھی۔ اُن کے چند مضامین اور نثری پیروڈیوں (خطوطِ غالب) نے چونکایا بھی' متوجہ بھی کیا۔ لیکن وہ آہستہ آہستہ پس منظر میں چلے گئے' یوسف ناظم آزادی کے بعد کے ابتدائی برسوں میں ریاست حیدرآباد میں متعارف ہو چکے تھے۔ بعد کے برسوں میں اُن کے یہاں پختگی آتی گئی۔ وہ ایک طرف تو رشید احمد صدیقی اور اُن کے قبیل کے نثر نگاروں کی طرح لفظوں کو TWIST کرتے ہوئے محاوروں سے بہت کام لیتے ہیں' لیکن ان کی حسِ مزاح لطیف ہے' چھوٹے چھوٹے ترشے ہوئے فقرے اور اختصار' ان کے طنزیوں کی خصوصیات میں سے ہیں۔ ان کے یہاں طنز و مزاح باہم دگر اس طرح مل جاتے ہیں کہ ان میں فرق مشکل ہے۔ ان کا مزاح ہو یا طنز تبسم زیرِ لب کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ اس باب میں کوئی دوسرا ان کا حریف نہیں۔ حیدرآباد میں انجمن زندہ دلانِ حیدرآباد نے سالانہ طنز و مزاح کانفرنسوں سے مزاح کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ـــ حیدرآباد کے مزاح نگاروں میں بعجلت چند کھنہ' نریندر لوتھر' برق آشیانوی' رشید قریشی' خواجہ عبدالغفور کے علاوہ کئی اور نئے نام لیے جا سکتے ہیں' لیکن ان سب میں امتیاز حاصل کیا مجتبیٰ حسین نے ـــ مجتبیٰ نے "سیاست" میں مزاحیہ کالم سے اپنے ادبی کیریر کا آغاز کیا' اُن سے پہلے یہ کالم برسوں' چند وقفوں کے علاوہ' شاہد احمد صدیقی لکھتے رہے' جن کے کالموں کا انتخاب چھپ چکا ہے۔ مجتبیٰ کے مضامین کے

www.taemeernews.com

کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حال میں اُن کا سفرنامہ "چلو جاپان چلو" شائع ہوا ہے۔ پاکستان میں تو سفرناموں کا رواج عام ہو چکا ہے جن میں کرنل محمد خاں کا پہلا سفرنامہ (یا سرگزشت؟) "بجنگ آمد" سفرنامے میں مزاح کا اچھا نمونہ ہے' بعد کے سفرنامے جیسے 'بسلامت روی' میں وہ بات نہیں۔ مجتبیٰ کے مختصر مضامین اور خاکے شخصیات کا اچھا نفسیاتی مطالعہ ہیں' وہ ادبی شخصیتوں کی کمزوریوں اور اُن کے کوہ بڑوں کو اس طرح سامنے لاتے ہیں کہ خود "ممدوح" بھی اپنے کردار کے مضحک پہلوؤں کے ذکر سے بدمزہ نہیں ہوتا ـــ سفرنامے کی حد تک وہ ہندوستان کے پہلے مزاح و طنز نویس ہیں جنھوں نے اس صنف کو برتا ہے۔ اُن کے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے سفرنامے "دو ملک ـ ایک کہانی" اور چین کا سفرنامہ سیاسی نوعیت کے ہیں' ان میں طنز تو ہے مگر تلخی بھی ہے اور کہیں کہیں جلنی لذتیت بھی۔ مجتبیٰ کا فن تلخی و لذتیت سے پاک اور زیادہ صاف ستھرا ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی ادیب قابلِ ذکر ہیں' جن میں خصوصیت سے تخلص بھوپالی قابلِ ذکر ہیں' لیکن وہ شذرہ مستحل ثابت ہوئے۔ وجاہت علی سندیلوی' مجیب شہابادی' شفیقہ فرحت کے ساتھ کبھی کبھی طنز لکھنے والوں میں زینت ساجدہ' جیلانی بانو' عوض سعید (خاکے) کے نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔

اگر طنز و مزاح کے ذیل میں نثری مضامین اور خاکوں کے علاوہ دوسری اصناف کو بھی شامل کیا جائے تو شاعروں کا ذکر بھی ناگزیر ہے۔ دلاور فگار نے اپنی چند نظموں سے شہرت حاصل کی' مستقل ایک ہی معیار کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کرنے والوں میں رضا نقوی واہی سب سے ممتاز ہیں' اُن کے یہاں دوسرے مزاح نگار شاعروں کی طرح زبردستی ہنسانے کے لئے منہ بنانے یا چڑانے کی کیفیت کہیں بھی نہیں۔ وہ زبان اور فن دونوں کا لحاظ رکھتے ہیں' ان کے یہاں موضوعات کا بھی تنوع ہے۔ دکھنی میں سرور ڈنڈا اور سلیمان خطیب نے نذیر دہقانی' صاحب وغیرہ کی روایت کو آگے بڑھایا۔ ڈنڈا کے یہاں سیاسی طنز زیادہ بالغ ہے' سلیمان خطیب کے یہاں دکن کی تہذیب اور عام زندگی کے مسائل پر زور ہے' انھوں نے دکنی لوک گیتوں سے بھی بھرپور استفادہ کیا۔ ان کے علاوہ حیدرآباد میں نئے مزاحیہ شاعروں کی ایک بڑی تعداد ہے جیسے حمایت اللہ' صبغت اللہ بمبھاٹ' گلی نلگنڈوی وغیرہ۔ لیکن ان میں حمایت اللہ کے علاوہ اور کسی کے یہاں صاف ستھرا مزاح نہیں۔ اسی طرح لکھنؤ کے بعض شاعروں جیسے ماچس اور آفتاب کے یہاں بھی سامعین کو ہنسانے کی کوشش اکثر مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ مجموعی طور پر شاعری میں مزاح کا معیار بہ استثنائے واہی کچھ زیادہ قابلِ اعتنا نہیں ـ ہاں اس ضمن میں ایک نام اور لیا جا سکتا ہے' راجہ مہدی علی خاں کا' لیکن وہ آزادی سے قبل ہی مشہور ہو چکے تھے۔ وہ اپنے رنگ میں منفرد تھے۔ موجودہ مزاحیہ شعر گویوں میں کشمیر کے قاضی غلام احمد کئی لحاظ سے قابلِ ذکر ہیں'

جہاں تک طنز کا سوال ہے اردو کی جدید شاعری کا معیار بہت اونچا ہے' نظم میں خصوصیت سے اور غزل میں کہیں کہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بڑی یا قابلِ ذکر شاعری نے ہمیشہ طنز سے کام لیا ہے' اساتذۂ متقدمین میں میرؔ' سوداؔ' غالبؔ اور انیسؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں ـ ترقی پسند شاعری میں طنز کا عنصر نایاب رہا ہے۔ ہاں جوشؔ کی طنزیہ شاعری استثنا ہے یا کیفی اعظمی کی چند نظمیں جو سیاسی طنز لیے ہیں ـــ بعد میں طنز کا عنصر اختر الایمان کے یہاں نمایاں ہوا (مثلاً میرا انعام

www.taemeernews.com

میر ناصر حسین وغیرہ)۔ آزادی کے بعد کی نسل کے شعراء میں طنز کا عنصر اور بڑھ گیا، میں چند نام لے سکتا ہوں باقر مہدی (جن کے یہاں طنز تلخی کی صورت اختیار کر لیتا ہے) عمیق حنفی، بمل کرشن اشک، من موہن کرشن، محمد علوی اور عادل منصوری (ان دونوں کے یہاں سنجیدگی اور طنز و مزاح کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا کبھی کبھی مشکل ہو جاتا ہے) ندا فاضلی، عزیز قیسی۔ خود میری گزشتہ دس پندرہ برسوں کی نظموں میں طنز کا عنصر بڑھ گیا ہے شاید ہمارے سماجی سیاسی حالات میں بڑھتا ہوا CORRUPTION اخلاقی اقدار کی پامالی، ذاتی اور اجتماعی محرومیاں اور FRUSTRATION اپنے اظہار کے لئے طنزیہ لہجے اور زبان کے استعمال کی متقاضی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے باضابطہ ہجویات لکھیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے حال میں اردو کے اساتذہ کی ہجو لکھی ہے۔ ہجو میں راقم الحروف نے بھی لکھی ہیں، لیکن وہ ناقابلِ اشاعت ہیں۔ ہجو کے لئے میرا خیال ہے کہ اس کی بنیادی شرائط دو ہیں، شعر زبان سے نکلتے ہی دل میں اُتر جائے (غزل کے لئے یہ معیار گمراہ کن ہے اچھی غزل کے اشعار کو دل تک پہونچنے کے لئے دماغ سے بھی گزرنا چاہیئے) اور 2۔ ناقابلِ اشاعت ہونا۔ اگر میر سودا قائم وغیرہ آج کے زمانے اور ازالہ حیثیت عرفی کے قانون کے دور میں ہوتے تو ان کی ہجویات شائع نہ ہو سکتی تھیں ——— یہ دوسری بات ہے کہ ہجو کے ممدوح کے لئے یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ اس کی حیثیت عرفی ہے بھی یا نہیں ——— یہ زمانے کے فرق کی نہیں اپنی اپنی "اوقات" کی بات ہے۔

جدید غزل میں بھی طنز کا عنصر خاصا توانا ہے۔ ایک جملۂ معترضہ لکھتا چلوں کہ جدید غزل کے بہت سے نمونوں کو مزاحیہ سمجھ کر پڑھا جائے تو زیادہ لطف لیا جا سکتا ہے!

تنقید ایسی صنف ہے جس میں کہیں کہیں طنز سے تو کام لیا جا سکتا ہے (جیسے بعض ادبی معرکوں میں قدیم سے ہوتا آیا ہے یا محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کے یہاں دورِ جدید میں اچھے طنزیہ فقرے ملتے ہیں) لیکن مزاح کی تنقید میں گنجائش نہیں۔ ہمارے بعض تنقید نگاروں نے تنقیدی مضامین کو بھی طنزیہ مضامین کے ساتھ مزاحیہ مضامین کی نوعیت دے دی ہے جن میں سرِفہرست اور سب سے زیادہ بسیار طول نویس وارث علوی ہیں، یہاں مجھے ان کی انفرادیت سے انکار نہیں۔ اس معاملے میں اُن کا جواب نہیں۔

مختلف اصناف کے اس جائزے کے بعد کیسے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا ادب روبہ زوال ہے۔ حسبِ حال بھی نہیں، اس لئے کہ پہلے کے دور میں طنز و مزاح کے لئے نہ اتنے مسائل تھے نہ اس کو برتنے کی اتنی جہتیں سامنے تھیں ——— میں روبہ کمال بھی نہیں کہوں گا اس لئے کہ "کمال" کے حصول کا تعلق اجتماعی صورتِ حال سے زیادہ انفرادی تخلیقی صلاحیت پر مبنی ہوتا ہے۔ لیکن بہ حیثیتِ مجموعی ہمارے یہاں طنز و مزاح نے جس معیار کو (نثر میں) چھوا ہے وہ خوش آئند و نیک فال ہے۔ ابھی اس میں توسیع و ترقی کی بہت گنجائش ہے۔

۲۔ پاکستان میں تقسیم کے بعد بعض بہت اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے جن میں سرِفہرست مشتاق احمد یوسفی ہیں، ان کے پہلے مجموعے، چراغ تلے، کو وہ مقبولیت ملی کہ میر کے اشعار کی طرح یہ مجموعہ لوگ سوغات کے طور پر ہندوستان

www.taemeernews.com

بھیجتے تھے اس کے بعد 'خاکم بدہن' اور 'زرگزشت' نے ان کے ادبی قد کو اور بھی بلند کیا۔ مشتاق یوسفی کے اسلوب پر تھوڑا سا اثر رشید احمد صدیقی کا ہے لیکن اسی کے ساتھ پطرس کی شگفتہ واقعہ نگاری بھی ہے۔ لیکن ان دونوں اثرات کو اُن کی انفرادیت نے چمکا دیا ہے، طنز و مزاح کا تعلق کسی دور کی تہذیب کی نفاست و لطافت کے معیار سے ہوتا ہے۔ یوسفی ہمارے دور کی تہذیب کے بہترین نمائندوں میں سے ہیں۔ بحیثیت مجموعی ان کے طنز و مزاح کا معیار، میرے نزدیک، عہد ماقبل کے تمام ایسے لکھنے والوں سے بلند تر ہے۔ ان کا معیار رشید احمد صدیقی اور پطرس ہی نہیں بلکہ تمام طنز و مزاح نگاروں سے زیادہ بلند ہے۔ اس صنف میں اُن کا ہمسر نہ ان سے قبل کوئی تھا نہ آج ہے۔ 'زرگزشت' کو خودنوشت بھی کہا جاسکتا ہے، طنز و مزاح کی فراوانی کے ساتھ ایسے کے عنصر کو انھوں نے پہلی بار اس کتاب اور بعض مضامین میں بڑی فنکاری سے آمیز کیا ہے۔ شفیق الرحمٰن نے رومانی انداز کے المیہ افسانے بھی لکھے ہیں، جن میں رومانیت زدگی ملتی ہے لیکن وہ المیہ اور مزاح کو باہم دگر آمیز کبھی نہ کرسکے۔ یوسفی کے علاوہ دوسرا اہم نام ابن انشاء کا ہے، جن کے مضامین اور سفرنامے بھی دورِ ماقبل سے انحراف کے ساتھ ارتقائے فن کے نمونوں کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ان کے علاوہ محمد خالد اختر بھی جو ہندوستان کے قارئین میں اتنے معروف نہیں، خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ پھر سفرنامہ نگار ہیں۔ کرنل محمد خاں، مستنصر حسین تارڑ اور کئی دوسرے۔ ایک بات ضمنی طور پر عرض کردوں کہ پاکستان میں اس وقت نثر نگاری کا عمومی معیار ہندوستان سے بلند تر ہے۔ شاید اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ وہاں اردو صرف عام بول چال ہی کی نہیں بلکہ اعلیٰ سوسائٹی اور تہذیبی اظہار کی زبان بھی سمجھی جاتی ہے۔ اسی مناسبت سے وہاں کے مزاح و طنز نگار ہمارے یہاں لکھنے والوں پر فوقیت لے جاتے ہیں۔

پرانے لکھنے والوں میں شوکت تھانوی اور ابراہیم جلیس نے تقسیم کے بعد بھی اچھا لکھا۔ خصوصیت سے شفیق الرحمٰن کی بہترین تخلیقات (جیسے تزک نادری یا بعض پرانے قصوں کی پیروڈیاں) تقسیم کے بعد ہی لکھی گئیں۔ تزک نادری کو میں ان کا شاہکار سمجھتا ہوں۔ اب اُن کا قلم رک گیا ہے۔ باقی حضرات اللہ کو پیارے ہوئے۔ ابن انشا کی قبل از وقت موت اور مشتاق یوسفی کے ترکِ وطن نے پاکستان کے مزاحیہ ادب کو خاصا غریب کردیا ہے۔

۴۔ کسی بھی فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے مسلسل لکھنا اُسی طرح ضروری ہے جیسے موسیقی یا رقص میں مستقل ریاض کرنا لیکن طنز و مزاح میں مسلسل لکھنے کے اپنے خطرات بھی ہیں، معیار کے گرنے کا اندیشہ رہتا ہے جس کی مثال شوکت تھانوی ہیں، یا 'پیاز کے چھلکے' کے روزآنہ مصنف فکر تونسوی۔ لیکن یہی مسلسل نویس جب قلم سنبھال کر خود کو روک کر مضامین لکھتے تھے تو کسی بھی درجۂ اول کے ادیب سے کم پایہ مضامین انھوں نے نہیں لکھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین بھی اب بلوغت و مقبولیت کی اُس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ انھیں رسمِ اجراء کے جلسوں کی فرمائشوں پر ہر کس و ناکس کا خاکہ لکھنے سے گریز کرنا چاہیئے۔ فرمائشی تخلیقات یوں بھی اعلیٰ معیار کو شاذ و نادر ہی چھوتی ہیں۔ اور اگر مزاح نگاری اخباری کالم نویسی کی طرح پیشہ بن جائے تو وہی حشر ہوتا ہے جو سعادت علی خاں کے دربار میں انشا کی لطیفہ

www.taemeernews.com

طرازی کا ہوا۔ اور آج کے ادیب کو تو ایک نہیں سیکڑوں باشعور قارئین کی صورت میں کئی سعادت علی خاں صاحبان کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

۴۔ ہندوستان میں مزاح نگاروں کے سامنے کوئی رکاوٹ نہیں، ہندوستان میں جمہوریت نے اظہار اور طنز کی کھلی اجازت دے رکھی ہے، ہم بڑے سے بڑے قائدین اور اربابِ اقتدار پر ہنس بھی سکتے ہیں۔ اگر کوئی رکاوٹ ہے تو وہ نثر لکھنے کے لئے زبان و محاورہ پر جو قدرت حاصل ہونی چاہیئے، اس کا فقدان یا کم یابی ہے۔ اس کی ذمہ داری اس نظامِ تعلیم پر ہے۔ جو آزادی کے بعد سے اردو کے ساتھ سوتیلے پن کا سلوک کرتا رہا ہے۔ ایک اور عنصر قابلِ لحاظ ہے۔ جس طرح مشاعروں کی بہتات اور سامعین کی تفریح پسندی و بد ذوقی نے مشاعروں کی شاعری کا معیار اتنا پست کر دیا ہے کہ وہاں شاعری برائے نام ہی ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلسل اور مستقل مزاح کے اجتماع بھی نثری مشاعرہ بازی بن کر عوام سے داد لینے یا انھیں ہر قیمت پر ہنسانے کی کوشش کے نتیجے کے طور پر طنز و مزاح کے معیار کو پست کرتے ہیں۔ مزاح کی داد ہنسی ہے، لیکن 'ہنسی' کو ہمیشہ داد کا نعم البدل نہیں سمجھنا چاہیئے۔ ہنسی کئی طرح کی ہوتی ہے جو فحش لطیفوں سے بھی انگیز ہوتی ہے، بازاری انداز کی فقرے بازی سے بھی۔ اور کبھی پست معیار کے خلاف احتجاج کے طور پر بھی بلند ہوتی ہے۔

جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں، آج کے سماجی و سیاسی حالات جس قدر طنز و مزاح کا ہدف بننے کے متقاضی ہیں، پہلے کبھی نہ تھے۔ طنز و مزاح کا مقصود محض تفننِ طبع نہیں بلکہ کچھ تہذیبی اور انسانی اقدار کا بالواسطہ تحفظ بھی ہے۔

پاکستان میں فوجی آمریت، زبان بندی اور تنقید کی فضا کا فقدان بھی معاشرتی خرابیوں اور سیاسی ناانصافی کے خلاف ادبی اظہار کے لئے طنز و مزاح لکھنے کے لئے سازگار ہے۔ جو بات سنجیدہ نظم و نثر میں قابلِ گرفت ہوتی ہے، طنز و مزاح کی نقاب اوڑھ کر آسانی کے لئے بھی قابلِ قبول بن جاتی ہے یا ان کی مزاح بے حسی، مضمرات سمجھنے سے قاصر رہتی ہے!

۵۔ مجھے ہندوستان کی اور زبانوں کے طنز و مزاح کا اندازہ نہیں، ہندی میں معیار اردو سے کم تر ہے، اردو ہمیشہ شہری زبان اور سوسائٹی کے مہذب ترین طبقے کے اظہار کا وسیلہ رہی ہے، اس لیئے اُس میں جو نفاست، لطافت، لفظوں کی بازی گری اور محاوروں کو برمحل استعمال کرنے کی گنجائش ہے شاید ہی کسی دوسری ہندوستانی زبان میں ہو۔ انگریزی میں اس وقت کوئی ادیب سوِفٹ، ڈکنس، مارک ٹوئین کے معیار کا نہیں۔ مقبول ترین مزاح نگار P.G. Wodehouse کہانیوں اور مکالموں سے مزاح پیدا کرنے میں لاجواب ہے، مگر اُس کی ادبی حیثیت مستحکم نہیں۔ ہر زبان کا مزاج اس کی تہذیبی روایت اور ان کے حالیہ امکانات سے بنتا ہے، اس لئے مختلف تہذیبی روایات کی حامل زبانوں کی اصناف کا ایک دوسرے سے موازنہ تنقیدی لحاظ سے درست نہیں۔ وہ لوگ جو انگریزی شاعری کا اردو شاعری سے یا میر و غالب و انیس و اقبال کا شکسپیر، ملٹن، گوئٹے، ورڈس ورتھ وغیرہ سے موازنہ

www.taemeernews.com

کرتے ہیں۔ یہی غلطی کرتے ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ فارسی اردو کا مشترکہ شعری ورثہ اور معیار انگریزی کی پوری شعری روایت اور ورثے سے کہیں زیادہ بلند اور متنوع ہے۔ طنز و مزاح کے لئے یہ بات اتنے یقین سے نہیں کہی جاسکتی لیکن میرا قیاس یہ کہتا ہے کہ اردو طنز و مزاح میں شاید ہی دنیا کی کسی زبان سے پیچھے ہو حالانکہ ہمارے یہاں سوفٹ کارک ٹوئین، وللیٹیر، سروینٹس یا گوگول کے پائے کا کوئی طنز و مزاح نگار اب تک پیدا نہیں ہوا۔

۶. انگریزی میں ESSAY کے ممتاز لکھنے والوں کے یہاں طنز و مزاح کا عنصر ہمیشہ نمایاں رہا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں دیرآگاہ نے انشائیہ کی جو تعریف کی، اور اس تعریف کے مطابق انشائیہ نگاری کے فروغ کی جس طرح تحریک چلائی، اس کے لحاظ سے ہمیں انشائیہ کو مزاحیہ و طنزیہ مضامین سے الگ کرنا پڑے گا۔ انگریزی کی اصطلاح ESSAY کو اس کی خصوصیات اور اُن میں طنز و مزاح کے عنصر کو مدِنظر رکھتے ہوئے مزاح و طنز نگاری کا اس صنف میں زیادہ اظہار ہوا ہے۔ لیکن طنز و مزاح کے لئے انشائیے سے زیادہ وسیع میدان مہیا ہے، ناول، سفرنامے، افسانے، خاکے اور شاعری ــــ!

۷. مختلف اصناف کے مجموعی معیار کے لحاظ سے طنز و مزاح کا نمبر یہ ہوگا۔

۱۔ شاعری
۲۔ مختصر افسانہ (طویل مختصر افسانے یا ناولٹ کو بھی اس میں شامل کر لیجئے)
۳۔ ناول (عالاں کہ بڑے ناول گئودان سے آگ کا دریا تک بہت کم ہیں)
۴۔ طنز و مزاح ہیں۔

لیکن پطرس، رشید احمد صدیقی اور یوسفی انفرادی طور پر بہت سے شاعروں اور افسانہ نگاروں پر سبقت لے جاتے

رشید حسن خاں

۱. پطرس اور رشید صدیقی کے بعد کا تو دور ہے، اس میں طنزیہ اور مزاحیہ ادب مجھے تو "مائل بہ زوال" نظر آتا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس دور کے لکھنے والوں نے، جو تعداد میں بھی اپنے پیش رووں سے کچھ زیادہ ہیں، تحریروں کے انبار لگا دیئے ہیں (اور بعض مصنفین کے تو چار چار چھے چھے مجموعے چھپ چکے ہیں) لیکن گہرائی اور گیرائی کم ہے، بلکہ کم تر۔ عشق نے جملے تراشنا تو سکھا دیا ہے اور گاہے گاہے لفظوں کو پہلودار انداز سے چسپاں کرنا بھی آگیا ہے، مگر بین السطور گویا خالی ہے، تہہ میں کچھ نہیں، ساری چمک دمک اوپری ہے۔ اور اس "اوپری پن" نے سطحیت کو بے طرح فروغ دیا ہے۔ جس طرح سستا کاپا تھرس والے ہندی میں کھوکھلی مزاحیہ شاعری کرتے ہیں، اسی طرح اردو کے بیشتر مزاح نگار لفظوں کے جان کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔ ان کی تحریریں پڑھ کر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزاحیہ ادب محض جملہ تراشی کا نام ہے یا پھبتی کسنے کا۔

www.taemeernews.com

مشکل یہ بھی ہے کہ ان اللہ کے بندوں نے شاید طنز اور مزاح کو ایک ہی چیز سمجھ رکھا ہے اور وہ جو حرفِ عطف کے ساتھ یہ دونوں لفظ ساتھ ساتھ آیا کرتے ہیں (طنز و مزاح) سو اس کی بنیاد پر ان دونوں کو ایک ہی بنا کے رکھ دیا ہے۔ اب معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم جس نظم یا نثر کو پڑھ رہے ہیں، یہ طنزیہ ہے یا مزاحیہ۔ طنز جس قدر گہرائی کا طلب گار ہے اور مزاح جس قدر نفاست اور لطافت کا متقاضی ہے، یہ بنیادی احساس تہہ نشین نہیں ہوتے۔

پچھلوں کے مقابلے میں آج کل کے لوگوں کے سامنے بہت سے موضوعات گویا بکھرے پڑے ہیں اور مضامین کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ سیاسی حالات، سماجی کیفیتیں اور معاشی بدحالیاں، ان سب نے مل کر مزاح نگار اور طنز نگار کے لئے بے شمار عنوانات بکھیر دیئے ہیں۔ یہ کثرت اس سے پہلے ایسی نہ تھی آج کا مزاح نگار اور طنز نگار ان سب کو دیکھتا تو ہے، ان کی حشر سامانی کو بھی سمجھتا ہے اور ان کو موضوعِ سخن بھی بنانا چاہتا ہے، مگر جب وہ کچھ لکھتا ہے تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوتی جو دل میں اتر جائے اور آنکھوں میں بس جائے۔ جلسے اور پیراگراف اس طرح گزرتے چلے جاتے ہیں جیسے کرایا پر منگائے ہوئے کارکنوں کا جلوس شور مچاتا ہوا گزر جاتا ہے، جو کبھی کبھار پتھراؤ بھی کر جاتا ہے۔ یا وہ چار بسوں کے ٹائر میں چھید کر دیتا ہے، اور بس۔ ایک دو دن کے بعد ان ہنگاموں کی یاد محو ہو جاتی ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ نثر کے مقابلے میں نظم کا احوال اس دور میں کچھ زیادہ بُرا ہے۔ نثر کی وسعت میں بہت سی چیزیں دب جایا کرتی ہیں، مگر نظم ایسی پردہ پوش نہیں ہوتی، اس میں رسوائی بہت جلد اور بہت زیادہ ہوتی ہے۔ نئے پرانے سبھی نظم نگار اس حمام میں ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ حد درجہ سطحی نظمیں اور انتہا درجے کی سپاٹ غزلیں رسالوں اور کتابوں میں نظر آتی ہیں، جیسے بہت سے لوگوں کو لکھنے کا باجماعت ہیضہ ہو گیا ہے۔ مثلاً حیدرآباد کے رسالہ شگوفہ کو دیکھئے جو سراسر ایسے ہی ادب کے لئے وقف ہے، اس میں اکثر و بیشتر سطحی، کم رتبہ اور مبتدیانہ نظمیں اور غزلیں ملیں گی۔

۲۔ پاکستانی رسالے اور کتابیں یہاں بہ آسانی اور مسلسل ملتی نہیں۔ اس لئے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں کا احوال کیا ہے۔

۳۔ ہرگز نہیں اگر قدرِ اول کے ادب کے لئے "مسلسل مزاح نگاری" ضروری ہوتی تو آج کل تو اردو میں سبھی لکھنے والے "قدرِ اول" کے ہوتے، کیوں کہ یہ سب مسلسل لکھتے ہیں اور بے تکان لکھتے ہیں۔ "قدرِ اول" کا تعلق کثرتِ نگارش سے نہیں شخصیت سے ہوتا ہے۔ لکھنے والا اگر باشعور ہے اور باصلاحیت ہے، تو وہ اچھے ادب کی تخلیق کر سکتا ہے، خواہ کم لکھے کم سواد اور بے صلاحیت افراد خواہ ساری عمر لکھتے رہیں، وہ رہیں گے اپنے دائرے میں۔ ہاں یوں کہئے کہ معاملہ اس کے برعکس ضرور ہو سکتا ہے اور اس کی مثال میں شوکت تھانوی اور عظیم بیگ چغتائی کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ دونوں کے لکھاڑ پن نے اس محدود صلاحیت کو بھی صحیح طور پر پنپنے نہیں دیا جو ان کے یہاں تھی۔ اگر کثرتِ نگارش سے "قدرِ اول" کا ادب پیدا ہو جایا کرتا تو پھر واہی اس زمانے کے سب سے بڑے مزاحیہ شاعر ہوتے اور فکر تونسوی سب سے بڑے نثر نگار۔

۴۔ جی نہیں مزاح نگاروں کے راستے میں کوئی ایسی خاص الخاص رکاوٹیں نہیں جن سے دوسرے ہندوستانیوں کا راستہ خالی ہو۔ راستے کی رکاوٹوں کا تعلق اچھے ادب کی تخلیق سے نہیں ہوتا۔ راستہ بالکل صاف ہو، لیکن ذہن اور سطح درجے کا

www.taemeernews.com

ہو یا پھر معمولی درجے کا، اس صورت میں "قدِ اول" کا ادب تو کیا، دوسرے درجے کا ادب بھی وجود میں نہیں آئے گا۔ رکاوٹوں سے تو ایک مزاح نگار اور طنز نگار کو مدد ملنا چاہیئے اور غالب کے الفاظ میں اُسے تو یہ کہنا چاہیئے کہ "رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور"۔ دیکھیئے صاحب! اچھے ادب کا تعلق ذہن و فکر کی بلندی سے ہے اور ادبی صلاحیت سے ہے، اس کا تعلق اِن چیزوں سے نہیں کہ آمدنی کتنی ہے اور کھاتے کیا ہیں اور جیل جانے کا امکان ہے کہ نہیں اور موٹر رکھنے کا مقدور ہے کہ نہیں اور آئی۔ اے۔ ایس ہیں کم نہیں۔ ورنہ جس قدر آئی۔ اے۔ ایس ہیں وہ تو بڑے ادیب اور اعلیٰ درجے کے مزاح نگار ہوتے، جب کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔

۵۔ میں "ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں" سے واقف نہیں، اِس لئے کچھ نہیں کہہ سکتا۔

۶۔ مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری وہی کہہ سکتے ہیں، جنھوں نے مثلاً تنقید کو انشائیہ نگاری میں بدل دیا ہو۔ کوئی معقول آدمی تو ایسی مجہول بات کہنے سے رہا۔ مزاح اور طنز میں کیا کچھ کمی ہے کہ اس کی جھولی میں انشائیہ نگار ہی سے کچھ ٹکڑے مانگ کر ڈال دیئے جائیں۔ ادبی اصناف کو جوگی کے کشکول اور فقیر کے کاسے اور عطر کی عیار کی زنبیل کی طرح گڈمڈ چیزوں کا مجموعہ نہیں بنایا جا سکتا۔

۷۔ جناب! نمبر دیئے جاتے ہیں امتحانی پرچوں کی کاپیاں جانچتے وقت، ادب میں یہ نمبر بازی نہیں ہوتی۔ اور اگر ہوتی ہے تو میں اس سے ابھی واقف نہیں ہو پایا ہوں، اس لئے اس "نمبری حساب کتاب" میں دخل دینے سے معذور ہوں۔

شمیم حنفی:۔

۱۔ ہندوستان میں طنز و مزاح کی صورت حال رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد کے دور میں بہ ظاہر بائل بہ زوال نظر آتی ہے، خاص طور سے گہرے، بامعنی سماجی طنز کا عنصر اردو کے مزاحیہ ادب میں (ہندوستان میں) روز بروز کم ہوتا جا رہا ہے۔

۲۔ پاکستان میں صورتِ حال بہتر ہے۔ اس بہتری کا سبب غالباً پاکستان کے سماجی ماحول کی ابتری بھی ہے۔

۳۔ ہر صنف میں ترقی کے لئے مسلسل کوششیں ضروری ہیں۔

۴۔ جی ہاں، چند رکاوٹیں ہیں، بالعموم خود ادیبوں کی پیدا کردہ۔ گرد و پیش سے بے خبری اور لاتعلقی اردو والوں میں عام ہے۔ مزاح کی مجلسی اور گھریلو سطح بھی ایک رکاوٹ ہے جو اردو والوں تک اپنی روایت کے واسطے سے پہنچی ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ ہم ہندوستانی اپنے تئیں ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس رویئے نے ہر ہندوستانی زبان کے ادب میں طنز و مزاح کی روایت کو نقصان پہنچایا ہے۔

۵۔ انگریزی میں صورتِ حال بہت بہتر ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے [illegible] اس کی ایک معمولی سی مثال ہے۔ ہمارے یہاں کالم نویسی میں یہ معیار کہیں نظر نہیں آتا۔ فقرے بازی، بگت اور اخباری ادب بھی مقبول رہا۔

www.taemeernews.com

ہندی میں سماجی طنز بہتر لکھا جارہا ہے۔ اردو زبان مزاح کے لیے ہندی سے زیادہ موزوں ہے۔ مگر اس کا دائرہ وسیع تر ہونا چاہیئے۔

۶۔ انشائیہ گو شاعر کی ترکیب مہمل ہے۔ مزاح نگاری انشائیہ نگاری کا مترادف نہیں ہے۔

۷۔ نمبر دینے کی عادت کا اظہار طلباء کی کاپیوں تک ہو تو بہتر ہے۔ مجھے تو اس مشغلے سے بھی کچھ دلچسپی نہیں ہے۔ پھر میری ناقص رائے میں کوئی صنف بطور خود اعلیٰ یا ادنیٰ نہیں ہوتی۔ فرق و امتیاز لکھنے والے کی استعداد قائم کرتی ہے کسی بھی صنف کا حال لکھنے والے کی "کوشش" سے خراب ہو سکتا ہے۔

عمیق حنفی

۱۔ رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد اس برصغیر میں مزاحیہ گوشوں اور طنز کے نشانوں میں اضافہ ہوا۔ کالم نویسی کا رواج بہت بڑھا۔ کارٹونوں کی کیفیتی اور کمیتی ترقی ہوئی۔ اردو والوں کی ناک میں دم زیادہ رہا اور پیشانی پر خم بھی کم نہ رہا۔ لہٰذا طنز و مزاح تحریر میں بھی بڑھا۔ سرحد پار طنز سے حربے کا کام لیا گیا۔ سیاسی حالات کا جبر طنز نگاری کے لیے ریڑھ لگاتا رہا۔ شفیق الرحمٰن، مشتاق یوسفی، کرنل محمد خاں، ابراہیم جلیس، ابن انشاء، ہمارے یہاں کنھیالال کپور، فکر تونسوی، یوسف ناظم، مجتبیٰ حسین، احمد جمال پاشا نے اس میدان میں زبردست جوہر دکھائے۔ بعض اوقات ترسیل کی ناکامی نے (بلکہ فصلِ ترسیل کہنا زیادہ صحیح ہوگا) بعض لوگوں کی نہایت سنجیدہ تحریروں کو بھی مزاحیہ رنگ دے دیا۔ بڑھتی ہوئی قیمتیں، رشوت ستانی، بیروزگاری نئی نسل کے بے قابو ہونے اور سیاست داخلاقیات کی کشیدگی وغیرہ نے جسم میں غیر ضروری طور پر پیدا ہونے والی رطوبتوں کو جتنا زیادہ آنکھوں کی طرف پمپ کیا اتنے ہی انجزائے ہند سے پھسپھسا کر اور زور مار کر نکلے جنھیں قہقہے کے علاوہ اور کہا بھی کیا جا سکتا ہے، جو قومیں اپنے رونے پر ہنسنا سیکھ لیتی ہیں انھیں کوئی مصیبت پسپا نہیں کر سکتی۔ طنز و مزاح کا رو بہ کمال ہونا چیرہ دستی کی بات نہیں۔

۲۔ ہو گیا مذاق۔ آپ کا سوال پڑھا بھی نہ تھا اور جواب پہلے ہی سوال کے سلسلے میں دے ڈالا! اچھی طنز نگاری تو جناب پاکستان ہی میں ہوتی ہے۔ مزاح نگاری بھی پہلے سے بہتر ہوتی ہے۔ مزاحیہ اور طنزیہ شاعری البتہ تعداد میں بہت کم نظر آتے ہیں۔ شاید اس کی کمی نئی شاعری کے بیشتر نمونوں سے پوری ہو گئی۔

۳۔ مسلسل لکھتے رہنے کی شرط صرف مزاحیہ ادب کے لیے ہر تحریری صلاحیت کے ارتقاء کے لئے ناگزیر ہے۔ ترقی تو کہتے ہی درجہ بدرجہ بڑھنے کو ہیں۔ لیکن صرف لکھتے رہنا ہی کافی نہیں، تجربے میں اضافہ بھی لازمی ہے۔ ہر واقعے، ہر خبر، ہر شئے کو طنز کی چکلیوں اور مزاح کی گدگدیوں سے چھیڑتے رہنا چاہیئے۔ کیا اشیاء اور کیا اشخاص، کیا الفاظ اور کیا محاورہ ان کے منطقی روابط میں ردوبدل کرتے رہنے ہی سے تو مزاح پیدا ہوتا ہے۔

۴۔ مزاح نگاروں کے سامنے کوئی خاص رکاوٹ نہیں۔ وہی تکلفات، وہی حجابات، وہی حدود مزاح نگاروں کے

www.taemeernews.com

سامنے بھی ہیں جو ہر سوچنے سمجھنے اور کہنے سننے والے کے سامنے ہیں۔ دنیاداری، مصلحتیں اور سمجھوتے۔ مگر یہ طنز نگار کے کام میں زیادہ روڑے اٹکاتی ہیں۔ مزاح نگار کا کام تو ہنسانا ہے۔

۵۔ آپ کے سوال کے جواب کی تیاری میں نے نہیں کی۔ یہ سوال تو اور بھی "آرٹ آف کورس" دے دیا ہے۔ میں تو اردو کے علاوہ ہندی انگریزی اور تھوڑی بہت مراٹھی پڑھ لیتا ہوں۔ مجھے خشونت سنگھ، ہری شنکر پارسائی، شرد جوشی اور کے پی سکسینہ جیسی بے باکی اور حق گوئی اردو میں نظر نہیں آتی۔ ہم سیاست پر طبع آزمائی نہیں کرتے۔ اور آج ہمارے برصغیر میں سیاست سے زیادہ وسیع و عریض اور زرخیز علاقہ طنز و مزاح کے پھولنے پھلنے کے لئے کہیں اور نظر نہیں آتا۔

۶۔ مزاح نگاری کو الگ صنف ادب نہیں مانا جا سکتا۔ ویسے آپ علیحدہ پر اصرار کریں تو مزاحیہ مضامین کو "فکاہیہ" کہہ لیں۔ ورنہ اصل میں مضمون، افسانہ، ناول، ڈرامہ، نظم (شعر) کسی بھی صنف میں مزاح کی کیفیت ہو سکتی ہے۔ مزاح ایک کیفیت ہے، ایک انداز ہے، ایک رنگ ہے، ایک رس ہے۔ مزاح نگار کا فن ہمیں Sublime سے Ridiculous اور Ridiculous کو بیک وقت ایک ہی سطح پر دکھا سکتا ہے۔

۷۔ نمبر دینا ضروری ہے؟ پہلے معیار تو طے ہو۔ ادب کا اپنا معیار ہوتا ہے۔ اس معیار کو مواد، ہیئت اور اسلوب کی بنا پر پرکھا جاتا ہے۔ ذوق کی سطح کا تعین بھی ضروری ہے۔ تحریر اول درجے کی ہو سکتی خواہ وہ طنزیہ یا مزاحیہ ہی کیوں نہ ہو۔ یونانیوں کی طرح ہم المیے کو طربیے پر ہمیشہ فوقیت نہیں دے سکتے۔

ابن فرید

۱۔ میرے مطالعہ کے مطابق تقسیم ہند کے بعد ہندوستان میں طنز و مزاح اگر رو بہ کمال نہیں ہے تو مائل بہ زوال بھی نہیں ہے۔ تقسیم کے زمانہ میں کنھیالال کپور، فکر تونسوی، فرقت کاکوروی، مخمور جالندھری، راجہ مہدی علیخان وغیرہ نے ایک معیار قائم کیا تھا، اس کے بعد اس صنف نثر و نظم میں مزید ایسے پختہ کاروں کا اضافہ ہوا جنھیں اس صنف کی تاریخ میں نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، احمد جمال پاشاہ، وجاہت علی سندیلوی، واہی تباہی، عامر عثمانی اور مخلص بھوپالی ایسے نام ہیں جن کے طنز و مزاح کا وقار وابستہ ہے۔

بعض اوقات سیاسی و گروہی مصلحتیں کسی باصلاحیت فنکار کو اس کے جائز اعتراف سے محروم کرا دیتی ہیں! ایسا بدقسمتی سے م نسیم کے ساتھ ہوا، چنانچہ رفتہ رفتہ وہ ایسے بے توجہ ہوئے کہ انھوں نے لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ پھر بھی ان کی چند تحریریں جو ان کے اکلوتے مجموعے "اونھوں کتاب" میں محفوظ ہو گئی ہیں وہ کبھی نہ کبھی اپنا اعتراف کرائیں گی۔

www.taemeernews.com

۲. سنیئر لکھنے والے روبہ انحطاط نہیں ہوتے، وہ بس استادی کے مرحلہ پر آکر ٹھہر جاتے ہیں اور خود کو دہرانے لگتے ہیں۔ یہ ہر صنفِ ادب اور ہر فن میں، ہر ملک اور ہر دور میں ہوتا ہے اور ہو رہا ہے۔ لیکن پھر استاد تو استاد ہی ہوتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہاں بہت اچھے طنز و مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں، اور اس صنف کے سرمایہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے۔ شوکت تھانوی، ابراہیم جلیس، محمد عمیر جعفری، مشتاق احمد یوسفی، کرنل محمد خاں، حبیب محسن، عطاالحق قاسمی وغیرہ ایسے نام ہیں جن سے انحطاط کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انہوں نے اس فن کو آگے بڑھایا ہے۔

الٰہ سدید نے "غالب کے نئے خطوط" لکھ کر پیروڈی کی صنف میں ایک اہم قلمکار کے نام کا اضافہ کرایا ہے۔

پاکستان میں بھی مرزا نسیم کی طرح ملک نصراللہ خاں عزیز مرحوم کا بلیک آؤٹ کیا گیا ہے۔ وہ خاصے سنیئر لکھنے والے تھے اور سندباد جہازی وغیرہ کے معاصر تھے۔ ان کے کالم "تیر و نشتر" میں ویسا ہی تیکھا پن ہوتا تھا جیسا ولایت علی بمبوق مرحوم کے "ہمدرد" کے کالموں میں ہوتا تھا۔ شاید کبھی کبھی وہاں کی سیاسی ادبی صورتحال میں نرمی پیدا ہو تو ان کا اعتراف کیا جائے

۳ جو اپنے اندر صلاحیت رکھتے ہیں وہ اپنے فن کو پختگی یا MATURITY حاصل کرنے کیلئے مطالعہ، مشاہدہ اور مشق کے سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں، اور جو محض منجھ کا مزا بدلنے کے لئے کچھ ٹکنکہ جلے یا اشعار لکھ ڈالتے ہیں انہیں محض "مہمان طنز و مزاح نگار" تصور کیجئے۔ البتہ بعض ایسے لکھنے والے بھی ہوتے ہیں جو زندگی بھر لکھتے رہتے ہیں مگر طنز و مزاح نگار نہیں بن پاتے۔

۴. ہندوستان میں اردو کے مزاح نگاروں کے سامنے صرف ایک ہی رکاوٹ ہے، اور وہ ہے اپنا منفرد مقام پیدا کرنے کی صلاحیت! ہمارے یہاں مشکل یہ ہے کہ ایک طرف اکبر الہ آبادی اور دوسری طرف عظیم بیگ چغتائی کی ٹانگ پکڑ لی گئی ہے۔ ان کے نظم و نثر کے اسلوب مزاح نگاری کا ردیف و قافیہ بن گئے ہیں۔ کوئی یہ نہیں سوچتا کہ بھائی اب معاشرہ بدل چکا ہے، پسند و ناپسند کی اقدار بدل چکی ہیں، افراد کا مذاق بدل چکا ہے، پھر آپ نئی دنیا میں نئے PARADOXES اور نئی ABSURDITIES کا نوٹس کیوں نہیں لیتے۔ مزید برآں اس طرف بھی توجہ نہیں دی جاتی کہ عالمی ادب میں طنز و مزاح کا موجودہ رجحان کیا ہے۔ بس وہی پرانے ریکارڈ "زہرہ بائی انبالے والی" اور "تیرا نام ہے کار و قرآں" کے بجائے جاتے ہیں۔

۵. ہندوستان کی دوسری زبانوں سے میں واقف نہیں ہوں۔ اردو میں جو دو چار ترجمے شائع ہو جاتے ہیں انہیں بالواسطہ مطالعہ کی دلیل بھی نہیں بنایا جاسکتا۔ انگریزی میں تھوڑا بہت پڑھ لیتا ہوں۔ میرے خیال میں اس زبان میں کچھ اچھی چیزیں تو ضرور مل جاتی ہیں لیکن ان میں بھی ہندوستانی مسائل کا چٹپٹا پن اتنا تیز ہوتا ہے کہ بارہا یہ خیال ہوتا ہے کہ ہم کسی ہندوستانی زبان کی تحریر کا ترجمہ پڑھ رہے ہیں۔

ہمیں یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہندی میں طنز و مزاح ابھی ناپختگی اور ناتراشیدگی کے مرحلے میں ہے۔ بعض اوقات تو VULGARITY سے طبیعت میں انقباض پیدا ہونے لگتا ہے۔ اسے اردو زبان کے طنز و مزاح کی لفاظی

www.taemeernews.com

نزاکتوں اور لطافتوں تک پہنچنے کے لئے کم از کم نصف صدی کا عرصہ درکار ہوگا۔ ممکن ہے کہ اس کے بعد بھی یہ اتنی لطیف و شگفتہ نہ ہو سکے۔

میرے نزدیک اردو طنز و مزاح کے عمدہ نمونے بہت عمدہ ہیں۔ ان سے لطف اردو ہی میں اٹھایا جا سکتا ہے کسی اور زبان میں ترجمہ انھیں غارت کر دیتا ہے۔ طنز و مزاح ایک ثقافتی تہذیبی مجلسی فن ہے جس کا ڈیڑھ ہزار سال کا ورثہ اردو کو نصیب ہوا ہے۔ یہ ورثہ اتفاق سے ہندوستان کی کسی زبان کو ودیعت نہیں ہوا ہے اس لئے وہ اُن FINENESSES سے عاری ہیں جو اردو کا طرۂ امتیاز ہیں۔

۶. اس سوال سے میں خاصا محظوظ ہوا۔ کیا آپ "رباعی گو افسانہ نگار" "ڈرامہ نگار داستان گو" "ہزل گو نقاد" "مثنوی نگار" "ناول نگار" وغیرہ کی اصطلاحات کو قبول کریں گے؟ اگر نہیں تو پھر "انشائیہ گو شاعر" کیا بلا ہوئی؟ میں یہ سوال ہی سمجھنے سے قاصر ہوں ــــ سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا!

۷. تمام اصناف ادب سے کہیئے کہ پہلے وہ امتحان کی فیس جمع کریں، اس کے بعد اپنا اپنا پرچہ حل کر کے میرے پاس جمع کریں تاکہ میں انصاف کے ساتھ نمبر دے سکوں ــــ مگر انصاف ہے کہاں؟

صاحب یہ نمبروں کا چکر جو ہے یہ نقادوں کا بہت بڑا پروفیشنل فراڈ ہے۔ ایک صاحب نے افسانے کو نمبر دو دے دیا، دوسرے صاحب نے جھلا کر پوری شاعری کو نمبر دو دے دیا۔ تیسرے صاحب ارسطو کو پکڑ کر کھینچ لائے اور انہوں نے مزاحیہ ادب کو گھٹیا قرار دے دیا۔ یہ کیا افراتفری ہے؟ اور کیوں ہے؟ کامیڈی طربیہ اور ٹریجڈی حزنیہ کی بحث پرانی ہوگئی۔ اب طنز و مزاح صرف لغونری (BUFFOONERY) نہیں ہے۔ اس کا اپنا فن ہے اور اپنی حیثیت! اس کا اعتراف کیجئے نمبر نہ دیجئے۔

ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

۱. مائل بہ زوال

۲. قیام پاکستان کے بعد وہاں مشتاق احمد یوسفی اور کرنل محمد خاں جیسے مزاح نگار اہمیت رکھتے ہیں۔ وہاں [illegible] محسوس نہیں ہوتا۔

۳. قطعی نہیں۔ پطرس اس کی بہترین مثال ہیں۔

۴. فنکاروں کے سامنے رکاوٹیں نہیں ہوتیں۔ اپنا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔ طنز و مزاح نگار ہوں کہ اور فنکار انہوں نے نامساعد حالات میں بھی لکھا ہے۔ واضح نہ سہی، استعاروں اور کنایوں میں۔ طنز و مزاح میں تو اس کی اور گنجائش ہے۔

اچھے فنکاروں کے سامنے رکاوٹیں ہی کہاں ہوتی ہیں۔ ہاں اگر اچھا لکھنا نہ آتا ہو تو رکاوٹوں کو بہانہ بنایا جا سکتا

www.taemeernews.com

۵۔ انگریزی زبان و ادب کی تاریخ بے حد قدیم ہے۔ چوں کہ انگریزی زبان کا علاقہ خاصا وسیع ہے۔ اس کے لکھنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہے انگریزی اور اردو ادب کا غیر مشروط اور دو ٹوک تقابلی جائزہ مناسب نہیں۔ ہاں اردو کی حد بندیوں اور اس کے ادب کے پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے انگریزی کے مقابلے میں اردو سے مایوسی نہیں ہوتی۔ جہاں تک ہندوستانی زبانوں کا تعلق ہے اردو طنز و مزاح میں ان زبانوں سے بہت آگے ہے۔

۶۔ مزاح نگاری اور انشائیہ نگاری قطعی جداگانہ ہیں۔ مزاح نگار، انشائیہ نگار ہو سکتا ہے لیکن انشائیہ نگار کیلئے مزاح نگار ہونا ضروری نہیں بلکہ بعض مزاح نگاروں کی تخلیقات تو قطعی انشائیے ہوتے ہیں جو مزاح کے ذیل میں نہیں لائے جا سکتے۔

۷۔ مجموعی طور پر اردو میں طنز و مزاح کا ادب بلاشبہ صفِ اول کا ادب نہیں ہے!

مظفر حنفی

۱۔ ہندوستان میں مائل بہ زوال (پاکستان میں روبہ کمال)

۲۔ جی ہاں۔ بے شک پاکستان میں بھی سنیئر لکھنے والوں کا فن روبہ انحطاط ہے۔

۳۔ مستثنیات ہر جگہ ہیں لیکن میرے خیال میں دوسری اصناف کی طرح طنز و مزاح میں بھی قدرِ اول کا ادب تخلیق کرنے کے لیے مسلسل ریاضِ فن ضروری ہے چند مضامین اور شعر لکھ کر مطمئن ہو جانے والے فنکار اپنے لیے دائمی مقام نہیں بنا سکتے۔

۴۔ جی ہاں۔ جب تک اردو معاشرے میں طنز و مزاح کو ثانوی درجے کا ادب سمجھا جائے گا، بہتر اور موثر مزاح نگاری کے لیے راہیں ہموار نہیں ہو سکتیں۔

۵۔ کم از کم انگریزی کی حد تک عرض کر سکتا ہوں کہ وہاں Encyclopedia کی تعریف میں طنز کے ساتھ مزاح کی شمولیت ضروری ہے ہم نے اس اصطلاح کا اطلاق اپنے ادب پر کیا تو خالص طنز کی روایت مجروح ہو گئی اور مزاح کے بیریہ استعمال سے دوسرے درجے کا ادب وجود میں آیا۔ ورنہ میر اور غالب جیسے عظیم فنکاروں کے بہترین اشعار وہ ہیں جن کی اساس طنز پر ہے۔ طنز و مزاح میں اکبر سب سے بلند مقام پر ہیں لیکن کیا ہم انھیں میر و غالب کے ساتھ ٹانکنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟

۶۔ جی نہیں۔ مزاح گو شاعر کو انشائیہ گو شاعر کہنا بھی ایک مزاحیہ حرکت ہوگی۔

۷۔ دوسرے نمبر پر!

مناظر عاشق ہرگانوی

۱۔ نحو تونسوی، یوسف ناظم، واہی اور مجتبیٰ حسین جیسے طنز و مزاح نگاروں کی وجہ سے یہ صنف روبکمال ہے۔

www.taemeernews.com

۲. یقیناً اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں۔ وزیر آغا، مشکور حسین یاد، مشتاق قمر، غلام جیلانی اصغر، تقی حسین خسرو وغیرہ نے موضوعاتی تنوع اور تکنیکی رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ بیسویں لکھنے والوں شفا مشتاق احمد یوسفی، مسعود مفتی، کرنل محمد خاں، سید ضمیر جعفری، شفیق الرحمٰن، محمد صدیق سالک وغیرہ کا فن کسی بھی صورت سے سہ پہ انحطاط نہیں ہے۔ ان سب کی تخلیقات کے بغیر اس صنف کا اپنا تکنیکی اور صنفی چہرہ مکمل نہیں کہا جا سکتا۔

۳. قطعی ضروری نہیں ہے۔ رشید احمد صدیق، پطرس، امتیاز علی تاج، انجم مانپوری، ابن انشا وغیرہ کی مثال سامنے ہے۔

۴. ہندوستان میں تحریر کی جتنی آزادی ہے اس کے پیش نظر مزاح نگاروں کے سامنے رکاوٹیں نہیں ہونی چاہئیں۔ سماجی زندگی میں حفظ مراتب، نظم و ضبط اور رواداری، خلوص اور باہمی ہمدردی کی اخلاقی قدروں نے مزاح کی قدر و قیمت کا پیمانہ فراہم کیا ہے۔ دوسری طرف ملک کو خوشحال دیکھنے کی آرزو، سرمائے کی بے قدری، نو دولتے طبقے کا وجود میں آنا، اخلاقی قدروں کی شکست و ریخت، اسمگلنگ، حصول زر کی دوڑ، مادی زندگی پہ بھروسہ وغیرہ نے بھی مزاح نگاروں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

۵. جہاں تک میرے اپنے مطالعے کا سوال ہے، ہندوستانی زبانوں میں بنگلہ اور ہندی ادب میں طنز و مزاح نگاری جم کر کی گئی ہے اور قابل قدر سرمایہ فراہم ہے۔ ان زبانوں کے طنز و مزاح نگاروں میں جوں جوں آزادی کا شعور ترقی کرتا گیا ہے طنز و مزاح نگاری میں گہرائی آتی گئی ہے۔ ویسے موجود سرمایے کے تجزیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ طنز و مزاح مبلغ اخلاق ہے اور نہیں بھی ہے، طنز و مزاح کا بنیادی فریضہ معاشرے کی اصلاح ہے اور نہیں بھی ہے، اور طنز و مزاح انسان کو سوسائٹی کے ضابطے کے تابع کرنے کا وسیلہ ہے اور نہیں بھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اپنی تہذیب کی منتشر قدروں کو سمیٹ کر ایک ایسا نگار خانہ سجا دیا گیا ہے جس میں انسان اپنے بگڑے ہوئے نقوش دیکھ کر ان کی کھوئی ہوئی آب و تاب کی بازیابی کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔

۶. میں مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری کہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ انشائیہ میں ایک بے تکلف شخص کا دوستانہ اور غیر رسمی انداز کارفرما ہوتا ہے۔ انگریزی میں اس لونا کی تحریروں کے لئے PUREESSAY یا PERSONAL یا LIGHTESSAY کی اصطلاح استعمال کی جاتی رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں انشائیہ اس صنف نثر کا نام ہے جس میں انشائیہ نگار اسلوب کی تازہ کاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اشیاء یا مظاہر کے مخفی مفاہیم کو کچھ اس طور پر گرفت میں لیتا ہے کہ انسانی شعور اپنے مدار سے ایک قدم باہر آ کر ایک نئے مدار کو وجود میں لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

.. افسانہ، طنز، نظم اور تنقید کے بعد۔ یعنی پانچویں نمبر پر

www.taemeernews.com

ہندوستانی مزاح نمبر کی اشاعت کے موقع پر

نیک تمنائیں

مہاراشٹرا اسکریپ

حسب ذیل اشیاء کے ہم ڈیلر ہیں :

- اسٹرپس اسکریپ ، شیٹ کٹنگ
- پنچنگ ، ٹرننگ ، بورنگ
- ہر قسم کے دھاتی اسکریپ

اس پتہ پر ربط پیدا کریں :

پلاٹ نمبر A-6 بلاک نمبر 253
کوسلہ بنڈر
دارو خانہ ۔ بمبئی 400010

فون نمبر : آفس : 371014 ، 398181

رہائش { 528040 (نعت اللہ سیٹھ)
{ 527379 (راحت علی سیٹھ)

www.taemeernews.com

ڈاکٹر اعجاز علی ارشد (پٹنہ)

باتچیت

کلیم الدین احمد سے

شگوفہ کے ہندوستانی مزاح نمبر کے لئے انٹرویو لینے جب میں پروفیسر کلیم الدین احمد کی رہائش گاہ واقع ۷، بی بی کرشنا پوری، پٹنہ پہنچا تو وہ بے حد خوشگوار موڈ میں تھے۔ جناب یوسف ناظم کے ارسال کردہ سوالات کی کاپی میں ایک دن پہلے ہی ان کے حوالے کرآیا تھا۔ اس لئے مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا ــــ "دیکھئے" میں نے آپ کے سوالات پڑھ لیئے۔ دراصل میرے لئے ان سوالات کا جواب دینا بہت مشکل ہے کیوں کہ . . . ." میں نے انہیں مکمل انکار کی سرحدوں میں داخل ہونے سے قبل ہی ٹوک دیا ــــ "لیکن میں تمام سوالوں کے جواب پانا مصر بھی نہیں کرتا۔ آپ جن سوالات کا جواب نہ دینا چاہتے ہوں، انہیں میں حذف کرسکتا ہوں" ــــ اور پھر انٹرویو شروع ہوگیا۔

ارشد: آپ کے خیال میں Satire، Humour اور Wit کے اردو مترادفات کیا ہیں؟

کلیم الدین احمد:۔ انگریزی کے تین terms یعنی Satire، Humour اور Irony کے معنی حسب ترتیب طنز، لطافت اور ہجو ہیں۔ بنیادی طور پر صنف ادب Satire ہے اور طنز و ظرافت اس کے Means ہیں۔ Wit کے لئے ہم نکتہ سنجی کا لفظ استعمال کرسکتے ہیں۔ مغربی ادب میں شروع سے ہی یہ تفریق واضح تھی۔

ارشد: مگر مزاح کے لئے آپ انگریزی میں کون سا لفظ پیش کریں گے؟

کلیم الدین احمد:۔ مزاح کا ہمارے یہاں تقریباً وہی مفہوم ہے جو مغربی ادب میں Joke کا ہے۔ گویا اس کی سطح نیچی ہے۔ میں نے اپنی کتاب سخنہائے گفتنی میں اس موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

ارشد: آپ کی رائے میں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد کے دور میں ہندوستان میں طنز و مزاح کی کیا کیفیت رہی ہے؟

کلیم الدین احمد:۔ اس سے آگے لوگ نہیں بڑھ پاتے ہیں۔ نہ نثر میں نہ نظم میں۔ نظم میں تو آج کل کچھ ہے ہی نہیں۔ اس لئے مجموعی طور پر میں طنز و مزاح کو مائل بہ زوال سمجھتا ہوں۔

ارشد: کیا پاکستان میں (غیر منقسم ہندوستان کے ادیبوں کے علاوہ) قیام پاکستان کے بعد اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں اور آیا وہاں کے سینیر لکھنے والوں کا لب و لہجہ انحطاط ہے۔

www.taemeernews.com

کلیم الدین احمد۔ میں پاکستانی ادب سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ لیکن ابن انشاء کو میں نے پڑھا ہے اور اس معیار کے لکھنے والے بھی یہاں کم ملتے ہیں۔

ارشد: طنز و مزاح میں قدر اول کا ادب تخلیق کرنے کے لئے کیا مسلسل مزاح نگاری ضروری ہے؟

کلیم الدین احمد:۔ یہ سوال کچھ عجیب سا ہے۔ اسے چھوڑ دیجئے۔ ویسے انگریزی کا مقولہ ہے کہ PRACTICE MAKES MAN Perfect مگر میں اس کا قائل نہیں۔

ارشد: کیا ہندوستان میں اردو کے مزاح نگاروں کے سامنے کچھ رکاوٹیں ہیں جو بہتر اور موثر مزاح نگاری کی راہ میں حائل ہیں؟

کلیم الدین احمد۔ کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ مگر اچھی مثالیں نہیں ملتی ہیں اور اچھے مزاح نگار نہیں ملتے ہیں تو اس کا سبب صلاحیت کا فقدان ہے۔ پھر یہ کہ رکاوٹیں تو ادیب کو مقابلے کے لئے اکساتی ہیں۔

ارشد: ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں (جن میں انگریزی شامل ہے) کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے راست یا بالواسطہ مطالعے سے اگر آپ کسی نتیجے پر پہنچے ہوں تو اس کی وضاحت فرمائیے۔ کیا آپ کے تقابلی مطالعے کی بناء پر تنقیحات قائم کی جاسکتی ہیں؟

کلیم الدین احمد۔ دیکھئے، ہجو یہ ادب بھی بڑا ادب ہوسکتا ہے اور اس کی مثالیں انگریزی میں چاسر کے یہاں ہیں۔ ڈرائیڈن، پوپ اور ڈاکٹر جانسن تین بڑے شاعر ہیں اور بڑے ہجو نگار بھی۔ کوئی انگریز نقاد اس حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا۔ MAC FLECKNOE of MacLOCK کو دیکھئے۔ یہ ایک Great Satire ہے اور Great Poetry بھی۔ ڈرائیڈن کی دو مشہور تخلیقات Absolam and achitophel اور MacFlecknoe ہیں۔ اس کے علاوہ پوپ کی Don Juan آٹھ جلدوں میں ہے۔ اور یہ انگریزی میں Longest Satire ہے۔ اب نثر میں اٹھارہویں صدی عیسوی میں سوئفٹ کو دیکھئے۔ A modest Proposal کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ سوئفٹ آئرلینڈ میں تھا اور وہاں Britishers کی حکومت تھی۔ عوام میں غریبی کے سبب بڑی بدحالی تھی۔ اب سوئفٹ نے بہت Ironically یہ Suggest کیا کہ آئرلینڈ والوں کے بچوں کو انگریزوں کو خرید لینا چاہیئے تاکہ وہ انہیں کھلا پلا کر خوب تندرست کرسکیں اور اس کے بعد اپنے دسترخوانوں کی غذا بنائیں۔ اب اس کتاب کے نام یعنی A Modest Proposal میں بھی طنز ہے۔ سوئفٹ کی دو اور کتابیں Gulliver's Travels اور A Tale of ہیں اور یہ تینوں تین طرح کی تخلیقات ہیں۔ مگر۔ . . .

ارشد: لیکن میں ہندوستان کی دوسری زبانوں کے . . . .

(بات کاٹ کر)

کلیم الدین احمد:۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں سے تو میں زیادہ واقف نہیں لیکن کوئی مجھ سے پوچھے کہ اردو کا مزاحیہ ادب کیسا ہے تو میں اس کا مقابلہ سوئفٹ، ڈرائیڈن اور پوپ سے کروں گا کیوں کہ ادب میں امریکن اور ہندوستانی کی دیواریں

www.taemeernews.com

میں نہیں کھڑی کر سکتا۔ رہا یہ کہ ابھی تو ہندوستان میں تخلیق کردہ جو انگریزی ادب ہے اس کی کچھ اہمیت [illegible]

ارشد: لیکن فارسی اور عربی وغیرہ کے مقابلے میں اردو کے ظریفانہ ادب کو آپ کس مقام پر رکھیں گے؟ آپ نے تو یہ زبانیں بھی پڑھی ہیں۔

کلیم الدین احمد:۔ عربی اور فارسی میں طنزیاتی ادب کی کوئی بالیدہ شکل ہی نہیں ہے۔ وہاں شاعری بہت اچھی ہے۔ خصوصاً فارسی میں مثنوی اور غزل دونوں بہت اچھی ہے۔ اب اردو والوں سے ہم کو تو یہ شکایت ہے کہ جو معیار سودا اور میر نے قائم کیا تھا، وہاں تک بھی کوئی نہیں پہنچ سکا۔ انگریزی کو تو جانے دیجئے۔ خود سودا میں بہت اچھے Satirist ہونے کی صلاحیت تھی۔

ارشد: گویا شاعری میں تو سودا ایک معیار ہوا مگر اردو نثر نگاری میں؟

کلیم الدین احمد:۔ نثر میں غالب کے خطوط کو پڑھئے۔ ڈاکٹر جانسن نے ایڈیسن کے بارے میں کہا تھا کہ

If you want to have a Middle Style give your Nights and Days to Addison.

میں نے کسی جگہ اسی کو بدل کر اس طرح کہا ہے کہ اگر آپ اچھی اور ظریفانہ اردو لکھنا چاہتے ہیں تو اپنی راتیں اور دن غالب کو دیجئے۔

ارشد: کیا آپ مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری کہنے کے حق میں ہیں؟ اگر ہاں تو کیا۔ . . .

کلیم الدین احمد:۔ دیکھئے، اول تو یہ کہ آج کل انشائیہ کا جو ہنگامہ ہے، (بات کاٹ کر) اس کے ہم قائل نہیں ہیں۔ انشائیہ کوئی الگ صنف نہیں ہے۔ انگریزی میں یہ ESSAY کی ایک شکل ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے اسے Loose Sally of Mind کہا تھا، یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے۔ [illegible] A Roast Pig لکھا تھا۔ دراصل انیسویں صدی عیسوی سے ہی یہ انداز بیان نکلا اور پھر بیسویں صدی میں اس طرح کے بہت سے لکھنے والے ہو گئے جو اسے Light Personal Essay کہا کرتے تھے۔ جن میں E.A. Locas اور Hillairy Bellock Amilin Robeatlynd وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اسی طرح کی چیزیں لکھتے تھے جسے آپ لوگ انشائیہ کہتے ہیں۔ یعنی ایسی چیزیں کہ جنہیں پڑھا اور پھینک دیا۔

ارشد: کیا انشائیہ میں مزاح نگاری ضروری ہے؟

کلیم الدین احمد:۔ کوئی ضروری نہیں ہے، نہ رہی ہے۔ چوں کہ یہ Essays کافی Amusing ہوتے تھے اور دس پندرہ منٹ کی تفریح کے لئے لکھے جاتے تھے، اس لئے ایسا سمجھا جانے لگا کہ ان میں مزاح ہونا ضروری ہے۔

ارشد: بہر حال آپ مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری کہنے کے حق میں ہیں یا نہیں؟

کلیم الدین احمد:۔ میں بالکل حق میں نہیں ہوں چوں کہ مزاح نگاری انشائیہ کے باہر بھی پائی جاتی ہے اور ہر صنف میں موجود ہے۔

www.taemeernews.com

انشائیہ بہرحال نثر کے ساتھ مخصوص ہے۔

ارشد: اُردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کو معیار کے حساب سے آپ کس نمبر پر رکھیں گے؟

کلیم الدین احمد:۔ کس معیار سے؟ اگر اردو کے معیار سے تب بھی اس کو Serious Poetry اور Serious Prose کے نیچے ہی رکھنا ہوگا کیوں کہ اردو میں یہ دوسرے درجے کی چیز رہی ہے ہاں انگریزی میں جو Great Satire ہے وہ Great Poetry یا Great Prose بھی ہے۔۔۔۔ اچھا اب ختم کیا جائے۔

ارشد:۔ ایک آخری سوال، کیا آپ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان میں لطائف Short ہوتے ہیں پیدا نہیں ہوتے؟

کلیم الدین احمد:۔ آج کل ایسا ضرور ہورہا ہے اور عام طور پر آج کل اخبار میں لطائف Short بھی ہوتے ہیں لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوا ہے۔ آخر بیربل یا ملا دوپیازہ کے لطائف کو آپ کیا کہیں گے؟

بات چیت

ڈاکٹر عبدالمغنی سے

ارشد:۔ سب سے پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کے خیال میں Satire، Humour اور Wit کے اردو مترادفات کیا ہیں؟

عبدالمغنی:۔ Satire ہجو ہے، اور یہی اصل صنفِ ادب ہے۔ نظم و نثر دونوں میں، انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی۔ اس صنفِ ادب کے وسائل کے طور پر Irony یعنی طنز، Wit یعنی ظرافت، Humour یعنی مزاح استعمال ہوتے رہے ہیں۔ یہ میں نے انگریزی الفاظ کے جو اردو مترادفات بتائے ہیں تو یہ سب اصلاً عربی لفظ ہیں روزان کے معنی ہو بہو وہی ہیں جو انگریزی الفاظ کے ہیں۔

ارشد:۔ لیکن احتشام حسین نے جو Satire کا ترجمہ۔۔۔۔

ع۔م:۔ احتشام حسین نے Satire کا بالکل غلط ترجمہ "طنز" کردیا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ عربی نہیں جانتے تھے۔ انگریزی میں اولاً یہی صورتِ حال رہی جو میں نے بیان کی ہے۔ بعد میں کچھ ناقدوں نے مزاح کو ہجو سے الگ کرکے ایک مستقل صنف قرار دیا اور اس سے پہلے دوسرے ناقدوں نے ظرافت یعنی Wit کو ہجو سے الگ کیا تھا۔ چنانچہ سترہویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں Restoration Period کے جو ڈرامہ نگار ہوئے اور اُنھوں نے Comedies لکھیں انہیں بھی Wit کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات بھی صنفِ ادب کے لحاظ سے نہیں تھی کیوں کہ صنفِ ادب ڈرامہ ہے اور ڈرامے کی وہ صنف جو Comedy کہلاتی ہے۔ اس لئے ان کو Wit ان کے مخصوص اندازِ بیان کے سبب کہا گیا جو

www.taemeernews.com

ظرافت پر مشتمل تھا۔ اسی طرح اس سے پہلے سوفٹ نے جو کچھ لکھا وہ دراصل فنی طور پر Satire کے تھا اس صنف میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ "گولیورس ٹریولز" ایک ناول کی شکل میں ہے اور اس کو طنز یعنی Satire کا ماہر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے اسلوب بیان کا غالب عنصر Satire ہے۔

ارشد: آپ کی رائے میں رشید احمد صدیقی اور پطرس کے بعد کے دور میں ہندوستان میں طنز و مزاح کی کیا کیفیت رہی ہے؟

ع۔م: یہ دونوں نثر کے لکھنے والے ہیں اور آپ کا سوال عام ہے۔ بہرحال اگر صرف نثر کی بات کی جائے تو پطرس اور رشید سے بہتر چیزیں نہیں لکھی گئیں۔ گرچہ بعض اچھے لکھنے والے ابھرے ہیں مثلاً شفیق الرحمٰن، ابراہیم جلیس، ابن انشا یا فکر تونسوی وغیرہ۔

ارشد: گویا رشید اور پطرس کے بعد طنز و مزاح کم از کم، رد و کی حد تک نہ مائل بہ زوال ہے نہ رو بہ کمال!

ع۔م: اس کا جواب ذرا مشکل ہے۔ چوں کہ مان لیا کہ شاعری میں ایک غالب پیدا ہو گیا تو پھر موجودہ شاعری میں ارتقاء کی صورت کے باوجود آپ اسے کیا کہیں گے؟ نظم ہی کی صورت حال کو دیکھئے۔ اب کوئی پوچھے کہ اکبر کے بعد، تو آپ کیا کہیں گے؟ ظاہر ہے داور فگار اور سلیمان خطیب تو ہیں مگر یہ لوگ اکبر کے درجے تک نہیں پہنچتے کیوں کہ ان کے یہاں فن کی وہ پختگی نہیں۔ خیالات کی وسعت تو ضرور ہے۔

ارشد: کیا پاکستان میں (غیر منقسم ہندوستان کے ادیبوں کے علاوہ) قیام پاکستان کے بعد اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں اور کیا وہاں کے پرانے لکھنے والوں کا فن رو بہ انحطاط ہے؟

ع۔م: میری جو تھوڑی سی واقفیت ہے، اس کی روشنی میں میں خاص طور پر ابن انشاء کا نام لوں گا۔ مجید لاہوری بھی میں سمجھتا ہوں کہ ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ بہرحال قیام پاکستان کے بعد بھی وہاں اچھے مزاح نگار پیدا ہوئے ہیں۔

ارشد: طنز و مزاح میں قدر اول کا ادب تخلیق کرنے کے لئے کیا مسلسل مزاح نگاری ضروری ہے؟

عبدالمغنی: یہ سوال ہی غلط ہے۔ مسلسل مزاح نگاری کوئی ضروری نہیں ہے۔

ارشد: کیا ہندوستان میں اردو کے مزاح نگاروں کے سامنے کچھ رکاوٹیں ہیں جو بہتر اور موثر مزاح نگاری کی راہ میں حائل ہیں؟

عبدالمغنی: کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ بلکہ مزاح کے سارے اسباب جمع ہیں۔ ایک سے ایک مضحکہ خیز واقعات ہوتے ہیں اور جمہوریت کا زمانہ ہے، اس لئے اظہار خیال پر کوئی پابندی نہیں۔ یہاں تو پوپ اور ڈرائیڈن پیدا ہونا چاہیئے۔ حالاں کہ پوپ سے بہتر شاعر اکبر الہ آبادی تو یہاں پیدا ہو ہی چکا ہے۔ اب بھی اعلیٰ شاعری کے لئے ماحول پہلے ہی سازگار نہیں مگر طنز و مزاح نگاری کے لئے تو ماحول بے حد سازگار ہے۔ اس لئے اردو میں طنز و مزاح کے فروغ میں کوئی رکاوٹ ہے تو وہ بس بہتر صلاحیتوں کی کمی ہے۔

ارشد: ہندوستان کی دوسری اہم زبانوں (جن میں انگریزی شامل ہے) کے طنزیہ و مزاحیہ ادب کے راست یا بالواسطہ مطالعے سے اگر آپ کسی خاص نتیجے پر پہنچے ہوں تو اس کی وضاحت فرمائیے؟ کیا آپ کے تقابلی مطالعے کی بناء پر کوئی تنقیحات قائم کی جاسکتی ہیں؟

www.taemeernews.com

عبدالمغنی:۔ دوسری زبانوں کا تو میں نے زیادہ مطالعہ نہیں کیا اور ہندوستان میں انگریزی ادب کی عام روایت ہی کتنی ہے؟ اخباروں میں جو چیزیں چھپ رہی ہیں وہ ادب کے زمرے میں آتی ہیں یا نہیں، یہ بھی قابلِ غور ہے۔ یہ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا کہ ہندوستان میں انگریزی ادب کے طنز و مزاح کی کوئی روایت قائم ہوئی ہے۔ میری نظر میں انگریزی کا کوئی ادیب ہندوستان میں نہیں ہے جسے طنز نگار یا مزاح نگار کہا جاسکے۔

ارشد:۔ اردو ادب میں طنزیہ و مزاحیہ ادب کو معیار کے حساب سے آپ کس نمبر پر رکھیں گے؟

عبدالمغنی:۔ ابھی تک یہ شاعری کی حد تک دوسرے درجے کی چیز رہی ہے۔ اگر یہ خالص طنزیہ و مزاحیہ ہو تو اس کی مثال سوداؔ کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ سوداؔ کا جو ہجویہ کلام ہے اور طنز و مزاح پر مشتمل ہے، اسے سوداؔ کا اول درجے کا کلام نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے کہ انہوں نے اپنے عام طرزِ کلام سے الگ ایک خاص قسم کی ہجویہ شاعری کی۔ اس کے برخلاف اکبرؔ کی شاعری ظرافت میں پست ہونے کے باوجود اعلیٰ درجے کی شاعری ہے۔ کیوں کہ انھوں نے الگ سے کوئی طنزیہ و مزاحیہ شاعری نہیں کی بلکہ صرف شاعری کی اور بیشتر غزل کی شکل میں کی، جس میں ظرافت کا عنصر غالب ہے۔ البتہ ان کے قطعات یا بعض نظموں میں طنز و مزاح بہت نمایاں ہے لیکن وہ ان کی ظرافت سے معطر غزلوں کے انبار میں چند دانوں کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبرؔ نے غزل کے پختہ نمونے پیش کئے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کے تغزل میں غالبؔ کی طرح ظرافت کے احساسات اس فرق کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ اکبرؔ کے یہاں ان کا غلبہ ہے اور غالبؔ کے یہاں صرف چند جلوے ہیں۔

ارشد:۔ کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ طنز و مزاح نگاری میں وہی شاعر کامیاب ہوگا جو Full timer ہوگا؟

عبدالمغنی:۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اردو میں اب تک جو شاعری خالصتاً طنزیہ و مزاحیہ عنوان سے کی گئی ہے وہ درجہ اول کی شاعری نہیں ہے۔ نثر نگاری کا معاملہ مختلف ہے۔ نثر میں طنز و مزاح کے جو نمونے ملتے ہیں وہ یقیناً اعلیٰ پائے کے ہیں اور ان کا سلسلہ رتن ناتھ سرشارؔ سے شروع ہو کر انجم مانپوری، فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرسؔ، کنہیا لال کپورؔ، شوکت تھانوی، وغیرہ سے گزرتا ہوا ابراہیم جلیسؔ، ابن انشاءؔ، شفیق الرحمٰنؔ اور فکر تونسوی اور مجتبیٰ حسینؔ تک پہنچتا ہے۔

ارشد:۔ کیا آپ اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ ہندوستان میں لطائف Jokes کئے جاتے ہیں، پیدا نہیں ہوتے۔

عبدالمغنی:۔ مجھے تو یہ خیال بھی ایک لطیفہ ہی معلوم ہوتا ہے۔ پتہ نہیں Jokes ہے یا نہیں۔

ایک نئے وکیل نے اپنے پرانے وکیل سے پوچھا،

"میں اپنے موکل کو بچانے کے لیے جج کو کتنی دیر مخاطب کروں کہ جج مطمئن ہو جائے اور میرا موکل بری ہو جائے؟"

"تم جسقدر وقت لے سکتے ہو۔ تم جتنی دیر بحث کروگے کم از کم اتنی دیر تو وہ بیچارہ جیل جانے سے بچا رہے گا۔"

www.taemeernews.com

مرتب : ڈاکٹر محمد ضیاء الدین انصاری (علیگ)

اُردو طنز و مزاح ـــــ منتخب کتابیات

تعارف مرتب :-

نام : محمد ضیاء الدین انصاری

ولادت : ۱۹۴۲ء بمقام سنبھل ضلع مرآباد ، اُتر پردیش

تعلیم : ایم اے ، پی ایچ ڈی (علیگ)

ملازمت : اسسٹنٹ لائبریرین (شعبہ اردو) مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

تصانیف : فارسی ادب کی تاریخ (۱۹۷۶ء) اُتر پردیش اردو اکیڈمی سے انعام یافتہ

آزاد ، ابوالکلام	طنزیات آزاد ۔ مرتبہ عمر فریدی (الہلال اور البلاغ سے ۲۳ مضامین کا انتخاب)	لاہور ، نیا کتاب گھر	۱۹۱۳ء
آزاد ، سید محمد	خیالات آزاد ، مرتبہ محمد عبدالغفور شہباز	لکھنؤ ، قومی پریس	۱۸۸۷ء
" "	" ، مرتبہ محمد عبدالحمید حمید	کلکتہ ، رضوانی پریس	۱۹۰۸ء
" "	نوابی دربار ؛ مرتبہ مشتاق احمد	کلکتہ ، ارشد پبلشرز	۱۸۷۴ء
" "	"	لکھنؤ ، سیٹھ کندن داس پریس	ب ت
" "	"	آگرہ ، بال کرشن پریس	ب ت
آزاد ، غلام علی	بلی نامہ	، مطبع محمدی	۱۲۶۳ھ
آزردہ ، مرزا محمد زماں	غبار خیال	سرینگر ،	۱۹۷۳ء
آسی ، عبدالباری	ملا زاغول	لکھنؤ ، صدیق بک ڈپو	ب ت
آفاقی ، علی سفیان	کمنیں ۔	لاہور ، مکتبۂ چراغ راہ	۱۹۵۵ء
ابراہیم جلیس	آزاد غلام	لاہور ، گوشۂ ادب	۱۹۵۵ء
"	اوپر شیروانی اندر پریشانی (لباس اور خوراک سے متعلق مضامین)	دہلی ، مکتبۂ عالم و فن	۱۹۶۶ء

www.taemeernews.com

ابراہیم جلیس	پبلک سیفٹی ریزر	لاہور، گوشۂ ادب	۱۹۵۰ء
"	نیکی کر تھانے جا	دہلی، ادبی دنیا	۱۹۷۱ء
"	"	دہلی، مکتبۂ علم و فن	۱۹۶۷ء
"	واہیات باتیں	کراچی، رس پبلی کیشنز	۱۹۶۴ء
"	پہلے اور پہلے	کراچی، مکتبۂ جلیس	۱۹۶۴ء
ابن انشاء	آوارہ گرد کی ڈائری، سفرنامہ	دہلی، جمالی پریس	۱۹۷۴ء
"	ابن بطوطہ کے تعاقب میں	نئی دہلی، اردو بکس	بات
"	دنیا گول ہے، سفرنامہ	دہلی، ادبی دنیا	۱۹۷۸ء
ادیب، محمد عبدالقادر	فقار خانے میں		۱۹۸۱ء
ابوالکلام	ماڈرن قصہ درویش		۱۹۸۰ء
ارشد علی خاں	شوشے	زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۹ء
اطہر پرویز	اس حمام میں	زیور پبلی کیشنز	۱۹۷۸ء
	اکبر اور بیربل کے لطیفے	علی گڑھ، اردو گھر	بات
الفت، دُرگا پرشاد	اُلو کی دُم فاخت	لکھنؤ، صدیق بک ڈپو	
"	نگڈم	" "	
اکبر علی خاں	چھیڑ غالب سے چلی جائے	رامپور، کتاب کار	۱۹۶۵ء
امجد حسین، سید	جملۂ معترضہ	لاہور، اردو بک اسٹال	۱۹۵۴ء
انجم مانپوری، نور محمد	مرنے کے بعد	گیا، انجم پبلشنگ ہاؤس	بات
انشاء۔ انشاء اللہ خاں۔	لطائف السعادت، مرتبہ مع اردو ترجمہ از آمنہ خاتون۔	جنگلہ، کوہ نور پریس	۱۹۵۵ء
برق آشیانوی۔ موسیٰ کلیم	پتے کی بات	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	۱۹۷۸ء
" "	یہ ایک تبسم	حیدرآباد، زندہ دلان حیدرآباد	۱۹۷۱ء
" "	ہنستے ہنستے	" "	۱۹۸۱ء
اعجاز علی ارشد	کرسی اور کرنسی	ناشر: مصنف	۱۹۸۲ء
برہان حسین	چند کلیاں نشاط کی	حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۸۱ء
پاشا، احمد جمال	اندیشۂ شہر مع مقدمہ وزیر آغا	لکھنؤ، پنچ پبلشرز	۱۹۶۵ء
" "	اودھ پنچ کے لطیفے	" "	

www.taemeernews.com

پاشا، احمد جمال		دنیا کے بہترین لطیفے		پنچ پبلشرز	
" "		ستم ایجاد		کتاب پبلشرز	۱۹۶۶ء
" "		شوکت تھانوی کی مزاحیہ صحافت		پنچ پبلشرز	۱۹۶۷ء
" "	مرتب	غالب سے معذرت کے ساتھ		لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	۱۹۶۴ء
" "		فن لطیفہ گوئی (پھڑکتے لطیفے)		پنچ پبلشرز	۱۹۷۵ء
" "		لذتِ آزار		"	۱۹۶۸ء
" "	مرتب	مجاز کے لطیفے		علی گڑھ، جھلک بک ڈپو	۱۹۵۷ء
"		مزاح نگاروں کے لطیفے		لکھنؤ، پنچ پبلشرز	۱۹۶۸ء
" "		مضامینِ پاشا		" "	
" "	مرتب	مُلّا نصیر الدین کے لطیفے		لکھنؤ، عبدالباری آسی اکاڈمی	۱۹۶۶ء
پرویز یداللہ مہدی		تُو تُو، مَیں مَیں		حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۸ء
"		چوڑی کے غلام		بمبئی، آپ ہم پبلی کیشنز	۱۹۷۷ء
"		چھیڑ چھاڑ		حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۴ء
"		ٹائیں ٹائیں فش		" "	۱۹۸۳ء
پطرس بخاری		پطرس کے مضامین		لاہور، مکتبہ میمن اکادمی	
"		"		" اردو اکیڈیمی	۱۹۴۴ء
"		"		دہلی، ادبی دنیا	۱۹۶۵ء
تخلص بھوپالی، عبدالحفیظ۔		پاندان والی خالہ	۱۷	بھوپال، پنچ بھون پبلی کیشنز	
"		"	۲۸	" "	"
"		پوسٹ مارٹم رپورٹ		" "	"
"		شیطان جاگ اُٹھا		" "	۱۹۶۲ء
تلکین کاظمی، سید		غنچۂ تبسم (مجموعہ نگارشات فکاہی)		حیدرآباد، شمس الاسلام پریس	۱۹۳۰ء
تمنا مظفرپوری		تمتِ پنچ۔		ناشر، تمنا مظفر پوری	۱۹۸۴ء
جے پال		گنجینۂ ظرافت		لکھنؤ، نول کشور	۱۹۸۹ء
چغتائی، عظیم بیگ		کونتار			
حسرت، چراغ حسن		زرِ ضیغ کے خطوط		لاہور، اردو اکیڈیمی	۱۹۵۱ء

www.taemeernews.com

حبیب ضیاء، ڈاکٹر	گویم مشکل	حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۸۱ء
حفیظ نعیمی	کوفتے	پبلی بھیت، عبدالمجید نعیمی	۱۹۷۶ء
حسّان، ایم۔اے	گستاخی معاف	حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	
خوشتر گرامی، رام رکھے مل۔	بیسویں صدی کے تیر و نشتر	دلّی، بیسویں صدی پبلی کیشنز	۱۹۷۴ء
رام لعل نابھوی	تبسم مع مقدمہ وزیر آغا	نابھہ، رام لعل نابھوی	۱۹۷۹ء
رشید الدین	خواہ مخواہ	حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۸۰ء
رشید قریشی	مزاج شریف	" "	۱۹۷۳ء
رؤف خوشتر	غبارِ حاضر	حیدرآباد، شگوفہ پبلی کیشنز	۱۹۸۲ء
رضی کاظمی مرتب	انتخاب اودھ پنچ	لکھنؤ، کتابی دنیا	۱۹۶۴ء
رفیع الدین احمد	آنکھوں کے شہتیر	رامپور، انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز	بات
رفیق شاکر کھامگانوی	سکنڈ ہینڈ	اکولہ (مہاراشٹرا)	۱۹۸۲ء
رموزی، ملّا	صبح لطافت	لاہور، مکتبۂ میری لائبریری	بات
"	گلابی اُردو	بدایوں، نقاش پریس،	۱۹۲۱ء
ماجد صدیقی و والی آسی مرتبین	مرزا غالب کے لطیفے	لکھنؤ، مکتبۂ دین و ادب	۱۹۶۸ء
سجاد حسین، منشی۔	احق الدین	لکھنؤ، بھارگو اسکول بک ڈپو	۱۹۲۵ء
" "	پیاری دنیا یعنی افسانۂ گیتی و بیگم و طالب	" "	۱۹۲۳ء
" "	سرگذشت حاجی بغلول	" مطبع شام اودھ	۱۹۰۳ء
" "	" " طبع دوم	" "	۱۹۱۳ء
" "	" " مرتبہ جمیل جالبی	کراچی، مشتاق بک ڈپو	۱۹۶۱ء
" "	طرحدار لونڈی	لکھنؤ، صدیق بک ڈپو	بات
" "	"	" نیّر پریس	بات
"	مع مقدمہ از میمونہ بیگم	لاہور، مجلس ترقی ادب	۱۹۶۵ء
"	کایا پلٹ	لکھنؤ، صدیق بک ڈپو	بات
" "	میٹھی چھری	" مطبع شام اودھ	۱۹۱۳ء
سجاد حسین کسمنڈوی	حیاتِ شیخ چلّی	" صدیق بک ڈپو	بات
سراج الدین	اپریل فول	لاہور، مسلم پرنٹنگ پریس	بات

www.taemeernews.com

سرور جاں	خمارِ گندم	لکھنؤ، پنچ پبلشرز	ب ت
"	مشقِ ستم	" ، اردو پبلشرز	۱۹۷۴ء
سندباد جہازی	حرف و حکایت	لاہور، مکتبہ کاروان	۱۹۵۶ء
سیف الحق	لطائف غیبی	دہلی، اکمل المطابع	۱۸۶۴ء
شاد، نریش کمار	ادبی لطیفے	" ، ہند پاکٹ بکس	ب ت
" "	سرخ حاشیے	" ، مکتبہ شاہراہ	۱۹۵۸ء
شبلی نعمانی	ملایاتِ شبلی ؛ مرتبہ جالب مظاہری	بمبئی، علوی بک ڈپو	۱۹۶۳ء
شبیر حکیم	شوخیاں	مالیگاؤں، نیا ادب	۱۹۷۱ء
شمیم گوہر، سید	رقصِ تحریر	الہ آباد، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	۱۹۷۸ء
شفیع دہلوی	پیرِ نابالغ	دہلی، مکتبہ سلطانی	۱۹۵۲ء
شفیع عقیل	تیغِ ستم	لاہور، مکتبہ جدید	۱۹۶۳ء
شفیق الرحمٰن	پچھتاوے	لکھنؤ، کتابی دنیا	ب ت۔
"	حماقتیں	" "	"
"	کرنیں	لاہور، مکتبہ جدید	۱۹۶۲ء
"	مزید حماقتیں	دہلی، چمن بک ڈپو	ب ت
"	"	لکھنؤ، کتابی دنیا	"
شفیقہ فرحت	لو آج ہم بھی	بھوپال، مدھیہ پردیش اردو اکیڈیمی	۱۹۸۱ء
شوکت تھانوی (محمد عمر)	الٹ پھیر	کراچی، مشتاق بک ڈپو	۱۹۶۴ء
"	انشاء اللہ	دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس	ب ت
"	"	" ، مکتبہ جامعہ	"
"	اے دلربا تیرے لیے	" ، نئی پبلشنگ ہاؤس	"
"	بارِ خاطر	امرتسر، آزاد بک ڈپو	۱۹۵۶ء
"	بحرِ تبسم	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	ب ت
"	برقِ تبسم	" "	"
"	بزمِ جمس	" "	"
"	بقراط	لاہور، ادارۂ فروغِ اردو	"

www.taemeernews.com

شوکت تھانوی (محمد عمر)	بھابی	لاہور، ادارۂ فروغ اُردو	ب ت
"	"	امرتسر، آزاد بک ڈپو	"
"	بیگم، بادشاہ، غلام	لکھنؤ، پرواز بک ڈپو	"
	پگلی	انبالہ، آزاد بک ڈپو	"
"	"	دہلی، کوہ نور پریس	"
"	جوڑ توڑ	لاہور، ادارۂ فروغ اُردو	"
"	جوکر	لکھنؤ، سردار پبلشنگ ہاؤس	"
"	خانم خاں	لکھنؤ، صدیق بک ڈپو	"
"	خدا نخواستہ	لاہور، ادارۂ فروغ اُردو	"
"	دل پھینک	لکھنؤ، صدیق بک ڈپو	"
"	دنیائے تبسم، مع مقدمہ رشید احمد صدیقی	دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس	۱۹۳۷ء
"	راجہ صاحب	دہلی، محمود پبلشنگ ہاؤس	۱۹۵۶ء
"	سانچ کو آنچ	دہلی، حالی پبلشنگ ہاؤس	۱۹۵۴ء
"	"	لاہور، ادارۂ فروغ اُردو	۱۹۵۴ء
"	سسرال	دہلی، اردو پاکٹ بک سیریز	۱۹۶۰ء
"	سُنی سنائی	دہلی، شہباز پبلشنگ ہاؤس	ب ت
"	سوتیا چاہ	لکھنؤ، صدیق بک ڈپو	۱۹۵۸ء
"	سودیشی ریل	" "	ب ت
"	سیلابِ تبسم	" "	"
"	شیش محل	" نسیم بک ڈپو	۱۹۸۱ء
"	شیطان کی ڈائری	" "	۱۹۶۳ء
"	طوفانِ تبسم	" صدیق بک ڈپو	۱۹۳۳ء
	غالب کے ڈرامے	دہلی، بک سروس	۱۹۷۰ء
	غزل	لاہور، ادارۂ فروغ اردو	ب ت
	فانی بی (حصہ اوّل، دوم، سوم)	" "	"
	"	دہلی، نیا ادارہ	"

www.taemeernews.com

شوکت تھانوی (محمد عمر)	قاعدہ بے قاعدہ		لاہور، ادارۂ فروغِ اُردو	ب ت
"	کارٹون		لکھنؤ، مکتبۂ اردو	"
"	کائناتِ تبسم		بمبئی، علوی بک ڈپو	۱۹۵۹ء
"	کتیا		دہلی، کبیر بک ڈپو	ب ت
"	کمی کمی		" ، نیو تاج آفس	۱۹۶۵ء
"	لاہوریات		" ، بھوشن بک ڈپو	ب ت
"	مابدولت		لاہور، ادارۂ فروغ اردو	"
"	مریخ کی سیر		لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	"
"	مسکراہٹیں		" ، "	"
"	مضامینِ شوکت		لاہور، ادارۂ فروغ اردو	"
"	مسز خاتون		لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	"
"	منشی جی		" ، صدیق بک ڈپو	"
"	موجِ تبسم		" ، "	"
"	مولانا		دہلی، جہانگیر بک ڈپو	"
"	مونڈی کاٹے		لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	"
"	نورتن		" ، "	۱۹۶۰ء
"	نیلوفر		امرتسر، آزاد بک ڈپو	ب ت
"	وغیرہ وغیرہ		لاہور، ادارۂ فروغ اُردو	"
شہابی، انتظام اللہ	غالب کے لطیفے		دہلی، عالی پبلشنگ ہاؤس	"
شین مظفرپوری	آدھی مسکراہٹ		پٹنہ،	۱۹۸۰ء
صدیقی، رشید احمد	آشفتہ بیانی میری		علی گڑھ، سرسید بک ڈپو	(فروری) ۱۹۵۸ء
" "	"	(بار دوم)	" "	(اپریل) ۱۹۵۸ء
" "	"	(بار سوم)	" "	(ستمبر) ۱۹۵۸ء
"	"		نئی دہلی، مکتبہ جامعہ	۱۹۶۲ء
"	خندواں		دہلی، مکتبہ جامعہ	۱۹۴۰ء
"	"		نئی دہلی، مکتبہ جامعہ	۱۹۶۵ء

www.taemeernews.com

صدیق، رشید احمد	سہیل کی سرگزشت	حیدرآباد، نفیس اکیڈیمی	۱۹۴۷ء
" "	شیخ نیازی	علی گڑھ، سرسید بک ڈپو	۱۹۵۸ء
" "	"	" " "	۱۹۷۷ء
" "	"	" مسلم ایجوکیشنل پریس	۱۹۷۰ء
" "	مضامین رشید	دہلی، مکتبہ اُردو	۱۹۴۱ء
" "	"	کراچی، اُردو اکیڈمی	ب ت
" "	"	علی گڑھ، انجمن ترقی اُردو	۱۹۶۴ء
ظفر علی خاں	سفر انگلستان	لاہور، میری لائبریری	ب ت
عابد حسین، سید	بزم بے تکلف	دہلی، سنگم کتاب گھر	"
عاتق شاہ	الٹین کا جن	حیدرآباد، شگوفہ پبلی کیشنز	۱۹۷۹ء
عبدالعزیز خاں	سوال و جواب طنز و مزاح	میرٹھ، شرف المطابع	ب ت
عبدالغفور، خواجہ	چمن زار	حیدرآباد زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۸ء
" "	شگوفہ زار	نئی دہلی، نئی آواز	۱۹۷۷ء
	قہقہہ زار	بمبئی، حلقۂ ادب	ب ت
" "	گل و گلزار	حیدرآباد، زندہ دلان حیدرآباد	۱۹۷۶ء
" "	لالہ زار	بمبئی، رپورٹر آفسٹ پریس	۱۹۷۳ء
عبدالمجیب سہالوی	الکشنیات	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	۱۹۷۱ء
"	داد کی بیداد	" " "	۱۹۶۶ء
عرش ملسیانی۔ بال مکند۔	پوسٹ مارٹم	نگودر، مرکز تصنیف و تالیف	ب ت
" "	"	دہلی، محبوب المطابع	"
عصمت اللہ بیگ	گندم نما (طنزادیے، مزاحیے، فکاہیے)	کراچی، مکتبۂ شاہد	۱۹۷۶ء
زحمت اللہ بیگ	مضامینِ فرحت (حصہ اول)	لاہور، طاب پریس	ب ت
"	" مرتبہ شمیم انہونوی	لکھنؤ، مکتبۂ کلیاں	ب ت
"	" (حصہ دوم)	لاہور، مکتبۂ معین الادب	۱۹۴۸ء
"	" مرتبہ شمیم انہونوی	لکھنؤ، مکتبۂ کلیاں	ب ت
"	" (حصہ سوم)	حیدرآباد، اعظم اسٹیم پریس	"

www.taemeernews.com

فرحت اللہ بیگ	مضامینِ فرحت	(حصہ چہارم)	حیدرآباد، انتظامی پریس	ب ت
"	"	(حصہ پنجم)	" " "	"
"	"	(حصہ ششم)	" " اقبال اکیڈیمی	"
"	"	(حصہ ہفتم)	" " "	"
"	"	"	" " عبدالحق اکیڈیمی	"
فرقت کاکوروی، غلام احمد	صید ہدف		لکھنؤ، ادارۂ فروغِ اُردو	"
"	غالب خستہ کے بغیر		دہلی، مکتبۂ شاہراہ	۱۹۷۰ء
"	کفِ گل فروش		لکھنؤ، ادارۂ فروغِ اُردو	۱۹۵۵ء
"	مداوا		لکھنؤ، یوسفی پریس	۱۹۴۴ء
"	مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں		" " نسیم بک ڈپو	ب ت
"	مزاحیہ شرح دیوانِ غالب		" " ادارہ فروغِ اُردو	۱۹۶۴
"	ناروا		" " سرفراز قومی پریس	۱۹۴۶ء
فریدی، شاہ نصیر	طرزیاتی خاکے		آگرہ، آگرہ اخبار پریس	۱۹۶۸ء
فکر تونسوی	آخری کتاب		نئی دہلی، آہلو والیہ بک ڈپو	۱۹۸۰ء
"	بدنام کتاب		دہلی، لاجپت رائے	۱۹۷۵ء
"	چاند اور گدھا		لاہور، آئینۂ ادب	۱۹۶۱ء
"	چور پٹ راجہ		دہلی، لاجپت رائے	۱۹۷۳ء
"	فکر نامہ	(مع تعارف از کرشن چندر)	نئی دہلی، انجمن ترقی اُردو ہند	۱۹۷۷ء
فلک پیما، میاں عبدالعزیز	مضامینِ فلک پیما، مرتبہ میاں بشیر احمد		لاہور، آئینۂ ادب	۱۹۶۴ء
کپور، کنہیالال	بال و پر		دہلی، لاجپت رائے	۱۹۵۳ء
"	سنگ و خشت		لاہور، مکتبۂ جدید	۱۹۶۰ء
"	"		نئی دہلی، انڈین اکیڈیمی	ب ت
"	گردِ کارواں		لاہور، مکتبۂ جدید	۱۹۶۱ء
"	نرم گرم		لاہور، میری لائبریری	۱۹۶۳ء
کرشن چندر	غلی قاعدہ		دلّی، ایشیا پبلشرز	۱۹۶۶ء
"	گدھے کی سرگزشت			

www.taemeernews.com

کول ، کشن پرشاد ۔	مرتب گلدستۂ پنج (مع دیباچہ برج نرائن چکبست)	لکھنؤ ، ہندوستانی پریس	۱۹۱۵ء
کمنہ ، بھارت چند	تیر نیم کش	حیدرآباد ، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۲ء
" "	کیا نام نہ ہوگا	" "	۱۹۷۷ء
لق لق ، حاجی	درانتی	لاہور ، اُردو بک اسٹال	۱۹۳۷ء
لو تھر ، نریندر	مزاج پُرسی	حیدرآباد ، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۳ء
لیق صلاح ، ڈاکٹر	سُنی سنائی	" ، شگوفہ پبلی کیشنز	۱۹۸۱ء
مانپوری	طنزیاتِ مانپوری (حصہ اوّل)	پٹنہ ، برقی پریس	۱۹۵۰ء
"	" (حصہ دوم)	گیا ، محمد حبیب الرحمٰن	۱۹۵۰ء
مجتبیٰ حسین	بہرحال	حیدرآباد ، نیشنل بک ڈپو	۱۹۷۴ء
"	تکلف برطرف	" "	
"	شیشہ و تیشہ (شاہد صدیقی کے مزاحیہ کالموں کا انتخاب)	" "	
"	قصۂ مختصر	" "	۱۹۷۲ء
"	قطع کلام	" "	۱۹۷۰ء
"	آدمی نامہ	" ، حسامی بک ڈپو حیدرآباد	۱۹۸۱ء
"	بالآخر	" "	۱۹۸۲ء
"	جاپان چلو	" "	۱۹۸۳ء
محفوظ علی بدایونی	طنزیات و مقالات	کراچی ، انجمن ترقی اُردو	۱۹۵۶ء
"	" مرتبہ محی الدین بدایونی	" "	۱۹۷۴ء
محمد اشرف ، آغا	مرتب آبِ حیات کے لطیفے اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی مکمل سوانح حیات	لاہور ، شیخ مبارک علی	۱۹۳۹ء
محمد خاں ، کرنل	بجنگ آمد	علی گڑھ ، علی گڑھ بک ڈپو	۱۹۷۷ء
"	بسلامت روی	راولپنڈی ، مکتبۂ جمال (جون)	۱۹۷۵ء
"	(بار دوم)	" " (اگست)	۱۹۷۵ء
	(بار سوم)	" " (فروری)	۱۹۷۶ء
	(بار چہارم)	" " (اگست)	۱۹۷۷ء
	بزمِ آرائیاں	، غالب پبلشرز لاہور	۱۹۸۰ء

www.taemeernews.com

مسیح انجم	سائیڈ سے چلئے	حیدرآباد، مینار بک ڈپو	۱۹۷۲ء
"	در پردہ	" ، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۶ء
"	چنا پنجہ	" "	۱۹۸۳ء
ملا ابن العرب مکی	مسجد سے میخانے تک	دیوبند، مکتبۂ تجلی	۱۹۶۶ء
نادم سیتاپوری ۔ مرتب	اکبر الہ آبادی کے لطیفے	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	۱۹۵۴ء
" "	انتخاب، فتنہ	" "	۱۹۶۰ء
	(یعنی ریاض خیرآبادی کے مزاحیہ ہفت روزہ کا انتخاب)		
نصیر انور	معذرت کے بغیر	لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز	۱۹۶۵ء
نصیر علی	ظرافت نامہ	دہلی،	۱۹۷۶ء
نظیر صدیقی	شہرت کی خاطر	علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس	۱۹۸۱ء
نعمان ہاشمی	دو بیل	کریم گنج، گیا، اثر پبلی کیشنز	۱۹۸۰ء
"	سیاسی شکنجے میں	" "	"
وجاہت علی سندیلوی	بات کا بتنگڑ	لکھنؤ، نسیم بک ڈپو	۱۹۷۰ء
"	بے ساختہ و بے ضابطہ	" ، ادبی دنیا	۱۹۶۰ء
"	دودھ کے دُھلے	" ، خورشید بک ڈپو	۱۹۶۶ء
وہبی، دیبی پرشاد	انتخاب نادرہ (معنی خیز، لطافت آمیز لطائف کا انتخاب)	" ، صدیق بک ڈپو	
"	لطائفِ ہندی	" "	
وجاہت علی سندیلوی	رقصِ تماشائی	سندیلہ (یوپی)، نصرت منزل	۱۹۸۰ء
یوسف ناظم	دیوار ہیے	بمبئی، نقش کوکن پبلی کیشنز ٹرسٹ	۱۹۷۱ء
"	ذکرِ خیر	نئی دہلی، مکتبۂ جامعہ	۱۹۸۲ء
"	زیر خود	بمبئی، بنت حوا پبلی کیشنز	۱۹۷۲ء
"	سائے اور سائے	حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۵ء
"	فٹ نوٹ	لکھنؤ، نصرت پریس	۱۹۶۹ء
"	کیف و کم	ادارۂ ادبیات اُردو، حیدرآباد	۱۹۶۲ء
		اور میر اکاڈیمی، دہلی	۱۹۶۴ء

www.taemeernews.com

یوسف ناظم	نقطہ	حیدرآباد ، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۷۷ء
"	البتہ	" " "	۱۹۸۱ء
یوسفی ، مشتاق احمد	چراغ تلے	دہلی ، تاج پبلشرز	۱۹۶۱ء
" "	"	" ، ادبی دنیا	۱۹۷۰ء
"	ناکم بدہن	" ، "	۱۹۷۳ء
"	زرگزشت	" ، چمن بک ڈپو	۱۹۷۷ء

فن ظرافت نگاری پر کتب و رسائل

کتب :-

پاشا ، احمد جمال	ظرافت اور تنقید	لکھنؤ ، پنچ پبلشرز	ب ت
حسین ، سید محمد	صنف انشائیہ اور انشائیے	پٹنہ (بہار) ایوانِ اردو	۱۹۷۸ء
سردار احمد	گنجینۂ ظرافت (ظرافت کے اصول، فوائد اور نقصانات۔ نتائج)	لاہور ، خادم التعلیم پریس	ب ت
صدیقی ، رشید احمد	طنزیات و مضحکات	الٰہ آباد ، ہندوستانی اکیڈیمی	"
" "	" "	نئی دہلی ، مکتبۂ جامعہ	۱۹۷۳ء
فرقت کاکوروی	اردو ادب میں طنز و مزاح (حصہ اول : نثر)		
"	" (حصہ دوم : نظم)		
وزیر آغا	اردو ادب میں طنز و مزاح	لاہور ، اکیڈمی آف پنجاب	۱۹۵۸ء
"	"	دہلی ، نازر پبلشنگ ہاؤس	ب ت
خواجہ عبدالغفور ، ڈاکٹر	طنز و مزاح کا تنقیدی جائزہ		

رسائل :-

پیروڈی نمبر	اسکالر ۔ علی گڑھ ، مسلم یونیورسٹی ، سرسید ہال				
طنز و مزاح نمبر	شاہراہ ۔ دہلی				
طنز و ظرافت نمبر	علی گڑھ میگزین ۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ، شعبۂ اردو				۱۹۵۳ء
طنز و مزاح نمبر	نقوش ۔ لاہور			(جنوری۔ فروری)	۱۹۵۹ء
مزاح نگاروں کی کل ہند کانفرنس نمبر	پونم ۔ حیدرآباد	(جلد ۳ شمارہ ۳۱ - ۳۲)		(جنوری)	۱۹۶۷ء
کام نگار نمبر	پندرہ روزہ چنگاری	-	-	-	۱۹۸۴ء
طنز و مزاح نمبر اول و دوم	ماہنامہ آج کل دہلی	-	-	-	۱۹۷۴ء

www.taemeernews.com

ماہ نامہ شگوفہ فبروری ۱۹۷۹ء

مزاح نگاروں پر کتب و رسائل

کتب :-

ڈاکٹر عابد حسین کے مضامین میں طنز و مزاح	قاضی نسیم الحسن	بنگلور، ترسیل پبلی کیشنز	۱۹۷۶ء
رشید احمد صدیقی	سلیمان اطہر جاوید	حیدرآباد، نیشنل بک ڈپو	۱۹۷۸ء
رشید احمد صدیقی : کردار، افکار، گفتار	مالک رام۔ مرتب	دلی، علمی مجلس	۱۹۷۵ء
رشید احمد صدیقی : آپ بیتی (حیات، افتاد اور فتوحات)	معین الرحمٰن۔ مرتب	دہلی، نیو بھارت بک ڈپو	۱۹۷۷ء
فکر تونسوی، شخصیت اور طنز نگاری	نصیر الدین احمد بوکس	حیدرآباد، زندہ دلانِ حیدرآباد	۱۹۸۰ء
کنہیالال کپور : حیات اور کارنامے	یس۔ جے۔ صادق	" نیشنل فائن پرنٹنگ پریس	۱۹۷۵ء
یادگارِ فرحت	غلام یزدانی۔ مرتب	" مطبع انشاء	۱۹۵۱ء

رسائل :-

پطرس نمبر	نقوش، لاہور	شمارہ ۷۶، ۷۵	(ستمبر)	۱۹۵۹ء
ظریف نمبر	ساقی، دہلی		اپریل	۱۹۴۵ء
غالب نمبر	شگوفہ حیدرآباد			۱۹۶۹ء
رشید احمد صدیقی نمبر	تحریر، دلی، علمی مجلس	جلد ۹ ۔ شمارہ ۴	(اکتوبر/دسمبر)	۱۹۷۵ء
" "	نقد و نظر علی گڑھ	جلد ۲ ۔ شمارہ ۱	(اپریل)	۱۹۸۰ء
رضا نقوی واہی نمبر	نگار ادب میوناتھ بھنجن (یوپی)			۱۹۸۳ء
شوکت تھانوی نمبر	نقوش، لاہور	شمارہ ۹۹	(ستمبر)	۱۹۶۳ء
کنہیالال کپور نمبر	اودھ پنچ، لکھنؤ	جلد ۳ ۔ شمارہ ۳		
کرشن چندر نمبر	شاعر، بمبئی			
رضا نقوی واہی نمبر	نگار ادب	میوناتھ بھنجن	مئی جون	۱۹۸۳ء
سلیمان خطیب نمبر	ماہ نامہ شگوفہ		دسمبر	۱۹۷۸ء
بھارت چندر کھنہ نمبر	ماہنامہ شگوفہ۔ حیدرآباد		فروری	۱۹۷۲ء
نریندر لوتھر نمبر	" "		ستمبر	۱۹۷۳ء
کنہیالال کپور	"		جنوری	۱۹۸۱ء
ابراہیم جلیس نمبر	"		مئی	۱۹۷۸ء

www.taemeernews.com

پیروڈی نمبر	ماہنامہ شگوفہ ، حیدرآباد	ستمبر	۱۹۷۶ء
تخلص بھوپالی نمبر	"	نومبر	۱۹۷۷ء
خواجہ عبدالغفور نمبر	"	جون	۱۹۸۴ء

شگوفہ کی خصوصی اشاعت

"ہندوستانی مزاح نمبر"

کے موقع پر

ہماری نیک تمنّائیں

منجانب:

سِمت الکٹرک کارپوریشن

بمبئی۔

www.taemeernews.com

اداریہ

۱۹۸۳ء کے اواخر میں مشفق جناب یوسف ناظم سے ایک ملاقات میں یہ طے پایا تھا کہ ۱۹۸۴ء میں شگوفہ کا "ہندوستانی مزاح نمبر" (نثر) شائع کیا جائے اور اس نمبر کے لیے تمام ہندوستانی زبانوں کے نثری ادب میں طنز و مزاح کے موقف، رفتار اور مسائل پر مضامین لکھوائے جائیں۔ نیز ہر زبان کے ایک منتخب مزاح نگار کی تخلیق کا اردو میں ترجمہ کروایا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل کام تھا کیوں کہ اس نہج پر اب تک کسی بھی زبان میں کام نہیں ہوا ہے۔ اس مشکل کو آسان بنانے کے لیے میں نے محترم یوسف ناظم کو بہ حیثیت مہمان مدیر اس خصوصی شمارہ کی ادارت کے لیے راضی کر لیا۔ (ان کی مہمانی کا یہ دور تو عارضی تھا لیکن در حقیقت شگوفہ کے معاملات میں میں نے انہیں ہمیشہ میزبانوں کی صف میں شامل رکھا ہے) شروع میں مضامین جمع کرنے میں کچھ دقتیں پیش آئیں لیکن ناظم صاحب نے مسلسل پیچھا کر کے سارا مواد اکٹھا کر لیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیدرآباد کے فرقہ پرستوں کو تمام زبانوں کی یہ یکجائی پسند نہ تھی۔ ۱۹۸۴ء حیدرآباد کے لیے کرفیو اور فسادات کا سال بن گیا۔ ایسے حالات میں عام شماروں کی وقت پر اشاعت کی ایک معجزہ سے کم نہ تھی۔ ضخیم خصوصی نمبر شائع کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ پھر یہ طے ہوا کہ عالمی مزاح کانفرنس کے موقع پر یہ خصوصی نمبر شائع ہو۔ لیکن کانفرنس کا کام اس قدر وسعت اختیار کر گیا اور مجھ پر ذمہ داریوں کا اس قدر بوجھ پڑ گیا تھا کہ اعلان کے باوجود اس کی اشاعت کا کام انجام نہ دے سکا۔

اس عرصہ میں مجلس مشاورت کے رکن محترم خواجہ عبدالغفور کے انتقال پر ایک خصوصی شمارہ بھی شائع ہوا۔ نیز عالمی مزاح کانفرنس کے لیے حسب روایت سوونیئر شائع کیا گیا۔

بہرحال "ہندوستانی مزاح نمبر" آپ کے ہاتھوں میں ہے اس نمبر میں ملک کی تمام اہم زبانوں کا احاطہ کیا اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی زبانوں میں طنز و مزاح کی روایت اردو کی طرح مستحکم نہیں۔ اس کے باوجود سوالنامہ کے جواب میں بعض ناقدین اردو طنز و مزاح کے معیار سے مطمئن نظر نہیں آتے۔ ان آرا پر بحث کی کافی گنجائش موجود ہے۔ شگوفہ کے عام شماروں میں اس سلسلہ کو جاری رکھا جا سکتا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زیر نظر خصوصی اشاعت کو ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ یہ نمبر شگوفہ کی خصوصی اشاعتوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔ جس کے لیے ادارہ مہمان مدیر جناب یوسف ناظم اور تمام قلمی معاونین کا خاص طور سے ممنون ہے۔!

سید مصطفیٰ کمال

www.taemeernews.com

اُردو ادب میں طنز و مزاح اور شاعری پر ——

معیاری مطبوعات

طنز و مزاح

مجتبیٰ حسین ـ آدمی نامہ ★ بالآخر ★ تکلف برطرف ★ جاپان چلو ★ قصہ مختصر ★ قطع کلام

ابراھیم جلیس ـ پتے کی بات ★ الٰہی قہر

شوکت تھانوی : قہقہے ★ خطبے ★ ہم زلف ★ پہلی بیگم ★ بہروپیہ ★ مکرر ارشاد

مشتاق یوسفی :- خاکم بدہن اور چراغ تلے کے علاوہ

کرنل محمد خاں : کی طنزیہ نگارش "بجنگ آمد" اور "ابن انشا" کا سفرنامہ "ابن بطوطہ کے تعاقب میں"

اور

ممتاز شعراء کے شعری مجموعے

علامہ اقبال : کلیات اقبال ○ بانگ درا ○ بالِ جبریل ○ ضربِ کلیم

عبدالحمید عدم : جادۂ نود ★ دمِ آہو ★ سرو سمن اور نگارخانہ

احمد فراز : تنہا تنہا ★ بے آواز گلی کوچوں میں ★ درد آشوب ★ جاناں، جاناں

قتیل شفائی : آبرختہ اور مطربہ کے علاوہ

رقص موج : خمار بارہ بنکوی، ورق انتخاب : شاذ تمکنت ، غزل : مجروح سلطان پوری

تلخیاں : ساحر ، رشک قمر : قمر جلال آبادی شفق : سعید شہیدی

مطلع عرض ہے : دلاور فگار

ناشر : حسامی بک ڈپو مچھلی کمان حیدرآباد

www.taemeernews.com

"ہندوستانی مزاح نمبر" کی اشاعت

کے موقع پر

ہماری نیک خواہشات

منجانب :

سفاری سیلس پرائیویٹ لمیٹیڈ

ایڈمنسٹریشن آفس : 107/0 کھیتانی ٹکسٹائیل کمپاؤنڈ
بازار وارڈ
کرلا ، بمبئی 400070

فون نمبر : 512 5463
گرام : "سفاری باغ"

حیدرآباد میں ، مکان نمبر 11-5-263/1
ریڈ ہلز حیدرآباد 500004
فون : 220367

www.taemeernews.com

پیرامونٹ سلک ملز پرائیویٹ لمیٹڈ

ھماری نیک خواھشات

آپ کے ساتھ

منجانب: معین الحق چودھری
ڈائرکٹر

فون ملز : 692204 - 682083 - 685273
فون رہائش : 546608 - 546629

ملز : کیلاش نگر ، آف آرے روڈ ، گورے گاؤں (ایسٹ)
بمبئی — 400063
پتہ رہائش : "المحمود" 40 - پیری روڈ ، باندرہ (ویسٹ)
بمبئی — 400050

www.taemeernews.com

اسکول کے یونیفارمس کے لیے واحد نام!

بنّی کے اسٹاکسٹس

الیف۔ ڈی۔ خان اینڈ کمپنی

عابد روڈ۔ حیدرآباد
فون: ۲۲۲۲۸۲

فون نمبر 222482

کان کھایئے نہ جان کھایئے
آیئے آیئے

پان کھایئے پان کی جان

کشمیری قوام

بنانے والے:

پورن داس رنچھوڑ داس اینڈ سنس گلزار حوض، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

www.taemeernews.com

WDS

واٹر ڈیولپمنٹ سوسائٹی

مولا علی، حیدرآباد ۴۰

— زمین کے خزانوں کے متلاشی.

— پانی و معدنیات کے لیے ڈرلنگ رگس کے تیار کنندگان.

— تلاش برائے آب و معدنیات.

— زیرِ زمین آبی ذخائر کے استعمال کے لیے کھدائی.

— دیہی ترقی کے لیے بہ حیثیت معاون کام کر رہے ہیں.

— ایک سماجی مقصد کے تحت ایک مثالی صنعت کو ترقی دی جارہی ہے.

ٹیلی فون : 851411 -12 -13 & 851054

گرامس : ROCKRIG.

www.taemeernews.com

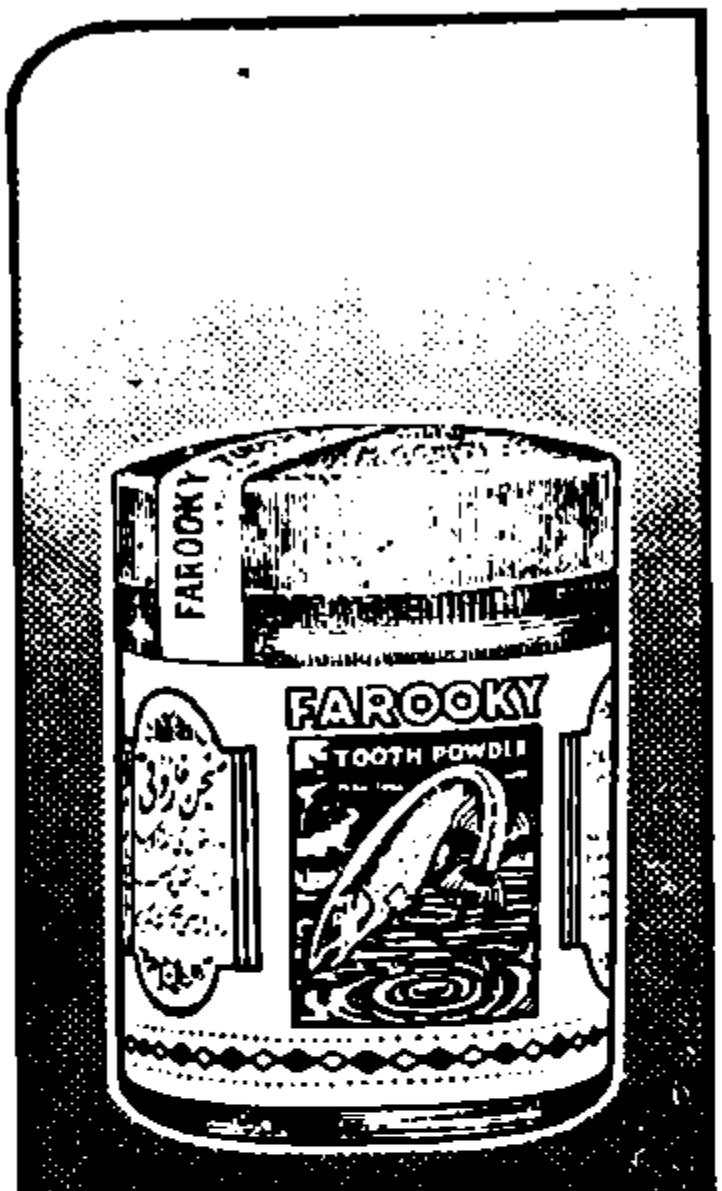

دن بھر کی خوشگوار تازگی!

بجری بوٹیوں سے سائنسی طریقے پر تیار کیا گیا
منجن فاروقی دانتوں کی نہ صرف چمک دمک
بڑھاتا ہے بلکہ
کی خرابی کو دور کرتا ہے
مناسب اور واجبی دام میں منجن فاروقی آپ
کے پیسے کا بہترین بدل ہے۔

دندان و دہن یعنی
مونھ کی مکمل حفاظت کیلئے

منجن فاروقی

کارخانہ زندہ طلسمات۔ حیدرآباد ۵۰۰۰۱۲

www.taemeernews.com

With best compliments from :

NATRAJ CONSTRUCTION COMPANY

Regd. Office : 156, (1st Floor) CHENOY TRADE CENTRE,

116, PARK LANE Secunderabad 500 003.

Phone : 823606

www.taemeernews.com

www.taemeernews.com

R. No. 15822/68 | SHUGOOFA Hyderabad-I | Postal Regd. No. H/HD 6
Vol. 18 Copy Spl. | INDIAN HUNEUR NUMBER | June 1985 Phone : 557716

Banjara Construction Company Private Limited

EKASILA
Cements Pvt. Ltd.

EKASILA PROMISES A LITTLE MORE OF QUALITY, STRENGTH & DURABILITY

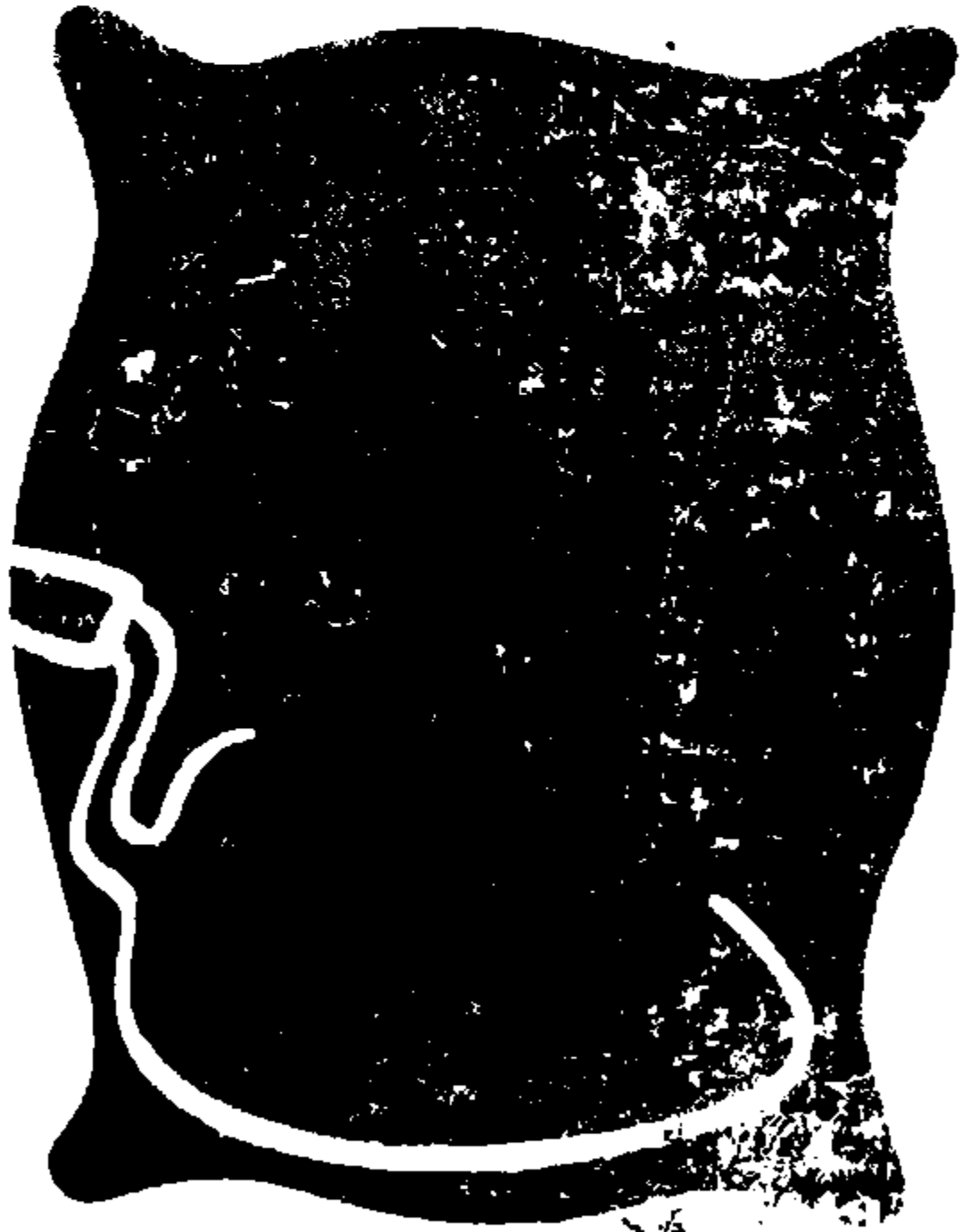

From THE Banjara GROUP

The Builders of

Banjara Castle
Banjara Gardens
Banjara Sadan
Mount Banjara
Banjara Basant
Banjara Basera
Banjara Nivas
Banjara Saman
Banjara View
Banjara Shanti
Banjara Bhavan
Banjara Cottage
Banjara Chembers

Offer
An Excellent Investment
Opportunity

Contact :
Road No. 12
Banjara Hills
Hyderabad-500 034
Phone : 33430